سسپنس ڈائجسٹ

CPNE — MEMBER APNS

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
یمنیٰ احمد

نائب مدیر
اطہر حسین

مارکیٹنگ منیجر
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269
محمد شہزان خان
0333-2256789

جلد 52 • شمارہ 04 اپریل 2023 • زرِ سالانہ 2400 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 180 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
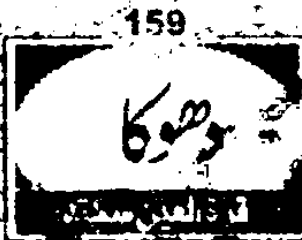
پبلشر و پروپرائٹر: نیشان رسول، مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن ، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

کی صورت شروع ہوا۔ پاپولر ادب کی دنیا میں ایک قندیل روشن ہوئی جو دست بدست چلتی نکھرے اور معطر اجالوں کی پیامبر بنی...... بقول حبیب جالب

اسے بجھا نہ سکے گی ہوا زمانے کی
جلا چلے ہیں لہو سے جو ہم چراغِ سحر

الحمدللہ اب ہم گولڈن جوبلی کے دور سے گزر رہے ہیں

انہی سنہری یادوں میں آپ کا بھی روپہلا اور سنہرا خوب صورت سا حصہ کتنا ہے؟ ہمیں بھی بتائیں...... یہ سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین ہی کے لیے تو ہے۔

1...... ماہنامہ پاکیزہ سے پہلا تعارف......؟

2...... پاکیزہ تحریروں سے کوئی تین ایسی باتیں کیا سیکھیں جو آج بھی زندگی کا حصہ ہیں......؟

3...... سنہرا یا دور حاضر کے پسندیدہ قلم کار کہ جن کی تحریریں پڑھنے کو آج بھی بے چین رہتی ہیں......؟

4...... کوئی فرمائشی سلسلہ ہے تو ضرور بتائیں۔

انشائیه

جون ایلیا

منطق اور فلسفه

تم دیکھ رہے ہو کہ انسانوں نے انسانیت کی طرف سے کس طرح آنکھیں پھیر لی ہیں۔ محبت ہماری بستیوں میں کس طرح نایاب ہوگئی ہے۔ ہر طرف نفرت کا دور دورہ ہے۔ نفرت کے جو مناظر ہم نے اپنے دور میں دیکھے ہیں، انہوں نے انسانیت کی نگاہیں نیچی کردی ہیں۔ سیاست نے کیا کیا؟ زندگی کے خلاف فقط سازشیں کیں۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ زندگی حرام ہوکر رہ گئی ہے۔ غرض مند علم نے کیا فرض انجام دیا؟ جہل کے حوصلے بڑھائے۔ اس کا فیضان یہ ہے کہ لوگ بدی کے نئے نئے گر سیکھ گئے ہیں۔

ہمارے مدبر بے تدبیری میں طاق اور مشاق ہیں۔ سن لو! وہ ایسی باتیں کر رہے ہیں جو غریبوں، سادہ لوحوں اور مظلوموں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا جانی دشمن بنادیں۔ یہ جھگڑا آخر کیوں کھڑا کیا گیا ہے؟ اس لیے کہ مظلوم اور محروم آپس میں ٹکرا جائیں اور ظالم اور غاصب تماشا دیکھیں۔ یہی ان کا تدبر ہے اور یہی ان کی حکمت۔

سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ تعصب کے سب سے بڑے وکیل ہیں۔ اگر یہ لوگ فریب کار نہیں ہیں تو یقیناً فریب خوردہ ہیں۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ اس ملک میں جتنی نفرتیں پھیلائی ہیں، وہ پڑھے لکھے لوگوں ہی نے پھیلائی ہیں۔ یہاں پڑھا لکھا ہونا اور متعصب ہونا، دونوں کا ایک ہی مطلب ہے۔ علم نے جہل کو جس گرم جوشی کے ساتھ اپنے سینے سے لگا رکھا ہے، وہ ہمارے زمانے کا ایک طرفہ ماجرا ہے۔

تم ان لوگوں سے بات کرو جو پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ اگر انہیں بری طرح بہکا نہ دیا گیا ہو تو پھر تم دیکھو گے کہ نہ ان میں زبان کا تعصب ہے اور نہ علاقے کا۔ اگر انہیں کسی پر غصہ آئے گا یا وہ کسی وجہ سے کسی سے نفرت کریں گے تو وہ اپنے غصے اور اپنی نفرت کے حق میں کوئی فلسفہ نہیں گھڑیں گے۔ ان کی نفرت اس شخص کی ذات سے آگے نہیں بڑھے گی جس سے انہیں کوئی اذیت پہنچی ہو۔ مگر یہ پڑھے لکھے لوگ اپنی نفرت اور غصے کو ایک منطق اور فلسفہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ مفسدانہ کلیے بناتے ہیں اور گروہوں کے درمیان مستقل فتنے پھیلاتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کی زبان سے اس قسم کے مقولے سننے کو ملتے ہیں کہ فلاں قوم تعصبی ہوتی ہے۔ اس قسم کے بے رحمانہ کلیے صرف چند مثالوں کو سامنے رکھ کر بڑی شتابی اور نہایت بے حسی اور بے شرمی کے ساتھ لاکھوں کروڑوں انسانوں پر تھوپ دیے جاتے ہیں۔

آج کل ان ''حکیمانہ کلیوں'' اور ''دانشمندانہ مقولوں'' کی ساعتوں کے بازاروں میں بڑی مانگ ہے۔ لوگ یہ کلیے اور مقولے تحفے کے طور پر ایک دوسرے کی ساعت کو پیش کرتے ہیں۔ زہر ہے کہ پھیل رہا ہے، نفرتیں ہیں کہ بڑھ رہی ہیں۔ عقل دیوانی ہوگئی ہے اور دماغ ماؤف اور دانش بے دانشی کے چبوترے پر بیٹھی ہوئی بکواس کررہی ہے۔ سمجھا جائے کہ ہم اپنی تاریخ کے جس دور سے گزر رہے ہیں وہاں خودغرض اور مطلبی طبقے اسی قسم کے شوشے اٹھایا کرتے ہیں۔ اسی طرح کے اشغلے چھوڑا کرتے ہیں ورنہ تم خود سوچو کہ زبانوں، تہذیبوں اور علاقوں کے درمیان بھلا کیا جھگڑا ہے۔ آخر اس بات کے کیا معنی ہیں کہ میں فلاں گروہ سے اس لیے نفرت کرنے لگوں کہ وہ ایک خاص زبان بولتا ہے اور ایک خاص گردوپیش سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ہر گروہ کو اپنے گروہ کے سوا ہر گروہ کا دشمن ہونا چاہیے۔ یہ کتنی مجنونانہ بات ہے اور کتنی بے معنی۔ سنو کہ ہمیں اس بات کو اور ایسی ہی باتوں کو سختی سے رد کرنا ہے۔

☆☆☆

آپ کا خط

عزیزان من

السلام علیکم!

اپریل 2023ء کا خوب صورت شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ بہار کا موسم اس وقت اپنے جوبن پر ہے۔ ہر طرف خوش رنگ پھولوں نے ماحول کو خوشگوار بنا دیا ہے۔ کاش اقتدار کے کچھ خوش کن فیصلے بھی قوم کی تقدیر کا موسم بدل دیتے..... یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہر سال کیا بلکہ ہر دن کوئی نہ کوئی نیا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ قوانین میں ترمیم ہوجاتی ہے مگر [illegible] ان تمام تبدیلیوں کا مثبت اثر صرف اور صرف بااختیار طبقے پر ہی ہوتا ہے جبکہ عوام کے لیے یہ فیصلے کسی سزا سے کم ثابت نہیں ہو رہے..... شب برأت کے موقع پر بھی انہیں عوام کی حالت زار پر رحم نہ آیا۔ شعبان کا یہ مہینہ رمضان المبارک کی آمد کا اعلان کرتا ہے مگر موجودہ حالات میں رمضان المبارک کی آمد اور سحر و افطار کا اہتمام کرنا پوری قوم کے لیے ایک سوالیہ نشان بن گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کو دس گنا زیادہ کرنے والے اس پاک مہینے کا احترام ہمارا بااختیار طبقہ یہ کرتا ہے کہ ہر خورد و نوش کی اشیا کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے۔ کمال ہے پوری دنیا کے لوگ اپنے مذہبی حوالے سے مخصوص ایام میں اشیا کی قیمتیں کم کر کے ہر امیر و غریب کی دسترس ممکن کر دیتے ہیں جبکہ ہمارے یہاں رمضان ہی تو وہ مہینا ہے جب دس گنا زیادہ منافع کمانے کے مواقع میسر آجاتے ہیں۔ ایسے میں غریب طبقہ خاص کر سفید پوش طبقہ کس طرح [illegible] قائم رکھ سکتا ہے۔ جہاں آٹے کا مصنوعی بحران کرنے والوں کو خوف خدا نہیں کہ جس رزق کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اس رزق کو عوام سے بند کر کے یہ کون سی قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ خدارا اب بس کر دیں..... لوگوں کے حوصلے جواب دے گئے ہیں [illegible] حوالے سے [illegible] سمجھوتا کرتی رہے گی۔ کبھی بے روزگاری ..... کبھی بجلی گیس کی بندشیں ..... مہنگی دواؤں کے بے ترستے مریض ..... کب تک [illegible] اور گھٹن [illegible] اس عوام کا مقدر رہے گی کچھ خبر نہیں ..... ہر سطح پر منافع خوری اور من مانی اپنی انتہا کو چھو رہی ہے مگر افسوس کسی کو بھی ایک دوسرے پر [illegible] سے فرصت نہیں ..... ایسے میں کون عوام کی مشکلات کا احساس کر سکتا ہے..... اب تو صرف اللہ ہی سے دعا کی جا [illegible] یا الٰہی [illegible] بے بس قوم کی دادرسی کر ..... جہاں بچے، بوڑھے اور جوان ہر کوئی ایک نادیدہ خوف اور آزار میں مبتلا ہیں۔ یا اللہ پاک تو ان [illegible] دلوں میں رحم کا جذبہ اور قوم کا درد جگا دے۔ پاکستان کی بہت خوب صورت اور زرخیز زمین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے [illegible] نعمتوں سے نوازا ہے..... اللہ پاک منصف حکمرانوں سے بھی نواز دے اور جو ہیں انہیں بھی نیک ہدایت دے۔ فی الحال تو [illegible] پاس [illegible] کے [illegible] کچھ بھی نہیں ہے۔ اللہ پاک ہماری نیک تمناؤں اور دعاؤں کو پورا کر دے اور اس مشکل گھڑی میں ہمارے [illegible] آسانیاں [illegible] (الٰہی آمین) اور جناب اس کے ساتھ ہی اب چلتے ہیں اپنی دھنک رنگ محفل کی جانب۔

٭ ناہید یوسف، اسلام آباد سے تبصرہ کر رہی ہیں۔ "زندگی روز بروز مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ مسائل کا [illegible] اپنے ساتھ بہا کرلے جا رہا ہے مگر ہمارے ارباب اختیار چپ سادھے ہیں بلکہ انہیں صرف "کرسی" سے مطلب ہے [illegible] حاصل کرنے کی دوڑ میں مصروف رہنا چاہتا ہے۔ غریب لوگوں کی کسے پرواہ ہے؟ غریب بے چارہ تو دو وقت کی روٹی کے حصول میں [illegible] ہوا جا رہا ہے۔ آٹا، تیل، گھی غرض اشیائے ضرورت کی ہر چیز پہنچ سے دور ہوگئی ہے۔ دو وقت کی روٹی کا حصول بھی بہت مشکل ہو گیا ہے۔ کم آمدنی والے افراد جائیں تو جائیں کہاں۔ کوئی ہے جو ہماری دادرسی کرے اور ہمارے دکھ درد کو اپنا دکھ جان کر ہمارے لیے آواز اٹھائے۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمیں کوئی ایسا حکمران عطا کرے جو ہمارے مسائل کو حل کر سکے۔ غریب کی دادرسی کر سکے۔ آگے مبارک مہینا رمضان آرہا ہے۔ دیکھیے اس ماہ مبارک میں ہم پر اور کون سے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے انشائیہ پڑھا۔ جون صاحب لوگوں میں "شعور" اجاگر کر رہے تھے۔ "باغی" کا تیسرا اور آخری حصہ پڑھا۔ زویا سلطان نے کسی کو بھی بور نہیں ہونے دیا۔ ویلڈن زویا! شاہ زین رضوان کی "اڑان" وہ اڑان نہ اڑ سکی جس کا ہم سوچ رہے تھے۔ بس ٹھیک تھی۔ "شہ زور" زبردست جا رہی ہے۔ معاذ دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا رہا ہے۔ ادھر اعظم کو حاصل کرنے کے لیے لاشوں کے انبار لگ رہے ہیں۔ بہرحال اعظم بخیر خیریت سے اپنے نانا کے ہاں پہنچ چکا ہے مگر دشمن بھی کم نہیں۔ اسے وہاں سے برآمد کرنے کے لیے انہوں نے حویلی پر اینٹی کرپشن کی ریڈ بھیج دی ہے۔ اب آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ ادھر کنول کا بھی کچھ پتا نہیں کہ اس کی حالت کیسی ہے۔ وہ ٹھیک بھی ہو سکے گی یا نہیں۔ یہ سوچ سوچ کر دل گھبرانے لگتا ہے کہ ہیروئن کو کچھ ہو گیا تو ہیرو بے چارہ کیا کرے گا جس نے اس کی خاطر خاموشی سے

قربانیاں دی ہیں۔ خیر آگے چل کر راز کھلے گا۔ دوسرے نمبر پر دوسرا سلسلہ ''جنگ باز'' پڑھی۔ ہمیں تو سمجھ نہیں آرہی کہ کہانی اندھا دھند چلے جا رہی ہے۔ جہاں سے شروع ہوئی تھی، وہ دشمن تو پس پشت چلے گئے، اب نئی نئی کہانیاں سامنے آرہی ہیں۔ جادو ٹونا وغیرہ۔ کہانی میں وہ جان نہیں کہ قاری کو اپنی گرفت میں لے سکے۔ آگے دیکھیں اور کیا کیا سامنے آتا ہے۔ عیوق بخاری کی ''طاق'' انتہائی اچھی اور سبق آموز کہانی تھی۔ واقعی دولت کا لالچ انسان سے انسانیت کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ گیارہ دوست خزانے کے حصول میں ایک دوسرے کی زندگیاں ختم کرتے رہے اور بالآخر خزانہ ملا نہ ان کی زندگیاں رہیں۔ جو لوٹ آئے تھے بس وہی زندہ رہے۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ ''عرضِ ارض'' میں زبیدہ کی گمشدگی کے ذمے داروں کو قانون کی گرفت میں لیا۔ زبیدہ کو تو واپس نہ لایا جاسکا تاہم مجرموں کو ان کے انجام تک پہنچانے کے لیے قانون حرکت میں آگیا۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ کچھ لوگ چند روپوں کی خاطر معصوم بچوں کو اغوا کرنے کے بعد فروخت کر دیتے ہیں۔ اس مذموم کاروبار کے سدباب کے لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اجتماعی و انفرادی کوشش کریں اور جہاں کہیں کچھ گڑبڑ محسوس ہو تو اپنا کردار ادا کرتے ہوئے قانون کی مدد کریں۔ خلیل انجم کی ''کاش'' اس ماہ کی سب سے اچھی کہانی تھی۔ سفلی خیالات و بری عادات ایسے ہی انسان کو زمین پر پٹختی ہیں جیسے سوڈل کے ساتھ ہوا۔ اس کی اپنی بہن غلیظ کام میں ملوث ہوگئی اور اس کا سامنا اپنے ہی بھائی سے ہوگیا۔ محفل شعروسخن اچھی رہی۔ صائمہ دانش کی ''معما'' کچھ خاص تاثر قائم نہ کرسکی۔ عمران قریشی کی ''پس وپیش'' اچھی کہانی تھی۔ ایلی نے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کردیا اور ٹینی کے لیے اتنی دولت چھوڑ گیا کہ اسے آئندہ زندگی میں کسی قسم کی مشکل پیش نہ آئے۔ ضیاء تسنیم بلگرامی کی ''حکیم لقمان'' ایمان افروز تحریر تھی۔ جزاک اللہ۔ لبنیٰ خان کی ''غیر محفوظ'' اچھی کہانی لگی۔ نشور ہادی کی ''شریف مجرم'' ہمیں کچھ خاص نہ لگی۔ مجموعی طور پر رسالہ بہترین رہا۔ خطوط کی محفل میں روبینہ اشعر کی صدارت پر تمہیں، مبارک باد۔ باقی تمام لوگوں کے خطوط بہت اچھے لگے۔ پرانے قارئین سے گزارش ہے کہ وہ بھی خطوط کی محفل میں حاضری کو یقینی بنائیں۔''

٭ مہتاب احمد کی بے چینی حیدر آباد سے ''مارچ کا ڈائجسٹ بک اسٹال پر دیکھا تو بے چینی سے ادھر کا رخ کیا اور بے تابی سے ہاتھوں میں تھام لیا۔ سنجیدہ سی حسینہ کتاب کھولے جانے کن خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی شمع بلاوجہ جلے جارہی ہے۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ مگر دل بے چین رہا کہ حسینہ کس فکر میں مبتلا ہے۔ سب سے پہلے فہرست دیکھی اور دوڑ لگادی شہ زور کی طرف۔ شہ زور بہت ہی تیز رفتاری سے دوڑ رہی ہے۔ معاذ کامیابیاں سمیٹ رہا ہے اور دشمن کو زیر کرتا جارہا ہے۔ بس نجل کی حالت ٹھیک نہیں۔ آئندہ اقساط میں کیا ہوتا ہے یہ تو پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔ جنگ باز میں بھی سہراب مشکل میں پھنس چکا ہے۔ رانگا بابا، میڈم پھپھی کالی لہر والے اس کے پیچھے ہیں اور وہ انہیں بے نقاب کرنے کے چکر میں ہے۔ کہانی دلچسپ ہوتی جارہی ہے۔ ملک صفدر حیات کی تحریر عرضِ ارض میں لڑکیوں کا اغوا اور پھر ان کی اسمگلنگ کے حوالے سے بتایا گیا۔ تاہم ملک صاحب نے مجرموں کو قانون کے شکنجے میں کس دیا۔ اچھی کہانی تھی۔ نشور ہادی کی شریف مجرم سیدھی سادی اچھی کہانی تھی۔ حکیم لقمان کے بارے میں پڑھ کر دل ایمان سے بھر گیا۔ واقعی وہ اللہ کے برگزیدہ بندے تھے اور اپنی رعایا کو سیدھے راستے کی نصیحت کرتے رہتے تھے۔ جزاک اللہ۔ زویا صفوان کی باغی بھی اچھی رہی۔ مدگوت شہید ہوگیا مگر حق بات کی سربلندی کے لیے آخری دم تک لڑتا رہا۔ ویلڈن زویا جی۔ شاہ زین رضوان کی اڑان اچھی کہانی لگی۔ عیوق بخاری کی طاق اس ماہ کی اچھی کہانیوں میں سے ایک تھی۔ گیارہ دوستوں پر مشتمل قافلہ صرف تین دوستوں کی زندگی بچا گیا کیونکہ ان کی آنکھوں سے لالچ کی پٹی ہٹ گئی تھی۔ باقی تمام دوست اپنی لالچ سمیت اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور ان کے اہل خانہ ان کی راہ دیکھتے رہ گئے۔ ویلڈن۔ خلیل انجم کی تحریر کاش دل ہلا دینے والی کہانی تھی۔ غلط صحبت اکثر ایسے ہی انسان کو شرمندگی اور پشیمانی کے سمندر میں غرق کردیتی ہے۔ لبنیٰ خان کی غیر محفوظ ہلکی پھلکی کہانی لگی۔ عمران قریشی کی پس وپیش میں ایلی نے جو کچھ کیا اس کے مداوے کے طور پر ٹینی کو بہت کچھ دے گیا جس کے بعد اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہی۔ اچھی کہانی تھی۔ کترنیں بھی اچھی رہیں۔ صائمہ دانش کی معما واقعی اپنے نام کے مطابق رہی۔ محفل شعروسخن اچھی رہی۔ اس دفعہ کا رسالہ ہمیں بہت پسند آیا۔ (رسالے کی پسندیدگی کے لیے بے حد شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی یہ قلمی تعاون جاری رہے گا)۔

٭ روبینہ اشعر کی آمد کراچی سے۔ ''اس بار مارچ 2023ء کا شمارہ تھوڑا سا لیٹ ملا۔ ٹائٹل کو سراہتے ہوئے فہرست پر سرسری نظر دوڑائی اور پھر جون ایلیا کے انشائیہ سے مستفید ہوئے۔ خطوط کی محفل میں بشیر احمد بھٹی، جنید علی، ملک وحید، احمد فراز صائی، انجم فاروق ساحلی کی شرکت بھرپور رہی۔ خاص طور پر جنید علی کا تفصیلی تبصرہ پسند آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے زویا صفوان کی تاریخی کہانی ''باغی'' کا آخری حصہ پڑھا۔ ماضی میں بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز واقعات کا بہت خوبصورتی سے احاطہ کیا گیا۔ زبردست تحریر رہی۔ زویا صفوان نے بہت عمدگی سے کہانی کا اختتام کیا۔ ویلڈن زویا جی! شاہ زین رضوان کی تحریر ''اڑان'' زبردست

رہی۔ جب کسی انسان کے دل پر چوٹ لگتی ہے تو اس کے اندر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو اسے پہلے سے زیادہ مضبوط اور مستعد بنا دیتا ہے بشرطیکہ اس موقع پر کوئی ہمت بندھانے والا ساتھ کھڑا ہو۔ عیوق بخاری کی ''طاق'' بہترین تحریر ثابت ہوئی۔ تمام دوست جس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نکلے تھے اس میں ان کی تعداد کو ہمیشہ طاق میں رہنا تھا مگر اس طاق عدد کو برقرار رکھنے کے لیے انہیں کتنے خوفناک مراحل سے گزرنا پڑا، اگر اس کا ادراک پہلے ہو جاتا تو شاید کوئی بھی اس سفر کا آغاز نہ کر پاتا۔ مشکل میں پڑ کر زندگی کی آسانیاں پانے کے لیے عیش پرست دوستوں کا خطرناک انجام۔ ویلڈن۔ ملک صفدر حیات کی ''عرضِ ارض'' غیرت کو پیروں تلے کچل کر لالچ کی بنیاد پر محل بنانے والوں کی عبرت اثر روداد تھی۔ مہر نوازش علی جیسے معاشرے کے ناسوروں اور ضمیر فروشوں نے آنکھوں پر لالچ اور ہوس کی پٹی باندھی ہوتی ہے۔ ایسے کرداروں کو عبرت ناک سزا دلوا کر ملک صاحب نے دھرتی سے محبت و وفاداری کا قرض ادا کیا۔ ضیاء تسنیم بلگرامی کی تحریر ''حکیم لقمان'' بہت عمدہ رہی۔ ان کا ذکر قرآن پاک میں بھی موجود ہے۔ ان کی حکمت آمیز باتیں، ان کی نصیحتیں، ان کی ہدایات، آج بھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ وہ نہ تو پیغمبر تھے اور نہ ہی نبی مگر اللہ کے ولی کا درجہ رکھتے تھے۔ خلیل احمد انجم کی ''کاش'' بھی اچھی رہی۔ صائمہ دانش کی تحریر ''معما'' پسند آئی۔ عمران قریشی کی ''پس وپیش'' میں ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے جوڑے کے دلوں میں چھپی محبت کا انوکھا انداز پڑھنے کو ملا۔ تحریر پسند آئی۔ لبنیٰ خان کی ''غیر محفوظ'' بھی اچھی رہی جس میں انجام کی پروا کیے بغیر ایک کمسن بچی کی بہادری کا قصہ پڑھنے کو ملا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''جنگ باز'' اپنے سسپنس اور ایکشن کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے اور سہراب کی مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دیکھتے ہیں سہراب کی یہ مشکلات کب ختم ہوں گی۔ نشور ہادی کی ''شریف مجرم'' پسند آئی۔ لوگ اندر سے کتنے گہرے ہوتے ہیں، یہ ایسی حقیقت ہے جس کا ادراک اکثر ٹھوکر کھانے کے بعد ہوتا ہے۔ ایک شوخ حسینہ کے باکمال کارناموں اور ایک معصوم عاشق کی حسرتوں پر مشتمل دلگداز داستان زبردست رہی۔ محفل شعر و سخن بھی خوب سجی رہی۔ کترنیں بھی پسند آئیں۔''

* ملک وحید کراچی سے چلے آ رہے ہیں۔ ''مارچ 2023ء کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل زبردست رہا۔ حسینہ کو سراہتے ہوئے جون ایلیا کے انشائیہ پر پہنچے جہاں پُرمغز گفتگو سے مستفید ہوئے۔ خطوط کی محفل میں احباب کی شرکت بھرپور رہی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ضیاء تسنیم بلگرامی کی تحریر ''حکیم لقمان'' پڑھی۔ ان کے بارے میں پڑھ کر بہت لطف آیا۔ زویا صفوان کی تاریخی کہانی ''باغی'' زبردست تحریر تھی۔ بہت خوب زویا جی! شاہ زین رضوان کی تحریر ''اڑان'' کچھ خاص نہیں لگی۔ ملک صفدر حیات کی ''عرضِ ارض'' بہترین تحریر تھی۔ ملک صاحب نے مہر نوازش علی کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر اپنی دھرتی سے وفاداری کا ثبوت دیا۔ عیوق بخاری کی ''طاق'' بھی اچھی تحریر تھی۔ لالچی دوستوں کا انجام بہت برا ہوا۔ عمران قریشی کی ''پس وپیش'' اچھی تحریر تھی۔ خلیل احمد انجم کی ''کاش'' کوئی خاص تاثر قائم نہ کر سکی۔ صائمہ دانش کی تحریر ''معما'' خوب رہی۔ لبنیٰ خان کی ''غیر محفوظ'' زبردست تحریر تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''جنگ باز'' اپنے سسپنس، ایکشن اور سہراب کی مشکلات کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ نشور ہادی کی ''شریف مجرم'' پسند آئی۔ محفل شعر و سخن اور کترنیں پسند آئیں۔''

* ملتان سے جنید علی کا قلمی تعاون۔ ''السلام علیکم! سسپنس کے قارئین کیسے ہیں آپ سب؟ کہیں اداس تو نہیں کہ قیمت میں معمولی سا اضافہ ہو گیا۔ کوئی بات نہیں آج کل کے بچے اتنے پیسے لے لیتے ہیں۔ عوام جنک فوڈ پر بھی تو اتنا خرچ کرتی ہے، ساتھ یہ سوشل میڈیا کے ذرائع، کیبل کے بلز تو ہر ماہ یہ ایک ڈائجسٹ کی قیمت سے دو سے تین گنا یا اس سے بھی زیادہ موبائل کے وائس ایپ، ایف بی، کال اور وائی فائی پر خرچ ہوتا اور اگر ڈائجسٹ کی قیمت میں کاغذ کی موجودہ پیچیدہ صورتِ حال کی بنا پر بیس تیس روپے کا اضافہ ہو جائے تو یہ آسمان سے ہم گرنے کا تصور تو نہیں ہونا چاہیے۔ اب ادارے بھی کیا کریں۔ وہ تو پوری کوشش کر رہے ہیں عوام کو اچھا اور معیاری ادب دیں۔ پھر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر چیز مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔ اپنے بہتر معیار کی وجہ سے نصف صدی سے یہ چند ڈائجسٹ کے publication Houses باقی ہیں ورنہ کتنے ڈائجسٹ بند ہو گئے، تو اب اگر ہم ادارے کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے تو کیا ہم یہ چاہیں گے کہ مطالعے کا تصور ختم ہو جائے اور اگلی نسل بس الیکٹرانک میڈیا کی منفی خرافات میں غرق رہے تو قیمت کو سر پر اتنا سوار نہ کیا جائے۔ خیر، سسپنس اس ماہ تاخیر سے تیس فروری کو حسبِ معمول یونیورسٹی سے واپسی پر بک اسٹال سے لیا۔ سرورق بہت دلکش ہے۔ سادہ سا کینڈل، ٹیبل اور ماڈل کے ہاتھ میں خاص کر کتاب دیکھ کر خوشگواریت کا احساس ہوا۔ ہاں، مگر یہ ماڈل پچھلے ماہ کی ماڈل کی ہمشیرہ لگی کہ ایک جیسے چہرے کے نین نقش تھے۔ فہرست میں سسپنس کے باقاعدہ رائٹرز ہی جلوہ گر ہیں۔ آگے جون ایلیا صاحب ''شعور'' پر بحث فرما رہے ہیں اور درست کہتے ہیں کہ ہم سدا کے بے معنی اور مہمل ہیں۔ اگر شعور کو جز وقتی نہیں، کل وقتی طور پر اپنا لیں گے تو ہماری مہملیت اور عبثیت کی چیرہ دستی ہمارا کچھ زیادہ نہیں بگاڑ سکے گی۔ سسپنس میں یہ سلسلہ پڑھ کر یقین

کیجیے جون صاحب کی کتب پڑھنے کا دل کرتا ہے اور تاریخی تحریروں کی وجہ سے نسیم حجازی کو۔ خیر یہ خواہش بھی جلد پوری ہوگی، اِن شاء اللہ۔ تاریخی تحریر ''باغی'' کا دلچسپ اختتام، درگوت کی شہادت کے ساتھ۔ یہ تحریر بہادری، دیدہ دلیری، انا پرستی، غرور اور حسد و عناد کی داستان رہی، ساتھ منظر کشی سے بھرپور۔ اگلے ماہ بھی ضرور اس سلسلے میں کچھ خاص ہی پڑھنے کو ملے گا۔ دوسری تحریر ''اڑان'' جو کہ نادی نے بھری تھی تب ہی تو ایلانا کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ نوری اور گرینڈ ما، میوس کا کردار بہت مثبت رہا۔ ''جانی کیک'' کی تعریف کہانی میں پڑھ پڑھ کر دل کیا کاش، ہم بھی اسے چکھ سکیں۔ ساتھ یہ پسندیدہ رہی کہ لکھنے کا انداز اچھا تھا۔ سسپنس کے ہیرو نمبرون یعنی محاذ کی طرف چلتے ہیں۔ تو اس قسط میں بہت سے حیران کن انکشافات ہوئے اور یہ پروفیسر اینڈریو شیطان کے بھائی کم، دادا زیادہ لگے جو اپنی ایجاد کے چکر میں کتنی انسانی جانوں سے کھیل رہے تھے اور بیدردی سے مارنے کے بعد بھی یہ گھناؤنے کام۔ سورنج کی ہوشیاری کام آتی رہی جو خود کو اب تک بچاتا رہا۔ لارا کو تو مر ہی جانا چاہیے یا کرنٹ لگا کر اسے مار ہی دینا چاہیے اور باذل بھی بچنا نہیں چاہیے۔ شکر ہے اعظم مل گیا اور اب جلد اپنی ماں سے بھی مل جائے گا۔ ''طاق'' میں آٹھ دوستوں کے لالچ و طمع پر مبنی ایک الگ ہی داستان تھی جس کو پڑھتے ہوئے ایک الگ ہی لطف آیا۔ ڈیوڈ، ولسن اور جیری تو بچ ہی گئے کہ لالچ کی پٹی آنکھوں سے ہٹ گئی تھی جب موت کا دیدار کیا اور باقی سارے خاص کر مارٹن اور چارلس اس لالچ کی وجہ سے اپنی زندگی کی بازی ہار گئے۔ عیوق بخاری ہر بار سسپنس میں مکمل تیاری کے ساتھ آتی ہیں۔ احمد سلیم سلیمی اس بار غیر حاضر تھے۔ ملک صفدر صاحب کی تحریر سے زیادہ ان کی تحریر کا نام دلکش تھا۔ کہانی میں طوالت بھی محسوس ہوئی۔ واقعی یہ ارض بھی تو ہم سے ایک ہی عرض کرتا ہے کہ اس ارض کو ہم باسیوں سے صرف وفاداری ہی تو چاہیے اور یہی تو صرف عرضِ ارض ہے۔ زبیدہ، ریحانہ اور نزہت کے لیے تو کچھ نہیں ہوسکتا مگر چلیں ان کی وجہ سے باقی قوم کی بیٹیوں کے لیے تو کاوش ہوئی مہر نوازش کو پکڑ کر۔ عقیل انجم کی تحریر ''کاش'' کا بہت بھیانک انجام ہوا یعنی جب سوڈل نے کس جگہ پر کس کے لیے کس کو دیکھا یعنی اپنی بہن رتنا کو دیکھا یہ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا اور وہی ہوا۔ غلط صحبت اور والدین کی بے پروائی سے یہی ہوتا ہے۔ ''معما'' حل ہو ہی گیا۔ پوری کہانی میں نیکلس ہی جگہ بدلتا رہا۔ رابرٹس نے بھی اپنی محبت یعنی لیلیا کو قتل کر دیا کہ میری نہیں تو کسی کی نہیں ہوگی۔ ''پس و پیش'' میں فینی اور ایلی کی داستان پڑھی۔ ایلی کا خیال بھی کسی حد تک درست ہی تھا اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ جن حالات سے وہ دونوں میاں بیوی دوچار ہوئے، ان کی اولاد بھی یہ سب برداشت کرے۔ ہم واقعی خود کو مکمل تصور کرتے ہیں اور دوسروں کی کسی قدرتی خامی پر اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ضیاء تسنیم نے اس بار ''حضرت لقمان'' پر لکھ کر احسان کیا، ہم سب پڑھنے والوں پر اور ان کا یہ لکھنا، ادارے کا چھاپنا صدقۂ جاریہ ہے۔ کتنے اَن گنت انسانی اخلاق و کردار سے متعلق اصلاحی پہلو اور کارآمد نصیحتیں پڑھنے کو ملیں، ساتھ ان کی داستانِ حیات میں ان کا اپنے لختِ جگر کی اتنی بہتر انداز میں تربیت کرنا۔ اللہ پاک ہمیں۔ ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ لبنیٰ خان ''غیر محفوظ'' میں ایک کمسن بچی کی بہادری کا قصہ سنا رہی تھیں جو ہمیں زیادہ پسند نہ آیا۔ آخری تحریر کی بات کی جائے تو نشور ہادی نے پچھلی بار کی نسبت اس بار کمال کر دیا ''شریف مجرم'' عامر کو دکھا کر۔ یہ ناول پورے شمارے میں سب سے زیادہ پسند آیا۔ کام تو سارا نیلم نے ہی کیا۔ نیلم کی ہوشیاری قابلِ داد تھی۔ کس طرح اس نے شریف مجرم کو پکڑنے میں اہم کردار ادا کیا اور آخر میں شکیب، نیلوفر کے ہو گئے۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ جی تو یہ تھیں مارچ کے سسپنس پر باتیں۔ اس دعا کے ساتھ اجازت کہ ہم تمام مسلمانوں کی زندگی اسلام پر ہو، خاتمہ ایمان پر ہو۔ ملتے ہیں اگلے ماہ سسپنس کے ان ہی دلکش صفحات پر۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے

غلام رسول، پھالیہ۔ قمر شہزاد، لاہور۔ ریاض الدین، میرپور خاص۔ ریحانہ عطا، ملتان۔ صابرہ ریاض، گجرات۔

سانحہ ارتحال

عرصۂ دراز سے جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن سے وابستہ اور معراج رسول صاحب کے دیرینہ کارکن اختر بیگ رضائے الٰہی سے انتقال کر گئے...... ان کی انتھک محنت اور وابستگی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا......

☆☆☆

سسپنس ڈائجسٹ کے نائب مدیر اطہر حسین کی بھتیجی کا ٹریفک حادثے میں انتقال ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے...... ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

نخلِ وفا

اے آر راجپوت

ماضی کا کوئی بھی قصہ ہو...
ہمیشہ سننے یا پڑھنے میں بہت اثر
رکھتا ہے... زیر قلم عہد کو بھی بھلانا
کوئی آسان نہیں تھا... جس عہد میں
قتل و غارت گری اور انسانیت سوز مظالم
صفحۂ قرطاس پر اذیتوں بھری داستان رقم
کرگئے... اسی عہد میں کچھ لوگوں نے بڑے
خوبصورت خواب بھی آنکھوں میں سجالیے تھے
لیکن فرائض کی ادائیگی نے کبھی انہیں محبت کی
روش پر چلنے نہیں دیا... اس کے باوجود محبت نے
ہمیشہ ان ٹوٹے ہوئے دلوں کا تعاقب کیا اور ایک آس اور
امید نے ہر لمحہ ان کی ڈھارس بندھائے رکھی کیونکہ ان کے
اس سفر میں کچھ اہلِ وفا اور کچھ راہنما بھی ان کے ہم قدم
رہے تھے... جن کی حوصلہ افزائی نے ہمیشہ انہیں خوش
گمان رکھا... تاتاریوں کی زندگی کے حوالے سے ایک اور
گمشدہ پہلو کی کربناک تصویر جس میں لہو نے اپنا رنگ بھرا

شام جھک آئی۔ فضائے بسیط پر ایک عجیب سی خاموشی طاری ہے۔ یوں جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ اکناف میں پھیلے صحرا کے دامن میں اشجار کے اس مختصر سے علاقے کو فقط جیسے ایک ہی شخص نے آباد کر رکھا تھا۔

یہ بانکا، سجیلا اور کڑیل نوجوان جنگجو بھی نظر آتا تھا اور کسی کی راہِ وفا کا منتظر بھی۔ اسی سبب اس کی نظریں اپنے ترکش سے کھیلتے کھیلتے ایک راستے پر یکبارگی اٹھ بھی جاتی تھیں۔

بالآخر دیدِ منتظر بار آور ثابت ہوئی۔ راہِ وفا کے دم بخود سناٹوں کو کسی سیمیں بدن کے وجود نے جیسے گلنار کر دیا۔ نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ قریب آ گئی۔ اس خوش خصال دوشیزہ پری جمال کے عنابی ہونٹوں پر محبتوں کی مسکانیں ثبت تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں کچھ تھما ہوا تھا۔ وہ اس کے لیے کھانا لے کر آئی تھی۔

دونوں کو نخلستان کے ان جاں گداز لمحات گزارتے ہوئے کچھ دیر بیتی تو محبوبہ حسن طراز نے نوجوان کے ترکش سے کھیلتے ہوئے بڑے دلار سے کہا۔

''اب جانے دو مجھے جیش! میرے بابا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

نوجوان جیش نے ایک آہ بھری۔ اس کے جانے کے تصور سے وہ اداس سا ہوا پھر بولا۔

''نفیسہ! کچھ دیر اور ٹھہر جاؤ نا۔ ذرا چاند ابھرنے دو پھر چلی جانا۔''

''چاند کی آج بائیس تاریخ ہے۔ وہ دیر سے نکلے گا۔'' نفیسہ نے جواب میں دھیرے سے کہا۔

''تو کیا ہوا۔ چچا سلمان کو تو معلوم ہے کہ تم مجھے کھانا دینے آئی ہو۔'' جیش نے اطمینان دلانا چاہا۔ نفیسہ کو کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ خود بھی تو یہی چاہتی تھی کہ کچھ دیر اور جیش کے پاس ٹھہرے لیکن گھر پر اس کا باپ اکیلا تھا اور اسے آئے کافی دیر بھی ہو چکی تھی۔

یوں تو جیش دن بھر اس کے ساتھ ہی رہتا تھا لیکن رات کو اس کا پہرا سرحد پر لگتا تھا اور وہ سرِشام سے تیر کمان اور سنان سنبھالے، نخلستان کے مغربی سرے پر ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچ جایا کرتا تھا۔

نفیسہ اور جیش دونوں چچا زاد تھے لیکن اس وقت ان کے خاندان میں سوائے نفیسہ کے باپ سلمان کے اور کوئی زندہ نہ بچا تھا۔ ان دونوں کی منگنی بچپن ہی میں ہو چکی تھی اور اگر تاتاریوں کے حملے کی خبر نہ ملتی تو اس ماہ کی چودہ تاریخ کو ان کی شادی ہو چکی ہوتی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نفیسہ نے شوخی سے کہا۔

''لوگ کہتے ہیں کہ چودہ تاریخ منحوس ہوا کرتی ہے۔''

جیش اس کا اشارہ بھانپ گیا اور بولا۔ ''لوگوں کے لیے ہو یا نہ ہو لیکن یہ چودہ تاریخ اپنے لیے تو واقعی بہت منحوس ثابت ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ نخلستان والوں کا یہ وہم ہے۔ تاتاری تین بار شکست کھا چکے ہیں۔ اب وہ حملہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔''

''نہیں جیش! ایسا نہ کہو۔'' نفیسہ نے خوفزدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''بابا کہہ رہے تھے کہ تاتاری بہت ضدی اور ظالم ہوتے ہیں۔ وہ بیس برس کے بعد بھی بدلہ لیتے ہیں۔ وہ نہ خود چین سے بیٹھتے ہیں اور نہ دوسروں کو چین لینے دیتے ہیں۔''

جیش بولا۔ ''یہ تو ٹھیک ہے لیکن تاتاریوں کو بھی یہ معلوم ہو چکا ہے کہ سلطانِ مصر ان کے مقابلے کے لیے لشکر لے کر چل پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایک ہفتے سے تاتاریوں کے آگے بڑھنے کی کوئی خبر نہیں آئی پھر اگر ایسا خطرہ تھا تو تم دوسری عورتوں کے ساتھ حمص چلی جاتیں۔''

''میں تمہیں اکیلے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں جیش؟'' نفیسہ کی آواز کپکپا گئی۔

جیش نے نفیسہ کے ہوا میں لہراتے ہوئے نرم بالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''نفیسہ! مجھے تمہارے دل کا حال معلوم ہے لیکن تم میرے لیے اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے خود حمص جانے سے انکار کر دیا ہے لیکن سلمان چچا کا کہنا بھی غلط نہیں ہوتا۔ ہم ہی کیا، خماریہ کا ہر چھوٹا بڑا ان کے کہنے کو نہیں جھٹلا سکتا۔ خطرہ واقعی ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور خماریہ پر کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا ہے۔''

نفیسہ نے دو قدم بڑھ کر جیش کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھے اور لرزتے لہجے میں بولی۔ ''جیش! پھر تم بھی میرے ساتھ حمص کیوں نہیں چلتے؟''

نفیسہ کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہی جیش نے بڑی تیزی سے نفیسہ کے ہاتھ جھٹک دیے۔

اندھیرے کی وجہ سے اس کے چہرے کے تاثرات تو نہ معلوم ہو سکے لیکن اس کی آواز کی گرج سے اس کے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ کڑک کر جری لہجے میں بولا۔

''نفیسہ! تم جیش کو بزدل بنانا چاہتی ہو تاکہ نخلستان خماریہ کے جوان مجھ پر آوازے کسیں اور کہیں کہ جیش عورتوں کی طرح موت سے ڈر کر بھاگ گیا۔ اس نخلستان میں اب تک میں نے صرف پسینا بہایا ہے لیکن اگر اس

سرزمین کو میرے خون کی ضرورت پڑی تو میں اس سے بھی دریغ نہ کروں گا۔'' جیش بول رہا تھا اور نفیسہ سہمی ہوئی پیچھے ہٹ رہی تھی۔

جب جیش خاموش ہوگیا تو نفیسہ ہمت کر کے آگے بڑھی اور بڑی محبت سے بولی۔

''جیش! تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میں بھی ایک مسلمان لڑکی ہوں اور جنگ کے موقع پر مسلمان عورتیں اور لڑکیاں، مردوں کی طرح دشمن کا مقابلہ کرتی ہیں۔ بابا جانی نے مجھے نیزہ چلانا اور خود تم نے تیراندازی سکھائی ہے۔ میں دشمن سے نہیں ڈرتی اور نہ یہ چاہتی ہوں کہ تم دشمن کو پیٹھ دکھا کر میرے ساتھ بھاگ چلو۔ میں تو یہ کہنا چاہتی ہوں کہ نخلستان والوں نے ہر گھر سے ایک نوجوان لیا ہے اور جس گھر میں صرف ایک جوان موجود تھا، اسے اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو لے کر یہاں سے حمص چلا جائے۔ اس صورت میں تمہیں حق پہنچتا ہے کہ تم ہم لوگوں کو لے کر یہاں سے حمص چلو۔''

نفیسہ کی محبت اور پھر اس انداز سے گفتگو نے جیش کے غصے کو ٹھنڈا کر دیا۔ وہ اپنے سخت الفاظ پر نادم تھا۔ آخر وہ نفیسہ کے قریب آیا۔ اتنا قریب کہ دونوں نے ایک دوسرے کی سانسوں کو محسوس کیا۔

''نفیسہ! مجھے معاف کر دو۔ میں غصے میں بہت کچھ کہہ گیا۔'' جیش نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

نفیسہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اتنا ضرور ہوا کہ اس کی سانس کی رفتار کچھ تیز ہوگئی اور جسم میں برقی لہریں دوڑنے لگیں۔ اس کا جسم جیش کی طرف جھک گیا اور سر جیش کے کاندھے سے آلگا۔

اس طرح کھڑے ہوئے چند لمحے بیت چلے تھے کہ یکا یک نخلستان کے مشرق کی جانب ایک شور سا بلند ہوا اور پھر دم کے دم میں پورا نخلستان آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔

یہ دیکھ کر جیش نے پھرتی کے ساتھ جست لگائی اور اب وہ اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر تھا۔ اس نے ہاتھ کے سہارے سے سہمی ہوئی نفیسہ کو اپنے پیچھے بٹھایا اور پھر گھوڑا بڑھا کر ریت میں گرے ہوئے نیزے کو کھینچا۔

اس قلیل سے وقفے میں بھی نخلستان میں قیامت برپا ہو چکی تھی۔ تاتاریوں کے حملے کے پیش نظر عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو نخلستان سے نکل کر محفوظ علاقوں میں پہنچا دیا گیا تھا پھر بھی کافی لوگ موجود تھے۔

ان لوگوں میں بوڑھے مرد بھی تھے اور عورتیں بھی جن کا کام صرف پہریدار نوجوانوں کو کھانا پہنچانا تھا۔ تاتاریوں کا حملہ اتنا بے وقت اور اچانک تھا کہ پہریدار پوری طرح سنبھل بھی نہ سکے اور وحشی تاتاریوں نے انہیں کاٹنا شروع کر دیا۔

نخلستان کے لوگوں نے احتیاط کے طور پر دو سواروں کو سرحد پار اس لیے بھیج دیا تھا کہ وہ تاتاریوں کی نقل و حرکت کی خبریں پہنچاتے رہیں لیکن شاید وہ سوار ان لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے کیونکہ حملے سے قبل نخلستان والوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تاتاریوں کا وہ لشکر جوان سے دو سو فرسنگ کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے، وہ بغیر اطلاع کے حملہ آور ہو سکتا ہے۔

یوں اس اچانک حملے کی اصل وجہ یہ تھی کہ تاتاریوں نے اس بار اپنا راستہ بدل دیا تھا۔ عام طور پر ان کا حملہ شمال سے ہوا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ مشرق سے نمودار ہوئے اور آنِ واحد میں پورے نخلستان کو تہ و بالا کر ڈالا۔

تاتاریوں کے جس دستے نے نخلستان پر حملہ کیا تھا، وہ ان کا ہراول دستہ تھا۔ اس ہراول دستے میں بھی تقریباً دو ہزار سوار شامل تھے۔ گو خارسیہ کے مجاہد کچھ غافل تھے لیکن تاتاریوں کے حملہ کرتے ہی وہ سنبھل گئے اور پھر تقریباً پانچ سو سواروں نے کفار کا اتنا ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ تھوڑی دیر کے لیے تو ان کے دانت کھٹے پڑ گئے لیکن کب تک اس طوفان اور سیلاب کو روکا جا سکتا تھا۔

بالآخر یہ لوہے کی دیوار چند ساعتوں کے اندر تہس نہس ہوگئی اور پھر تاتاریوں نے نخلستان میں داخل ہو کر قتلِ عام شروع کر دیا۔ تاتاریوں نے مشعلوں سے بستی میں آگ لگا دی۔ بوڑھوں اور عورتوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل دیا اور بھاگنے والوں کو تیر سے چھید ڈالا۔ تاتاریوں کا یہ عام دستور تھا کہ وہ جس بستی سے گزرتے، اسے برباد کر دیتے، لوگوں کو قتل کر دیا جاتا اور کنوؤں، تالابوں یا پانی کے دیگر ذخیروں میں زہر ہلاہل ملا دیا جاتا جسے پینا موت کو دعوت دینا تھا۔ اس ہرے بھرے نخلستان کی تباہی میں اتنا کم وقت لگا کہ وہ لوگ جو نخلستان سے کچھ فاصلے پر تھے، وہ اس بارے میں مشکل ہی سے کچھ سوچ سکتے تھے۔

جیش نے شور و غل کی آواز سن کر گھوڑے پر جست لگائی، سنان سنبھالا اور نفیسہ کو اپنے پیچھے سوار کیا لیکن جس وقت وہ سنان (نیزہ) ہلاتا ہوا نخلستان پہنچا تو اس وقت تک پورا نخلستان تباہ ہو چکا تھا اور تاتاری اس کو برباد کرنے کے بعد مغرب کی طرف نکل رہے تھے۔

جیش کو چچا سلمان کا رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ اس بوڑھے پر نا معلوم کیا گزری ہوگی۔ یہ سوچتا ہوا وہ نخلستان میں داخل ہوا۔

اس کی نظر سب سے پہلے سلمان پر پڑی جو ان کی طرف بھاگتا ہوا آرہا تھا۔ اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔

''جیش ......! واپس جاؤ۔ نفیسہ کی اور اپنی جان بچاؤ۔''

جیش نے سلمان کے الفاظ سے پوری حالت کا اندازہ لگالیا تھا۔ اس نے اچھی طرح اندازہ لگالیا کہ اب نخلستان میں لڑنا یا اس طوفان سے ٹکرانا سراسر حماقت ہے لیکن اس کی طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ بوڑھے سلمان کو تاتاریوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود بھاگ جائے۔

لہٰذا جیش بیک ترنت اپنے گھوڑے سے اترا اور سلمان کی طرف بڑھا تاکہ اسے بھی سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کرے لیکن ٹھیک اسی وقت ایک تیر سلمان کی پشت میں پیوست ہو گیا۔ جیش نے دیکھا کہ ایک تاتاری سوار دور سے تیر چلاتا ادھر ہی آرہا ہے۔ سلمان کے منہ سے ایک آہ نکلی۔ جیش نے [illegible] دیا اور اٹھا کر نفیسہ کے برابر گھوڑے پر بٹھا دیا۔ اس [illegible] تاتاری جیش کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

جیش نے اپنا نیزہ سنبھالا اور نفیسہ سے [illegible] چچا کو لے کر حدیثہ کا رخ کرو۔''

''اور آپ ......؟'' نفیسہ نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

''اگر زندگی رہی تو حدیثہ میں ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔'' یہ کہا اور دو قدم آگے بڑھ کر آنے والے تاتاری کا انتظار کرنے لگا۔

تب جیش نے دیکھا کہ نفیسہ جانے میں کچھ پس و پیش کر رہی ہے۔ اس نے فوراً اپنے نیزے سے گھوڑے کو ذرا ہشکارا دیا جس کے ساتھ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

نفیسہ کے روانہ ہو جانے کے بعد جیش کو کچھ اطمینان ہوا۔ اس وقت تاتاری سوار اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ جیش نے پوری طاقت سے اس پر نیزہ کھینچ مارا اور نیزہ اس کے سینے کو چیرتا ہوا پشت سے نکل گیا۔

جیش نے بڑھ کر نیزہ اس کے جسم سے نکال لیا لیکن اس عرصے میں ہزاروں تاتاری سوار اس طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ سوار قتل عام کے بعد فاتحانہ انداز سے گھوڑے بھگاتے اب آگے بڑھ رہے تھے۔

اس وقت بھی ان کا رخ جنوب کے بجائے مغرب کی طرف تھا اور مغرب میں جیش ایک تاتاری کو ختم کرنے کے بعد اندر داخل ہونے کی فکر میں تھا۔

جیش نے اتنے بہت سے سواروں کو آتے دیکھا تو فوراً تاتاری کی لاش کھینچ کر ایک طرف کر دی تاکہ آنے والوں کی نظر اس پر نہ پڑے اور خود راستے سے ہٹ کر دور ایک جھاڑی میں چھپ گیا۔

وحشی تاتاری سوار شیطانی قہقہے لگاتے نخلستان سے نکلے اور پھر ان کے گھوڑے لق و دق ریگستان میں دوڑنے لگے۔

چاند کافی بلند ہو چکا تھا اور چہار سو پھیکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ تاتاریوں کے جانے کے بعد جیش جھاڑیوں سے نکلا اور آبادی میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر پہلے یہ ایک ہرا بھرا نخلستان تھا لیکن اب اس وقت اس کی کیفیت ایک ایسے کھنڈر کے مانند ہو گئی تھی جسے دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔

تاتاریوں نے مکانوں کو پھونک دیا تھا اور انسانوں کے علاوہ جانوروں کو بھی اپنے ظلم کا نشانہ بنایا تھا۔ جیش کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کے قدم بھاری ہو رہے تھے پھر بھی وہ ہمت کر کے آگے بڑھ رہا تھا۔

بستی کا کوئی مکان ایسا نہ تھا جس کی شکل نہ بگڑ گئی ہو۔ راستوں پر لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور مکانوں پر جلتے ہوئے لاوے کے نیچے لاشیں دبی ہوئی تھیں۔

تاتاریوں نے اس انداز سے غارت گری اور خونریزی کی [illegible] آبادی میں کوئی بھی زندہ نہ رہا تھا۔ جیش نے کئی لاشوں کو الٹ پلٹ کر [illegible] لیکن وہ سب بے جان تھیں۔

[illegible] جانوروں [illegible] وہ [illegible] اور [illegible] کو بھی بیدردی سے قتل کیا [illegible] مکانات [illegible] اور ان میں سے اب صرف کھنڈر [illegible] رہ گیا تھا۔

جیش بڑھتا ہوا اپنے مکان کے سامنے [illegible] مکان جس میں باپ کے مرنے کے بعد اس نے چند [illegible] ہنستے کھیلتے گزارے تھے۔ اس مکان کے سامنے کھجور کا وہ درخت جسے اس کے باپ نے لگایا تھا، اس وقت ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی مرنے والے کے غم میں خاموش کھڑا ماتم کر رہا ہو۔ اس درخت کے پاس اس نے اور نفیسہ نے کتنے ہی حسین لمحات گزارے تھے۔

پورا مکان جل چکا تھا۔ جیش تھوڑی دیر تک خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر لڑکھڑاتے قدموں سے چل پڑا اور نخلستان کے باہر آگیا۔ شدت غم تلے اس کا برا حال تھا۔ بستی پر جو کچھ گزرنے والی تھی وہ گزر چکی تھی اور اب سوال یہ تھا کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے؟

اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ تاتاریوں کا لشکر نہیں

بلکہ ہراول دستہ ہے اور ہراول دستے کے بعد تاتاری لشکر کا آنا لازمی ہے۔ اس لیے اس آبادی میں ٹھہرنا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ بستی چھوڑ کر کہاں اور کس طرف جائے؟

اس نے اپنے گھوڑے پر نفیسہ اور سلمان کو روانہ کر دیا تھا اور پوری آبادی میں اسے کوئی گھوڑا دکھائی نہیں دیا۔ وہاں تو صرف چند بھیڑیں اور بکریاں تھیں جو ظالموں کے ہاتھوں بچ گئی تھیں اور ان سے غذا تو حاصل کی جاسکتی تھی لیکن سواری کے لیے بہرصورت گھوڑے کی ضرورت تھی۔

ابھی وہ اسی فکر میں تھا کہ بستی سے ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ تاتاری لشکر ہے جو اتنی جلدی آ گیا لیکن اسے اپنے خیال کو خود ہی رد کرنا پڑا کیونکہ یہ آواز صرف گھوڑے کے ہنہنانے کی تھی اور ایسی آواز اصیل گھوڑے صرف اس وقت نکالتے ہیں جب ان کا مالک انہیں چھوڑ کر چلا جائے۔

جیش پھر بستی میں آیا اور اس نے دیکھا کہ ایک گھوڑا ایک جلے ہوئے مکان کے سامنے کھڑا اپنے پیروں سے گرد اڑا رہا ہے۔ جیش قریب گیا تو عقدہ کھلا کہ گھوڑا اکیلا نہیں ہے بلکہ اس پر سوار بھی موجود ہے لیکن یہ سوار زین سے لٹکا ہوا ہے اور اس کے سینے میں ایک تیر چھدا ہوا ہے۔

جیش نے گھوڑے کو چمکارا۔ چمکار پر گھوڑے نے گردن گھما کر پہلے جیش کو غور سے دیکھا جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو پھر وہ خود ہی جیش کے قریب آ گیا۔

جیش نے سوار کو زین سے علیحدہ کیا۔ اس کا جسم ٹھنڈا تھا اور وہ مر چکا تھا۔

جیش نے سوار کا چہرہ دیکھا۔ یہ بستی کے تاجر کا لڑکا تھا جو مشرقی حصے میں پہرے پر متعین تھا۔ اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد کہ اس میں جان بالکل باقی نہیں ہے، جیش گھوڑے کے پاس آیا اور اس کی گردن سے چمٹ کر بے ساختہ اسے چومنے لگا۔

اس وقت سوائے اس گھوڑے کے اس کا کوئی ہمدرد اور ساتھی نہ تھا۔ جیش جانتا تھا کہ گھوڑا اس کی زبان پوری طرح نہیں سمجھ سکتا پھر بھی وہ غم و غصے سے اس قدر پاگل ہو رہا تھا کہ اس نے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عزم سے کہا۔

”اے بہادر سوار کے وفادار گھوڑے! میں عہد کرتا ہوں کہ اگر میری عمر نے وفا کی تو میں تیرے مالک کا بدلہ ظالم تاتاریوں سے ضرور لوں گا اور اس آبادی کے ہر شہید کے بدلے ایک سو تاتاری خود اپنی تلوار سے قتل کروں گا۔“

گھوڑا سمجھ پایا ہو یا نہیں سمجھ پایا ہو لیکن اس نے اپنی ٹاپیں زمین پر اس انداز سے ماریں جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ تیرے اس عہد میں برابر کا شریک ہوں۔ اس کے ثبوت میں گھوڑے نے جیش کو اپنی پیٹھ پر بلا عذر سوار کر لیا اور جیش کے اشارے پر چلنے لگا لیکن جیش کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ گھوڑے کی ایک ٹانگ زخمی ہے اور وہ پوری رفتار سے نہیں بھاگ سکتا۔ چنانچہ اس نے رفتار کم کر دی۔ پیدل چلنے سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ گھوڑے پر آہستہ آہستہ چلے۔

جیش نے چلتے وقت نفیسہ سے کہا تھا کہ وہ سلمان چچا کو لے کر حدیثہ جائے۔ اسی لیے اس نے بھی حدیثہ کا رخ کیا۔ اسے بہت کم امید تھی کہ نفیسہ تن تنہا چچا سلمان کو لے کر حدیثہ پہنچ سکے گی کیونکہ ایک تو تنہا مسافت پھر چچا سلمان کو تیر لگ چکا تھا۔

بہرکیف، وہ خیالوں کے بھنور میں پوری طرح پھنس چکا تھا۔ تب وہ بڑبڑایا۔ ”معلوم نہیں وہ زندہ بھی بچے ہیں یا زخم کی تاب نہ لا کر انہوں نے بھی جان دے دی ہے۔“ اس نے ایک جھرجھری لی اور پھر بڑبڑایا۔ ”تاتاری بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگر نفیسہ نے ذرا بھی سستی برتی ہو گی تو اس کا تاتاریوں کے ہاتھوں میں پڑ جانا بھی ممکن ہے۔“

ان تمام وسوسہ انگیز خدشات کے باوجود جیش سوائے حدیثہ کے اور کہاں جا سکتا تھا۔ وہ ایک موہوم امید پر سفر کر رہا تھا اور سفر میں زخمی گھوڑا اس کا پوری طرح ساتھ دے رہا تھا۔

ان پریشان کن خیالات کو ساتھ لیے جیش صبح کے وقت ایک نخلستان میں پہنچا اور اس نخلستان کو دیکھ کر اس کے زخم پھر ہرے ہو گئے۔ ظالم تاتاریوں نے وہاں سے گزرتے ہوئے اسے بھی بالکل برباد کر دیا تھا۔ سوائے لاشوں اور جلے پھکے مکانوں، گھروں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔

جیش نے آبادی پر نظر ڈالنے کے بعد نخلستان کے کنارے ایک چشمے پر اپنا گھوڑا روکا۔ اسے تو کچھ بھوک نہ تھی لیکن گھوڑا رات بھر چلا تھا اور اس کے لیے چارے کا انتظام ضروری تھا۔

جیش گھوڑے سے اتر پڑا اور اسے چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ زمین کا سبزہ بھی گھوڑوں کی ٹاپوں کے تلے اتنا روندا گیا تھا کہ غریب گھوڑے کو اپنا پیٹ بھرنے میں کافی وقت لگ گیا۔

جیش نے بھی چند کھجوریں حاصل کیں اور چشمے پر آ کر

بیٹھ گیا۔ رات بھر کے مسلسل سفر نے اس میں تکان پیدا کر دی تھی۔ اس نے کھجوریں کھا کر چشمے کا پانی پیا اور پھر لیٹ کر ایسا غافل سویا کہ دوپہر تک اس کی آنکھ نہ کھلی۔

شاید اب بھی اس کی آنکھ نہ کھلتی لیکن جس جگہ وہ سو رہا تھا وہاں دھوپ آ گئی تھی اور سورج کی تیز کرنوں نے اسے بیدار کر دیا۔ اس نے آنکھ کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کا گھوڑا اس کے قریب ہی بڑے آرام سے بیٹھا تھا لیکن اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ گھوڑے کے قریب ہی ایک ضعیف انسان بھی لیٹا تھا۔

جیش گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے تو اس نے لیٹے ہوئے آدمی کو غور سے دیکھا۔ وہ سوچنے لگا جس وقت وہ سویا تھا اس وقت تو یہاں کوئی موجود نہ تھا، اب یہ آدمی کہاں سے آ گیا؟ وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب گیا اور جھک کر دیکھا تو بوڑھے آدمی پر غشی سی طاری تھی۔ جیش نے آواز دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔

اس نے بوڑھے کے جسم پر نظر ڈالی تو دائیں پیر پر خون کے دھبے دکھائی دیے۔ جیش نے لبادہ الٹ کر ٹانگ دیکھی۔ بوڑھے کی ران میں ایک ٹوٹا ہوا تیر چبھا ہوا تھا۔ شاید تیر نکالنے کی کوشش میں ٹوٹ گیا تھا۔

جیش نے اس کی ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر پوری طاقت سے تیر کھینچا۔ تیر تو نکل آیا لیکن بوڑھا اب تک بے ہوش تھا۔ جیش نے ایک پیڑ کی چھال اور کچھ پتے کوٹ کر ''لگدی'' بنائی اور زخم پر تھوپ کر پٹی باندھ دی۔

شام کے قریب بوڑھے کو ہوش آیا مگر نقاہت سے اس کی آواز نہ نکلتی تھی۔ اس نے پیر پر پٹی بندھی دیکھی تو متشکرانہ نظروں سے جیش کو دیکھا۔

جیش نے کچھ کھجوریں اور چشمے سے پانی لا کر اسے دیا۔ تیر نکل جانے سے اس کی تکلیف کم ہو گئی تھی۔ غذا کے پیٹ میں پہنچنے سے اس میں کچھ طاقت آئی اور وہ بات کرنے کے قابل ہوا۔

بوڑھے نے اس نخلستان پر جو گزری تھی، وہ جیش کو سنائی۔ تاتاریوں نے اس نخلستان کا بھی وہی حشر کیا تھا جو حال جیش کی بستی کا ہوا تھا۔

بوڑھے نے بتایا۔ ''ہمیں تاتاریوں کے حملے کی اطلاع چند گھنٹے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ اسی لیے ہم نے تمام عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو اطلاع ملتے ہی حدیثہ کی طرف روانہ کر دیا تھا لیکن تمام لوگ پھر بھی بستی سے نہ جا سکے۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید تاتاری اس طرف کا رخ نہ کریں اور راستہ کاٹ کر کسی اور طرف نکل جائیں۔ اس صورت میں خوامخواہ پوری بستی کو پریشان اور بے خانماں کیوں کیا جائے۔''

حدیثہ کا نام سن کر جیش کو نفیسہ اور چچا سلمان پھر یاد آ گئے۔ وہ بھی حدیثہ کی طرف روانہ ہوئے تھے پھر یکایک جیش کو خیال آیا کہ آخر اس بستی والوں کو کس نے اطلاع دی؟

اس نے بوڑھے سے سوال کیا۔ ''بابا! آپ لوگوں کو تاتاریوں کے حملے کی اطلاع کس طرح ملی؟''

بوڑھے نے کہا۔ ''حملے سے دو تین گھنٹے پیشتر یہاں ایک سوار آیا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ نخلستان خماریہ پر تاتاریوں نے حملہ کر کے برباد کر دیا ہے اور ممکن ہے کہ وہ اس طرف سے بھی گزریں۔ یہ خبر پاتے ہی ہم نے عورتوں وغیرہ کو اس کے ساتھ حدیثہ روانہ کر دیا۔''

جیش نے پوچھا۔ ''کیا وہ سوار اکیلا تھا؟''

''ہاں، اسے اکیلا ہی سمجھنا چاہیے۔'' بوڑھے نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ اس کا ساتھی مر چکا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ اس کا باپ تھا اور ایک تاتاری کے تیر نے اسے ہلاک کر دیا۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟'' بوڑھے نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

جیش نے افسردگی سے کہا۔ ''بابا! میں بھی اسی بدنصیب بستی خماریہ سے آ رہا ہوں جہاں کل رات تاتاریوں نے ظلم توڑے تھے۔ اس آبادی میں ایک انسان بھی زندہ نہ بچ سکا۔ ہمیں تو ان کے حملے کی خبر بھی نہ ہو سکی اور ہماری پوری بستی ان کے ہاتھوں نیست و نابود ہو گئی۔''

اس کے بعد جیش نے مختلف الفاظ میں خماریہ پر گزرنے والی قیامت بیان کی۔ وہ خاموش ہوا تو پیرمن نے پوچھا۔

''پھر تم اس لڑکی کو جانتے ہو گے جس نے ہمیں اطلاع دے کر بہت سی عورتوں اور بچوں کو موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا؟''

''میں اسی کی تلاش میں نکلا ہوں بابا!'' جیش نے کرب آمیز انداز میں کہا اور آگے بولا۔ ''وہ میری چچا زاد بہن نفیسہ اور مرنے والا میرا چچا سلمان تھا۔''

''ہاں...... ہاں...... یہی نام بتایا تھا اس نے......؟''

پیرمن نے کہا۔ ''خدا اسے اس کا اجر دے گا۔ اس نے ہمیں بروقت اطلاع دے کر سیکڑوں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اترنے سے بچا لیا ہے۔ اگر وہ خبر نہ دیتی تو یہاں بھی خماریہ جیسا حال ہوتا۔''

پھر تھوڑی دیر تک دونوں اپنے خیالات میں گم رہے۔ ذرا سی دیر بعد جیش اپنے خیالات سے چونک کر بولا۔

"بابا! تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہاں سے جانے والی عورتیں اور بچے محفوظ ہوں گے؟ ہوسکتا ہے کہ تاتاری بھی حدیثہ گئے ہوں اور راستے ہی میں انہیں پکڑ لیا ہو؟"

پیرمن نے کہا۔ "ایسا نہیں ہوسکتا۔ حدیثہ کا راستہ یہاں سے گھومتا ہے۔ جب رات میرے تیر لگا تھا تو میں گرتا پڑتا ایک درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ وہ جگہ کافی بلند تھی اور میں تاتاریوں کی نقل وحرکت پوری طرح دیکھ سکتا تھا۔ تاتاری آبادی کو جلانے اور قتل وغارت کرنے کے بعد صبح تک یہیں رہے۔ شاید وہ آگے بڑھنے سے پہلے کسی کا انتظار کررہے تھے لیکن سورج نکلنے سے پہلے وہ پھر تیار ہوگئے اور بجائے جنوب کی طرف مڑنے کے، وہ مغرب کی طرف روانہ ہوئے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ان کا رخ حمص کی طرف ہے؟"

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔" پیرمن نے جواب میں کہا۔

☆☆☆

نفیسہ شہ سواری میں ماہر تھی۔ وہ جیش کا اشارہ پاتے ہی چل پڑی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے اپنا گھوڑا نخلستان خباراں کی طرف موڑ دیا۔

اسے باپ کی بھی فکر تھی اور وہ کسی مقام پر ٹھہر کر باپ کی پیٹھ سے تیر نکالنا چاہتی تھی۔

نخلستان خباراں کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھا پھر جیش کا گھوڑا خاص عربی نسل کا تھا اس لیے نفیسہ کو نخلستان پہنچنے میں مطلق دیر نہ لگی لیکن جب وہ نخلستان میں پہنچ کر گھوڑے سے اتری تو معلوم ہوا کہ اس کے باپ کا پہلے ہی انتقال ہوچکا تھا۔

اپنی بستی کی تباہی سے وہ پہلے ہی تنہا ہوچکی تھی۔ اب اس تازہ غم نے اسے اور بھی نڈھال کردیا۔ نخلستان والوں کو جب نفیسہ کی زبانی معلوم ہوا کہ تاتاری ان کے بالکل قریب آچکے ہیں تو انہوں نے فوراً نخلستان کو خالی کرنے کا فیصلہ کرلیا اور تمام عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو ایک قافلہ بنا کر حدیثہ کی طرف روانہ کردیا۔

اس نخلستان سے روانگی کے تھوڑی دیر بعد تاتاری بلائے بے درماں کی طرح نازل ہوگئے اور اسے تہ وبالا کردیا اور وہاں صرف وہ پیرمن باقی رہ گیا جس نے جیش کو ان تمام حالات سے آگاہ کیا۔

نفیسہ بھی اس قافلے کے ساتھ دمشق روانہ ہوئی لیکن وائے قسمت کہ بوکھلاہٹ اور پریشانی میں یہ قافلہ سیدھا راستہ چلتے چلتے ایسا بھٹکا کہ جب صبح ہوئی تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ حدیثہ کے بجائے حمص کی طرف جارہے ہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا، سب نے یہی فیصلہ کیا کہ اب قسمت جس طرف لے آئی ہے، اسی طرف چلو اور اس طرح یہ قافلہ ریگستان میں بھٹکتا ایک ہفتے کے بعد حمص میں داخل ہوا۔

حمص پہنچ کر سب کی جان میں جان آئی۔ حمص والوں کو تاتاریوں کی تاراج اور پیش قدمی کی خبر مل چکی تھی لیکن وہ اس لیے مطمئن تھے کہ انہیں یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ مصری سلطان ایک لشکر جرار کے ساتھ تاتاریوں کے مقابلے میں قاہرہ سے روانہ ہوچکا ہے اور کچھ دنوں بعد وہ حمص پہنچ جائے گا۔

حمص والوں نے اس پریشان حال قافلے والوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے رہنے اور کھانے کا معقول انتظام کیا۔ سرحدی علاقوں کی تباہی کا حال سن کر مسلمانوں میں بڑا جوش پیدا ہوگیا اور وہ تاتاریوں سے انتقام لینے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے میں مصروف ہوگئے۔

نفیسہ کے پہنچنے کے تین روز بعد والیِ حمص کو سلطانِ مصر کے آنے کی اطلاع ملی اور وہ اپنے عمائدین کے ساتھ شہر سے نکل کر استقبال کے لیے بڑھ گیا۔

مصر میں اس وقت برائے نام عباسی خلیفہ موجود تھا جس کا کام محض مذہبی جلسوں سے خطاب کرنا یا سلطانی سند کی تصدیق کرنا رہ گیا تھا۔ حکومت کی باگ ڈور دراصل ممالیک بحریہ کے ہاتھ میں تھی اور اس وقت سلطان سیف الدین ملک منصور قلاؤن مصر کے تخت کا مالک تھا۔

ملک منصور بڑا شجاع اور عاقل سلطان تھا۔ اسے معلوم تھا کہ تاتاری جو تین بار مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کر پیچھے ہٹ چکے ہیں، وہ ایک نہ ایک دن ضرور انتقامی حملہ کریں گے اس لیے اس نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی لشکرِ اسلامی کو منظم کرنا شروع کردیا تاکہ وقت آنے پر تاتاریوں کو منہ توڑ جواب دیا جاسکے۔

بہرکیف، ملک منصور کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ تاتاری اسلامی علاقے کا پھر رخ کررہے ہیں، وہ بغیر انتظار کیے ایک لشکر جرار کے ساتھ قاہرہ سے چلا۔ اس نے چلتے وقت تمام صوبوں کے حاکموں کو مطلع کردیا کہ وہ اپنی فوج کو تیار رکھیں اور دوسری اطلاع ملنے پر مع اپنی فوج کے اس سے آن ملیں۔

اس طرح ملک سلطان منصور قطع منازل کرتا ہوا بہت جلد حمص پہنچ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ تاتاریوں کو اسلامی علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہی للکارے لیکن تاتاری اس کے حمص پہنچنے سے پہلے ہی اسلامی علاقے میں داخل ہوگئے اور بستیوں

کو ویران کرنا شروع کر دیا لیکن جب ملک منصور کی حمص کی طرف آنے کی اطلاع ملی تو ان کی رفتار سست پڑ گئی اور وہ حمص سے کئی منزلیں رک کر ملک کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

وہ دن بھی آ گیا جس کا حمص کو بے چینی سے انتظار تھا۔ ملک منصور مع اپنے لشکر کے شام کے وقت حمص کی فصیل کے قریب پہنچا۔ اس کے استقبال کے لیے والیِ حمص موجود تھا۔ والیِ حمص نے سلطان کا شایانِ شان استقبال کیا اور سلطان بعد نمازِ مغرب شہر میں داخل ہو کر محل میں فروکش ہوا۔

سلطان نے محل میں پہنچتے ہی والیِ حمص سے خماریہ کے لوگوں کے متعلق دریافت کیا جو تاتاریوں کے بارے میں تازہ ترین اطلاعات دے سکتے تھے۔ والیِ حمص، خماریہ کے لوگوں سے پہلے ہی مل چکا تھا اس لیے ان میں سے ایک شخص کو سلطان کے حضور پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

ادھر خماریہ والوں کو سلطان کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ خود بھی سلطان کے روبرو اپنی داستانِ غم بیان کرنے کے لیے بے چین تھے۔ جب والیِ حمص کا کارندہ ان میں سے ایک کو بلانے آیا تو سب نے متفقہ طور پر نفیسہ کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

نفیسہ غموں سے نڈھال لیکن سب کا کہنا نہ ٹال سکی اور سر جھکائے بلاوے والے کے ساتھ ہولی۔ باہر سواری موجود تھی۔ نفیسہ والیِ حمص کی سواری میں بیٹھ کر تھوڑی دیر میں محل میں جا پہنچی۔

محل کی آرائش دیکھ کر نفیسہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کسی شاہی محل میں آنے کا یہ اس پہلا اتفاق تھا۔ وہ حیرت سے ایک ایک چیز کو دیکھتی، لمبے لمبے دالان اور صحن طے کرتی آخر اس جگہ پہنچ گئی جہاں سلطان کا دربارِ خاص ہو رہا تھا۔

ساتھ لانے والے دربان نے اسے تمام آدابِ مجلس سے آگاہ کر دیا تھا اس لیے جب وہ سلطان کے روبرو گئی تو اس نے ان تمام آداب کا صحیح مظاہرہ کیا جو اسے ذہن نشین کروائے گئے تھے۔

آداب بجا لانے کے بعد جب نفیسہ سیدھی ہوئی تو سلطان نے نرم آواز میں پوچھا۔

''مظلوم لڑکی...... ! تمہارا کیا نام ہے؟''

''نفیسہ......!'' وہ کچھ اور نہ کہہ سکی اس لیے کہ سلطانی ہیبت سے اس کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

سلطان نے کہا۔ ''نفیسہ! گھبراؤ نہیں۔ سلطان رعیت کا باپ ہوتا ہے۔ تم یہ سمجھو کہ اس وقت اپنے باپ سے گفتگو کر رہی ہو۔''

نفیسہ کو سلطان کی باتوں سے کچھ تسلی ہوئی لیکن باپ کا لفظ سن کر اس کے آنسو چھلک پڑے جنہیں اس نے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بارِ چشم کی طرح ٹپک ہی پڑے اور مجبوراً دامن سے خشک کرنے پڑے۔

سلطان، نفیسہ کے رونے سے بہت متاثر ہوا اور بولا۔ ''قسم ہے مجھے خدائے واحد کی، جب تک مظلوموں کے خون کا بدلہ تاتاریوں سے نہ لے لوں گا، قاہرہ واپس نہیں جاؤں گا۔''

دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور ہر شخص کا ہاتھ قبضۂ شمشیر پر تھا۔ گویا وہ کہہ رہے تھے کہ شمشیریں ان شاء اللہ سلطان کی قسم کی لاج رکھیں گی۔

سلطان نے پھر نرمی سے پوچھا۔ ''مظلوم بیٹی! تم کس شہر کی رہنے والی ہو...... تمہارا باپ کہاں ہے؟''

نفیسہ نے ضبط سے کام لیتے ہوئے جواب میں کہا۔ ''سلطانِ عالی! میں نخلستان خماریہ کی وہ واحد ہستی ہوں جو تاتاریوں کی تلوار بے رحم سے بچ سکی ہوں۔ تاتاریوں نے پوری بستی کو جلا کر خاک کر دیا اور جوانوں کے علاوہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو بھی قتل کر دیا۔''

''اف خدایا! تو مجھے معاف کر دے۔ میں تیرے نام لینے والوں کی مدد کو پہلے نہ پہنچ سکا لیکن تیرے حضور تیرا یہ بندۂ ناچیز عہد کرتا ہے کہ جب تک تاتاریوں کو صفحۂ ہستی سے نہ مٹا دوں گا، چین سے نہ بیٹھوں گا۔''

دربار میں مکمل سناٹا تھا۔ صرف لوگوں کی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سلطان پھر مخاطب ہوا۔

''مظلوم بیٹی! اس واقعے کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''صرف دس دن عالی جاہ......!''

اس کے بعد نفیسہ نے اپنی بستی کے علاوہ نخلستان خماراں کی تباہی کی داستان بھی سنائی کیونکہ ایک دن پہلے اسے خماراں کی بربادی کی خبر ایک قافلے کی زبانی مل چکی تھی۔

سلطان ملک منصور یہ حالات سن کر سخت غضبناک ہوا اور اپنے سرداروں کو مخاطب کر کے بولا۔ ''اسلام کے علم کو سربلند رکھنے والے سردارو...... ! تم نے خود اپنے کانوں سے تاتاریوں کے مظالم کی داستان سن لی۔ اب بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے اور فرض تمہیں کیا قدم اٹھانے پر مجبور کرتا ہے؟''

بہ یک جنبش و بہ یک ترنت ایک سردار نے خم ہو کر کہا۔ ''سلطانِ عالی مقام! آپ حکم فرمائیں۔ ہم آپ کے

اشارے پر اپنی گردنیں کٹوانے کے لیے تیار ہیں۔''

سلطان نے تحمل سے کہا۔ ''ہمیں اپنے سرداروں کی وفاداری پر پورا اعتماد ہے لیکن اس وقت ہم اس لشکرِ کفار کے مدِمقابل ہیں جسے اپنی طاقت پر ناز ہے اور جو اسلام کے نام کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے تیار ہو کر آیا ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آئندہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہم آپ سے مشورہ کریں تاکہ کامیابی ہمارے قدم چومے۔''

ایک دوسرا سردار بولا۔ ''ہم کفار کے غرور کا سر نیچا کر کے اسلام کا جھنڈا بلند کریں گے۔ میں سلطان سے درخواست کرتا ہوں کہ لشکر کو فوراً کوچ کا حکم دیا جائے تاکہ جس قدر جلد ہو سکے، ہم اپنے مظلوم بھائیوں کا انتقام لے سکیں۔''

سلطان نے کہا۔ ''شاباش بہادرو! تمہارے ہوتے تاتاری اسلام کے جھنڈے کو نیچا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے وزیر فخرالدین کی طرف دیکھا جو اس کے دائیں جانب خاموش کھڑا تمام گفتگو بڑے غور سے سن رہا تھا۔

سلطان نے کہا۔ ''ہمیں بہادر سرداروں کے جذبات کا اندازہ ہو گیا ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ مصر کا عالی دماغ وزیر اب تک خاموش ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنی رائے سے دربار کو آگاہ کرے گا۔''

فخرالدین مصر کا سب سے زیادہ ذہین اور عقلمند انسان خیال کیا جاتا تھا۔ نیز مصر کا وزیراعظم ہونے کے علاوہ اسے سلطان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ سلطان اس پر بڑا اعتماد کرتا تھا اور ہر مہم پر اسے اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا تاکہ اس کے قیمتی مشوروں سے فائدہ اٹھا سکے۔

فخرالدین، سلطان کا ارشاد سن کر بوکھلا گیا۔ اس نے اب تک تمام باتیں خاموشی سے سنی تھیں۔ اس اہم معاملے میں وہ خاموش تو نہیں رہ سکتا تھا لیکن اس نے ارادہ کیا تھا کہ تمام لوگوں کے رخصت ہونے کے بعد وہ تخلیے میں سلطان سے گفتگو کرے گا لیکن سلطان کو اس کی خاموشی کچھ پسند نہ آئی اور اس نے فخرالدین کو بولنے پر مجبور کر دیا۔

لہٰذا فخرالدین نے ادب سے کہا۔ ''بندۂ ناچیز کی بھی وہی رائے ہے جس کا اظہار دوسرے بندگانِ عالی کر چکے ہیں۔ مسلمانوں کا خون رائیگاں نہیں جا سکتا۔ اگر ہم نے تاتاریوں سے مظلوموں کا بدلہ نہ لیا تو حشر میں خداوند کریم کو کیا جواب دیں گے۔''

سلطان نے خوش ہو کر کہا۔ ''ہم وزیر با تدبیر کے جواب سے بہت خوش ہوئے۔ ان شاء اللہ تاتاریوں سے ایسا انتقام لیا جائے گا کہ ہم حشر میں شرمندہ نہ ہو سکیں گے۔''

سلطان کے خاموش ہوتے ہی وزیر نے پھر سلطان کو مخاطب کیا۔ ''اگر سلطانِ عالی کا ارشاد ہو تو اس سلسلے میں خادم اپنا مشورہ پیشِ خدمت کرے؟''

فخرالدین کی زبان سے یہ جملہ سن کر ہر سردار نے اسے حیرت سے دیکھا کیونکہ ان کے خیال کے مطابق فخر الدین کو تو جو کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا۔ اب بھلا مزید اسے کیا کہنا باقی تھا۔ سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''فخرالدین! ہم نے تمہاری رائے کو ہمیشہ اہمیت دی ہے اور اس وقت بھی تم جو کہنا چاہتے ہو، بےخوف کہو۔''

فخرالدین بولا۔ ''خادم یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ پچھلی لڑائیوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تاتاری ہمیشہ پوری تیاری سے حملہ کرتے ہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس سے پہلے ان کے ہر حملے کو ناکام بنا کر انہیں کافی سزا دی جا چکی ہے لیکن ان کا ہر حملہ پہلے حملے سے زیادہ شدید ہوا کرتا ہے اور اس دفعہ ان کا چوتھا حملہ ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اس بار ہر دفعہ سے زیادہ طاقت اکٹھی کی ہوگی۔ اس لیے ہمیں بھی پوری طاقت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔''

سلطان یہ سن کر قدرے خوش ہوا اور پھر بولا۔ ''فخر الدین! ہم تمہاری رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ اس وقت تقریباً ڈیڑھ لاکھ کا عظیم لشکر ہمارے ساتھ ہے۔ اس سے زیادہ ہم کیا تیاری کر سکتے ہیں؟''

فخرالدین کہنے لگا۔ ''خادم کی گستاخی اور بےباکی کو معاف کیا جائے۔ میری ناچیز رائے میں اتنا لشکر بھی تاتاریوں کو شکست دینے کے لیے ناکافی ہوگا۔''

''پھر تمہاری کیا رائے ہے؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

سلطان نے اس بار قدرے چڑ کر پوچھا تو فخرالدین نے کہا۔

''عراق کا لشکر اب تک ہم سے نہیں ملا۔ میرے خیال میں اگر چند روز ہم حمص میں ان کا انتظار کر لیں تو لشکر کو سفر کی تکان دور کرنے کا موقع بھی مل جائے گا اور اس وقت تک ہم عراق، بیت اور حدیثہ سے مزید فوج حاصل کر سکیں گے۔''

اس پر سلطان نے فوراً کہا۔ ''فخرالدین! ہم تمہاری فراست کی داد دیتے ہیں۔ ہمیں تمہاری رائے پسند آئی۔ ہم ایک ہفتہ حمص میں قیام کریں گے اور اس دوران عراق اور شام کے سرحدی علاقوں کے والیوں کو اطلاع دی جائے کہ وہ لشکر لے کر حمص میں ہم سے آملیں۔''

یوں اس تمام عرصے کے دوران نفیسہ خاموش کھڑی رہی تھی مگر اب وہ بےچین ہو گئی جب اس نے حدیثہ کا نام

سنا تو ادب سے بولی۔

''کنیز کچھ عرض کرنا چاہتی ہے سلطانِ عالم!''

گفتگو کی گرما گرمی میں دربار والے نفیسہ کی موجودگی کو بھول چکے تھے۔ نفیسہ کی آواز پر سلطان نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کہو بیٹی! ہم تمہارے لیے کیا کرسکتے ہیں؟''

وہ بولی۔ ''حضور! حدیثہ کتنے آدمی بھیج رہے ہیں؟''

''ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے؟ تم یہ کیوں معلوم کرنا چاہتی ہو؟'' سلطان نے تعجب کا اظہار کیا۔

نفیسہ بولی۔ ''اگر سلطان کی نوازش ہوجائے تو میں ان لوگوں کے ساتھ حدیثہ جانا چاہتی ہوں جو یہاں سے بھیجے جائیں گے۔''

سلطان اس کی بات سن کر مسکرایا اور بولا۔ ''بیت اور حدیثہ سرحدی علاقے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تاتاری اس طرف کا بھی رخ کریں لیکن اس کے لیے تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہیں بہ حفاظت گھر پہنچادیں گے۔ شاید وہاں تمہارا کوئی عزیز ہے؟''

''جی عزیز ہے تو نہیں لیکن شاید مل جائے۔'' نفیسہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ نفیسہ، سلطان سے یہ کس طرح کہتی کہ اسے حدیثہ میں جیش سے ملنے کی امید ہے۔ یہ امید اسے اس وجہ سے تھی کہ جیش نے اس سے حدیثہ جانے کے لیے کہا تھا۔ اگر جیش تاتاریوں کے ہاتھ سے بچ گیا ہوگا تو اس نے سیدھا حدیثہ کا رخ کیا ہوگا۔

وہ یہی سوچ رہی تھی کہ سلطان کی آواز سنائی دی۔

''پچاس سواروں کا دستہ ہمارا فرمان حدیثہ لے جانے کے لیے فوراً تیار کیا جائے۔ اس دستے کے ساتھ یہ مظلوم لڑکی بھی جائے گی۔''

نفیسہ نے شکر گزار نگاہوں سے سلطان کو دیکھا لیکن سلطان اس وقت اپنے وزیر فخر الدین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سلطان نے محسوس کیا کہ فخر الدین جیسے کچھ کہنا چاہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی سلطان کی آواز دوبارہ بڑے کمرے میں گونجی۔

''حدیثہ پچاس کے بجائے سو سوار روانہ کیے جائیں۔''

تمام اہلِ دربار سلطان کے اس فیصلے پر بڑے متعجب ہوئے لیکن وزیر فخر الدین نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے سلطان کو دیکھا۔ سلطان نے وزیر سے کہا۔

''فخر الدین! اب تم کو اطمینان ہوگیا ہوگا؟''

''جی عالی جاہ!'' فخر الدین نے جواب دیا۔

سلطان نے سرداروں کو مخاطب کرکے کہا۔ ''آپ لوگوں کو علم ہے کہ اسلامی لشکر کے مصر سے روانہ ہونے کی خبر نے کافر بازنطینیوں کو بھی پریشان کردیا ہے۔ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ ہم اس وقت تاتاریوں کے خاتمے کے ارادے سے نکلے ہیں پھر بھی انہوں نے عراق کی اکثر سرحدوں پر کافی لشکر اکٹھا کردیا ہے اور ان کے سراغرساں دستے اکثر ہمارے علاقوں میں دور دور تک آجاتے ہیں۔ اس خیال کے پیشِ نظر حدیثہ کے سفر پر سو سواروں کا مضبوط دستہ روانہ کیا جارہا ہے کہ اگر ان سے مڈبھیڑ ہوجائے تو سفارت کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

تمام دربار والے سلطان کی دور اندیشی کے قائل ہوگئے۔

☆☆☆

جیش کو دو تازہ دم گھوڑے نخلستان خماراں سے حاصل ہوگئے۔ ایک پر وہ خود سوار ہوا اور دوسرے پر زخمی بوڑھے کو سوار کیا۔ بوڑھے کا زخم اب پہلے کی نسبت بہتر حالت میں تھا اور وہ سفر کرنے کے قابل ہوگیا تھا۔

جیش کو جو گھوڑا اپنے نخلستان سے ملا تھا اس کے پیر میں زخم تھا مگر اس نے کسی نہ کسی طرح اسے اتنی دور پہنچا ہی دیا اس لیے جیش نے اس گھوڑے کو ویران نخلستان میں چھوڑنے کے بجائے اپنے ساتھ لے لیا تھا اور اس پر خورد و نوش کا معمولی سامان بار کرکے حدیثہ روانہ ہوا۔

بوڑھا ریگستان کے پُر پیچ راستوں سے پوری طرح واقف تھا۔ یہ دونوں آہستہ آہستہ سفر کرتے ہوئے حدیثہ میں داخل ہوئے۔ حدیثہ میں پہنچ کر سب سے پہلے جیش نے نفیسہ کی تلاش شروع کی۔ بوڑھے کو بھی نفیسہ کی تلاش تھی کیونکہ اس نے دونوں جوان لڑکیاں نفیسہ کے ساتھ کردی تھیں۔

انہوں نے ہر سرائے اور گلی کوچے چھان مارے مگر نفیسہ کا کوئی پتا نہ چلا۔ ہر جگہ یہی معلوم ہوا کہ اس قسم کا کوئی قافلہ حدیثہ پہنچا ہی نہیں اور یہ بات ٹھیک ہی تھی کیونکہ نفیسہ کا قافلہ راستہ بھول کر حمص پہنچ چکا تھا۔

دو دن تک کوشش کرنے کے بعد وہ تھک کر بیٹھ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ نفیسہ کا قافلہ کہاں رہ گیا۔ جب وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہوگئے تو بوڑھے نے جیش سے کہا۔

''جیش! اب کیا ارادہ ہے؟ قافلے کا کچھ پتا نہیں چلا۔ ہوسکتا ہے قافلہ تاتاریوں کے ہاتھوں پڑ گیا ہو۔''

جیش نے افسردگی سے جواب دیا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

''جیش!'' بوڑھے نے کہا۔ ''اب سوائے صبر کے

کوئی چارہ نہیں۔“
جیش کو اس کے تحمل سے بڑا تعجب ہوا۔ اس نے بوڑھے سے پوچھا۔
”بابا! کیا تمہیں اپنی بیٹیاں یاد نہیں آتیں؟ کیا تم کو ان کا کوئی غم نہیں؟“
بوڑھے نے اپنا غمزدہ چہرہ اٹھایا اور استقلال سے بولا۔ ”جیش! وہ ہماری ہی بیٹیاں تھیں جو تمہارے نخلستان میں یا دوسری جگہوں پر تاتاریوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنیں۔ مجھے تو افسوس اس بات کا ہے کہ کاش خدا نے مجھے بیٹے دیے ہوتے اور وہ تاتاریوں سے لڑ کر اسلام کے نام پر جان دیتے۔“
جیش کو بوڑھے کی باتوں سے بڑا سکون ہوا اور اس میں ایک نیا عزم پیدا ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ”بابا! تم سچ کہتے ہو۔ ہر جوان کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے نام پر تلوار بلند کرے اور تاتاریوں کے مقابلے پر جامِ شہادت نوش کرے۔ تم نے میرا ایک بڑا بوجھ ہلکا کردیا ہے۔ اب میں اپنے جسم میں پہلے سے زیادہ طاقت محسوس کرتا ہوں۔“
ادھر یہ لوگ یہ باتیں کررہے تھے کہ سرائے میں ایک سوار داخل ہوا اور اس نے سرائے کے مالک سے پوچھ گچھ کی۔ مالک سرائے نے سوار کو اشارے سے ان دونوں کو دکھایا اور کچھ کہا۔ سوار وہاں سے سیدھا جیش اور بوڑھے کے پاس آیا اور سلام کرکے گفتگو کی اجازت چاہی۔
جیش نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”خوش آمدید سوار، تشریف رکھیے۔ آپ جو سوال کریں گے، ہم اس کا جواب دینے کو تیار ہیں۔“ سوار ان کے قریب بیٹھ گیا۔
جیش نے حدیثہ میں داخل ہوکر سرائے میں ایک کمرا لے لیا تھا جس میں یہ دونوں رہا کرتے تھے۔ دن بھر وہ نغیسہ کے متعلق لوگوں سے دریافت کرتے رہتے اور شام کے وقت سرائے میں اپنے کمرے کے سامنے بیٹھ کر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ دو دن کی اس تگ و دو کے دوران انہیں کئی جگہ نخلستان خماریہ اور خماراں کی بربادی کی داستان بیان کرنا پڑی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خبر آگ کی طرح تمام شہر میں پھیل گئی اور پھر کسی طرح والیِ حدیثہ کے کانوں تک پہنچی۔
سوار نے سوال کیا۔ ”اے برادر! کیا یہ سچ ہے کہ آپ کسی سرحدی علاقے سے آئے ہیں؟“
جیش نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا خیال درست ہے۔ ہم سرحد کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جسے ہماری آنکھوں کے سامنے تاتاریوں نے برباد کیا۔“

یہ سن کر سوار کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ”میری درخواست ہے کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ والیِ حدیثہ آپ سے ملنے کے لیے بےچین ہیں۔“ جیش اور بوڑھا بابا بلا عذر سوار کے ساتھ ہوگئے اور پُررونق بازاروں سے گزر کر شاہی محل میں داخل ہوگئے۔
بیت وحدیثہ اور حمران اس زمانے میں سلطنتِ مصر کے صوبے تھے لیکن وہاں کے محلوں کی آن بان مصر کے شاہی محلوں سے کسی طرح کم نہ تھی اور ان محلات میں داخل ہونے والوں کو بالکل ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مصر کے کسی شاہی محل میں آگئے ہیں۔
والیِ حدیثہ واقعی بڑا بےچین تھا۔ ان کے پہنچتے ہی اس نے سوال کیا۔
”تمہارا کیا نام ہے نوجوان؟“
”میرا نام جیش خماریہ ہے۔“ جیش نے جواب میں کہا اور آگے بولا۔ ”میں نخلستان خماریہ کا باشندہ ہوں جو اب تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہوکر مٹی کا ڈھیر بن چکا ہے۔ یہ بزرگ نخلستان خماراں کے رہنے والے ہیں۔ ان کے نخلستان کو بھی تاتاریوں نے برباد کرڈالا۔“
والیِ حدیثہ، جیش کی زبان سے ادا ہوتے یہ الفاظ سن رہا تھا۔ اس وقت اس کے دربار میں چیدہ چیدہ لوگ موجود تھے۔ والی نے پوچھا۔
”کیا آپ لوگوں کو حملے کی خبر بالکل نہیں تھی؟“
جیش نے کہا۔ ”ہمارے جاسوسوں نے صرف یہ خبر پہنچائی تھی کہ تقریباً دو سو فرسنگ پر تاتاری نقل و حرکت شروع ہوئی ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑا حملہ کرنے والے ہیں لیکن اس کے ساتھ تاتاریوں کو یہ خبر بھی مل گئی کہ ان کے مقابلے کے لیے سلطانِ مصر ایک بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ قاہرہ سے نکلا ہے۔ اس خبر نے تاتاریوں میں الجھن پیدا کردی اور وہ سرحد سے دور سلطانِ مصر کی فوجوں کا انتظار کررہے تھے لیکن ان کا یہ وقتی انتظار ایک دھوکا تھا اور ایسا سکون جیسا طوفان آنے سے پہلے سمندر پر چھا جاتا ہے۔ یوں ایک رات جب بستی کے لوگ آرام کرنے کی فکر میں تھے کہ تاتاری ہراول دستہ مشرق سے ہمارے نخلستان میں داخل ہوا۔ ہم نے احتیاط کے طور پر بچوں اور عورتوں کی ایک کثیر تعداد حمص روانہ کردی تھی لیکن اس کے باوصف اس وقت نخلستان میں ایک بڑی تعداد بوڑھوں اور عورتوں کی موجود تھی جو تہ تیغ کردی گئی۔ نخلستان کو برباد کرنے کے بعد تاتاری نخلستان خماراں پہنچے اور اسے بھی مٹی کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔“

اس دردناک داستان کو سن کر والی حدیثہ بڑا افسردہ ہوا لیکن افسردگی کے ساتھ ساتھ اسے بڑا طیش بھی آیا۔

اس زمانے میں جنگی قانون کے مطابق بچوں، بوڑھوں اور عورتوں پر ہاتھ اٹھانا منع تھا جبکہ تاتاریوں نے اس اصول کو بالکل توڑ دیا تھا۔ بوڑھے، بچے اور عورتیں بھی ان کے ستم سے نہ بچ سکے اور انہوں نے ان کا قتلِ عام کر دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ تاتاری صرف جوان لڑکیوں اور عورتوں کو گرفتار کر لیتے تھے تاکہ اپنے نفس کی تکمیل کرتے رہیں۔

یہ تمام واقعات سننے کے بعد والی نے کہا۔ ”جیش خماری! ہم تمہارے غم اور مصیبت کے شریک ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے خون کا پورا پورا بدلہ لیں گے۔“

جیش نے کہا۔ ”ہمیں حدیثہ اور شامی مسلمانوں سے پوری امید ہے کہ وہ اس دفعہ نہ صرف تاتاریوں سے انتقام لیں گے بلکہ ان کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قلع قمع بھی کر دیں گے۔“

”ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ ہم بالکل تیار ہیں۔ صرف سلطان کے فرمان کے آنے کی دیر ہے۔“

جیش نے پوچھا۔ ”آپ کب سے انتظار کر رہے ہیں؟“

والی نے کہا۔ ”کچھ دن پیشتر ہمیں شاہی فرمان موصول ہوا تھا کہ سلطانِ مصر ملک منصور قلاؤن بہ نفسِ نفیس ایک لشکر جرار کے ساتھ قاہرہ سے روانہ ہو چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم اپنی فوج کے ساتھ تیار رہیں اور دوسرا حکم ملتے ہی شاہی لشکر سے آملیں۔“

جیش نے کہا۔ ”لیکن شاہی لشکر کے حمص پہنچنے کی خبریں تو کئی دن سے گرم ہیں۔“

”ہمیں بھی کچھ ایسی اطلاعات ملی ہیں۔“

”کیا آپ یہ مناسب خیال نہیں فرماتے کہ حمص کی طرف چلیں۔ اگر شاہی لشکر وہاں پہنچ چکا ہے تو اس سے مل جائیں اور اگر نہیں پہنچا تو حمص ٹھہر کر انتظار کریں۔“ یہ جیش کا پُرخلوص مشورہ تھا۔

والی نے کہا۔ ”نوجوان! یہ خیال ہمارے ذہن میں بھی ہے لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ خود کوچ کر کے سلطان مصر کی ناخوشگواری مول لیں۔ ہم کتنا ہی پُرخلوص قدم اٹھائیں لیکن امرائے دربار اسے اپنے رنگ میں سوچتے ہیں۔“

جیش نے خیال ظاہر کیا۔ ”ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ سلطانِ مصر نے آپ کو کوئی پیغام بھیجا ہو اور وہ آپ تک نہ پہنچا ہو۔ ممکن ہے کہ سلطان حمص پہنچ چکے ہوں اور آپ کا انتظار کر رہے ہوں۔“

یہی وہ وقت تھا جب والی حدیثہ کو یہ خبر ملی کہ شاہی ہرکارہ حمص سے آیا ہے اور فوراً ملنا چاہتا ہے۔ والی نے جیش کو دیکھا پھر شاہی ہرکارے کو داخلے کی اجازت دی۔

☆☆☆

سلطانِ مصر کے لشکر نے حمص کے میدان میں خیمے، ڈیرے لگا دیے۔ سلطان ملک منصور، والی حمص کے محل میں فروکش ہوا۔ رات کے کھانے کے بعد سلطان نے حدیثہ جانے والے دستے کے سردار اور نفیسہ کو بلایا۔ دونوں حاضر ہوئے۔ سلطان نے سردار سے کہا۔

”اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم والی حدیثہ کو فرمان بھیجیں۔ تمہارا حدیثہ پہنچنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ہمیں شامی لشکر کی ضرورت ہے۔ والی حدیثہ سے کہا جائے کہ بلاتاخیر وہ حمص روانہ ہو جائیں۔“

سردار نے خم ہو کر تعمیلِ حکم کی بجا آوری کا اعلان کیا۔ سلطان نے اس کے جانے سے پہلے اتنا اور کہا۔

”کسی دشمن کی یہ ہمت نہیں کہ وہ تمہارا راستہ روک سکے پھر بھی اگر ایسا موقع آجائے تو تمہارا فرض ہے کہ اس لڑکی کی پوری حفاظت کرو۔“ سردار نے اس حکم پر بھی اپنا سر خم کر دیا اور پھر کچھ دیر بعد نفیسہ سو سواروں کے دستے کے ساتھ حدیثہ کی طرف جا رہی تھی۔

رات اندھیاری تھی۔ تمام سوار احتیاط سے گھوڑے دوڑاتے جا رہے تھے۔ نفیسہ، سردار کے برابر آگے آگے چل رہی تھی۔ صبح تک یہ لوگ بغیر کسی حادثے کے چلتے رہے۔

ان کے ایک طرف گھاٹی تھی اور دوسری طرف ریت کے اونچے اونچے ٹیلے۔ یہاں ذرا [illegible] تھا اس لیے انہیں آگے پیچھے چلنا پڑ رہا تھا۔

ابھی سورج نکلنے میں کچھ دیر تھی پھر بھی کچھ روشنی ہوگئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے چہرے دیکھ سکتے تھے۔ گھاٹی کے کنارے چلتے ہوئے انہیں کچھ دیر گزری تھی کہ سامنے سے ایک دم کچھ سوار نمودار ہوئے۔

سواروں کو دیکھ کر سردار اور نفیسہ نے اپنے گھوڑے روک لیے اور ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔

”معزز بہن! ہم شاید دشمنوں میں گھر گئے ہیں۔ آپ پیچھے ہو جائیں۔“

نفیسہ نے کہا۔ ”برادر! آپ میری فکر نہ کریں۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں لیکن اس وقت سوال یہ ہے کہ اگر ہم سب مارے گئے یا گرفتار ہوئے تو حدیثہ خبر نہ پہنچ سکے گی اور مہم ناکام ہو جائے گی۔“

سردار جس کی نظریں راستے سے ہٹ کر اب ٹیلوں پر جمی ہوئی تھیں، اس نے کہا۔ ''بہن! جب تک ہمیں ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا، اس وقت تک ہم حدیثہ کے بارے میں کیا سوچ سکتے ہیں۔ ذرا ٹیلوں پر دیکھو، اگر میرا خیال غلط نہیں تو وہاں بھی سوار ہی سوار موجود ہیں۔''

نفیسہ نے ٹیلوں پر نگاہ ڈالی تو واقعی وہاں سوار موجود تھے اور اب وہ بھی گھبرا گئی تھی۔

تمام سواروں نے ترکش سنبھال لیے تھے اور وہ سردار کے حکم کے منتظر تھے۔ نفیسہ نے جلدی سے کہا۔ ''کیا ہم راستہ کاٹ کر نہیں نکل سکتے؟''

''نہیں بہن! ایسا ممکن نہیں۔ دشمن سامنے بھی موجود ہے اور بائیں طرف بھی۔ واپس ہونا لاحاصل ہے۔ رہا یہ گھاٹی کا راستہ تو اس میں اترتے ہی دشمن ہمیں گھیر لیں گے اور ہم کھل کر مقابلہ بھی نہ کر سکیں گے۔''

نفیسہ بولی۔ ''پھر میں آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ مجھے جانے دیں۔ میں گھاٹی کے راستے سے نکل کر حدیثہ پہنچنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اگر زندہ بچی تو سلطانِ مصر کا پیغام والیِ حدیثہ کو پہنچاؤں گی۔''

سردار نے کہا۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتا بہن! سلطان نے آپ کو میرے سپرد کیا ہے اور آپ کی حفاظت میرا فرض بن چکا ہے۔''

''اس وقت ضد نہ کیجیے معزز سردار! دشمن بالکل سر پر آچکا ہے۔'' کہتے ہوئے نفیسہ نے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اپنا گھوڑا گھاٹی کی طرف موڑ دیا۔

سردار عجیب تذبذب کے عالم میں ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس وقت کیا کرے۔ ایک طرف نفیسہ کی حفاظت کا سوال تھا اور دوسری طرف وہ اپنے سواروں کو اکیلے بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا لہٰذا ادھر وہ اس عالم میں تھا اور ادھر سامنے اور ٹیلوں کی طرف سے تیروں کی بارش شروع ہو چکی تھی۔

تیر پھینکنے والا دراصل تاتاریوں کا ایک دستہ تھا۔ اس میں کم و بیش پانچ سو سوار شامل تھے۔ یہ دستہ اصل میں خورد و نوش کی تلاش میں نکلا تھا لیکن ریگستان میں راستہ بھول کر اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔

بہرکیف، سردار نے تیروں کا جواب تیروں سے دینے کا حکم دیا پھر اپنے نائب سے بولا۔ ''میرے دوست! گھاٹی میں اترنے والی اس لڑکی کی حفاظت سلطان نے میرے سپرد کی ہے اس لیے اب میں اپنے دستے کو تمہارے

سپرد کرتا ہوں اور میں اس لڑکی کی طرف جا رہا ہوں۔ لڑکی واپس آ گئی تو خیر ورنہ میں اس کی حفاظت میں اپنی جان دے کر وعدائے فرض کی لاج رکھوں گا۔"

نائب نے جواب میں کہا۔ "سردار! آپ بے فکر رہیں۔ ہم دشمنوں سے مقابلے کے لیے نکلے ہیں۔ جہاں دشمن مل جائے وہی میدانِ جنگ ہے۔ آپ اپنا فرض پورا کریں، ہم اپنا فرض ادا کریں گے۔"

دونوں طرف سے تیر اندازی کے جوہر دکھائے جانے لگے۔ تاتاری تیر برساتے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ جب سردار نے اپنا گھوڑا بھی گھاٹی کی طرف موڑا تو تاتاریوں میں سے سو سوار ٹیلے سے اتر کر گھاٹی کی طرف ہو لیے۔

انہوں نے اس سے پہلے ایک لڑکی کو گھاٹی میں جاتے دیکھا تھا۔ انہیں خیال ہوا کہ کہیں ایک ایک کر کے تمام سوار اس گھاٹی میں اتر کر غائب نہ ہو جائیں۔

سردار بہت جلد گھوڑا دوڑا کر نفیسہ کے قریب جا پہنچا تھا۔ اس نے نفیسہ کو واپس بلانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس وقت تاتاری بھی ان کا پیچھا کرتے ہوئے قریب آ گئے تھے۔

یہ دونوں نشیب میں چل رہے تھے اور تاتاری ان کے سروں پر تھے جہاں سے وہ برابر تیر پھینک کر انہیں زخمی کرنے کی فکر میں تھے۔

آخر ایک موڑ پر کسی تاتاری نے نیزہ کھینچ مارا۔ نیزہ نفیسہ کے گھوڑے کے پیٹ میں لگا اور وہ تڑپ کر گرا۔ اس کے ساتھ ہی نفیسہ بھی گھوڑے سے اچھل کر دور جا گری۔

سردار نے چاہا کہ گھوڑا روک کر نفیسہ کو اٹھائے لیکن نفیسہ نے چیخ کر کہا۔ "خدا کے لیے آپ میری فکر نہ کریں۔ جب تک تاتاری مجھے گرفتار کریں گے آپ بہت دور نکل چکے ہوں گے۔ آپ حدیثہ پہنچ کر سلطان کا پیغام پہنچائیں۔ یہی آپ کا اصل فرض ہے۔"

سردار کی سمجھ میں کچھ آ گیا تو اس نے سوچا کہ نفیسہ نے محض دمشق خبر پہنچانے کے لیے خود کو ہلاکت میں ڈالا ہے۔ اب اگر اس وقت میں بھی مارا گیا یا پکڑا گیا تو شاید حدیثہ کوئی خبر پہنچانے والا نہیں رہ جائے گا۔ یہ سوچ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور ہوا کی طرح گھاٹیوں کے پُرپیچ راستوں میں گم ہو گیا۔ تاتاریوں نے نفیسہ کے گھوڑے کو گرتے دیکھا تو وہ ٹھہر گئے۔ اس کے پیچھے وہ لوٹ کر گھاٹی میں اترے۔

نفیسہ کے پیر میں ہلکی چوٹ آئی تھی اور جب تاتاری زد پر آ گئے تو اس نے تیر چلانا شروع کر دیے۔ اس اچانک تیر اندازی سے تاتاری سنبھلتے سنبھلتے بھی اپنے پانچ سواروں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب وہ ٹیلوں اور چٹانوں کی آڑ لے کر بڑھ رہے تھے۔

اس طرح انہوں نے نفیسہ کو مزید تیر چلانے کا موقع نہ دیا اور اسے بالکل گھیرے میں لے لیا۔ نفیسہ کو معلوم ہو گیا کہ وہ تاتاریوں کے گھیرے میں آ چکی ہے اور اب تیر کمان بیکار ہے۔

اس نے ترکش الگ رکھ دیا اور تلوار سونت کر کھڑی ہو گئی۔ تاتاری اپنے پانچ سوار ضائع کر چکے تھے جس کے لیے انہیں غم بھی تھا اور غصہ بھی لیکن پھر بھی وہ اس بہادر لڑکی کو زندہ ہی گرفتار کرنا چاہتے تھے۔

تاتاری اپنا حلقہ سمیٹتے سمیٹتے نفیسہ کے بالکل قریب آ گئے اور بجائے بھالے یا تلوار کے، انہوں نے کمندوں سے کام لیا۔ چاروں طرف سے انہوں نے کمندیں پھینکنا شروع کر دیں۔ نفیسہ نے کئی کمندیں تلوار سے کاٹ دیں لیکن کہاں تک۔ آخر ایک کمند میں الجھ کر وہ سر کے بل گری اور اس کے ماتھے سے خون جاری ہو گیا۔ تاتاریوں نے بڑھ کر اسے پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیے۔

دوسری طرف گھاٹی کے اوپر تاتاری اور مصریوں میں تیروں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ تاتاری، مصریوں کے تھوڑے فاصلے پر آ کر رک گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سورج کی روشنی پھیل جائے تاکہ وہ اندازہ لگا سکیں کہ کتنے مصری سوار وہاں ہیں اور اس اندازے کے مطابق ان سے مقابلہ کیا جا سکے۔

مصری سواروں کے نائب صدر نے مورچہ سنبھال لیا تھا اور گھاٹی کی آڑ لے کر اس نے اپنے سو سواروں کو اس طرح پھیلا دیا تھا کہ ان کی صحیح تعداد کا اندازہ ہونا مشکل ہو گیا تھا۔

تاتاری تین طرف سے تیر پھینک رہے تھے لیکن مصری ایک ہی طرف سے اس تیزی سے تیر پھینکتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ لہٰذا جب دھوپ پھیل جانے کے بعد بھی تاتاریوں کو ٹھیک اندازہ نہ ہو سکا تو انہیں بڑی فکر ہوئی۔ انہیں خوف تھا کہ اگر ہم نے بڑھ کر حملہ کیا اور مصری تعداد میں زیادہ ہوئے تو خواہ مخواہ میں مصیبت ہو جائے گی۔ آخر تاتاریوں نے ایک جنگی چال چلی۔

انہوں نے تیر اندازی بالکل بند کر دی۔ مصری کچھ نہ

سمجھ سکے کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹیلے سے تین سوار اترتے دکھائی دیے۔ ان کے تیروں پر سفید کپڑا لپٹا ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ جنگ کے بجائے گفتگو کے لیے آرہے ہیں۔

ان سواروں میں سے دو سوار تو دور ٹھہر گئے اور ایک سوار بڑھ کر اس جگہ آگیا جہاں مصری مورچا سنبھالے ہوئے تھے۔ اکیلے سوار کو آتا دیکھ کر نائب سردار نے کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

تاتاری نے کہا۔ ''تمہارا سردار کون ہے؟ ہم اس سے گفتگو کریں گے۔''

نائب نے کہا۔ ''واپس جاؤ اور تاتاری سردار کو یہاں بھیجو۔ مصری سردار سے صرف تاتاری سردار ہی بات کرسکتا ہے۔''

تاتاری نے بھیانک قہقہہ لگا کر کہا۔ ''مصری جوان! تاتاری سردار تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ اپنے سردار کو بلاؤ۔''

نائب نے کہا۔ ''تو کہو پھر کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں ہی ان مصری سواروں کا سردار ہوں۔''

تاتاری نے غور سے مصری کو دیکھا پھر بولا۔ ''تمہاری تعداد کتنی ہے؟''

نائب نے کہا۔ ''ہمارے ساتھ اتنے سوار ہیں کہ ہم تمہیں شکست دے سکتے ہیں۔''

تاتاری بولا۔ ''ہمیں دھوکا نہ دو۔ تاتاری شکست نہیں کھا سکتے۔ اگر تم ہتھیار ڈال دو تو ہم تمہیں ایک شرط پر چھوڑ سکتے ہیں۔''

نائب نے طیش میں آکر کہا۔ ''بہادر ہتھیار نہیں ڈالا کرتے۔ ہماری تلواریں تمہارا خون پینے لگی ہیں۔''

تاتاری نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور دور کھڑے ہوئے سواروں کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ ''اچھا، ہم تمہاری لڑکی کے ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے۔ اگر تم اسے بچانا چاہتے ہو تو خود کو بغیر لڑے ہمارے حوالے کردو۔''

نائب نے غور سے دیکھا تو ایک گھوڑے پر نفیسہ کو سوار پایا۔ اس کی مشکیں زین پر کسی ہوئی تھیں۔ یہ دیکھ کر اس کے حواس جاتے رہے اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔

تاتاری سوار نے اندازہ لگایا کہ گرفتار لڑکی واقعی کوئی اہم ہستی ہے کیونکہ لڑکی کو دیکھ کر مصری سردار کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوگیا تھا اور اب وہ شیر ہوکر بولا۔ ''بتاؤ، کیا فیصلہ کیا تم نے؟ لڑکی کی موت یا رہائی.....؟''

نائب نے کہا۔ ''عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا جنگی اصول کے خلاف ہے۔ تم اسے قتل کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے ہو۔''

تاتاری بولا۔ ''جس طرح بھڑکتے ہوئے آگ کے شعلے ہر چیز کو جلا دیتے ہیں، اسی طرح جنگ میں عورت اور مرد کو یکساں قتل کیا جاتا ہے تاکہ مردوں کے بعد عورتیں دشمن بچے نہ پیدا کرسکیں۔''

نائب کو کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ افسردگی سے بولا۔ ''ہمیں سوچنے کا موقع دو۔''

''ہم وقت بیکار ضائع نہیں کرسکتے۔ جو فیصلہ کرنا ہے، ابھی کرو۔''

نائب سردار پھر کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ اسے علم تھا کہ انکار کی صورت میں تاتاری فوراً نفیسہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ نائب کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم لڑکی کو چھوڑ دو گے؟''

تاتاری نے کہا۔ ''ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم صحیح راستے سے ہمیں لشکر میں پہنچانے میں کامیاب ہوگئے تو ہم اس لڑکی کے ساتھ تم سب کو رہا کردیں گے۔''

''یعنی تم راستہ بھول کر یہاں ٹھوکریں کھا رہے ہو؟'' نائب نے سوال کیا۔

''یہ ٹھیک ہے اور اس شرط پر تم لڑکی کو بچا سکتے ہو ورنہ اشارہ پاتے ہی اسے قتل کردیا جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے ایک تاتاری نے ایک بار پھر لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

نائب نے کہا۔ ''اچھا تو جاؤ، لڑکی کی مشکیں کھول دو۔ ہم تیار ہیں۔''

تاتاری بولا۔ ''لیکن اگر تم نے ہمیں غلط راستے پر ڈال دیا تو جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟ تم سب کا قتلِ عام۔ ایسا قتلِ عام جسے تم سوچ بھی نہیں سکتے ہو۔''

نائب نے جواب میں کہا۔ ''مصری دھوکے فریب سے نہیں، کھلے میدان سے لڑنا جانتے ہیں۔ بتاؤ، تمہارا لشکر کہاں ہے؟''

''حمص کے شمال میں۔'' تاتاری نے جواب دیا۔

مصر کے نائب سردار نے سب سے پہلے اپنی تلوار تاتاری کے حوالے کردی جس کے ساتھ ہی تاتاری نے اشارہ کیا اور نفیسہ کے ہاتھ کھول دیے گئے۔ نفیسہ گھوڑا بڑھا کر نائب سردار کے پاس آئی اور مضمحل انداز میں بولی۔

''یہ کیا کیا تم نے سردار؟''

نائب سردار نے کہا۔ ''بہن! ہم مجبور تھے۔''

نفیسہ کی جان بچانے کی خاطر مصری دستے نے ہتھیار ڈال دیے۔ تاتاریوں نے انہیں نہتا کرنے کے بعد واپسی

کا حکم دیا۔ دستے کے نائب سردار نے ان کی راہنمائی کی ذمے داری اپنے سر لی اور تاتاریوں کے اس پانچ سو سواروں کے رسالے کو جو کئی دن سے ریگستان میں بھٹک رہا تھا، لے کر حمص روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

ادھر مصری سردار گھاٹیوں کو پار کرتا ہوا بہت جلد حدیثہ پہنچ گیا۔ حدیثہ پہنچ کر اس نے سلطان کے حمص پہنچنے اور اس کے زبانی فرمان سے والیٔ حدیثہ کو مطلع کیا۔ جس وقت یہ سردار والیٔ حدیثہ کو تمام کیفیت سے آگاہ کر رہا تھا، اس وقت دربار میں جیش بھی موجود تھا۔

لٰہذا جب اس نے سنا کہ نفیسہ زخمی ہو کر گھاٹی میں گری ہے اور تاتاریوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگئی ہے تو وہ بے چین ہوگیا لیکن وہ تمام واقعات خاموشی سے سنتا رہا اور جب سردار بیان کر چکا تو والیٔ حدیثہ کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔

جس وقت ہلاکو خان نے وحشی تاتاریوں کے لشکر جرار کے ساتھ عراق و شام کا رخ کیا، اس وقت مصری طاقت بھی کچھ کمزور نہ تھی لیکن مصر کے تمام صوبے تقریباً آزاد ہوگئے تھے اور ان کے والی خود کو مختار حکمران سمجھنے لگے تھے۔

اگر اس وقت مسلمان دانشمندی سے کام لے کر متحدہ طور پر ہلاکو خان کا مقابلہ کرتے تو شاید مسلمانوں کا خون اس قدر بیدردی سے نہ بہتا لیکن وہ اتحاد سے کام لینے کے بجائے ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنے لگے اور یہ انتظار کرتے رہے کہ دوسرا صوبہ ختم ہوجائے تو وہ اپنی طاقت بڑھائیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہلاکو خان عراق کے علاقوں کو روندتا ہوا بغداد میں داخل ہوا اور بغداد کو اس طرح برباد کیا کہ جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

بے گناہ مسلمانوں کے قتلِ عام کے ساتھ ساتھ ہلاکو خان نے عباسی خلیفہ کو ہاتھی کے پیر سے بندھوا کر گھسٹوایا۔ یہاں تک کہ خلیفہ نے سسک سسک کر جان دے دی۔

اس واقعے سے دنیائے اسلام تھرا اٹھی اور سب نے یہ محسوس کرلیا کہ ہلاکو خان اس عظیم حکومت کو ضرور تباہ کردے گا جسے صلاح الدین ایوبی نے اپنے خون سے سینچا تھا اور واقعی ہلاکو خان نے کیا بھی ایسا ہی۔

دریائے فرات اور ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی حکومت کے ٹکڑے اڑ گئے۔ موصل، بخارا، جزیرہ، بغداد، حلب وغیرہ تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہو کر مصر کے ہاتھ سے نکل گئے اور ہلاکو خان اپنے باپ کے مرنے کی خبر سن کر واپس نہ ہوتا تو شاید کرد بلاد مصر میں ایک خوفناک معرکہ ہوتا جس کا نتیجہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ہلاکو خان کی واپسی پر مصر کے سپہ سالار بیبرس بندقدار نے تاتاریوں کو زبردست شکست دے کر انہیں حدود شام سے نکال دیا۔ بیبرس کی اس فتح سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے محسوس کیا کہ اگر منظم اور متحدہ طریقے سے تاتاریوں کا مقابلہ کیا جائے تو انہیں شکست دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ عراق کے بعد صوبہ داروں نے آہستہ آہستہ تاتاریوں سے اپنے علاقے نکالنا شروع کردیے۔

ادھر مصری فوج نے تاتاریوں کو دو اور لڑائیوں میں شکستِ عظیم دے کر یہ ثابت کردیا کہ مسلمان دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرانے کی ہمت رکھتے ہیں۔

تاتاری تین بار شکست کھانے کے بعد خاموش نہ بیٹھے۔ انہیں سب سے زیادہ فکر مصر کی تھی کیونکہ ہر بار انہیں مصریوں کے مقابلے سے بھاگنا پڑا تھا۔ اس دفعہ انہوں نے سیدھا مصر کا رخ کیا اور تہیہ کیا کہ اگر مصریوں کو شکست ہوئی تو وہ قاہرہ کا بھی وہی حشر کریں گے جو حشر بغداد کا کیا تھا لیکن ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

سلطان مصر ملک منصور، تاتاریوں کی خبر سن کر فوراً لشکرِ عظیم کے ساتھ قاہرہ سے نکل کھڑا ہوا تاکہ تاتاریوں کو بلاد مصر میں داخلے سے پہلے ہی للکارا جائے۔

سلطان نے مصر سے چلتے وقت تمام صوبوں اور دیگر سرداروں کو اس جہاد میں شرکت کی دعوت دے دی تھی چنانچہ یہ سردار اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ سلطان سے راہ میں ملتے جاتے تھے اور اس طرح دمشق پہنچتے پہنچتے سلطان کا لشکر ایک لاکھ سے زیادہ ہوگیا۔

یہی نہیں، جب یہ لشکر حمص پہنچا تو اس کی فوج ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہوگئی تھی پھر بھی اس نے حمص ٹھہر کر مزید لشکر اکٹھا کرنے کی تمام تدبیروں کو عملی جامہ پہنایا اور ان تمام سرداروں کو فوج لے کر آنے کا پیغام بھیجا جو اب تک اس سے نہ مل سکے تھے۔

اس نے اپنے ہرکارے بخارا اور موصل کے امیروں کے پاس روانہ کیے۔ موصل اور بخارا تاتاریوں کے قبضے میں تھے لیکن ان کے بعض علاقے اب تک مسلمانوں کے پاس تھے اور ان کے امیر اس کے انتظار میں تھے کہ تاتاریوں کا زور گھٹے تو اپنے علاقے چھین لیں۔

اس وقت حدیثہ میں کافی فوج اکٹھی تھی۔ والیٔ حدیثہ نے ان تمام لوگوں کو اپنے ہاں جگہ دی تھی جو تاتاریوں کی

تاراجی سے بچ کر وہاں پہنچے تھے اور جوشِ انتقام سے بھرے بیٹھے تھے۔ والیِ حدیثہ نے سمجھ لیا تھا کہ یہ لوگ بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور ان سے بہتر سپاہی دستیاب ہونا مشکل ہے۔

والیِ حدیثہ کو جس وقت سلطان کا پیغام ملا تو اس نے فوراً کوچ کی تیاری کی۔ فوج پہلے ہی سے تیار تھی۔ صرف حکم کی دیر تھی۔ ایک گھنٹے کے معمولی وقفے میں اس کی فوج صف آراء ہو چکی تھی۔ یہ لوگ حمص روانہ ہو گئے۔ اس فوج کے ساتھ جیش اور بوڑھا بھی تھا۔

جیش نے والیِ حدیثہ کو مشورہ دیا کہ چونکہ وقت کم ہے اس لیے ہمیں راستہ کاٹ کر گھاٹی کی طرف سے حمص چلنا چاہیے۔ اس طرح وقت بھی کم لگے گا اور ممکن ہے کہ وہ تاتاری سوار جنہوں نے سلطان کے سواروں کو گھیر رکھا ہے، اب تک وہاں موجود ہوں اور انہیں رہائی دلائی جا سکے۔

والیِ حدیثہ نے جیش کے اس مشورے کو قبول کیا اور اپنی فوج کو گھاٹی کے راستے چلنے کا حکم دیا۔ مسلمان جوشِ جہاد سے سرشار تھے۔ ان کی رفتار فطرتاً تیز ہو گئی اور وہ گھاٹی کے پُرخطر اور پیچ در پیچ راستے کو بڑی تیزی سے عبور کر گئے اور وہ سب اس مقام پر پہنچ گئے جہاں آٹھ گھنٹے پہلے تاتاری اور مصری سواروں میں معرکہ ہوا تھا۔

اس مقام کو جیش نے سردار کے ساتھ گھوم پھر کر اچھی طرح دیکھا لیکن وہاں سوائے چند تیروں کے جو مختلف مقامات پر چبھ کر رہ گئے تھے اور کوئی چیز نظر نہ آئی۔

جیش سخت مضطرب تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ نفیسہ پر کیا بیتی ہوگی؟ اگر وہاں گھمسان کی لڑائی ہوئی ہوتی تو لاشیں اور گھوڑے ضرور ملتے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں ایک آدمی بھی نہیں مارا گیا۔ آخر جیش کو نفیسہ کا پتا چل گیا۔ اس نے ایک جگہ ریت میں ایک خنجر گڑا دیکھا۔ اس خنجر کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ جیش نے خنجر اٹھا کر پہلے تو اسے الٹ پلٹ کر دیکھا پھر سردار سے کہا۔

”محترم سردار! یہ خنجر اس بات کی علامت ہے کہ نفیسہ اور اس کے ساتھی گرفتار ہو چکے ہیں۔“

سردار نے پوچھا۔ ”جوان! یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟“

جیش بولا۔ ”ہمارے قبیلے کا رواج ہے کہ اگر ہم خود ہتھیار ڈال دیں تو اس کی نشانی کے طور پر خنجر کو زمین میں گاڑ دیتے ہیں تاکہ ہمارے دوسرے ساتھیوں کو معلوم ہو جائے کہ ہم گرفتار ہو گئے ہیں اور وہ انہیں چھڑانے کی فکر کریں۔“

”تو اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ سردار نے جلدی سے پوچھا۔

جیش نے کہا۔ ”تاتاری انہیں گرفتار کر کے مشرق کی جانب لے گئے ہیں یعنی وہ لوگ حمص کے شمالی حصے کی طرف گئے ہیں۔“

”یہ تم کیسے کہہ رہے ہو جوان؟“ سردار نے پھر حیرت کا اظہار کیا۔

”خنجر کا رخ مشرق کی طرف تھا جس کا صاف مطلب ہے کہ وہ ادھر گئے ہیں اور یہ خیال صحیح بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ تاتاریوں کا لشکر حمص کے شمال میں کہیں ٹھہرا ہوگا۔“

”پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے پوچھا۔

جیش نے کہا۔ ”چلیے والیِ حدیثہ سے مشورہ کرتے ہیں۔ اگر وہ رضامند ہو گئے تو ہم کچھ سوار لے کر ان کا پیچھا کریں گے۔ ممکن ہے وہ ہمیں راستے میں ہی مل جائیں اور ہم اپنے ساتھیوں کو چھڑانے میں کامیاب ہو جائیں۔“

سردار کہنے لگا۔ ”اگر والیِ حدیثہ آمادہ ہو گئے تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا کیونکہ نفیسہ کی حفاظت میرے سپرد ہوئی ہے۔ اگر ہم نفیسہ کو چھڑانے میں کامیاب ہو گئے تو میں سلطان کے سامنے شرمندہ نہیں ہوں گا۔“

جیش اور سردار گھوڑے بڑھا کر والیِ حدیثہ کے بقریب پہنچے۔ سردار نے اس مقام پر پہنچتے ہی والیِ حدیثہ کو بتا دیا تھا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ اپنے ساتھیوں سے جدا ہوا تھا۔

والیِ حدیثہ کو سلطانی سواروں کے ضائع ہونے کا بہت افسوس تھا۔ اس لیے خود اس نے چند اور سواروں کو چاروں طرف دوڑایا تاکہ وہ کھوج لگائیں کہ اگر تاتاری اب تک قرب و جوار میں موجود ہیں تو لڑ کر مصریوں کو آزاد کرایا جائے۔

جیش نے والیِ حدیثہ کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”والیِ محترم! سلطانی سوار گرفتار ہو گئے ہیں اور تاتاری انہیں حمص کے شمالی حصے کی طرف لے گئے ہیں۔“

والی نے پوچھا۔ ”نوجوان! تمہیں یہ باتیں کس نے بتائیں؟“

جیش نے جواب دیا۔ ”دراصل وہ لڑکی جو سلطانی سواروں کے ساتھ حمص سے آ رہی تھی، میرے قبیلے کی ہے اور میری منگیتر ہے۔ اس نے گرفتاری کے وقت کچھ ایسی علامات چھوڑی ہیں جن کی بنا پر میں یہ کہہ رہا ہوں۔“

والی نے کہا۔ ”جیش! ہمیں افسوس ہے کہ ہم اتنی فوج رکھتے ہوئے بھی تمہاری منگیتر کو نہیں بچا سکے۔ ہمیں تمہارے ساتھ پوری ہمدردی ہے۔“

"اگر والیِ محترم کو مجھ سے ہمدردی ہے تو میں ایک درخواست پیشِ خدمت کرتا ہوں۔"

"ہم تمہاری درخواست سننے سے پہلے منظور کرتے ہیں۔" والی نے مسکرا کر کہا۔

جیش نے کہا۔ "میری خواہش ہے کہ مجھے کچھ سوار دیے جائیں اور میں ان تاتاریوں کے تعاقب میں روانہ ہوں جنہوں نے سلطانی سواروں کو گرفتار کیا ہے۔"

"لیکن وہ تو اپنے لشکر میں بھی پہنچ چکے ہوں گے۔" والی نے جلدی سے کہا۔

"والیِ محترم نے میری درخواست پہلے ہی منظور کر لی ہے۔" جیش نے اس بات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

والی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "ہمیں کوئی عذر نہیں لیکن ہم نہیں چاہتے کہ تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ تم نے پہلے ہی مصیبتیں اٹھائی ہیں اور اب تمہیں اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔"

"آپ میری فکر بالکل نہ کریں۔" جیش نے کہنا شروع کیا۔ "مجھے تو اس دن سکون حاصل ہوگا جس دن تاتاریوں کو شکست ہوگی اور ہم اپنے بھائی بہنوں کے خون کا بدلہ لے سکیں گے۔"

"ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" والی نے کہا۔

"پھر کیا حکم ہے؟" جیش نے بے چینی سے پوچھا۔

"کتنے سوار لے جانا چاہتے ہو؟" بالآخر والی نے پوچھا۔

"صرف دو سو۔ اگر اتنے ممکن نہ ہوں تو سو بھی کافی ہیں۔" جیش نے الجھ کر کہا۔

والیِ حدیثہ نے اپنے سپہ سالار کی طرف دیکھا اور کہا۔ "سپہ سالار! اس جوان کو دو سو مضبوط سواروں کا دستہ دے دو تاکہ یہ سلطانی سواروں کو چھڑانے میں کامیاب ہو سکے۔"

سپہ سالار نے تعمیلِ حکم کے لیے اپنا سر خم کر دیا اور گھوڑا گھما کر سواروں کو الگ کرنے کے لیے چلا گیا۔ وہ سردار جو سلطانی سواروں کو چھوڑ کر حدیثہ پہنچا تھا، اس نے والیِ حدیثہ سے بڑے ادب سے کہا۔ "اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں؟"

والی مسکرایا اور کہا۔ "تم سلطانی پیامبر کی حیثیت رکھتے ہو۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا۔ "مجھے بھی نوجوان جیش کے ساتھ تاتاریوں کے تعاقب میں جانے کی اجازت دی جائے۔"

"لیکن تم سلطانی پیامبر ہو۔ ہم سلطان کو کیا جواب دیں گے؟" والی نے متفکرانہ انداز میں کہا۔

"والیِ محترم!" سردار نے کہا۔ "میں سلطان سے بہت شرمندہ ہوں۔ وہ لڑکی جسے تاتاری گرفتار کر کے لے گئے تھے، اس کی حفاظت انہوں نے میرے سپرد کی تھی۔ اب میں کس منہ سے سلطان کا سامنا کروں گا۔ کامیاب ہو کر واپس آیا تو اچھا ہے ورنہ تاتاریوں سے لڑ کر سلطان کے سامنے سرخرو ہو جاؤں گا۔"

والیِ حدیثہ نے قدرے پس و پیش کے بعد اسے بھی اجازت دے دی۔ اتنی دیر میں سپہ سالار نے دو سو سواروں کا مضبوط دستہ جیش کے ساتھ کر دیا تھا۔ جیش کے ساتھ وہ بوڑھا بھی تھا جو نخلستان خماراں سے اس کے ساتھ آیا تھا۔

جیش نے اس کو اپنے ساتھ یوں رکھا تھا کہ وہ راستوں سے بہ خوبی واقف تھا اور جہاندیدہ ہونے کے ساتھ اس کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ جیش نے وقت ضائع کرنا بیکار سمجھا اور والیِ حدیثہ کو سلام کر کے بڑی تیزی سے اس طرف دیکھا جدھر تاتاری روانہ ہوئے تھے۔

اس وقت اس کے دماغ میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔ وہ خیال تھا کہ نفیسہ کا ظالم اور سفاک تاتاریوں کے ہاتھ لگنا کس قدر خطرناک تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک حسین اور اپنے حسن و شباب میں لاجواب عورت جو اپنی نظیر بھی نہ رکھتی ہو، تاتاری اس کے ساتھ کس قدر وحشیانہ سلوک کرتے تھے۔

تقریباً دو گھنٹے اس طرح مسافت طے کرنے کے بعد جیش کو نفیسہ کا ایک نشان ملا۔ وہ ایک جھاڑی میں الجھا ہوا نفیسہ کا رومال تھا۔ جیش نے رومال جھاڑی سے نکالا اور سردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سردار! ہم بالکل صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔" پھر بوڑھے سے سوال کیا۔

"کیوں بابا! حمص کے شمال میں کوئی ایسا راستہ بھی جاتا ہے جس تک پہنچنے میں کم وقت لگے؟"

بوڑھے نے جواب میں کہا۔ "نوجوان جیش! ایک راستہ ہے تو ضرور لیکن جس راستے پر ہم چل رہے ہیں، جب وہ ٹھیک ہے تو پھر اسے چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے؟"

جیش نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "بابا! ہم راستہ اس لیے کاٹنا چاہتے ہیں کہ اگر ہمیں دیر ہوگئی اور تاتاری اپنے لشکر میں پہنچ گئے تو پھر سلطان کے سواروں کو چھڑانا ناممکن ہو جائے گا۔ میں انہیں راستے ہی میں جا لینے کی فکر میں ہوں۔"

"تمہارا خیال ٹھیک ہے جیش!" کہتے ہوئے بوڑھے نے گھوڑا ایک طرف موڑ دیا۔ اب یہ لوگ بجائے

سیدھے راستے کے، راستہ کاٹ کر روانہ ہوئے۔

صحرائے شام کے بعض علاقے تین ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلند ہیں۔ اس علاقے میں کوئی دریا نہیں ہے لیکن جگہ جگہ نخلستان اور گھاٹیاں ہیں جن میں شیریں چشمے ہیں۔ اونچے اونچے ٹیلوں نے راستہ دشوار گزار بنا دیا ہے لیکن جس طرف جیش جا رہا تھا وہ راستہ نسبتاً زیادہ خطرناک تھا۔

پہلی تاریخوں کا چاند کچھ دیر چمک کر غروب ہو گیا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ بوڑھا راستے سے اچھی طرح واقف تھا لیکن اندھیرا ہونے کی وجہ سے ان کی رفتار سست ہو گئی۔ جیش کو یہ سست رفتاری بڑی گراں گزر رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ تاتاریوں کو لشکر میں پہنچنے سے پہلے جا لے اور نفیسہ اور دیگر مصریوں کو رہا کرائے۔

جیش نے بوڑھے سے کہا۔ ”بابا! اس وقت ہم کہاں ہیں؟ تاتاریوں کا کوئی پتا نہیں چلتا۔“

بابا نے راستے کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ”جیش! میرے اندازے کے مطابق ہم لوگ اس وقت حمص سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔“

”آگے نکل آئے ہیں؟ یعنی ہم نے حمص کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔“ جیش نے گھبرا کر پوچھا۔

بوڑھے نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ حمص ہم بائیں جانب چھوڑ آئے ہیں۔ اس وقت ہم حمص کے شمال میں آ گئے ہیں اور اگر حدیثہ پہنچنے والی خبریں درست ہیں تو تاتاری لشکر کو یہیں کہیں ہونا چاہیے۔“

جیش نے گھوڑا روکے بغیر کہا۔ ”مگر میں نے سنا ہے کہ تاتاری حمص سے کئی منزل پہلے ٹھہر گئے ہیں۔ شاید انہیں سلطانِ مصر کے آنے کی خبر معلوم ہو گئی ہے۔ وہ اب آگے بڑھنے سے ہچکچا رہے ہیں۔“

”لیکن جیش! ایک خبر یہ بھی ہے کہ تاتاری بالکل حمص کے قریب پہنچ چکے ہیں۔“

بوڑھے نے تردید کی تو جیش پھر بولا۔ ”کچھ بھی ہو، یہاں تو تاتاری دور دور تک نظر نہیں آتے۔“

اس وقت وہ لوگ چڑھائی پر تھے۔ جب وہ اوپر پہنچے تو انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ دوسری طرف نشیب میں دور دور تک آگ روشن ہے اور وہاں ایک پورا شہر کا شہر آباد ہے۔

جیش نے گھوڑا روک لیا اور بوڑھے سے بولا۔ ”یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟ شاید یہ کسی کا لشکر ہے۔“

بوڑھا مسکرایا اور بولا۔ ”جیش! یہ وہی لوگ ہیں جن کی تلاش ہے۔ ذرا غور سے دیکھو۔ مشعلوں کی روشنی میں ان

کے جھنڈ سے صاف نظر آ رہے ہیں۔ تم ان وحشی پہریداروں کو دیکھ رہے ہو جو نیزے سنبھالے خیموں کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں؟''

جیش نے غور سے دیکھا تو اس کی سمجھ میں آ گیا مگر اس کے ساتھ ہی امید کی آخری کرن بھی جاتی رہی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس تاتاری دستے کو جس نے نفیسہ اور دوسرے سلطانی سواروں کو گرفتار کیا ہے، تاتاری لشکر میں پہنچنے سے پہلے روک لے گا لیکن اب تاتاری لشکر اس کے سامنے تھا جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ دستہ پہلے ہی اپنے لشکر سے آملا ہے۔

جیش کے رکتے ہی تمام سواروں نے اپنے گھوڑے روک لیے تھے اور ہر ایک میدان میں پھیلے ہوئے لشکر کو دیکھ رہا تھا۔ جگہ جگہ آگ روشن تھی اور مشعلیں جل رہی تھیں۔ رات ہونے کے باوصف خیموں کے اندر اور باہر کافی رونق تھی۔

کچھ دیر وہ حسرت و یاس کے ساتھ میدان کو دیکھتے رہے۔ جیش کے ساتھ صرف دو سو سوار تھے۔ ان سواروں کے ساتھ اتنے بڑے لشکر پر حملہ کرنا تو الگ رہا، شب خون بھی نہیں مارا جا سکتا تھا۔

جیش کے ساتھ اس وقت وہ سردار بھی تھا جس کے سپرد نفیسہ کی حفاظت کی گئی تھی۔ اس کی حالت بھی خراب تھی اور وہ تاتاری لشکر کو دیکھ دیکھ کر دانت پیس رہا تھا۔

سردار نے جیش سے کہا۔ ''اب کیا ارادہ ہے بہادر نوجوان؟''

''تمہاری رائے کیا ہے سردار؟'' جیش نے پوچھا۔

''میرا تو جی چاہتا ہے کہ گھوڑا بڑھا کر ان پر حملہ کر دوں اور لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں۔'' سردار نے بڑے جوش و خروش سے کہا۔

''برادر! جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔ مرنا برحق ہے پھر کیوں نہ اسی وقت ان کا مقابلہ کیا جائے۔''

''میرے بچو!'' اچانک بوڑھے کی آواز گونجی۔ ''پہاڑ سے ٹکرانا عقلمندی نہیں۔ ڈیڑھ دو لاکھ کے لشکر کا تمہارے دو سو سوار کیا بگاڑ سکیں گے؟''

''ہم شب خون تو مار سکتے ہیں بابا!'' جیش نے بے چینی سے کہا۔

''جیش! شب خون کا مطلب ہے کہ دشمن کو زیادہ نقصان پہنچایا جائے لیکن اگر تم نے اس وقت شب خون کا مظاہرہ کیا تو تمہارے دو سو سوار لشکر تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں گے۔ تم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔''

''پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ آپ کوئی تدبیر تو بتائیں؟'' جیش نے بے صبری سے کہا۔

بوڑھا بولا۔ ''جیش! ہر موقع پر جوش اور بہادری سے کام لینے کا نہیں ہوتا۔ والیٔ حدیثہ نے تمہارے ساتھ دو سو سوار کیے ہیں۔ ان کی جانوں کے محافظ تم ہو۔ اگر تم نے انہیں غلط جگہ لڑا کر ختم کرا دیا تو یہاں اور روزِ حشر تم اس کے جوابدہ ہو گے۔''

حشر کا خیال آتے ہی جیش تھرا اٹھا۔ واقعی اس وقت دو سو جانیں اس کے اشارے پر قربان ہونے کو تیار تھیں۔ تاتاریوں پر حملہ کرنا موت کو دعوت دینے کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ اور تذبذب میں پڑ گیا۔

وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ دائیں جانب نشیب میں گھوڑے دوڑنے کی آواز بلند ہوئی اور پھر ایک ہی لمحے بعد دو سوار تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے چڑھائی چڑھ کر بالکل ان لوگوں کے قریب آگئے۔

تاتاریوں کے لشکر میں اتنی روشنی ہو رہی تھی کہ اتنی دور ہونے کے باوجود یہ لوگ ایک دوسرے کے چہرے... بخوبی دیکھ سکتے تھے لیکن آنے والے صرف اس لشکر اور آگ کی طرف دیکھ رہے تھے جو سامنے میدان میں جگمگا رہی تھی۔ شاید وہ یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے کہ نشیب میں کس کا لشکر پڑا ہوا ہے کیونکہ نیچے سے انہیں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور اسی لیے ان میں سے دو سوار اوپر کو دیکھ رہے تھے۔

دونوں سوار اب ایک بلند جگہ پر پہنچ کر ٹھہر گئے اور انہوں نے غور سے میدان میں پھیلے لشکر کو دیکھا پھر ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے اور انہوں نے چیخ کر کسی وحشی زبان میں کچھ کہا جس کا جواب نیچے ان کے ساتھیوں نے بھی دیا مگر دوسری طرف سردار نے جیش کو بتایا کہ یہ لوگ وہی ہیں جنہوں نے نفیسہ اور سلطانی سواروں کو گرفتار کیا ہوا ہے۔ شاید یہ لوگ اب تک اپنے لشکر میں نہیں پہنچ سکے تھے۔ اس لیے ابھی موقع ہے کہ انہیں لشکر میں پہنچنے سے پہلے ہی روک لیا جائے۔

جیش اور سردار نے اس رائے سے اتفاق کیا پھر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ بوڑھے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ ہاں اس وقت تم حملہ کر سکتے ہو اور پھر دوسرے ہی لمحے جیش اور سردار کی کمان سے نکلے ہوئے دو تیروں نے اوپر والے دونوں سواروں کو آن کی آن میں واصلِ جہنم کا پروانہ دے دیا۔

سردار نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ راستہ بھولے ہوئے

تا تاری دستے نے نفیسہ اور سلطانی سواروں کو گرفتار کر کے اپنے لشکر کا رخ کیا۔ انہیں نہ تو جلدی تھی اور نہ کوئی خوف، اس لیے کہ شام کے علاقوں میں ان کے وحشیانہ حملوں کی دھاک بیٹھی تھی اور وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ کوئی ان کا راستہ روک سکتا ہے اس لیے وہ بڑے اطمینان سے نائب سردار کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے تھے۔

☆☆☆

نفیسہ نے گھاٹی سے چلتے وقت اپنا خنجر ریت میں گاڑ دیا تھا اور ایک جگہ دوسری نشانی چھوڑی تھی کہ اگر اتفاقاً جیش یا اس کے قبیلے کا کوئی آدمی ادھر سے گزرے تو اس کو پتا معلوم ہو سکے۔

نفیسہ نے دیکھا کہ تا تاری بڑی سست رفتاری سے چل رہے ہیں۔ یہ چیز اس کے حق میں زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ اسے امید تھی کہ اگر سردار نے بروقت والیِ حدیثہ کو خبر پہنچائی تو وہ ضرور مدد کو روانہ ہوں گے۔

جیش اور سردار نے دونوں تا تاریوں کو ختم کرنے کے بعد اپنے سواروں کو حملے کا حکم دیا۔ اس وقت جیش کے سواروں نے پہلے تو تا تاریوں پر تیر برسائے پھر تلواریں سونت کر موت کی طرح ان کے سر پر پہنچ گئے۔

تا تاری اس اچانک حملے سے بہت سراسیمہ ہوئے۔ انہیں تعجب تھا کہ ان کا لشکر سامنے پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور یہ لوگ ہیں جو تا تاری لشکر کی پروا کیے بغیر ان پر حملہ کر رہے ہیں۔

اس حملے سے کچھ تو شور ہوا اور کچھ گھوڑوں کی بھاگ دوڑ نے سامنے کے تا تاری لشکر کے پہریداروں کو خبردار کر دیا۔

جب تا تاریوں پر اچانک حملہ ہوا تو انہوں نے خود بھی اپنی وحشی زبان میں کچھ چیخ چیخ کر کہا۔ جس سے شاید وہ اپنے لشکر والوں کو مطلع کرنا چاہتے تھے۔

اس وقت چاند تو موجود نہ تھا لیکن لشکر کی آگ، مشعلوں کی روشنی کچھ کم نہ تھی۔ جیش نے جوش میں آ کر حملہ تو کر دیا لیکن جب وہ چڑھائی پر چڑھ کر نیچے پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ تا تاری تعداد میں ان سے دوگنا ہیں۔ پھر بھی اس نے ہمت سے کام لیا اور انہیں گھیرے میں لینے کی کوشش کی۔ تا تاریوں نے قیدیوں کی مشکیں زین سے باندھ دی تھیں۔ صرف نائب سردار اور نفیسہ کے ہاتھ کھلے تھے لیکن ان کے گھوڑوں کی باگیں دوسرے سوار پکڑے ہوئے تھے۔ جس وقت تا تاری دستے پر حملہ ہوا تو نفیسہ اور دیگر ساتھی قیدی یہ سمجھ گئے کہ حملہ کرنے والے ان کے دوست ہیں لیکن نفیسہ یہ نہ دیکھ سکی کہ ان کا سردار کون ہے۔

تا تاریوں نے خطرہ محسوس کرتے ہی قیدیوں کو سو سواروں کے حلقے میں آگے بھیج دیا تا کہ وہ مارے جائیں یا گرفتار ہو جائیں تو قیدی لشکر میں پہنچ جائیں۔

جیش نے تقریباً سو سواروں کو قیدیوں کے ساتھ آگے بڑھتے دیکھا تو اس نے ادھر کا رخ کیا لیکن تا تاریوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ ایک طرف دو سو جانباز اور دوسری طرف چار سو وحشی درندے۔ پھر بھی جیش نے اتنی دلیری کا مظاہرہ کیا کہ تا تاری اس کی شمشیرزنی دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

اب وہ اکیلے اکیلے اس کے سامنے آنے سے کتراتے تھے۔ جیش نے اس مضبوط دیوار کو توڑنے کی بہت کوشش کی مگر اس کی ایک نہ چلی اور وہ اس کوشش میں زخمی بھی ہو گیا۔

جیش کے سامنے اس کی محبوبہ قیدی کی حیثیت سے آگے بڑھائی جا رہی تھی۔ جیش اسے چھڑانے کی..... کوشش میں بے بس تھا

جیش اپنی کوشش میں ناکام رہا لیکن اصولی حیثیت سے اس نے فتح حاصل کی تھی۔ اس حملے میں اس کے دو سو سواروں میں سے ایک بھی شہید نہیں ہوا۔ برخلاف اس کے پچاس کے قریب تا تاری ان کے ہاتھوں مارے گئے اور لشکر کے پہریدار خبردار ہو کر ان کی مدد کو نہ آ جاتے تو وہ بھی مارے جاتے۔

دراصل تا تاری ایک تو اس اچانک حملے سے گھبرا گئے، دوسرے حملہ اتنا شدید تھا کہ سوائے اس کے وہ اپنی مدافعت کے اور کچھ نہ کر سکے۔ وہ تعداد میں دوگنے تھے لیکن بجائے انہیں گھیرے میں لینے کے، خود گھیرے میں گرفتار ہو رہے تھے۔

پہریداروں کے آ جانے سے تا تاریوں کا پلہ بھاری ہو گیا۔ بوڑھے نے پہریداروں کی کمک آتے دیکھ کر جیش کو اشارہ کیا کہ بس اب خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے چپ چاپ نکلو۔

جیش اور سردار نے بھی موقع کی نزاکت کا اندازہ لگا لیا تھا اس لیے جب پہریدار قیدیوں کو قبضے میں لینے کے بعد ان کی طرف چلے تو ان کے پہنچنے سے پہلے ہی جیش نے اپنے سواروں کو واپسی کا حکم دے دیا۔

جیش کے سواروں نے ایسی تیزی سے حملہ کیا تھا کہ آن واحد میں ٹیلوں میں چھپ گئے اور تا تاری منہ کھولے ہوئے یہ دیکھتے ہی رہ گئے کہ یہ لوگ کدھر سے آئے تھے اور کدھر چلے گئے۔

رات اندھیاری تھی۔ تاتاریوں نے ان کا تعاقب کرنے کا ارادہ نہیں کیا اور پچاس لاشوں کو وہیں چھوڑ کر دانت پیستے ہوئے لشکر میں واپس آگئے۔ انہیں پچاس سواروں کے ضائع ہونے کا افسوس تھا لیکن اندھیری رات میں ان کے تعاقب میں جانا اور خطرناک تھا۔ انہوں نے اسی کو غنیمت جانا اور چپ چاپ لوٹ گئے۔

☆☆☆

تاتاریوں کا ملک شام پر یہ پانچواں حملہ تھا۔ سب سے پہلے 658ء میں ہلاکو خان دمشق اور موصل شام فتح کرتا ہوا مصر کی طرف بڑھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بغداد ہلاکو خان کے ہاتھوں برباد ہو چکا تھا اور عراق و شام کے تمام علاقوں پر تاتاریوں کا پرچم لہرا رہا تھا۔ موصل، بخارا، جزیرہ حلب، حمص، دمشق کے والی شکست کھا کر قاہرہ پہنچ چکے تھے۔

عباسی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اب اگر مسلمانوں کو کہیں پناہ مل سکتی تھی یا اگر کوئی طاقت تاتاریوں کا مقابلہ کر سکتی تھی تو وہ صرف مصر کے سلطان تھے۔

ہلاکو کے حملے کے وقت مصر کی حکومت مظفر سیف الدین خوارزمی کے ہاتھ میں تھی۔ مظفر، خوارزم شاہ کا بھتیجا تھا اور چنگیز خان کے حملے کے وقت خوارزم سے بھاگ کر مصر آگیا تھا اور آخر اپنی شجاعت اور دانائی سے مصر کا سلطان بن گیا۔

دمشق سے آگے بڑھ کر ہلاکو خان نے مظفر خوارزمی کو اطلاع دی کہ اگر مصر بغیر جنگ کے اس کے حوالے نہ کیا گیا تو قاہرہ کا بھی وہی حال ہوگا جو بغداد کا ہوا ہے۔

دراصل تاتاریوں نے سمجھ لیا تھا کہ جب تک مصر کی حکومت موجود ہے، وہ عراق و ایران اور شام پر اپنا قبضہ دیر تک نہ رکھ سکیں گے اور مصر کی عظیم حکومت انہیں ہر وقت پریشان کرتی رہے گی۔

ہلاکو خان اسی خیال کے تحت مصر کی تسخیر کے لیے چلا تھا۔ مظفر خوارزمی نے ہلاکو کے ارادوں سے باخبر ہوتے ہی اپنے سرداروں کو بلا کر صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس وقت موصل، بخارا اور عراق و شام کے تمام ہی شکست خوردہ والی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے تلواروں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ وہ میدان سے منہ نہ موڑیں گے۔

ہلاکو خان کے مقابلے پر مظفر خوارزمی بڑے طمطراق سے نکلا۔ ابھی دونوں لشکر کافی دور تھے کہ ہلاکو خان کو اپنے بھائی کے مرنے کی اطلاع دی گئی۔ اس خبر کو پا کر وہ خود تو لوٹ گیا لیکن اپنے سردار امیر کتبغاں کو مصر کی تباہی اور تسخیر پر لگا گیا۔

مسلمان بے گناہوں کا خون تاتاریوں کے ہاتھوں پانی کی طرح بہا تھا۔ وہ رنگ لے آیا۔ ہلاکو خان کی واپسی تاتاریوں کی شکست کا پیش خیمہ بن گئی۔ ہلاکو خان کا سردار جوش و خروش سے آگے بڑھ رہا تھا کہ مصر کی فتح کا سہرا اس کے سر بندھے گا۔ ادھر مصری لشکر بھی جوشِ انتقام تلے اندھا ہو رہا تھا۔ مصریوں کو تاتاریوں کے وحشیانہ مظالم کی تمام داستان معلوم تھی اور وہ بھوکے شیروں کی طرح تاتاریوں سے لڑنے پر آمادہ تھے۔

تاتاریوں اور مصریوں کا پہلا معرکہ جس میں تاتاریوں کو پہلی بار مسلمانوں کے ہاتھوں بری طرح شکست ہوئی، مقام جالوت پر ہوا۔

تاتاریوں کا عظیم لشکر میدان میں صف آرا ہوا لیکن مصریوں نے انہیں ٹھہرنے نہیں دیا اور جالوت پہنچتے ہی ایسا سخت حملہ کیا کہ وہ تاتاری جو شکست کا نام بھی نہ جانتے تھے، ان کے پیر اکھڑ گئے اور وہ ایسے بھاگے کہ ایک دوسرے کی خبر نہ رہی۔ تاتاریوں کا سردار امیر کتبغاں میدان میں آیا اور دس ہزار تاتاری قتل ہوئے۔

اس پہلی تاریخی فتح کے بعد مسلمانوں کے دل بڑھ گئے اور تاتاریوں کا جو رعب ان پر بیٹھ گیا تھا، وہ جاتا رہا۔ اس شکست کے بعد مصری سردار ملک ظاہر بندقدار نے تعاقب کر کے تاتاریوں کا بڑا قتلِ عام کیا اور انہیں حدودِ شام سے باہر نکال دیا۔ اس شکست کے بعد تاتاری خاموش نہیں بیٹھے۔ کچھ ہی عرصے بعد ہلاکو کے بیٹے ریگا خان نے اناطولیہ سے بڑھنا چاہا۔ اس وقت مصر کا سلطان ملک ظاہر تھا۔ اسے معلوم ہوا تو ایک لشکر جرار کے ساتھ مصر سے چلا اور اناطولیہ میں تاتاریوں کو شکستِ فاش دے کر ریگا خان کو قتل کر دیا پھر اس مردِ مجاہد نے شام، عراق کے تمام علاقے تاتاریوں سے چھین لیے اور بغداد تک پہنچ گیا۔

اس سلطان کے عہد میں دوبارہ پھر تاتاریوں نے یورش کی۔ ایک بار تو وہ شام میں داخل ہوئے اور مصری سردار امیر قلاؤں کے ہاتھوں شکست کھائی۔ دوسری مرتبہ انہوں نے عراق عجم کا رخ کیا تو سلطان ملک ظاہر خود مقابلے پر نکلا اور ہلاکو خان کے دوسرے بیٹے اباخاقان کو شکست دے کر شام سے نکال بھگایا۔

اس دفعہ تاتاریوں کی ملک شام پر چڑھائی دراصل پہلی چار شکستوں کی صدائے بازگشت تھی۔ تاتاری اپنی شکست اور خون کا انتقام لینا چاہتے تھے اور اس بار وہ ہر بار

سے زیادہ تیاری کے ساتھ نکلے تھے کیونکہ اب وہ نہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھائیں۔

لہٰذا پہلے تو وہ سرحد سے دور ہٹ کر اپنی طاقت کو جمع کرتے رہے اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ مصری سلطان اس سے زیادہ لشکر ان کے مقابلے پر نہیں لا سکتا تو وہ حدود شام میں شمال سے داخل ہوئے۔

ہلاکو خان کے دو بیٹے، منجو تیمور اور اباخاقان تاتاریوں کی سرداری کر رہے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ اسی اسی ہزار وحشی تاتاریوں کا لشکر تھا۔ اس کے علاوہ دس ہزار سواروں کا ہراول دستہ لشکر کے آگے آگے چل رہا تھا جس کا کام بستیوں میں آگ لگانا اور مسلمان بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کا قتلِ عام کرنا تھا۔

مسلمانوں کا خیال تھا کہ پیہم شکستوں سے تاتاریوں کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی اور اب وہ بلادِ اسلامی کا رخ نہ کریں گے لیکن تاتاری خاموش نہیں بیٹھے اور موقع پاتے ہی ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے لشکر کے ساتھ پھر اسلامی علاقوں کا رخ کیا۔

تاتاریوں کا ہراول دستہ نخلستان اور سرحدی بستیوں کو روندتا اور برباد کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے تاتاریوں کا لشکر تھا۔ تاتاریوں کے شام میں داخل ہوتے ہی انہیں اطلاع ملی کہ سلطانِ مصر ملک منصور بڑی تیزی سے مقابلے کے لیے آرہا ہے۔ یہاں تک کہ تاتاریوں کے دمشق پہنچنے سے پہلے ہی سلطان منصور وہاں پہنچ گیا اور تاتاریوں کا انتظار کرنے کے بجائے وہ کوچ در کوچ کرتا حمص پہنچ گیا۔

تاتاریوں کو سلطان کے حمص پہنچنے کی خبر ملی تو ان کا بڑھتا ہوا سیلاب رک گیا۔ اب انہوں نے حمص کے شمال میں ڈیرے ڈال کر اپنی پوری طاقت کو اکٹھا کیا۔

ہزار ہزار اور پانچ پانچ سو کے کئی دستے قرب و جوار میں روانہ کیے تاکہ وہ سامانِ خورونوش حاصل کریں اور راستوں سے پوری طرح واقف ہو جائیں اور وقتِ ضرورت انہیں مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

لہٰذا پانچ سو کا ایک ایسا ہی دستہ راستہ بھول کر مارا مارا پھر رہا تھا کہ اس کی مڈبھیڑ ان سواروں سے ہوئی جنہیں سلطان نے حدیثہ روانہ کیا تھا۔ اس دستے کا سردار بقلو خان تھا جس نے نفیسہ اور دوسرے مصری سواروں کو گرفتار کرلیا تھا اور یہی وہ راستہ تھا جس پر جیش نے تاتاری لشکر کے سامنے حملہ کر کے نفیسہ کو چھڑانے کی کوشش کی تھی لیکن جیش اپنی کوشش میں ناکام ہو کر واپس حمص چلا گیا اور بقلو خان، نفیسہ اور سواروں کو لے کر تاتاری لشکر میں آگیا۔

بقلو خان تاتاری لشکر میں پہنچا تو اسے تاتاری لشکر کے سپہ سالاران منجو تیمور اور اباخاقان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس وقت اس کے ساتھ نفیسہ اور دیگر مصری قیدی بھی تھے۔ منجو تیمور نے قیدیوں کو حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بھیڑیں تم نے کیوں پالی ہیں؟''

بقلو خان نے جواب میں کہا۔ ''سردار! ہمارا دستہ راستہ بھول کر بھٹک رہا تھا۔ یہ سوار ہمیں مل گئے اور ہم نے انہیں گرفتار کرلیا پھر ان کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔''

یہ جواب سن کر اباخاقان جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''اور وہ لوگ کون تھے جنہوں نے ہمارے لشکر کے سامنے تم پر حملہ کیا؟''

بقلو خان بولا۔ ''ہمیں اس کا پتا نہیں لیکن وہ لوگ شاید مصری تھے۔ ان کی کلاہیں سرخ اور قبائیں سفید تھیں۔''

''اور یہ لوگ کون ہیں جنہیں تم نے گرفتار کیا ہے؟'' منجو تیمور نے پوچھا۔

''یہ بھی مصری ہیں۔'' بقلو خان نے کہا۔

''لیکن ان کی کلاہیں تو زرد ہیں؟'' اباخاقان نے قیدیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بقلو خان گھبرا گیا۔ اس نے قیدیوں کی طرف دیکھا۔ ان قیدیوں کی کلاہیں واقعی زرد تھیں اور یہ کلاہیں ان سے بناوٹ میں بھی مختلف تھیں۔

اس وقت قیدیوں کے نائب سردار نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''تاتاری سردار! وہ لوگ مصری نہیں تھے بلکہ شاہی لشکر کے سپاہی تھے۔ شاہی سوار اسی طرح کا لباس پہنتے ہیں۔''

منجو تیمور اور اباخاقان نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر منجو تیمور بولا۔ ''بقلو خان! ان بکریوں کو ابھی ذبح کر ڈالو۔ ان کے چارے کی ذمے داری ہم نہیں لے سکتے۔''

ادھر اباخاقان کی نظریں نفیسہ کے حسن سے الجھی ہوئی تھیں۔

(جاری ہے)

ماخذات: خوارزم شاہ۔ حماریہ کا مجاہد۔ سلطانِ مصر۔ تاتاری یلغار

ڈراپ سین

سیدہ شاہدہ شاہ

نیکی ہو یا بدی... ہمیشہ انسان کے انجام تک اس کا تعاقب کرتی ہیں... اس نے بھی وہی کاٹا جو بویا تھا... البتہ کسی کی دعاؤں نے اسے گہری کھائی میں گرنے سے بچالیا... اور اس کی بدی کے حوالے سے وصونیابی زیادہ تکلیف دہ ثابت نہ ہوئی... کیونکہ اس نے دعا کرنے والے لوگوں کے خلوص کو پہچان لیا... جبکہ مخالفین تو اس کی کشتی کو بھنور میں ڈال کر بھول چکے تھے۔

قربت کا ڈھونگ رچانے والے دشمنوں کے اصل چہرے

سیٹھ تنویر کا اغوا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ جہلم شہر تو کیا، پورے ملک کی نامی گرامی شخصیت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پوری سرکاری مشینری ہل کر رہ گئی تھی۔ ایوانِ اقتدار میں ہلچل مچ گئی تھی۔ کیا حکومتی ارکان اور کیا اپوزیشن والے، تمام کے تمام سیٹھ تنویر کے اغوا پر نہ صرف افسردہ تھے بلکہ ان کی بہ خیریت بازیابی کے لیے صدقِ دل سے دعا گو تھے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لا رہے تھے۔ اپنے تمام تر وسائل

استعمال کر رہے تھے مگر لاحاصل۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سیٹھ تنویر کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ کہیں سے کوئی بھی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

اچھے بھلے صبح کو ہشاش بشاش اٹھے۔ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر ناشتا کیا اور معمول کے مطابق آفس جانے کے لیے تیار ہونے لگے۔ ڈرائیور شفیق احمد نے کوٹھی کے سامنے گاڑی کھڑی کر دی تھی اور اپنے صاحب کا منتظر تھا۔ وقتِ مقررہ پر سیٹھ تنویر ہاتھ میں بریف کیس لیے کوٹھی سے باہر نکلے۔ ڈرائیور نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے بریف کیس لیا۔ ان کے لیے دروازہ کھولا اور جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئے تو ڈرائیور نے ان کی سائڈ کا دروازہ بند کیا پھر دوسری سائڈ سے آ کر بریف کیس پچھلی سیٹ پر رکھا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے چل پڑا۔

سیٹھ تنویر کا دفتر ان کی کوٹھی سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ وہ عموماً ساڑھے نو بجے آفس پہنچ جایا کرتے تھے۔ آفس پہنچتے ہی وہ معمول کے مطابق اپنی بیگم عنبرین کو خیریت سے پہنچنے کی اطلاع کرتے پھر اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہو جاتے مگر اس روز جب دن کے گیارہ بجے تک انہوں نے نہ تو عنبرین کو فون کر کے اپنے پہنچنے کی اطلاع کی اور نہ ہی آفس پہنچے تو نہ صرف عنبرین کو فکر لاحق ہو گئی بلکہ آفس والے بھی پریشان ہو گئے کیونکہ اس روز ساڑھے گیارہ بجے ان کی ایک پارٹی سے کاروباری میٹنگ طے تھی۔ سیٹھ تنویر وقت اور اصولوں کے انتہائی پابند تھے۔ وقت پر آفس پہنچنا، وقت پر آفس سے چھٹی کرنا، وقت پر سارے کاروباری امور نمٹانا وغیرہ۔ جس روز ان کی کوئی کاروباری یا دیگر میٹنگ ہوتی، وہ ہمیشہ وقت سے دس پندرہ منٹ پہلے پہنچ جاتے۔ وہ صرف دفتری اوقات اور کاروباری امور میں ہی وقت کے پابند نہ تھے بلکہ اپنی نجی زندگی اور نجی محفلوں میں بھی انتہائی نظم وضبط اور وقت کے پابند تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز جب گیارہ بج گئے تو نہ صرف ان کی بیگم عنبرین پریشان ہو گئی تھیں بلکہ آفس والوں کو بھی اچنبھا ہوا تھا۔ یہ خیال کیا جا سکتا تھا ہو سکتا ہے کہ راستے میں گاڑی خراب ہو گئی ہو یا کوئی ضروری کام نکل آیا ہو مگر ہر دو صورتوں میں سیٹھ تنویر فون کر کے اپنی بیگم اور آفس والوں کو اس تاخیر کا سبب بتا سکتے تھے جبکہ ان کا اور ڈرائیور کا سیل فون مسلسل بند مل رہے تھے۔ بالآخر ان کے منیجر انعام الحق نے سیٹھ تنویر اور ان کے ڈرائیور کے پُراسرار اغوا کی رپورٹ درج کرا دی۔

☆☆☆

سب انسپکٹر عارف محمود وہ پولیس اہلکار تھا جو اپنے سینئرز کی نظروں میں ہمیشہ معتوب رہا۔ اس کے ساتھی ترقی کر کے کہیں کے کہیں پہنچ چکے تھے مگر وہ اب بھی سب انسپکٹر کا سب انسپکٹر ہی تھا۔ کسی بھی تھانے میں وہ زیادہ عرصے تک ٹک نہیں پاتا تھا۔ اسے سزا کے طور پر کئی بار ایسے ایسے دشوار گزار اور دور دراز علاقوں میں بھی تعینات کیا گیا تھا جسے ڈیپارٹمنٹ کی زبان میں ''کالا پانی'' کہا جاتا تھا مگر اس کا رویہ، اس کی عادات بالکل بھی نہ بدل پائیں۔ اگر وہ پولیس کے محکمے میں ابھی تک ٹکا ہوا تھا تو صرف اور صرف اپنی اس اکلوتی خوبی کی وجہ سے کہ اسے جو بھی کیس دیا جاتا، وہ اس کیس میں یوں جت جاتا کہ دن دیکھتا نہ رات۔ نہ کھانے کی پروا، نہ آرام کی طلب۔ وہ جب تک اس کیس کو حل نہ کر لیتا، چین سے نہ بیٹھتا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے ماتحتوں کا سکون اور چین بھی برباد کیے رکھتا۔ اگر کسی ملزم کے بارے میں اسے یقین ہو جاتا کہ یہ ملزم نہیں، مجرم ہے تو پھر وہ اسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے سخت سے سخت سزا دلانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ دلوں میں کتنی بھی کدورتیں، بغض اور عناد کیوں نہ ہو پھر بھی جب بھی کوئی پیچیدہ سے پیچیدہ کیس آتا، سب انسپکٹر عارف محمود جہاں بھی ہوتا، جس تھانے یا ڈیپارٹمنٹ میں ہوتا، اسے وہاں سے عارضی طور پر ہٹا کر واپس بلا لیا جاتا اور وہ پیچیدہ اور لاینحل کیس اسے سونپ دیا جاتا۔ ان دنوں بھی وہ پولیس کے سی آئی ڈی ڈیپارٹمنٹ جسے عرفِ عام میں خفیہ پولیس کہا جاتا ہے، میں کام کر رہا تھا۔

ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر نے ذاتی طور پر اسے اپنے آفس بلا کر یہ کیس اس کے سپرد کر دیا کیونکہ دو ہفتے گزر جانے کے باوجود سیٹھ تنویر کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اغوا کرنے والوں نے اس دوران دو بار رابطہ کیا تھا اور سیٹھ تنویر کی رہائی کے لیے بھاری تاوان طلب کیا تھا۔ دونوں بار کال ٹریس کرنے کی کوشش کی گئی مگر دونوں بار ہی پولیس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا کیونکہ دونوں بار یہ کال ایسے جدید ترین صوتی آلے سے کی گئی تھی جسے پولیس کے ڈیٹیکٹیو (سراغ لگانے والے) آلات ٹریس نہیں کر پائے۔ اغوا کرنے والوں نے دونوں بار تاوان کا صرف مطالبہ ہی کیا تھا مگر رقم کس طرح اور کہاں پہنچانی ہے؟ ابھی تک نہیں بتایا تھا۔

آئی جی صاحب کی ہدایت پر انسپکٹر عارف محمود کو آفس بلا کر سیٹھ تنویر کے کیس کی فائل اور دیگر تمام تر

تفصیلات دے دی گئیں اور انسپکٹر عارف محمود فائل و دیگر تمام تفصیلات جو اس نے رف پیڈ پر نوٹ کرلی تھیں، لے کر واپس اپنے ڈیپارٹمنٹ میں چلا آیا۔

اپنے آفس میں بیٹھتے ہی اس نے ایک سپاہی کو بھیج کر چائے منگوائی اور فائل کا بغور مطالعہ کرنے لگا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر گہری سلوٹیں تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ چائے کی چسکیاں بھی لے رہا تھا۔ رف پیڈ پر لکھی گئی تمام تفصیلات اور فائل کو وہ دو تین بار پڑھ چکا تھا مگر ابھی تک وہ مکمل اندھیرے میں تھا۔ کہیں بھی کوئی سرا ہاتھ نہیں لگ رہا تھا جس کو پکڑ کر وہ سیٹھ تنویر کو اغوا کرنے والوں تک پہنچ سکے۔ اس نے فائل بند کی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں اور گہری سوچ میں کھو گیا۔ اس کے دماغ میں پورا کیس اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ کافی دیر سوچ بچار کے بعد اس نے سیٹھ تنویر کے آفس کے عملے اور ان کی بیگم عنبرین سے ذاتی طور پر ملنے کا فیصلہ کرلیا تاکہ اسے کوئی ایسا کلیو مل جائے جس کی مدد سے وہ سیٹھ تنویر کا سراغ لگا سکے۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے بیل بجا کر اپنے ماتحت عملے کو بلایا اور ان میں سے دس ایسے اہلکاروں کا انتخاب کیا جو انتہائی ذہین، فرض شناس اور اپنی ڈیوٹی کو اپنا ایمان سمجھ کر سرانجام دینے والے تھے پھر وہ منتخب شدہ اہلکاروں کو مختلف ڈیوٹیاں سونپنے لگا۔

اسی دوران ایک عجیب واقعہ ہوگیا۔ سیٹھ تنویر کے اغوا کے ٹھیک بیس روز بعد ان کا ڈرائیور شفیق احمد مع کار واپس آگیا۔ انسپکٹر عارف محمود کو جیسے ہی خبر ملی، وہ اپنے منتخب کردہ ماتحت نوید کے ساتھ سیٹھ تنویر کی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ چونکہ وہ دونوں سول کپڑوں میں تھے اس لیے گیٹ پر پہنچ کر انسپکٹر عارف محمود نے اپنا تعارف کرایا اور انہیں اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

☆☆☆

عنبرین اور سیٹھ تنویر آپس میں کزن تھے۔ دونوں کا شمار ان خوش قسمت لوگوں میں ہوتا تھا جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ دونوں کا خاندان ملک کا مشہور و معروف خاندان تھا۔ ان کے آباؤ اجداد ان گنت لوگوں کی طرح 1947ء میں متحدہ ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان نہیں آئے تھے اور نہ ہی ان کے خاندان میں سے کسی نے راہِ ہجرت میں جانوں کی قربانی دی تھی۔ ان کی ہندوستان میں کسی قسم کی کوئی جائداد وغیرہ بھی نہیں تھی کہ پاکستان بنتے وقت وہ پرکھوں سے پاکستان میں ہی آباد تھے

اس کے باوجود پاکستان بنتے ہی انہوں نے دیگر لوگوں کی طرح جعلی کلیم داخل کرواکے کروڑوں کی جائداد اپنے نام کروالی تھی۔ اس وقت پاکستان ابھی بالکل نوزائیدہ تھا۔ محکمے بھی ابھی پوری طرح فعال نہیں ہوئے تھے اس لیے چیک اینڈ بیلنس کا نظام ابھی نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے عنبرین اور تنویر کے اسلاف نے دیگر عیار لوگوں کی طرح اس نوزائیدہ مملکت کو خوب جی بھر کر دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے کاروبار پر قبضہ کرکے ان کے بنے بنائے کاروبار پر قابض ہوکر سیٹھ بن گئے اور جو بے چارے راہِ ہجرت میں اپنے عزیز و اقارب شہید کروا کر، لاکھوں کروڑوں کی جائدادیں، مال مویشی، زمینیں چھوڑ کر، خون کے دریا عبور کرکے، لٹ لٹا کر پاکستان پہنچے، وہ سفارش اور رشوت نہ ہونے کے باعث نہ کلیم کرواسکے اور نہ ہی انہیں رہنے کے لیے کوئی دو کمرے کا ہی مکان مل سکا۔ یوں وہ تنگ و تاریک گلیوں میں کرائے کے مکانوں میں اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں گمنامی کی موت مرگئے۔

عنبرین اور سیٹھ تنویر کے آباؤ اجداد کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا تھا جو تقسیم ہند سے قبل بھی پاکستان میں نسل در نسل آباد تھے اور پاکستان بننے کے بعد بھی وہ پاکستان میں ہی رہے۔ پاکستان بننے سے قبل وہ جہلم کے ایک دور افتادہ اور بنیادی سہولیات سے محروم گاؤں میں آباد تھے۔ گزارے کے لیے تھوڑی سی بارانی زمین تھی جو بہ مشکل اتنا اناج دے پاتی کہ چند ماہ گزارہ ہوجاتا۔ اس کے بعد اس خاندان کے مرد حضرات جہلم شہر آجاتے اور محنت مزدوری کرکے اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالتے لیکن پاکستان بنتے ہی ان کے دن پھر گئے۔ یہ خاندان تیز طرار اور چرب زبان تھا چنانچہ ان میں سے بہت سے مرد مختلف بڑے شہروں میں نکل گئے اور صاحبانِ اختیار و اقتدار کو اپنی چرب زبانی اور جھوٹی سچی دردناک کہانیوں سے ایسا موم دل بنایا کہ ہر بڑے شہر میں نہ صرف ہندوؤں کے بڑے بڑے مکانات اپنے نام الاٹ کروانے میں کامیاب ہوگئے بلکہ ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے کاروبار پر قبضہ جمالیا۔ یوں وہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں اچھی خاصی جائداد اور کاروبار کے مالک بن گئے۔ صاحب جائداد اور کاروبار بنتے ہی انہوں نے جہلم کے پسماندہ گاؤں میں اپنی زمین اور مکانات وغیرہ بیچے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ لاہور، راولپنڈی، کراچی اور دیگر بڑے شہروں میں آباد ہوگئے۔ معاشی حالات سدھرتے ہی ان کو نہ جانے کیسے سیاست میں آنے کا

شوق چرایا اور وہ سیاست میں آ گئے۔ سیاست میں آ کر انہوں نے بھانپ لیا کہ سیاست وہ منافع بخش کاروبار ہے جس میں نہ تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی عمر کی۔ بس آدمی کو جھوٹ بولنے کا فن آتا ہو، سبز باغ دکھانے میں ماہر ہو اور مخالفین کے لتے لینا خوب جانتا ہو۔

سیٹھ تنویر اور عنبرین کی شادی اگرچہ ان کے بڑوں کی باہمی رضامندی سے طے ہوئی تھی تاہم ان دونوں کی آپس میں شدید اور ''لیلیٰ مجنوں'' والی محبت کے باعث اسے محبت کی شادی بھی کہا جا سکتا تھا۔ دونوں کی عمریں چالیس سے اوپر تھیں۔ تین جواں سالہ بچوں کے ماں باپ تھے۔ اس کے باوجود ان کی محبت، ان کا پیار روزِ اول کی طرح جوان تھا۔ وہ آج بھی اپنی ازدواجی زندگی کے بائیس سال گزرنے کے باوجود پہلے دن کی طرح ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے سعید کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ وہ بھی ایک بچے کا باپ تھا۔ اس سے چھوٹی بیٹی نغمہ کی بھی شادی ہو چکی تھی جبکہ ان کی آخری اولاد جمیل کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی جب سیٹھ تنویر کے پراسرار اغوا کا واقعہ پیش آیا۔

یہ وہ ساری معلومات تھیں جو انسپکٹر عارف محمود نے اپنی منتخب کردہ ٹیم کی وساطت سے سیٹھ تنویر کے اغوا کا کیس سنبھالتے ہی معلوم کر لی تھیں اور اب وہ مزید پوچھ گچھ کے لیے سیٹھ تنویر کی کوٹھی پر آیا تھا۔

سیٹھ تنویر کی کوٹھی کے گیٹ پر اس کے تعارف کرواتے ہی اسے اور اس کے ماتحت کو بڑے احترام کے ساتھ ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازمہ کھانے پینے کی اشیا سے لدی پھندی ٹرالی لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور بڑے سلیقے سے ٹیبل پر اشیا سجانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوش پوش خاتون بڑے باوقار انداز میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر اگرچہ پریشانی اور گہرے دکھ کے سائے ہویدا تھے مگر اس کے انداز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ انسپکٹر عارف محمود اور اس کا ماتحت بے اختیار اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ باوقار خاتون سیٹھ تنویر کی بیوی عنبرین ہے۔ عنبرین نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ملازمہ کھانے پینے کی اشیا میز پر سجا چکی تھی۔ عنبرین نے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا اور بڑی شائستگی سے انسپکٹر عارف محمود اور اس کے ماتحت کو دعوتِ لذتِ کام و دہن دی۔

ابھی انسپکٹر عارف محمود اور اس کے ماتحت نے کھانے پینے کی اشیا کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک کوٹھی میں ہاہاکار مچ گئی۔ عنبرین صورتِ حال جاننے کے لیے تیزی سے باہر نکلی جبکہ انسپکٹر عارف محمود کی کشادہ پیشانی پر سلوٹوں کا جال اور آنکھوں میں گہری سوچ بچار کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ اس نے کھانے پینے کی اشیا کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں عنبرین ایک ادھیڑ عمر مرد کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ وفورِ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ ''انسپکٹر عارف!'' اس نے خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ کا کوٹھی میں آنا انتہائی مبارک ثابت ہوا ہے۔ دیکھیے تنویر صاحب بالکل ٹھیک ٹھاک اور بہ خیریت واپس آ گئے ہیں۔''

''کیا!'' انسپکٹر عارف محمود کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ مارے حیرت کے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ماتحت بھی میکانکی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''آپ لوگ تشریف رکھیے۔'' سیٹھ تنویر نے انتہائی سنجیدگی سے انسپکٹر عارف اور اس کے ماتحت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور پھر تھکے تھکے سے انداز میں دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ عنبرین بھی اس کے پہلو میں بیٹھ گئی اور بڑی محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگی۔

انسپکٹر عارف بڑے غور سے سیٹھ تنویر کا جائزہ لے رہا تھا۔ بیالیس تینتالیس سال کا ہونے کے باوجود وہ چہرے مہرے سے بالکل نوجوان لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک، اس کی ذہانت کی غمازی کر رہی تھی۔ ایک چیز جو انسپکٹر عارف کو الجھا رہی تھی، وہ یہ تھی کہ باوجود دو ہفتے سے زائد اغوا ہونے کے، سیٹھ تنویر نے جو سوٹ پہنا ہوا تھا، وہ بے شکن اور صاف ستھرا تھا۔ اغوا کنندگان اپنے شکار کو اتنے آرام دہ ماحول میں نہیں رکھتے کہ ان کے کپڑوں پر شکن تک نہ پڑے اور نہ ہی وہ کچھ لیے دیے بغیر یوں آرام سے رہا کر دیتے ہیں۔ یہ ایسی باتیں تھیں جو انسپکٹر عارف کو ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔

''اغوا کرنے والوں نے سیٹھ صاحب کو آج رہا کر دیا تھا اور وہ جیسے ہی ٹیکسی میں گھر پہنچے، میں انہیں سیدھا آپ کے پاس لے آئی تاکہ آپ ان سے ضروری پوچھ گچھ کر لیں۔'' عنبرین انسپکٹر عارف کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

ابھی سیٹھ تنویر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ

انسپکٹر عارف نے کہا۔ ''بیگم صاحبہ! اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ڈرائیور کو بھی بلالیں تاکہ میں دونوں سے ایک ہی وقت میں گفتگو کرلوں۔ اس طرح آپ لوگوں کا وقت بھی ضائع نہیں ہوگا اور مجھے بھی سہولت ہوجائے گی۔''

انسپکٹر عارف کی بات ختم ہوتے ہی عنبرین نے ملازمہ کو بھیج کر ڈرائیور شفیق کو بھی ڈرائنگ روم میں بلالیا۔

انسپکٹر عارف اور اس کا ماتحت تیز اور گہری نظروں سے سیٹھ تنویر اور ڈرائیور شفیق کا جائزہ لے رہے تھے۔ انسپکٹر عارف نے محسوس کیا کہ اس کی کھوجنے والی نظروں سے سیٹھ تنویر بے چینی اور اضطراب سے صوفے پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدل رہے تھے۔ انسپکٹر عارف نے اس اضطراب کو بھانپ لیا اور ذہن میں محفوظ کرلیا مگر منہ سے کچھ نہ بولا پھر اس نے سیٹھ تنویر اور ڈرائیور سے سوال جواب کا سلسلہ شروع کردیا۔ بیچ بیچ میں اس کا ماتحت بھی سوالات کرتا جاتا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے تک وہ سوال جواب کرتے رہے پھر چائے پی کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ جاتے جاتے انسپکٹر عارف نے سیٹھ تنویر سے کہا کہ وہ ان سے ایک دو تفصیلی ملاقات کے لیے ان کے آفس میں جلد ہی حاضر ہوگا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے اپنے ماتحت نوید سے پوچھا۔ ''کیوں برخوردار! کیا کہتے ہو تم اس سلسلے میں؟''

''سر!'' نوید نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو یہ بڑا عجیب اور پیچیدہ سا کیس لگ رہا ہے۔ سیٹھ تنویر کا ڈرائیور سمیت پراسرار اغوا، دو ہفتے تک ان کا غیاب، اغوا کرنے والوں کا تاوان طلب کرنا پھر بغیر تاوان لیے انہیں یوں چھوڑ دینا کہ انہیں خراش تک نہیں آئی۔ کیا یہ سب کچھ عجیب سا نہیں لگ رہا؟'' اس کے ماتحت نوید کا لہجہ ظاہر کررہا تھا جیسے وہ بری طرح الجھا ہوا ہے۔

''برخوردار!'' انسپکٹر عارف اس کا شانہ تھپکتے ہوئے بڑی بھید بھری مسکراہٹ سے بولا۔ ''میرے ساتھ رہو گے تو دیکھنا میں اس کیس کو کیسے اور کتنی جلدی سلجھاتا ہوں۔ بس مجھے اپنی دو چار الجھنیں سلجھا لینے دو۔''

نوید اپنے سینئر آفیسر کی ہسٹری سے واقف تھا اس لیے اس نے مزید کوئی سوال نہ کیا اور بس دیکھ کر رہ گیا۔

واپس آفس پہنچ کر اس نے اپنے تمام منتخب کردہ ماتحتوں کو بلایا اور ان سے ایک بھرپور میٹنگ کرتے ہوئے انہیں مختلف ڈیوٹیاں سونپ دیں۔ یہ ماتحت اس کے منتخب کردہ تھے اس لیے اسے ان پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے اپنے منصوبے کی تمام تر جزئیات اس امید پر بتادیں کہ وہ اس منصوبے کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے قبل اسے مکمل طور پر اپنے سینے میں دفن رکھیں گے۔

انسپکٹر عارف اور اس کے ماتحت پورا ہفتہ دن رات مصروف رہے اور جو جو ٹارگٹ اور کام انہیں سونپا گیا تھا، وہ اسے مکمل کرچکے تھے۔ جب انسپکٹر عارف کو اس کے ماتحتوں نے ''سب اچھا'' کی رپورٹ دے دی تو آٹھویں دن وہ اپنے ماتحتوں نوید اور اختر کے ساتھ سیٹھ تنویر کے آفس میں پہنچ گیا۔ اپنے باقی ماتحتوں کو بھی اس نے مختلف ذمے داریاں سونپ دی تھیں جو انہیں انتہائی مختصر وقت میں مکمل کرنا تھیں۔

جب انسپکٹر عارف اور اس کے ماتحت وہاں پہنچے تو سیٹھ تنویر کے آفس میں اس وقت ایک میٹنگ چل رہی تھی اس لیے سیٹھ تنویر کی سیکریٹری فرزانہ نے انہیں انتظار گاہ میں بٹھایا اور ان کے لیے مشروب بھجوا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ وہ وقت گزاری کے لیے مشروب سے دل بہلاتے رہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد میٹنگ ختم ہوگئی تو سیکریٹری فرزانہ نے انہیں آفس میں بھجوادیا۔

سیٹھ تنویر کی نظر جیسے ہی انسپکٹر عارف اور اس کے ماتحتوں پر پڑی، اس کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے متغیر ہوا پھر فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھا اور انتہائی پُرتپاک انداز میں ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے انہیں آفس سے ملحقہ ملاقات والے کمرے میں لے آیا۔ ساتھ ہی اس نے انٹرکام پر آفس سیکریٹری فرزانہ کو بتایا کہ وہ ایک ضروری میٹنگ میں مصروف ہے اس لیے کسی بھی ملاقاتی کو آفس میں نہ بھیجے۔ اس کے بعد باوجود انسپکٹر عارف کے منع کرنے کے، اس نے پُرتکلف چائے اور دوسرے لوازمات منگوالیے۔

انسپکٹر عارف اور نوید سے یہ اس کی دوسری ملاقات تھی اس لیے اس نے انہیں پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا مگر اختر اس کے لیے نیا تھا۔ چائے پینے اور دیگر اشیائے خورونوش سے انصاف کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان ہلکی پھلکی اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

چائے پینے کے بعد جب آفس بوائے تمام برتن وغیرہ اٹھا کر لے گیا تو سیٹھ تنویر نے ''آمدم برسر مطلب'' کے مصداق انسپکٹر عارف کی طرف دیکھتے ہوئے استفسارانہ لہجے میں کہا۔ ''کہیے انسپکٹر صاحب! کیسے زحمت گوارا کی؟''

انسپکٹر عارف نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ''بس، ادھر سے گزر رہے تھے تو سوچا

آپ سے بھی ملتے چلیں۔ ویسے بھی میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا نا پچھلی ملاقات میں کہ مجھے آپ سے ایک دو مزید ملاقاتیں آپ کے آفس میں کرنا پڑیں گی۔''

''جی، جی۔ مجھے یاد ہے۔'' سیٹھ تنویر نے بظاہر بڑی خندہ پیشانی سے جواب دیا مگر اس کی اضطرابی کیفیت انسپکٹر عارف کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔

''سیٹھ صاحب!'' انسپکٹر عارف نے سیٹھ تنویر کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''کیا یہ عجیب سی بات نہیں ہے کہ آپ کو اغوا کرنے والوں نے آپ کو اور ڈرائیور کو اغوا کیا، بیس پچیس دنوں تک اپنے پاس رکھا، آپ کی بیگم سے دو بار تاوان طلب کیا اور آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا پھر اتنے دنوں کے بعد آپ کو بغیر تاوان لیے بڑی عزت سے رہا کر دیا۔ آخر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا؟''

''انسپکٹر صاحب!'' سیٹھ تنویر نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''جب ہماری کوٹھی پر آپ سے پہلی ملاقات ہوئی تھی تو میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اغوا کرنے والوں نے مجھے اور ڈرائیور کو کسی غلط فہمی کی بنا پر اغوا کیا تھا پھر جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔ بس، اتنی سی بات تھی جو آپ میرے بتانے کے باوجود بھول گئے۔''

''سیٹھ صاحب!'' انسپکٹر عارف نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میری یادداشت اللہ کے فضل و کرم سے بڑی اچھی ہے۔ میں جو بات ایک بار سن لیتا ہوں، اسے کافی عرصے تک بھولتا نہیں ہوں۔ البتہ آپ کچھ بھول رہے ہیں۔''

''میں کیا بھول رہا ہوں؟'' سیٹھ تنویر تیکھے لہجے میں بولا۔

انسپکٹر عارف چند لمحے سیٹھ تنویر کو پُرخیال نظروں سے دیکھتا رہا پھر بڑے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کے اغوا ہونے کے دوران آپ کے اکاؤنٹ سے دو بار دو دو کروڑ کی رقوم نکلوائی گئی ہے اور بینک والوں کے بیان کے مطابق دونوں بار آپ خود کسی اجنبی ڈرائیور کے ساتھ... یہ رقم لینے آئے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

سیٹھ تنویر کے چہرے پر یکلخت سرسوں چھا گئی اور اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ انسپکٹر عارف باتیں کرنے کے دوران بار بار اپنا موبائل بھی چیک کر رہا تھا۔ دراصل وہ اپنے ماتحتوں سے بذریعہ ایس ایم ایس رپورٹس بھی لے رہا تھا جن کو وہ یہاں آنے سے قبل مختلف ٹاسک دے کر آیا تھا۔ کچھ رپورٹس آ چکی تھیں اور کچھ ابھی آنا باقی تھیں۔ تمام ماتحت صرف ایک لفظی رپورٹ دے رہے تھے اور وہ لفظ تھا ''ڈن۔''

''انسپکٹر صاحب!'' کچھ دیر توقف کرنے کے بعد سیٹھ تنویر جب بولا تو اس کے لہجے میں ایک شکستگی سی تھی۔ ''اس کیس میں بہت سی ایسی تلخ سچائیاں ہیں جو اگر منظرِ عام پر آگئیں تو میری ہنستی مسکراتی پُرسکون زندگی میں ایک بھونچال آجائے گا۔ آپ اپنے دونوں ماتحتوں کو باہر بھیج دیں اور تنہائی میں میری چند گزارشات سن لیں۔''

''سیٹھ صاحب!'' انسپکٹر عارف مضبوط اور اٹل لہجے میں بولا۔ ''میرے یہ دونوں ماتحت میرے دست و بازو ہیں۔ آپ نے جو کچھ کہنا ہے، ان کے سامنے ہی کہیں۔ یہ کہیں نہیں جائیں گے۔''

''تو پھر مجھ سے ایک سودا کرلیں۔'' سیٹھ تنویر آزردگی سے بولا۔ ''آپ اور آپ کے دونوں ماتحت مجھ سے سادہ چیک لے لیں۔ میں ان پر دستخط کر دیتا ہوں۔ آپ تینوں اپنی مرضی کی رقم ان خالی چیکس پر بھر لیں اور اس کیس کو ختم کر دیں۔ یقین کریں کہ یہ کیس اگر اوپن ہو گیا تو میں دنیا تو کیا، اپنے بیوی بچوں کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔''

انسپکٹر عارف محمود کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا ورنہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر سیٹھ تنویر کا چہرہ تھپڑ مار مار کر لال سرخ کر دے۔

''سیٹھ تنویر!'' انسپکٹر عارف نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں انسپکٹر ہوں ذرا وکھری ٹائپ کا۔ میں چاہوں تو ابھی آپ کو رشوت دینے کے الزام میں گرفتار کر سکتا ہوں تاہم آپ ساری کہانی مجھے بالکل سچ سچ بتا دیں۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ آپ سے متعلق جڑی ہوئی ہر اس حقیقت پر پردہ ڈال دوں گا جس سے آپ کی زندگی متاثر ہونے کا خطرہ ہوگا۔ کہانی سنانے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ میں آپ کی کہانی کے تقریباً ستر فیصد حقائق سے مکمل طور پر باخبر ہو چکا ہوں۔ باقی کہانی کے تیس فیصد حقائق مجھے آپ بالکل سچ سچ بتائیں گے۔''

''یہ تقریباً ایک سال پہلے کی بات ہے۔'' سیٹھ تنویر نے اپنی کہانی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک غیر ملکی فرم کے ساتھ میٹنگ اور ان کے ساتھ کامیاب ڈیل کی خوشی میں ہماری فرم کی طرف سے ایک پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ یہ پارٹی ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں تھی۔ چونکہ یہ ایک غیر ملکی فرم تھی اور اس کے نمائندوں کی اکثریت غیر مسلم تھی اس لیے

ان کے لیے شراب وغیرہ کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔ اسی پارٹی میں مجھے بھی کسی مشروب کی آڑ میں شراب پلادی گئی۔ میرے لیے زندگی میں شراب پینے کا یہ پہلا موقع تھا اس لیے نہ مجھے اس کی بو کا احساس ہوا اور نہ ہی ذائقے کا۔ چنانچہ نشے میں، میں کیا کچھ کرتا رہا اور مجھ سے کیا کچھ حرکات سرزد ہوتی رہیں، مجھے مطلق خبر نہ ہوئی البتہ اس سنگین صورتِ حال کا مجھے تیسرے روز احساس ہوا جب میرے موبائل فون پر میری چند قابلِ اعتراض اور شرمناک تصاویر موصول ہوئیں۔ یہ بے ہودہ تصاویر ایسی تھیں جو اگر منظرِ عام پر آجاتیں تو نہ صرف میں اپنے بیوی بچوں کی نظروں میں گر جاتا بلکہ ساری دنیا مجھ پر تھوتھو کرتی اور میرے پاس سوائے خودکشی کرنے کے اور کوئی چارہ نہ رہتا۔ میں ابھی ان شرمناک تصاویر کی وجہ سے پریشان بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے اسی گمنام فون نمبر سے جس نمبر سے مجھے تصاویر بھیجی گئی تھیں، فون موصول ہوا۔ آواز نسوانی تھی۔ اس نے بڑے بے باک لہجے میں تصاویر کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے یہ شرط پیش کی کہ میں ہر ہفتے اسے اسی ہوٹل میں ملا کروں۔ اس نے واضح طور پر مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس سلسلے میں کسی کو بھی ملوث کرنے کی کوشش کی تو وہ میری تمام تصاویر اور ویڈیو سوشل میڈیا پر اپ لوڈ کردے گی۔ یوں میں مجبور ہوگیا اور ہر ہفتے ہوٹل میں جانے لگا۔ یہ سلسلہ تقریباً سال بھر چلا۔ اس دوران ہوٹل میں مجھے کسی مشروب میں نشہ آور چیز پلادی جاتی جس کے بعد میں حیوان بن جاتا اور میرے ساتھ شامل کسی کا چہرہ ویڈیو میں نہیں ہوتا تھا۔ تقریباً ایک سال بعد انہوں نے مجھ سے پہلی بار چار کروڑ مانگے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اپنے اکاؤنٹ سے یکمشت چار کروڑ کیسے نکالوں کیونکہ اگر عنبرین یا کسی اور کو خبر ہوجاتی کہ میں نے چار کروڑ روپے بغیر کسی کاروبار میں لگانے کے، بلاوجہ نکالے ہیں تو جواب دہی مشکل ہوجاتی۔ چنانچہ میں نے اپنے اغوا کا جھوٹا ڈراما رچانے کے لیے اپنے ڈرائیور کو اعتماد میں لیا۔ ہم نے دو ہفتے ایک گمنام سے ہوٹل میں گزارے اور پھر وقفے وقفے سے دو دو کروڑ بینک سے نکال کر مطلوبہ بندے تک پہنچادیے اس کے بعد منصوبے کے مطابق میں نے پہلے ڈرائیور کو بھیجا پھر خود آگیا۔ باقی کی کہانی آپ کے سامنے ہے۔''

سیٹھ تنویر اپنی کہانی سنا کر خاموش ہوچکا تھا اور اب انسپکٹر عارف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر عارف، سیٹھ تنویر کی کہانی سنتے ہوئے بھی موبائل فون کی طرف متوجہ تھا۔ اس کے فون پر اس کے آخری ماتحت کی طرف سے ''ڈن'' کا میسیج عین اس وقت آیا جب سیٹھ تنویر اپنی کہانی سنا کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک انسپکٹر عارف کے منہ سے ایک قہقہہ بلند ہوا اور سیٹھ تنویر چونک کر اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا جبکہ انسپکٹر عارف کے ماتحت بھی حیرت سے اپنے باس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''سیٹھ صاحب! ماشاء اللہ آپ نہ صرف کہانیاں بڑی اچھی طرح گھڑ لیتے ہیں بلکہ ایکٹر بھی کمال کے ہیں۔'' انسپکٹر عارف نے طنزیہ انداز میں سیٹھ تنویر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ میرے ساتھ بالکل سچی باتیں کریں گے مگر آپ کی کہانی میں بہت زیادہ سقم ہیں جو آپ کی کہانی کو جھوٹا ثابت کررہے ہیں۔''

''تو پھر آپ کے خیال میں سچ کیا ہے؟'' سیٹھ تنویر نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

''سچ ابھی آپ کے سامنے آجائے گا اور سچی کہانی سنانے والا بھی.....'' انسپکٹر عارف نے اسرار بھری مسکراہٹ سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے موبائل فون پر ایک نمبر ڈائل کیا۔ نمبر ملتے ہی اس نے صرف ایک لفظ کہا۔ ''لے آؤ۔'' اس کے بعد موبائل فون بند کردیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازہ کھلا اور سیٹھ تنویر کی پرسنل سیکریٹری فرزانہ اندر داخل ہوئی مگر اس حالت میں کہ اس کے ساتھ دو لیڈی پولیس اہلکار جو عہدے کے لحاظ سے سب انسپکٹر اور اسسٹنٹ سب انسپکٹر تھیں اور ان کے پیچھے سادہ کپڑوں میں انسپکٹر عارف کے ماتحت تھے۔

''جی سیٹھ تنویر صاحب سچ بھی سامنے آگیا ہے اور سچی کہانیاں سنانے والا بھی۔ اب کہیے کیا کہتے ہیں آپ؟'' انسپکٹر عارف نے مسکراتے ہوئے سیٹھ تنویر سے پوچھا۔ سیٹھ تنویر کا تو اپنی سیکریٹری فرزانہ کو پولیس کی حراست میں دیکھتے ہی رنگ فق ہوگیا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کا کھیل ختم ہوگیا ہے مگر آدمی کائیاں اور شاطر تھا چنانچہ اس نے ایک بار پھر انسپکٹر عارف کو جھوٹی سچی کہانی سنا کر گمراہ کرنے کی کوشش کی تو انسپکٹر عارف نے اسے ہاتھ اٹھا کر مزید بولنے سے روک دیا۔

''سیٹھ صاحب! میرا خیال ہے کہ آپ کو میری یہ مخلصانہ پیشکش منظور نہیں جو میں نے آپ کو کی تھی کہ اگر آپ سچ بولیں گے تو میں آپ کی ذات سے منسوب آپ کی تمام لغزشوں کو چھپالوں گا۔ بہرحال اب سچ مجھ سے سن لیجیے۔ سیٹھ صاحب! کہانی تو بہت لمبی اور پرانی ہے مگر میں اس کہانی کو انتہائی اختصار سے سنانے کی کوشش کروں گا۔ آپ

کا خاندان، آپ کے آبا وَ اجداد قیامِ پاکستان کے وقت ہی اپنی ''ذہانت'' کی بدولت نہ صرف کاروبار بلکہ سیاست میں آ چکے تھے۔ کس طرح آئے، اس قصے کو چھوڑیئے۔ بہر حال گزرتے سالوں اور بدلتی ہوئی حکومتوں کے ساتھ ساتھ آپ کا خاندان مالی اور سیاسی مفادات سمیٹتے ہوئے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتے رہے۔ آپ کے خاندان کی دولت کسی دوسرے خاندان میں نہ جائے، یہی سوچ کر آپ کے خاندان میں یہ رواج بن گیا کہ اپنی اولادوں کی شادیاں اپنے ہی خاندان میں کی جائیں تاکہ دولت کی بہتات کے ساتھ ساتھ آپس میں رشتے داریاں بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی رہیں۔ دولت کی فراوانی جہاں اور بہت سی خرابیاں پیدا کرتی ہے وہاں انسان کے کردار پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور انسان عیاشیوں میں پڑ جاتا ہے۔ آپ کے مرد حضرات کی اکثریت بھی عیاشیوں میں پڑ گئی۔ انہوں نے ''گھر کی دولت جائداد گھر میں ہی رہے'' کے فارمولے پر عمل کر کے شادیاں تو اپنے بڑوں کی مرضی اور فیصلے سے کرلیں مگر درِ پردہ دو دو تین تین خفیہ شادیاں بھی کرلیں اور بعض نے تو درِ پردہ خفیہ شادیاں کرنے کا جھنجٹ پالنے کے بجائے غیر عورتوں سے ناجائز مراسم استوار کرلیے.... آپ کے خاندان میں ایک رواج یہ بھی ہے کہ میاں بیوی کے اکاؤنٹ جوائنٹ ہوتے ہیں اور جو لوگ آپ کی طرح کاروباری ہوتے ہیں وہ میاں بیوی اپنی چیک بکس پر باہمی رضامندی سے کئی بلینک چیکس پر اکٹھے دستخط کردیتے ہیں تاکہ کسی کاروباری ایمرجنسی میں فوری طور پر رقم نکلوانے کے لیے ایک دوسرے کا محتاج نہ رہنا پڑے۔ اس سلسلے میں بس سادہ سی ایک ہی شرط ہوتی تھی کہ رقم نکلوانے کے لیے بینک میں میاں بیوی میں سے کوئی ایک بذاتِ خود جا کر رقم نکلوائے۔ آپ کو بھی اپنے بڑوں کی عیاشی والی جین ورثے میں ملی ہوئی تھی۔ آپ نے بھی اپنے بڑوں کی طرح اپنے چہرے پر جھوٹی پارسائی اور شرافت کا نقاب بہت خوبی سے چڑھایا ہوا تھا.... اور تو اور، آپ سے شدت سے پیار کرنے والی بیوی بھی آپ کو نہ پہچان پائی اور آپ نے باوجود جوان اور شادی شدہ بچوں اور ٹوٹ کر پیار کرنے والی باوفا بیوی کے درِ پردہ اپنی عیاشیوں اور بداعتدالیوں کا سفر جاری رکھا پھر آپ کے آفس میں ایک ضرورت مند لڑکی ملازمت کی تلاش میں آئی۔ اس لڑکی میں نہ جانے آپ کو کیا نظر آیا کہ آپ اس پر سو جان سے مر مٹے اور اسے اپنی ذاتی سیکریٹری بنالیا۔ جی ہاں، میں آپ کی سیکریٹری فرزانہ کی بات کر رہا ہوں۔ یہ آپ کی زندگی میں اس حد تک مقام حاصل کر گئی کہ آپ اس سے خفیہ شادی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ آپ نے اسے ایک پوش علاقے میں ایک خوبصورت بنگلا خرید کر دیا اور اس بنگلے میں آپ کی ملاقاتیں ہونے لگیں پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ ملاقاتیں، یہ قربتیں اس حد تک بڑھیں کہ آپ بغیر نکاح کے میاں بیوی بن گئے۔ آپ یہ جان ہی نہ سکے کہ فرزانہ کی یہ قربتیں آپ سے محبت اور پیار کی بدولت نہیں تھیں بلکہ فرزانہ آپ کے کسی کاروباری رقیب کی وہ تیز طرار آلۂ کار تھی جسے آپ کو اپنے جال میں پھانسنے کے لیے آپ کے آفس میں ملازمت کی تلاش میں ایک ضرورت مند لڑکی کے روپ میں بھیجا گیا تھا۔ آپ کو یہ بھی پتا نہ چل سکا کہ آپ اور فرزانہ کی تمام جذباتی لغزشوں کی اس طریقے سے ویڈیوز بن رہی ہیں جس میں آپ کا چہرہ اور باقی جسم تو واضح طور پر نظر آ رہا ہوتا مگر فرزانہ کا چہرہ واضح نہ ہوتا اور یہ سارا انتظام آپ کے اسی کاروباری حریف کا تھا جس کی آلۂ کار فرزانہ تھی پھر آپ کو بلیک میل کرنے کا پروگرام بنا اور آپ کی ویڈیوز آپ کو بھجوادی گئیں جس کے عوض آپ سے چار کروڑ روپے تاوان مانگا گیا۔ یہاں آپ کے شاطر ذہن نے ایک پلان بنایا جس میں آپ اپنے ڈرائیور کو اعتماد میں لے کر فرزانہ کو دیے گئے بنگلے میں جا چھپے۔ وہاں سے آپ نے ایسے ٹاسکی آلے سے اپنی بیوی عنبرین سے رابطہ کر کے تاوان کی بات کی تاکہ اسے یقین آ جائے کہ آپ کو واقعی اغوا کیا گیا ہے۔ اس دوران آپ نے دو بار بینک جا کر چار کروڑ کی رقم نکلوائی اور بلیک میل کرنے والوں کی ہدایت کے مطابق ان کی بتائی ہوئی جگہ پر انتہائی خاموشی اور احتیاط سے پہنچادی کیونکہ بلیک میل کرنے والوں نے دھمکی دی تھی کہ کسی کو بھی بتانے کی صورت میں آپ کی تمام ویڈیوز سوشل میڈیا پر وائرل کردی جائیں گی۔''

اتنا کہہ کر انسپکٹر عارف کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ انتظار گاہ میں سارے لوگ مع انسپکٹر عارف کے ماتحتوں کے، انتہائی توجہ سے انسپکٹر عارف کو سن رہے تھے۔ چند لمحے توقف کرنے کے بعد انسپکٹر عارف دوبارہ گویا ہوا۔

''اس کے بعد آپ نے اپنے اغوا کے ڈرامے کا ''ڈراپ سین'' کرنا چاہا اور پروگرام کے مطابق آپ نے پہلے اپنے ڈرائیور شفیق کو مع گاڑی گھر بھجوایا اور کچھ وقفے کے بعد آپ بذریعہ ٹیکسی اپنے گھر پہنچ گئے۔ کیوں سیٹھ تنویر صاحب! آپ کے اغوا کے ڈرامے کی ساری کہانی اسی

طرح بے نا جیسے میں نے بتایا۔ اگر میں نے کسی جگہ غلط بیانی کی ہے تو مجھے بتادیں۔'' آخر میں انسپکٹر عارف نے سیٹھ تنویر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، انسپکٹر صاحب! آپ نے ایک ایک لفظ سچ بولا ہے۔'' سیٹھ تنویر نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے اپنی پیار کرنے والی بیوی سے بے وفائی کی ہے۔ اپنے جوان اور شادی شدہ بچوں کا مان، بھروسا اور اعتماد توڑا ہے۔ مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے لیکن کاش، مجھے اپنے اس جرم کی تلافی کا موقع مل جائے۔'' سیٹھ تنویر کے چہرے پر ندامت اور پشیمانی کے گہرے تاثرات تھے اور اس کا لہجہ سچائی سے بھرپور تھا۔

''ٹھیک ہے سیٹھ صاحب! اگر آپ سچے دل سے تائب ہو چکے ہیں تو آپ کی یہ کہانی میرے اور میرے ہر ماتحت کے سینے میں دفن رہے گی مگر آپ کے مجرم اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔'' انسپکٹر عارف نے ٹھوس اور آہنی عزم سے کہا۔

''میرے مجرم؟ کون ہیں میرے مجرم؟'' سیٹھ تنویر نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

انسپکٹر عارف نے جواب دیا۔ ''سیٹھ صاحب! آپ کو بلیک میل کرنے کے لیے آپ کے کاروباری حریف نے آپ کی سیکریٹری فرزانہ اور آپ کے منیجر جس پر آپ اندھا اعتماد کرتے ہیں، کو ہائر کیا تھا۔ یہ چار کروڑ تو ابھی ابتدا تھی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ آپ کو آہستہ آہستہ اس حد تک کنگال کر دیں گے کہ آپ اپنا سارا بزنس ان کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ آپ کو یہ سن کر یقیناً خوشی بھی ہوگی کہ ہم نے آپ کے چار کروڑ روپے نہ صرف ان سے واپس لے لیے ہیں بلکہ آپ کے منیجر اور آپ کی پرسنل سیکریٹری فرزانہ کو گرفتار کر کے آپ کے کاروباری حریف کے خلاف مقدمہ بھی درج کروانے جا رہے ہیں۔ وہ جعلسازی اور دھوکا دہی سے آپ کا کاروبار ہتھیانا چاہتے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ آپ کی ویڈیوز کے ذریعے آپ کو اس حد تک مجبور اور کنگال کر دیں گے کہ آپ اپنے بیوی بچوں اور دنیا والوں کی نظروں میں اپنی عزت، اپنی ساکھ بچانے کے لیے یا تو اپنی دولت، اپنا کاروبار ان کے حوالے کر دیں گے یا پھر خودکشی کر لیں گے۔ آپ کی ویڈیوز کا تمام ریکارڈ آپ کے منیجر اور آپ کی پرسنل سیکریٹری کے پاس تھا اور وہ آج کل میں یہ سارا ریکارڈ اور چار کروڑ روپے آپ کے کاروباری حریف کے حوالے کرنے والے تھے مگر میری ٹیم نے ان دونوں کے گھروں پر چھاپا مار کر وہ تمام ریکارڈ جو ان کے کمپیوٹر میں محفوظ تھا اور چار کروڑ روپے جو آپ کی پرسنل سیکریٹری کے سیف میں پڑے ہوئے تھے، اپنے قبضے میں کر لیے ہیں۔ ہم آپ کی سیکریٹری اور منیجر کو وعدہ معاف گواہ بنا کر آپ کے کاروباری حریف کے خلاف دھوکا دہی، جعلسازی اور بلیک میلنگ کی دفعات لگا کر ان کے خلاف مقدمہ درج کریں گے اور آپ بے فکر رہیں۔''

سیٹھ تنویر بڑی عقیدت اور شکر گزاری کے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ جانے لگے تو سیٹھ بڑی لجاجت سے بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! میری ایک گزارش ہے۔''

انسپکٹر عارف نے ٹھٹک کر اسے دیکھا اور بولا۔ ''جی، کہیے۔''

اس نے اپنی چیک بک سے تین دستخط شدہ بلینک چیک پھاڑے اور انسپکٹر عارف کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بھی اہلکار جب کوئی کارنامہ سرانجام دیتا ہے تو سرکار اور محکمہ اسے انعامات سے نوازتا ہے۔ میری طرف سے خالی چیک آپ کا انعام ہیں۔ اس پر جتنی چاہے رقم بھر لیجیے اور کیش کرا لیجیے۔ یہ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔''

انسپکٹر عارف کے چہرے پر ایک بار پھر غصے کے تاثرات ابھرے مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ چند لمحے وہ سوچتا رہا پھر اپنے ماتحتوں کی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا اور آگے بڑھ کر سیٹھ تنویر کے ہاتھ سے تینوں چیک پکڑ لیے۔

''سیٹھ صاحب!'' انسپکٹر عارف اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی خواہش کے مطابق میں نے چیک وصول کر لیے ہیں۔ اب میں ان کا کچھ بھی کروں، آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' سیٹھ تنویر بڑے جوش سے بولا۔

''تو پھر یہ لیجیے۔'' اتنا کہہ کر انسپکٹر عارف نے تینوں چیک پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیے اور مسکراتا ہوا اپنے ماتحتوں اور حراست میں لی گئی سیکریٹری فرزانہ کو لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا رخ باہر کی جانب تھا جہاں اس کے ماتحت سیٹھ تنویر کے منیجر کو حراست میں لیے گاڑی میں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

سیٹھ تنویر حیرت اور عقیدت سے اس فرض شناس انسپکٹر عارف کو جاتے دیکھ رہا تھا۔

⌘⌘⌘

قسط نمبر: 38

سماء قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جوالمیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ
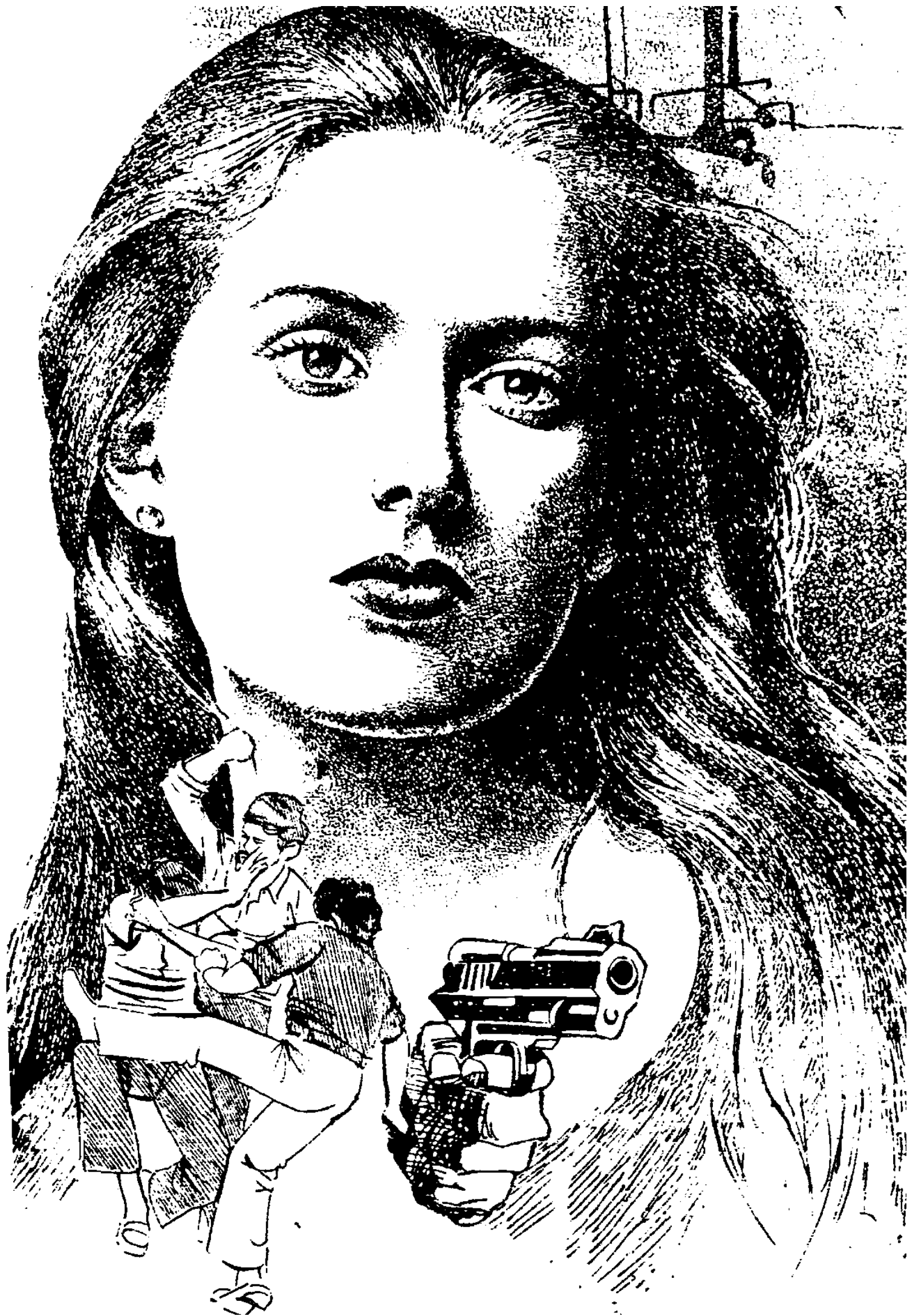
معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیرِ تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کردیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹوگرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہوجانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنھیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاص بات چیت کے بعد وہ اسے پُراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی شخص ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کر رہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے دردی سے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں ہلال نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم واپسی سے پہلے پکڑا جاتا ہے۔ ہلال اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل، چانگ بشریٰ کو چھپا لیتا ہے۔ بعد ازاں سب آزاد کرتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہوجاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کرکے اسے ان کے حوالے کردیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہوجاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالمشاہ کے بہنوئی کو قتل کردیا جاتا ہے۔ معاذ [illegible] مہارت حاصل کرلیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کرکے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ نفسو سے حاصل الو کے پر کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالمشاہ اور اس کا نوکر سرمد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن کمل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہوجاتا ہے۔ ادھر بشریٰ دبئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بیٹے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کرلیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہوجاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالمشاہ کو اس کے والد انڈیا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، کمل اور سرمد انڈیا روانہ ہوجاتے ہیں۔ ائرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انھیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالمشاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالمشاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالمشاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشریٰ اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالمشاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انھیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا

عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ بنگلے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کروا دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لیے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر بشریٰ باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے کجل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرمد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھر لیے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علینہ پاکستان میں ثوبیہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ثوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے کجل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدرآباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور سادھا دیوی کو میڈم ایکس کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کرا لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جارو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جارو اور معاذ، کجل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا عالم وغیرہ سمیت سب کو ٹھکانا بدلنے کا کہہ کر معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ کجل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے اور حامد کو اغوا کروا لیتا ہے۔ لالہ میڈم ایکس کے ٹھکانے کی نگرانی کرواتا ہے۔ ادھر سونیا پر تشدد کر کے اس سے معلومات لی جاتی ہیں تاہم وہ اپنے گلے پر خنجر پھیر لیتی ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈر گراؤنڈ کر دیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کر دیتا ہے اور کافی مارا ماری ہوتی ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کیا گیا تھا۔ وہ لارا نامی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اس سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کرواتا ہے اور سومی اور نیلی اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ سومی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا بتاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

قربان شاہ سے بات کر کے وہ کسی فکر میں مبتلا مسئلے کا حل سوچ رہے تھے۔ اچانک آنے والوں کو صداقت شاہ نے روکا بھی تھا لیکن وہ نہیں رکے تھے۔ قربان شاہ کا کہنا تھا کہ وہ اس اتنی بڑی خوشخبری کو احتیاط سے اعظم کی دادی یعنی اپنی بیگم کو سنائیں گے اور اپنی حویلی میں اعظم کے استقبال کی تیاری کریں گے۔

''مجھے ڈر ہے کہ حویلی کے لینڈ لائن نمبرز اور میرے موبائل پر نگاہ رکھی جارہی ہوگی اس لیے احتیاطاً سجل کے نمبر سے آپ کو کال کررہا ہوں۔''

''سب خیر تو ہے نا؟'' وہ فطری طور پر پریشان ہوگئے۔

''اطلاع ملی ہے کہ ہمارے لختِ جگر کو بازیاب کروانے کے لیے بہانے سے حویلی پر ریڈ کیا جانے والا ہے۔ ہمارے خیرخواہ دوست نے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ فی الحال اسے کہیں اور منتقل کردیا جائے۔'' صداقت شاہ نے مسئلے کی نوعیت سے آگاہ کیا۔

''اسے فوری طور پر ہماری طرف روانہ کردیں بلکہ میں خود اسے لینے آتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کس مائی کے لال میں اتنی ہمت ہے کہ میری جان کو مجھ سے چھین کر لے جاسکے۔'' قربان شاہ مسئلے کی نوعیت سن کر پریشان ہو اٹھے اور جذباتی لہجے میں بولے۔

''یہ وقت جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کا ہے۔ ہمیں کوئی اچھا حل سوچنا ہوگا۔ پہلے میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اسے آپ کی طرف روانہ کردوں لیکن دشمن کے لیے بھی یہ ایک سامنے کی بات ہے اس لیے اب سوچ رہا ہوں کہ اسے آپ کی حویلی کے بجائے کہیں اور بھجواتا ہوگا۔'' صداقت شاہ کا انداز سمجھانے والا تھا۔

''میرے ذہن میں ایک محفوظ جگہ ہے۔ آپ ان لوگوں کو حویلی سے روانہ کریں۔ میرے گارڈز راستے میں انہیں مل جائیں گے۔'' انہوں نے بات کو سمجھا اور احتیاطاً جگہ کا نام نہیں لیا۔

''تیاری کی جارہی ہے۔ بس تھوڑی دیر میں ہی روانگی عمل میں آجائے گی۔ ان لوگوں کے روانہ ہوتے ہی میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔'' انہوں نے رابطہ منقطع کیا۔ اسی وقت سجل کے ساتھ موحِی وہاں پہنچ گیا۔ وہ پوری طرح تیار دکھائی دے رہا تھا۔

''لالہ نے مجھے کال کرکے سب بتادیا ہے۔ آپ بس مجھے حکم دیں۔ میں ہر حکم پر عمل کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔'' صداقت شاہ کے کچھ بھی کہنے سے قبل وہ ان سے بولا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گئے۔ وہ ایک لمبے عرصے سے مشکلات کا شکار تھے اور اعظم کی شکل میں جو خوشی زندگی میں آئی تھی، اس کے یوں جھلک دکھا کر غائب ہوجانے پر اعصابی کشیدگی کا شکار ہورہے تھے لیکن کوشش کررہے تھے کہ ان کی یہ کیفیت کسی پر ظاہر نہ ہوسکے۔ اب بھی بہت حوصلے سے بولے۔

''سجل گاڑیاں اور گارڈز تیار کروانے جارہا ہے۔ تم چاہو تو اس کے ساتھ رہو، چاہو تو آرام سے بیٹھ کر انتظار کرو۔ ہم ذرا تھوڑی دیر کے لیے زنان خانے میں جارہے ہیں۔''

''میں سجل کے ساتھ رہوں گا۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' وہ غائب دماغی سے موحِی کو جواب دے کر خود زنان خانے کی طرف بڑھ گئے۔ اعظم اور نیلی کے لیے مختص کیے گئے کمرے کے باہر ہی موبل انہیں مل گئی۔

''سلام بابا سائیں!'' اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

''جیتی رہو بیٹا! روانگی کی ساری تیاری ہوگئی؟'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''جی، نیلی خود تیار ہے اور اعظم کی ضرورت کی چیزیں دیکھ رہی ہے۔ میں نے ملازماؤں کو راستے کے لیے چائے، کافی اور ہلکی پھلکی کھانے کی چیزیں تیار کرنے پر لگادیا ہے۔ آپ بتائیں کہ کتنی دیر میں روانگی ہے؟'' موبل کی اندرونی کیفیت اس کے لہجے سے بھی جھلک رہی تھی۔

''حوصلے سے بیٹا! صبح تمہیں اپنی اماں سائیں کو بھی سنبھالنا اور سمجھانا ہے۔'' صداقت شاہ نے اسے سمجھایا لیکن ردِعمل ان کی نصیحت کے برعکس ظاہر ہوا اور وہ یکدم ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

''وہ کیوں جارہا ہے بابا سائیں؟ ابھی تو ہم نے اسے دل بھر کر دیکھا بھی نہیں۔''

''اس کی حفاظت کے لیے اسے یہاں سے بھیجنا ضروری ہے بیٹا! پر آپ فکر نہ کرو۔ اللہ سائیں کے حکم سے وہ جلد ایک بار پھر ہمارے درمیان ہوگا۔ تم نے اس وقت تک خود بھی صبر سے رہنا ہے اور اپنی اماں سائیں کا حوصلہ بھی بڑھاتے رہنا ہے۔'' وہ بوڑھے اور کمزور ہوچکے تھے اور اس وقت انہیں اپنا گبرو جوان بیٹا بڑی شدت سے یاد آرہا تھا۔ وہ یہاں ہوتا تو اس وقت ان کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑا ہوتا جیسے کہ سجل اور معظم شاہ کے ڈاکوؤں کے ہاتھوں اغوا ہونے کے بعد کھڑا ہوا تھا لیکن اب وہ نہیں تھا اور خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے انہیں ہی سارے معاملات دیکھنا تھے۔

''اعظم کو سامنے دیکھ کر ادی کی جدائی کا غم تھوڑا ہلکا محسوس ہورہا تھا لیکن اللہ سائیں نے یہ خوشی بھی اتنی جلدی ہم سے چھین لی۔'' موبل کو صبر نہیں آرہا تھا۔

''ایسی باتیں نہ کرو جن سے شکوہ جھلکے۔ شکوہ ناشکری کی ایک شکل ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ جس رب نے اتنا

نواز ا ہے، اس کی ناشکری کریں۔ جو کچھ ہمارے ساتھ بیت رہا ہے، ہم نے اسے اپنے رب کی طرف سے آزمائش سمجھ کر قبول کرلیا ہے۔ تمہارے لیے بھی یہی بہتر ہے کہ رب کو ناراض کرنے والے کلمات زبان سے نہ نکالو۔'' اس بار ان کے لہجے میں ہلکی سی سختی تھی جسے محسوس کر کے مومل نے خود کو سنبھال لیا اور آہستہ سے بولی۔

''معافی چاہتی ہوں، بابا سائیں!''

''آؤ، اندر چل کر نیلوفر اور اعظم سے الوداعی ملاقات کرتے ہیں۔'' ان کا لہجہ ایک بار پھر نرم ہوگیا۔

دونوں باپ بیٹی دستک دے کر اندر داخل ہوئے۔ نیلی پوری طرح تیار تھی اور اعظم کو بستر میں لپیٹ رہی تھی۔ درمیان میں کچھ دیر جاگ کر سو جانے والا اعظم اس وقت گہری نیند میں تھا جبکہ اس کے سامان سے بھرا بیگ بھی بالکل تیار سامنے ہی بند پڑا تھا۔ بیگ کو دیکھ کر صداقت شاہ کے دل کو کچھ ہوا لیکن انہوں نے خود کو سنبھال لیا اور مسکرا کر نیلی سے مخاطب ہوئے۔

''ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی خاطر خواہ تواضع نہ کر سکے اور آپ کو یوں اچانک حویلی چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے۔''

''کوئی بات نہیں شاہ صاحب! ہم جلد اعظم سمیت دوبارہ یہاں لوٹ کر ضرور آئیں گے۔ اس وقت آپ ساری کسر پوری کر لیجیے گا۔'' نیلی حساس اور سمجھ دار لڑکی تھی اور اس وقت ان لوگوں کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی اس لیے ہمت سے مسکرائی اور حوصلہ بڑھانے والی بات کی۔

''اللہ سائیں وہ وقت لائے تو یقیناً ہماری طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی جائے گی۔'' صداقت شاہ نے اسے جواب دیا اور پھر موبائل فون کی گھنٹی بجنے پر اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ کال سچل کی طرف سے تھی۔

''سب تیار ہے سائیں! آپ جب حکم دیں، روانگی ہوجائے گی۔'' اس نے انہیں اطلاع دی۔

''ملازمائیں سامان لے کر آرہی ہیں، پہلے وہ رکھواؤ پھر باقی لوگ بھی آتے ہیں۔'' صداقت شاہ نے اسے جواب دے کر مومل کی طرف دیکھا۔ وہ ان کا اشارہ سمجھ کر جلدی سے باہر نکلی۔ کچھ دیر میں ملازمائیں خورونوش کی اشیا سمیت سارا سامان باہر منتقل کر چکی تھیں۔

''بس، اب زیادہ دیر نہ کرو۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔'' انہوں نے نیلی کو مخاطب کیا تو اس نے اعظم کو بستر سے اٹھانے کے لیے قدم آگے بڑھائے لیکن مومل نے اس سے زیادہ تیزی دکھائی اور سوئے ہوئے اعظم کو بانہوں میں بھر کر اسے بے تحاشا پیار کرنے لگی۔

''بس کرو بیٹا! دیکھو بچے کی نیند خراب ہو رہی ہے۔ جاگ گیا تو راستے میں ان لوگوں کو پریشان کرے گا۔'' صداقت شاہ نے اسے سمجھایا۔

''سوچا تھا اب تو یہ یہیں ہمارے پاس رہے گا اور یہ سوچ کر اسے ٹھیک سے پیار بھی نہیں کر سکی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ آکر اتنی جلدی واپس بھی چلا جائے گا۔'' وہ ایک بار پھر اداس ہونے لگی تھی۔

''ان شاء اللہ یہ جلد دوبارہ آپ لوگوں کے پاس آئے گا اور یہ جدائی عارضی ثابت ہوگی۔'' نیلی نے اسے تسلی دی۔ آخر کار ان لوگوں کی وہاں سے روانگی عمل میں آہی گئی۔ سچل کو صداقت شاہ نے ان کی والی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بھجوادیا تھا جبکہ گارڈز سے بھری دوسری گاڑی ساتھ ساتھ تھی۔ سچل پوری طرح چوکنا تھا اور اس کی نظریں اندھیرے میں بھی اطراف کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ کچھ یہی کیفیت نیلی کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھی مومی کی تھی۔ اندیشوں اور خدشات کے برعکس نہ تو کوئی ان کے تعاقب میں آیا اور نہ ہی راستے میں کوئی دوسری رکاوٹ آئی اور وہ گاؤں کی حدود سے باہر نکلتے چلے گئے۔ سچل کا قربان شاہ کے بندے سے مسلسل رابطہ تھا اور وہ اسی کی راہنمائی میں آگے بڑھ رہے تھے۔ جیسے جیسے فاصلہ طے ہو رہا تھا، خدشات کم ہوتے جارہے تھے اور تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔ منزل کے بے حد قریب جبکہ وہ سب کافی مطمئن ہو چلے تھے اور تھرماس سے نکلی کافی کے ساتھ سینڈوچز کا لطف لیا جارہا تھا، یکدم زوردار دھماکے کی کئی آوازوں کے ساتھ گاڑی بری طرح لہرائی۔

''نیچے... نیچے ہوجاؤ نیلی!'' مومی زور سے چیخا اور ہاتھ میں پکڑا کافی کا کپ باہر اچھال کر اپنی گن سنبھالی۔ نیلی بری طرح دھڑکتے دل کے ساتھ اعظم کو سینے سے لگائے نشست سے نیچے کھسک گئی۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ گھبرا کر رونا شروع کر دینے والے اعظم کی آواز ایک بار پھر اس کے اعصاب کی مضبوطی کا امتحان لے رہی تھی۔

☆☆☆

اینٹی کرپشن والے ساری حویلی میں دندناتے پھر رہے تھے۔ ان کے انداز کی درشتی اور رعونت صداقت شاہ کا خون کھولا رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ نہایت ضبط

سے کام لے رہے تھے۔
"سب جانتے ہیں کہ صداقت شاہ نے کبھی ایک پیسے کی کرپشن نہیں کی اور جب بھی وزارت ملی، اپنے علاقے کے لوگوں کی بہتری کے لیے کام کرنے کی کوشش کی لیکن آج جبکہ میں حکومت میں نہیں ہوں، تم مجھ پر جھوٹے الزامات لگا کر یہاں آپہنچے ہو۔" ضبط کرتے کرتے بھی انہوں نے چھاپا مارنے والی ٹیم کے انچارج سے شکوہ کر ہی دیا۔
"ہم صرف اپنی ڈیوٹی کررہے ہیں۔" اس نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔
"یہ ڈیوٹی کرنا تمہیں اس وقت یاد نہیں آیا جب لطیف سومرو نے اندھیر مچائی ہوئی تھی۔ ہر طرح کا دو نمبر کام کررہا تھا وہ شخص لیکن تمہیں اس کے متعلق کوئی خبر نہیں ملی۔" انہوں نے طنز کیا۔
"جی ہاں، نہیں ملی۔ ملی ہوتی تو ہم اس کے خلاف بھی کارروائی کرتے۔"
"مل بانٹ کر کھانے والے کیا خاک کارروائی کریں گے۔" انہیں اس کے اتنے صاف جھوٹ نے طیش دلایا اور یہ آواز بلند بڑبڑائے۔
"آپ ہماری توہین کررہے ہیں شاہ صاحب!" اس کا چہرہ سرخ ہوا۔
"اور تم لوگوں نے تو اس وقت ہماری حویلی پر چھاپا مار کر ہماری بہت عزت افزائی کی ہے؟" انہوں نے دوبدو جواب دیا۔
"ہم آپ کی عزت کے خیال سے ہی اس وقت آئے ہیں۔ اگر دن کی روشنی میں آئے ہوتے تو دور دور تک آپ کی بدنامی ہوتی۔" وہ ان کے ساتھ گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آدمیوں کی نگرانی بھی کررہا تھا۔ وہ ہر چیز کے ساتھ اکھاڑ پچھاڑ کررہے تھے اور ذرا سی دیر میں انہوں نے سجی سجائی حویلی کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ صداقت شاہ ان کے اشارے کنائے سب دیکھ رہے تھے۔ یقیناً وہ اعظم کو حویلی میں نہ پاکر مایوس ہورہے تھے اور اسی مایوسی میں بے دھڑک زنان خانے میں بھی جا گھسے تھے۔
"اگر آپ کو زنان خانے کی تلاشی لینا تھی تو لیڈی پولیس کو ساتھ لانا چاہیے تھا۔" صداقت شاہ نے احتجاج کیا۔
"آئندہ آئے تو خیال رکھیں گے۔" افسر کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔
"ہمارے ہاتھ صاف ہیں اس لیے ہم نے بادلِ ناخواستہ ہی سہی، تمہیں تمہارا اطمینان کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ آئندہ اس حویلی کا رخ بھی کیا تو ہمارے گارڈز تمہارے قدم روکنے کو کافی ہوں گے۔" انہوں نے اسے دھمکی دی لیکن وہ انہیں جواب دینے کے بجائے اپنے موبائل کی بجتی گھنٹی کی طرف متوجہ ہوگیا۔
"ٹھیک ہے۔ جیسا آپ کا حکم۔" خاموشی سے دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اس نے یہ مختصر جواب دیا اور اپنے عملے کے دو آدمیوں کے قریب جا کر انہیں سرگوشی میں ہدایت دینے لگا۔ تلاشی لیتے لیتے کچھ دیر میں وہ اس کمرے میں پہنچ گئے جس میں اعظم اور نیلی کو ٹھہرایا گیا تھا۔
"آپ کے ہاں تو کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہے شاہ صاحب! پھر یہ بچے کے کپڑے کہاں سے آئے؟" عجلت میں اعظم کا ایک جوڑا وہیں رہ گیا تھا جسے چٹکیوں میں اٹھائے وہ صداقت شاہ سے پوچھ رہا تھا۔
"کیا چھوٹے بچے کے کپڑے کرپشن کے مال میں شامل ہیں؟" صداقت شاہ، اعظم کی موجودگی کا ثبوت اس کے ہاتھوں میں دیکھ کر تھوڑے جز بز تو ہوئے لیکن اس پر اپنی کمزوری ظاہر نہ ہونے دی۔
"میں نے یونہی ایک سوال کیا تھا۔ اگر آپ جواب نہیں دینا چاہتے تو آپ کی مرضی۔" اس نے بے نیازی کے اظہار کے لیے شانے اچکائے۔
"یہ ہمارے نواسے کے کپڑے ہیں جو اس کی غیر موجودگی کے باعث ایک ملازمہ کے بچے کو دے دیے گئے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے ہمارے نواسے کے متعلق؟" انہوں نے اسے جواب دیتے دیتے اچانک ایک سوال کیا۔
"جی...... جی نہیں۔" وہ اقرار کرتے کرتے انکار کرگیا۔
"حیرت ہے۔ ہمارے ساتھ بیتی کو تو پرنٹ میڈیا کے علاوہ الیکٹرانک میڈیا نے بھی خوب کوریج دی ہے پھر آپ کیسے بے خبر رہ گئے ہمارے ساتھ بیتی سے۔ سنا ہے اینٹی کرپشن والے جب کسی کے گھر کا رخ کرتے ہیں تو سب کچھ اگلا پچھلا معلوم کرکے آتے ہیں۔ آپ لگتا ہے یہاں کچھ عجلت میں آگئے ہیں۔" انہوں نے اس پر طنز کیا۔
"شاہ صاحب! میرے خیال میں بہتر ہوگا کہ آپ ایک جگہ سکون سے بیٹھ جائیں اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔" وہ جھنجلایا۔
"ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس وقت آپ ہماری حویلی کے زنان خانے میں کھڑے ہیں جہاں خواتین کے علاوہ

ہمارے پشتینی ملازمین بھی بنا اجازت قدم نہیں رکھتے۔ آپ کے اس حصے کی تلاشی لینے تک ہم آپ کے ساتھ ہی رہیں گے۔'' انہوں نے دوٹوک جواب دیا جس پر کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر اس نے سکینہ شاہ کی خواب گاہ کا رخ کیا۔ سکینہ شاہ مسلسل چہل پہل اور آوازوں کی وجہ سے جاگ گئی تھیں اور تکیوں کے سہارے بیٹھی ناسمجھی سے سب کچھ دیکھ رہی تھیں لیکن غائب دماغی کی اس کیفیت میں بھی انہوں نے اپنے پردے کا خیال رکھا تھا۔ کچھ یہی حال مومل کا بھی تھا۔ وہ بھی خود کو بڑی سی چادر میں چھپائے نظریں نیچی کیے ماں کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

''اس لاکر کو کھولیں۔''

''اس میں ہمارے خاندانی زیورات اور تھوڑی سی رقم کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

''میں نے کہا، اسے کھولیں۔'' وہ خوامخواہ ان کے ساتھ تلخ ہوا۔ سکینہ شاہ اور مومل نے سراسیمہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''گھبراؤ مت۔'' انہوں نے دونوں کو تسلی دی اور لاکر کھول دیا۔ لاکر کھلتے ہی تین چار افراد نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

''یہ سب کیا ہے سائیں! کون ہیں یہ لوگ جو آپ کے ہوتے ہوئے میرے کمرے تک آپہنچے ہیں۔ کیا ابھی کوئی اور بھی تکلیف ہے جو مجھے پہنچنے سے رہ گئی ہے؟''

اس سارے منظر کو کسی ڈراؤنے خواب کی طرح دیکھتی سکینہ شاہ نے دہائی دی تو وہ ان کی طرف متوجہ ہوگئے اور قریب بیٹھ کر انہیں تسلی دینے لگے۔ تسلی تشفی کے چند بولوں سے وہ تھوڑی سی سنبھلی ہی تھیں کہ مومل نے انہیں پکارا۔

''بابا سائیں....!'' اس کے لہجے کے واضح خوف نے انہیں چونک کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا لیکن اس کی نظریں ان کے بجائے کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''یہ... یہ...'' ان کی نظریں سامنے میز پر ڈھیر ہوتی غیر ملکی کرنسی اور سونے کے بسکٹس پر جمی تھیں۔ ان جیسی حیثیت کے شخص کے لیے اتنی مالیت کی رقم یا سونے کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن وہ حیران اس لیے تھے کہ یہ چیزیں ان کے لاکر میں موجود ہی نہیں تھیں۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' ان کی حیرت غصے میں ڈھلی۔

''یہ تو معمولی چیزیں ہیں شاہ صاحب! آپ پر اصل الزام تو مختلف ترقیاتی پروجیکٹس میں ہیرا پھیری اور گھوسٹ ملازمین کی بھرتی کا ہے۔'' اینٹی کرپشن آفیسر نے گویا ان کی حالت سے حظ اٹھایا۔

''سب جھوٹ کا پلندا اور بکواس۔''

''یہ تو آپ عدالت میں ثابت کیجیے گا۔ فی الحال تو ہم آپ کو اریسٹ کر کے لے جا رہے ہیں۔'' اس کے الفاظ پر سکینہ شاہ اور مومل کے ہونٹوں سے دبی دبی چیخیں نکل گئیں۔ صداقت شاہ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو انہوں نے اپنی چیخوں کو حلق میں ہی گھونٹ لیا۔

''تو پھر چلیں شاہ صاحب؟'' آفیسر نے دریافت کیا۔

''ضرور، لیکن یاد رکھنا کہ تم بہت زیادہ دن ہمیں روک نہیں پاؤ گے۔''

''یہ فیصلہ کرنے والا میں کون ہوتا ہوں؟ مجھے گرفتاری کا حکم ملا، گرفتار کرلیا۔ چھوڑنے کا ملے گا تو چھوڑ دوں گا۔'' اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''ہم جانتے ہیں کہ تمہاری حیثیت ڈگڈگی پر ناچنے والے بندر سے زیادہ نہیں۔'' انہوں نے اسے جواب دیا اور از خود باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''اتنی جلدی کیا ہے شاہ صاحب! ابھی تو کچھ اور مہمان بھی آنے ہیں۔'' آفیسر نے انہیں ٹوکا تو وہ الجھ کر اسے دیکھنے لگے لیکن یہ الجھن اس وقت فوراً ہی حل ہوگئی جب انہوں نے کیمرے اٹھائے میڈیا کے افراد کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔

''آپ دونوں دوسرے کمرے میں چلی جائیں۔'' وہاں جو کچھ ہو رہا تھا، کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن وہ زندگی میں پہلی بار اس صورت حال سے گزر رہے تھے اس لیے انہیں بے حد سبکی محسوس ہو رہی تھی۔ خصوصاً ان لوگوں کی زنان خانے میں مداخلت تو انہیں بہت ہی زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ اب بھی میڈیا والوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر انہوں نے فوراً سکینہ شاہ اور مومل کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔

وہ دونوں جو اپنے چہرے پہلے ہی چادر کے پلو سے ڈھانپ چکی تھیں، ان کی طرف سے حکم ملتے ہی تیزی سے باہر نکل گئیں۔ میڈیا والے اپنا کام کرنے لگے۔ چند ایک نے ان سے بھی بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ بولنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ کچھ دیر بعد سارا تماشا سمٹا تو سرکاری گاڑیوں میں ان کی وہاں سے روانگی عمل میں آئی۔

''آپ کے لیے ایک کال ہے شاہ صاحب!'' ابھی وہ لوگ گاؤں کی حدود سے نہیں نکلے تھے کہ انہیں موبائل

فون تھمایا گیا۔ خود ان کا فون تو وہ لوگ پہلے مرحلے میں ہی اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔
''ہیلو!'' انہوں نے موبائل تھام کر فقط اتنا ہی کہا۔ انہیں پوری طرح اندازہ نہیں تھا کہ دوسری طرف کون ہوگا لیکن یہ طے تھا کہ جو بھی ہوا، مخالفین میں ہی سے ہوگا۔
''ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا انجام دیکھ لیا صداقت شاہ! تم سے کہا تھا کہ ساتھ مل کر چلو۔ تمہارے سارے مسئلے بھی ایک ایک کر کے حل ہو جائیں گے اور تم عیش بھی کرو گے لیکن تم نے اس دو ٹکے کے غنڈے کو ہم پر ترجیح دی۔'' دوسری طرف سے آتی عرفان اللہ کی آواز پہچاننے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔
''ہم...... میں...... میں سمجھا نہیں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' اس کے لہجے اور الفاظ پر ان کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔
''جو کچھ سمجھنے کو رہ گیا ہے، وہ تو اسے کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے اور جیل میں چکی پیسنے کے بعد اچھی طرح سمجھ آجائے گا۔'' وہ نفرت سے پھنکارا۔
''میری بات سنو عرفان اللہ! تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی......'' ان کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے اور عرفان اللہ نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ باقی ساری صورت حال اپنی جگہ تھی لیکن نواسے والی دھمکی نے انہیں لرزا کر رکھ دیا تھا۔ عرفان اللہ کے الفاظ نے انہیں اعظم کی طرف سے اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ یوں محسوس کر رہے تھے جیسے دشمنوں نے اس تک رسائی حاصل کر لی ہو۔ شدید ذہنی دباؤ نے ان کے پہلے ہی سے کمزور دل پر یلغار کی اور سینے میں بائیں جانب درد کی ایک لہر سی اٹھی۔ ان کے ہاتھ سے موبائل فون چھوٹ گیا اور وہ اپنے عرق آلود وجود کے ساتھ ایک جانب جھکتے چلے گئے۔

☆☆☆

اعظم کو بانہوں میں لیے دبکی بیٹھی نیلی کے لب مسلسل قرآنی دعاؤں کا ورد کر رہے تھے۔ تسلسل سے برستی گولیوں کی آوازیں اعصاب شکن تھیں تو اعظم کا مسلسل رونا دل کے لیے باعثِ تکلیف۔ وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ جو پہلا دھماکا سنائی دیا تھا وہ گاڑی کا ٹائر پھٹنے کے سبب ہوا تھا لیکن یہ ٹائر ان کے بجائے شاید گارڈز والی گاڑی کا پھٹا تھا کیونکہ ان کی گاڑی تو کچے راستے پر اچھلتی کودتی مسلسل آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ دھماکے کی آواز پر ڈرائیور ایک پل کے لیے شپٹا گیا تھا اس لیے ان کی گاڑی ذرا دیر کو لہرائی تھی لیکن پھر ڈرائیور نے اس پر قابو پا لیا تھا اور اب پوری مہارت سے گاڑی کو آگے بڑھائے لیے جا رہا تھا۔ اس کی برابر والی نشست پر بیٹھا کچل موبائل پر مصروف تھا۔ اس کے جو الفاظ اس شور میں اس کے کانوں میں پڑ رہے تھے، ان سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ قربان شاہ سے بات کر رہا ہے۔
''میں دیکھ رہا ہوں سائیں! پیچھے کوئی نہیں آ رہا۔ لگتا ہے گارڈز کے ساتھ الجھ گئے ہیں۔'' اس نے یہاں کی رپورٹ دی پھر ان کے پوچھنے پر اپنی پوزیشن بتانے لگا کہ حملہ کس مقام پر ہوا ہے۔ گاڑی جوں جوں آگے بڑھتی جا رہی تھی، فائرنگ کا شور بھی دھیما پڑتا جا رہا تھا لیکن یہ طے تھا کہ پیچھے ابھی ہنگامہ جاری ہے۔
''ہاں، تو بس پھر آپ کے بندے بالکل قریب ہی ہیں۔ آپ ان کو ہمارے ساتھیوں کی مدد کرنے کا حکم دیں۔ میں منزل پر پہنچ کر آپ کو خبر کرتا ہوں۔'' کچل کی یکطرفہ گفتگو اب واضح سنائی دے رہی تھی۔ اعظم بھی کسی نہ کسی طرح رونا بند کر چکا تھا۔
''کیا میں واپس سیٹ پر آ جاؤں؟'' نیلی نے گن ہاتھ میں دبوچے چوکس نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیتے موی سے پوچھا۔
''میرے خیال میں اب تھوڑا سا ہی فاصلہ رہ گیا ہے، تو بہتر ہے احتیاطاً وہیں بیٹھی رہو۔'' موی نے اسے جواب دیا اور پھر کچل سے تائید چاہی۔
''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا دوست؟''
''ہم پہنچ گئے ہیں جی۔ وہ دیکھیں سامنے سائیں انور کے فارم ہاؤس کا گیٹ نظر آ رہا ہے۔'' کچل نے اشارہ کیا تو موی نے اس طرف نظر ڈالی۔ بڑے سے گیٹ کے دونوں ستونوں پر نصب لیمپس کی روشنی میں وہ آس پاس متحرک انسانوں کو بھی صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھی گاڑی کی آواز اور ہیڈ لائٹس کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔
ڈرائیور نے گاڑی ان کے قریب لے جا کر روکی تو انہوں نے تیزی سے گاڑی کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ کچل کو دیکھ کر اور اس سے چند باتیں کر کے وہ مطمئن ہو گئے تو بڑا سا پُرشکوہ گیٹ ان کی گاڑی کے لیے کھول دیا گیا۔ گاڑی گیٹ سے اندر ہوئی تو نیلی بھی سکون کا سانس لیتے ہوئے اعظم سمیت نشست پر آ بیٹھی۔
''آپ لوگوں کے لیے کمرے کھول دیے ہیں سائیں! خاطر خدمت کا بھی پورا انتظام ہے۔ بس آپ حکم کریں، ہم حاضر ہیں۔'' اندر احاطے میں گاڑی رکتے ہی

ایک شخص جو شلوار قمیص اور ویسٹ کوٹ میں ملبوس تھا، دوڑا آیا اور عاجزی سے ان سے مخاطب ہوا۔

"سب سے پہلے سیکیورٹی پر توجہ دو اور اپنے بندوں سے کہو کہ بالکل چوکنے رہیں۔ چڑیا کا بچہ بھی ان کی نظر میں آئے بغیر اندر نہیں آنا چاہیے۔" جواب سچل نے دیا۔

"بے فکر رہو اوا۔ آپ سائیں انور سولنگی کے مہمان ہیں اور ہم اپنے سائیں کی آن کے لیے اپنی جان دے دیں گے پر آپ پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔" اس شخص نے انہیں اطمینان دلایا اور پھر اپنی راہنمائی میں اندر لے گیا۔

"آپ لوگ تازہ دم ہو جاؤ پھر میں ناشتا لگواتا ہوں۔" کمروں تک راہنمائی کر کے اس نے ان لوگوں سے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئے۔ کہنے کو موتی نے کھانے پینے کا بہت سا سامان گاڑی میں رکھوایا تھا کہ سفر طویل ہو تو ان کے کام آ سکے لیکن انہیں تو ہاتھ میں پکڑی کافی بھی ختم کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور دشمن کی طرف سے حملہ ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ سب پھر ڈائننگ ٹیبل پر جمع تھے جہاں ان کے لیے پُرتکلف ناشتا چن دیا گیا تھا۔ سچل کے جھجکنے کے باوجود انہوں نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھا تھا جبکہ ڈرائیور از خود اندر نہیں آیا تھا اور باہر ملازمین کے ساتھ رک گیا تھا۔

"سائیں قربان شاہ اور ان کے ساتھی نہیں پہنچے ابھی تک؟" ناشتا شروع کرنے سے قبل سچل نے دریافت کیا۔

"سائیں کی کال آئی تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ تھانے پولیس کے معاملات نمٹا کر فارغ ہو جائیں تو یہاں آتے ہیں۔ تب تک آپ ناشتا کر لیں اور چاہیں تو کچھ دیر آرام بھی۔" انور سولنگی کے آدمی نے اسے جواب دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس سے مزید کوئی سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ رات نیند پوری نہیں ہوئی تھی اس لیے پیٹ بھرتے ہی نیند کا خمار طاری ہونے لگا تھا۔

"آپ دونوں جا کر آرام کریں۔ سائیں قربان شاہ آئے اور انہوں نے آپ سے ملنے کا بولا تو میں آپ کو جگا دوں گا۔" سچل نے نیلی اور موتی سے کہا تو انہوں نے تکلف سے کام نہیں لیا۔ یہاں انہیں کمرا بھی ساتھ ملا تھا اور خوش قسمتی سے اعظم بھی سو چکا تھا اس لیے وہ دونوں بھی اطمینان سے سو گئے۔ دوبارہ آنکھ شور کی آواز پر کھلی۔

"کک.... کیا ہوا ہے؟" گہری نیند سے جاگنے کے باعث نیلی کو شور کی نوعیت کے بارے میں اندازہ نہیں ہو سکا تھا اور اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں خود سے پہلے جاگ

جانے والے مومی سے پوچھا تھا۔

''تم اعظم کا خیال رکھو، میں دیکھتا ہوں۔'' مومی اس کے سوال کا واضح جواب دیے بغیر باہر کی طرف بھاگا تو وہ نیند سے جاگ کر کسمساتے ہوئے اعظم کی طرف متوجہ ہوگئی لیکن دماغ باہر کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔ باہر سے لوگوں کے اونچا اونچا بولنے اور للکارے مارنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کچی پکی نیند میں اس نے فائرنگ کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ وہ اعظم کو سینے سے لگائے دھڑکتے دل کے ساتھ باہر کی آوازوں پر کان دھرے بیٹھی رہی۔

اڑتے اڑتے الفاظ تھے جن سے وہ کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہیں کر پا رہی تھی لیکن اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی تھی جس پر قابو پالیا گیا تھا۔ دھیرے دھیرے آوازیں کم ہوتی چلی گئیں۔ وہ خواہش کے باوجود اپنی جگہ سے ہلی نہ کسی کھڑکی کے قریب جا کر باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ اعظم اس کی گود میں تھا اور وہ ایسا کچھ کر کے اس کے لیے خطرہ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انتظار کے وہ چند لمحے بڑی مشکل سے گزرے اور آخر کار مومی واپس آیا۔

''کیا ہوا؟ کوئی مسئلہ پڑ گیا ہے کیا؟'' مومی کو دیکھتے ہی اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''بس اللہ نے بچت کروادی اور انور سونگی کے بندوں کی ہوشیاری نے کام دکھا دیا تھا ورنہ دشمن کا داؤ چل گیا تھا۔'' مومی نے آرام سے بیٹھتے ہوئے اسے بتایا۔

''کیوں، کیا ہوا تھا؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''دو بندے پتا نہیں کیسے نظر بچا کر اندر آگھسے تھے اور گھنے درختوں کی شاخوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ وہ تو ایک کو اتفاق سے چھینک آئی اور قریب سے گزرتے ایک کارندے نے آواز سن لی تو شور مچایا۔ کارندوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے فائرنگ شروع کردی۔ دوسرے کسی درخت پر چھپا بیٹھا اس کا ساتھی بھی شامل ہوگیا لیکن ایک تو انور سونگی کے کارندوں کی تعداد زیادہ تھی، دوسرے وہ سب ہیں بھی مار دھاڑ والے بندے تو انہوں نے اچھا مقابلہ کیا۔ دونوں میں سے ایک مارا گیا اور دوسرا بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔'' مومی نے اسے ساری تفصیل سنائی۔

''ایک اور قتل......!'' نیلی کراہی۔ جب سے وہ اس کام میں شامل ہوئی تھی، مسلسل قتل و غارت دیکھ رہی تھی اور جیسے خاصے مضبوط اعصاب کی مالک ہونے کے باوجود یہ سب اس پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ انسانوں کو مرتے دیکھنا بھی بھی آسان نہیں ہوتا۔ ایک عام شہری تو کیا، میدانِ جنگ میں اترنے والا سپاہی بھی مسلسل بہتا خون دیکھ کر ایب نارمل ہونے لگتا ہے اور اسے جنگ کے خاتمے کے بعد معمول کی زندگی میں واپس آنے میں وقت لگ جاتا ہے۔ بعض لوگوں کو تو باقاعدہ نفسیاتی معالج کی حاجت پیش آجاتی ہے۔ تو یہ تھا کہ اب نیلی بھی اعصاب زدہ ہو رہی تھی۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے والی لڑکی ضرور تھی لیکن اس نے بھی یوں انسانوں کو ایک کے بعد ایک قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

''فائرنگ میں انور سونگی کے دو بندے بھی زخمی ہوئے ہیں جن میں سے ایک کی حالت ذرا زیادہ سیریس ہے۔ دونوں کو اسپتال لے کر گئے ہیں۔ ان لوگوں نے پکڑے گئے بندے کو چھپر کر کے پولیس کو واقعہ کی اطلاع دے دی ہے۔ پولیس والوں سے نمٹنے کے لیے انور سونگی خود یہاں آرہا ہے۔'' مومی اس کی کیفیت کو محسوس کیے بغیر اسے معلومات فراہم کرتا جا رہا تھا۔

''اور سائیں قربان شاہ...... وہ نہیں پہنچے ابھی تک؟'' نیلی نے اپنے خشک حلق کو تر کرتے ہوئے پوچھا۔

''انہیں انور سونگی نے فی الحال آنے سے روک دیا ہے۔ انور سونگی کا خاص کارندہ بتا رہا تھا کہ سائیں کا کہنا ہے پہلے ہی قربان شاہ حملے اور قتل و غارت کے ایک معاملے میں الجھ چکا ہے۔ پولیس نے اسے یہاں دیکھ لیا تو دونوں واقعات کا آپس میں ربط ڈھونڈنے کی کوشش کرے گی۔ بہت ممکن ہے کہ یہی الزام لگا دے کہ دونوں واقعات قربان شاہ کی دشمنی کا شاخسانہ ہیں۔ ایسے میں ڈاکوؤں کے حملے والا بیانیہ کمزور پڑ جائے گا اور دونوں طرف کے کارندوں کی جان مشکل میں پڑ جائے گی۔''

''پتا نہیں کون ظالم ہیں جو اس معصوم کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے خون کی ندیاں بہانے پر تلے ہوئے ہیں۔'' نیلی نے اعظم کے ماتھے پر نرمی سے بوسہ دیتے ہوئے دکھ سے تبصرہ کیا۔ وہ اس کی گود میں ہی دوبارہ گہری نیند سو چکا تھا۔

''کبھی کبھی بڑوں کی لڑائی میں معصوم بچوں کو بھی پسنا پڑتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے جو بندہ پکڑا گیا ہے، اس کے پاس سے بے ہوش کرنے والی گیس کے گولے ملے ہیں۔ لگتا ہے ان کا منصوبہ تھا کہ سب کو بے ہوش کردیں اور اسے خاموشی سے اٹھا کر لے جائیں۔''

''اللہ ضرور اس کی حفاظت کرے گا۔ میں تو بار بار

قرآنی دعائیں پڑھ کر اس کے گرد حصار باندھتی رہتی ہوں۔ اللہ نے چاہا تو کسی کے ہاتھ نہیں پہنچ سکیں گے اس تک۔'' نیلی نے اعظم کو زور سے اپنے ساتھ بھینچ لیا جس پر وہ کسمسانے لگا۔

''کیا کرتی ہو، بچے کی نیند خراب ہو رہی ہے۔'' موی نے اسے ٹوکا تو وہ جھینپ گئی۔

''آرام سے لٹا دو اسے بستر پر۔''

''پتا نہیں کیوں اتنے تھوڑے سے وقت میں یہ مجھے اتنا پیارا ہو گیا ہے کہ اس کے ساتھ کچھ بُرا ہو جانے کے خیال سے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ دل چاہتا ہے اسے سارا وقت اپنے کلیجے سے لگا کر رکھوں۔'' موی کے ٹوکنے پر اس نے اعظم کو دوبارہ بستر پر تو لٹا دیا لیکن نرم ہاتھوں سے اسے تھپکتے ہوئے محبت پاش لہجے میں بولی۔

''یہ بھی اللہ کی طرف کے معاملات ہیں۔ ظالموں نے اسے ماں کی آغوش سے نکال کر ممتا سے محروم کرنے کی سازش کی تو اللہ نے تمہارے دل میں اس کے لیے وہی محبت پیدا کر کے تلافی کر دی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ خود بھی تمہارے ساتھ بہت سکون میں ہے اور اس کی طبیعت میں کوئی خرابی بھی محسوس نہیں ہو رہی ورنہ پہلے تو اسے ڈاکٹروں کی ضرورت پڑی ہوئی تھی۔'' موی کی تو جیہہ ایسی تھی جسے نیلی رد نہیں کر سکی۔ اعظم کی طرف جس شدت سے اس کا دل مائل ہوا تھا، وہ قدرت کے اشارے کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔

''سوچتی ہوں جب یہ ساری بھاگ دوڑ ختم ہو جائے گی اور یہ کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جائے گا یا اس کی ماں اسے مل جائے گی تو میں کیا کروں گی؟ میرا تو دل ہی نہیں مانے گا اسے چھوڑنے کو۔'' اب اس کے لہجے میں ہلکا سا خوف تھا۔

''اپنے نہیں، اس کے بارے میں سوچو اور دعا کرو کہ یہ محفوظ ہو کر نارمل زندگی گزار سکے۔ اگر تم اس کے لیے ممتا کے جذبات محسوس کر رہی ہو تو یاد رکھو کہ ممتا تو نام ہی قربانی کا ہے۔'' موی کے الفاظ ایک بار پھر قائل کر لینے والے تھے۔ تائیدی انداز میں سر ہلاتی نیلی جواب میں کچھ کہہ پاتی، اس سے قبل ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

''سائیں انور سولنگی تشریف لے آئے ہیں اور آپ کو یاد کر رہے ہیں۔'' آنے والا ایک ملازم تھا جو پیغام لے کر آیا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم چلو میں آتا ہوں۔''

''تھوڑی جلدی کریں سائیں۔ باہر پولیس آئی بیٹھی ہے پر وڈے سائیں پولیس والوں سے پہلے آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''اچھا تو پھر چلو۔'' اس نے نیلی کو اعظم کے پاس ہی ٹھہرے رہنے کا اشارہ کیا اور خود ملازم کے پیچھے چل پڑا۔ انور سولنگی کڑکڑاتے ہوئے کلف لگے کاٹن کے سفید شلوار قمیص پر مخصوص سندھی اجرک پہنے اور سر پر سندھی ٹوپی لگائے اس کا منتظر بیٹھا تھا۔ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اس نے موی سے سلام لیا اور بارعب لہجے میں بولا۔

''ہم نے تمہیں صرف یہ ہدایت دینے کے لیے بلایا ہے کہ پولیس کے سامنے ہم تمہیں اپنے کارندے وفا علی کا مہمان ظاہر کریں گے جو فارم ہاؤس دیکھنے کے شوق میں اپنی بیوی کے ساتھ یہاں آیا ہوا ہے۔ پولیس کے سامنے تم ہر بات سے لاعلمی کا اظہار کرنا اور یہی بیان دینا کہ تم اور تمہاری بیوی سوئے ہوئے تھے۔ شور اور فائرنگ کی آوازوں سے آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ ڈاکوؤں نے فارم ہاؤس میں گھسنے کی کوشش کی تھی جسے فارم ہاؤس کے ملازم نے ناکام بنا دیا۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' موی نے اس کی ہدایات توجہ سے سنیں اور یقین دہانی کرائی۔

''بچے کو پولیس کی موجودگی میں نیچے تہ خانے میں رکھنا پڑے گا۔ پولیس والوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب بال کی کھال نکالنے بیٹھ جائیں۔ انہوں نے تمہارا آگا پیچھا معلوم کرنے کے لیے تفتیش کی تو جان لیں گے کہ بچہ تمہارا نہیں ہے اس لیے بہتر ہے بچے کو سامنے نہ لایا جائے۔'' انور سولنگی کی اس بات نے ظاہر کر دیا کہ وہ اسے اپنے بجائے کارندے کا مہمان کیوں قرار دے رہا ہے۔ پولیس تحقیق کرتی تو واضح ہو جاتا کہ وہ اسکی حیثیت کا بندہ نہیں ہے کہ اس کی دوستی انور سولنگی جیسے بڑے زمیندار سے ہو سکتی اس لیے اسے اپنے خاص ملازم وفا علی کا مہمان قرار دینا ہی مناسب تھا۔

''فی الحال نگل کو بھی تم لوگوں کی گاڑی سمیت یہاں سے ہٹا دیا ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ اس وقت یہاں قربان شاہ یا صداقت شاہ میں سے کسی کا ذکر بھی نہ ہو۔'' انور سولنگی نے اسے مزید ہدایات دیں۔

''میں پورا پورا خیال رکھوں گا۔'' موی نے اسے یقین دہانی کروائی۔

''اپنی گھر والی کو بھی سمجھا دو۔''

''جی بہتر۔''

''وفا.....!'' انور سولنگی نے مؤدب کھڑے اپنے

خاص ملازم کو پکارا۔
"حکم سائیں!"
"بچے کو زنانی سے لے کر نیچے تہ خانے میں بھجواؤ پھر پولیس والوں کو بھیجو۔"
"جو حکم سائیں!" وفا علی فوراً حرکت میں آ گیا۔ نیلی کو اعظم کو خود سے الگ کرنے میں تامل تھا لیکن حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے یہ کڑوا گھونٹ بھرنا پڑا۔ وفا علی نے احتیاطاً اعظم کا سارا سامان بھی وہاں سے ہٹوا دیا۔ اس دوران مومی، نیلی کو مختصراً انور سولنگی کی دی گئی ہدایات سے آگاہ کرتا رہا۔ سب کچھ حسب منشا ہونے کے بعد وفا علی نے باہر منتظر بیٹھے پولیس والوں کی طرف رخ کیا۔
"آ جائیں تھانیدار صاحب! سائیں یاد کر رہے ہیں آپ کو۔"
"بڑا انتظار کروایا سائیں نے۔ مجھے تھانے واپس جا کر رپورٹ بھی تیار کرنا ہے۔ آج کا تو دن ہی خراب ہے۔ سویرے سورج چڑھنے سے پہلے ہی چاند چڑھنے شروع ہو گئے ہیں۔ مجھ جیسے چھوٹے بندے کی تو شامت ہی آ جاتی ہے۔" تھانیدار پریشان بھی تھا اور اس لمبے انتظار سے خفا بھی دکھائی دے رہا تھا۔
"اتنا شور کیوں کر رہے ہو تھانیدار صاحب! سائیں سفر کر کے آئے ہیں۔ آدمی سفر سے آتا ہے تو تازہ دم ہونے کے لیے تھوڑا وقت تو چاہیے ہوتا ہے یا نہیں؟" وفا علی نے تھانیدار کو تقریباً جھاڑ کر رکھ دیا۔ گاؤں، دیہاتوں میں بڑے زمینداروں کے سامنے تھانیدار کی اتنی مجال نہیں ہوتی کہ وہ ان سے ٹکر لے سکے۔ وہ شخص بھی وفا علی کی ذرا سی تیز آواز پر دھیما پڑ گیا اور پست لہجے میں بولا۔
"خفا نہ ہو ادا! آج کام کا بوجھ بڑا ہے۔ پیچھے سائیں قربان شاہ کے بندوں پر بھی منہ اندھیرے ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا۔ نیند سے جاگ کر بڑی دیر تک اس معاملے کو نمٹاتا رہا۔ تھوڑی فرصت ملی تو یہاں کی خبر آ گئی۔ آج تو تھانے میں صبح کا ناشتا بھی کرنے کی مہلت نہیں ملی۔"
"کیوں خیسو! تھانیدار صاحب کو ناشتے پانی کا نہیں پوچھا تُو نے؟ یہ اور ان کے بندے اتنی دیر سے یہاں سوکھے منہ بیٹھے ہوئے ہیں۔" وفا علی ملازموں کو وہاں سے خالی برتن اٹھا کر لے جاتے ہوئے دیکھ چکا تھا پھر بھی گرج کر وہاں خدمت پر متعین ملازم سے پوچھا۔
"نہ نہ۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو پچھلا دکھڑا رو رہا تھا۔ یہاں تو میری بہت اچھی خاطر خدمت ہوئی ہے۔" تھانیدار جلدی سے بول پڑا۔
"چلیں تو پھر چل کر سائیں سے مل لیں۔ انہیں آگے بھی بڑی مصروفیت ہے۔" وفا علی نے یوں جتایا جیسے تھانیدار کی انور سولنگی سے ملاقات کروا کر اس پر کوئی احسان کر رہا ہو۔ تھانیدار تھوڑا دبا دبا سا اس کے ساتھ ملاقات کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اس کا نائب بھی اس کے ساتھ تھا جبکہ باقی سپاہی وہیں بیٹھے رہ گئے تھے۔ انور سولنگی کی خدمت میں پہنچ کر تھانیدار نے اس سے سلام دعا کی پھر وقوعے پر گفتگو کا آغاز ہوا۔ ابھی گفتگو شروع ہی ہوئی تھی کہ وفا علی کا فون بجا۔ اس نے کال ریسیو کی اور ملنے والی اطلاع پر بھویں چڑھائیں۔
"ڈی ایس پی صاحب تشریف لائے ہیں۔" کال بند کر کے اس نے آہستہ آواز میں حاضرین کو آگاہ کیا۔ خبر سن کر تھانیدار اور اس کے نائب کی رنگت اڑ گئی جبکہ انور سولنگی کی پیشانی پر ایک موٹا سا بل پڑ گیا۔ وفا علی کو خبر مین گیٹ سے ملی تھی جہاں سے رہائشی عمارت کا فاصلہ اچھا خاصا تھا لیکن جیپ کے لیے اس فاصلے کی کیا اہمیت۔ دو منٹ بعد ہی باہر سے جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی۔ وفا علی لپک کر باہر نکلا۔ تھانیدار اور اس کا نائب تو اطلاع سنتے ہی اپنے افسر کے استقبال کے لیے باہر پہنچ چکے تھے۔ چہرے پر نہایت سنجیدہ تاثرات لیے ڈی ایس پی بغل میں چھڑی دبائے اس استقبالیہ ٹیم کو زیادہ گھاس ڈالے بغیر ملاقات کے کمرے میں انور سولنگی تک پہنچا، تب بھی اس کے تاثرات میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔
"اچھا ہوا ڈی ایس پی صاحب! آپ خود آ گئے۔ اب آپ خود دیکھ لیجیے کہ آپ کی سرکار میں نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ ڈاکو دن دہاڑے میرے فارم ہاؤس میں گھسنے کی ہمت کر بیٹھے۔" اس کے تاثرات دیکھ لینے کے باوجود انور سولنگی نے بے تکلفی اپنائی اور مصافحے وغیرہ کے مرحلے سے گزر کر مان بھرے لہجے میں شکوہ کیا۔
"میں آیا نہیں، بھیجا گیا ہوں سولنگی صاحب! اوپر والوں کو اس سارے علاقے کے حالات پر سخت تشویش ہے اس لیے انہوں نے میری ذمے داری لگائی ہے کہ میں اپنی نگرانی میں سارے معاملات دیکھوں۔" ڈی ایس پی نے سنجیدہ تاثرات کے ساتھ اس کی بات کا جواب دیا۔
"کیا مطلب...... کیا کہیں اور بھی گڑبڑ ہوئی ہے؟" انور سولنگی نے تجاہل سے کام لیا۔
"کمال ہے سولنگی صاحب! آپ اس علاقے کی

باأثر شخصیات میں سے ایک ہیں اور آپ کو کچھ خبر ہی نہیں ہے۔'' ڈی ایس پی نے طنزیہ لہجہ اپنایا۔

''میں دو دن سے علاقے سے باہر تھا۔ آج ہی واپس آیا ہوں۔ راستے میں مجھے اطلاع ملی کہ میرے فارم ہاؤس پر ڈاکوؤں کا حملہ ہوا تھا تو میں کوٹھی پر جانے کے بجائے سیدھا یہاں آگیا۔ آپ بتائیں کہ ایسی کون سی خبریں ہیں جنہیں سن کر سرکار نے آپ کی دوڑ لگوا دی ہے۔'' انور سولنگی نے تحمل سے اس کے طنز کا جواب دیا۔

''دو دن کے اندر علاقے میں ڈاکے کی تین بڑی وارداتیں ہوئی ہیں۔ تینوں وارداتوں میں بندے قتل بھی ہوئے ہیں اور زخمی بھی اور تینوں کی تینوں وارداتوں میں آپ سمیت علاقے کے بڑے زمینداروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔'' اس بار ڈی ایس پی نے بھی تحمل کا مظاہرہ کیا اور تفصیل بتانی شروع کی۔

''میرے سوا باقی دو زمیندار کون ہیں بابا! اصل میں ان دنوں میں خبروں سے ذرا دور رہا ہوں تو مجھے معلوم نہیں کہ میرے پیچھے علاقے میں کیا کیا ہوتا رہا ہے۔'' انور سولنگی اپنی لاعلمی کی اداکاری پر قائم رہا۔

''ایک تو سائیں صداقت شاہ ہیں اور دوسرے ان ہی کے رشتے دار قربان شاہ۔ ان دونوں کے آدمیوں پر ڈاکوؤں نے راستے میں حملہ کیا اور فائرنگ کے تبادلے میں دونوں ہی طرف کے لوگوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اب جب تیسری واردات آپ کے فارم ہاؤس پر ہونے کی اطلاع ملی تو اوپر والوں میں کھلبلی مچ گئی اور مجھے حکم ہوا کہ ''اصل'' صورتِ حال معلوم کرنے کی کوشش کروں۔'' ڈی ایس پی نے لفظ ''اصل'' پر خصوصی زور ڈالا جسے انور سولنگی نے نظر انداز کر دیا اور لہجے میں تشویش سمیٹ کر بولا۔

''یہ تو آپ نے بڑی پریشانی والی خبریں سنائی ہیں بابا! کچھ معلوم ہوا کہ اس سب کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اور کس مائی کے لال میں اتنی ہمت پیدا ہوگئی ہے کہ ہم جیسے لوگوں پر ہاتھ ڈال رہا ہے؟''

''اب تک جتنے بھی آدمی قتل ہوئے ہیں، ان میں سے کسی کا بھی تعلق ڈاکوؤں کے مقامی گروہوں سے نہیں ہے۔ ہم ان کی شناخت کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔''

''ذرا تیزی سے کام کریں ڈی ایس پی صاحب! کیونکہ جتنی تیزی سے وہ لوگ وارداتیں کر رہے ہیں، لگتا ہے علاقے میں کوئی شخص محفوظ نہیں رہے گا۔'' انور سولنگی نے تشویش کا اظہار کیا۔

''ہمیں اصل تشویش ہلاکتوں پر ہے۔ تینوں وارداتوں میں اسلحے کا کھلا استعمال ہوا ہے۔'' ڈی ایس پی نے جتایا۔

''اپنے تحفظ کے لیے اسلحہ استعمال کرنا ہمارا حق ہے۔ کوئی آکر حملہ کرے تو ہم خود کو لٹنے یا مرنے کے لیے تو پیش نہیں کر سکتے نا اور نہ ہی پولیس کا انتظار کر سکتے ہیں جو واردات کے بھی کئی گھنٹے بعد موقع پر پہنچتی ہے۔'' انور سولنگی نے اپنا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ پولیس کو بھی رگید دیا جس پر ڈی ایس پی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''قربان شاہ اور صداقت شاہ صاحب سے آپ کے کیسے تعلقات ہیں سولنگی صاحب؟'' ڈی ایس پی نے ذرا سا آگے کو ہوتے ہوئے انور سولنگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

''قربان شاہ اور ہماری گہری دوستی ہے اور ان ہی کے حوالے سے سائیں صداقت شاہ سے بھی اچھے مراسم ہیں۔ قربان شاہ کی درخواست پر ہم الیکشنز میں بھی ہمیشہ سائیں صداقت شاہ کی حمایت کرتے ہیں۔'' انور سولنگی کو احساس تھا کہ ڈی ایس پی گفتگو کو کس رخ پر لے جانے کی کوشش کر رہا ہے پھر بھی اس نے اپنی اور قربان شاہ کی دوستی کا اعتراف کر لیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے انکار کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ڈی ایس پی یا تو پہلے سے یہ بات جانتا ہوگا یا پھر معمولی سی تفتیش کے بعد جان لے گا۔

''ایسا تو نہیں سولنگی صاحب کہ یہ ڈاکوؤں کے بجائے آپ تینوں کے کسی مشترکہ دشمنوں کی حرکت ہو؟ کوئی ایسا دشمن جس کے مفادات پر آپ تینوں کا اتحاد گراں گزر رہا ہو۔ یا پھر وہ کچھ ایسا حاصل کرنا چاہتا ہو جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ اسے آپ تینوں میں سے کسی ایک سے مل سکتا ہے اس لیے اس نے پے در پے آپ تینوں پر ہی حملہ کر دیا۔'' ڈی ایس پی نے اس بار ذرا سا کھل کر سوال کیا۔

''اب یہ معلوم کرنا تو آپ کے محکمے کا کام ہے ڈی ایس پی صاحب کہ وہ کون ہے جس نے علاقے کا امن و امان تباہ کر دیا ہے۔ مشترکہ دشمن والی تھیوری پر تو اسی وقت سوچا جا سکے گا جب میری قربان شاہ اور صداقت شاہ سے ملاقات ہوگی۔ ابھی تک تو مجھے کوئی خبر ہی نہیں تھی کہ ان کے ساتھ بھی یہ سب ہوا ہے۔ ابھی تو بس اتنا جانتا ہوں کہ یہاں جو بندہ مارا گیا ہے، اسے شناخت نہیں کیا جا سکا۔ آپ اس کا کوئی کھوج لگائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا ہمارے کسی مخالف سے تعلق ہے یا نہیں۔'' انور سولنگی نے ایک بار پھر

ساری ذمے داری اس پر ڈال دی۔
''ٹھیک ہے سونگی صاحب! ہم اس پر تفتیش کرتے ہیں لیکن اس کے لیے آپ کو بھی ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔'' ڈی ایس پی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔
''کیوں نہیں بابا! آپ جیسا چاہو گے، ہم تعاون کریں گے۔'' انور سونگی نے پورے جوش و خروش سے یقین دہانی کروائی۔
''ابھی تو میری ٹیم پورے فارم ہاؤس کا اندر باہر سے جائزہ لے گی تاکہ ڈاکوؤں کے متعلق شواہد اکٹھے کیے جاسکیں۔ ان کا کھوج کھرا نکلے گا تو پتا چلے گا کہ وہ کیوں ہاتھ دھو کر آپ دوستوں کے پیچھے لگ گئے ہیں۔''
''آپ کو جو کرنا ہے کرو بابا! میرے لوگ آپ سے پورا تعاون کریں گے۔'' ڈی ایس پی کے لہجے کا شک انور سونگی سے چھپا ہوا نہیں تھا اس لیے وہ جان بوجھ کر بے نیازی کا مظاہرہ کررہا تھا۔
''تم نے زخمی ڈاکو کا بیان لیا نیاز علی؟ اس نے کچھ بتایا اپنے بارے میں؟'' ڈی ایس پی نے اچانک ہی تھانیدار کی طرف رخ کرکے اس سے سوال کیا۔ وہ جو اس ساری گفتگو کے دوران ہاتھ باندھے مؤدب کھڑا رہا تھا، اس اچانک سوال پر گڑبڑا گیا۔
''زخمی ڈاکو......؟ زخمی ڈاکو تو کوئی نہیں پکڑا گیا سر! بس ایک کی لاش ملی ہے۔''
''کمال ہے۔ مجھے تو اطلاع ملی تھی کہ سونگی صاحب کے بندوں نے ایک ڈاکو کو زخمی حالت میں پکڑ رکھا ہے۔'' ڈی ایس پی کی گردن گھوم کر پھر انور سونگی کی طرف ہوگئی۔
''مجھے تو ایسی کوئی اطلاع نہیں۔ کیوں بابا وفا علی! کیا کوئی بندہ پکڑا بھی گیا ہے؟'' سونگی نے اپنا رخ وفا علی کی طرف کرلیا جو تھانیدار ہی کی طرح ہاتھ باندھے باادب باملاحظہ کھڑا ہوا تھا۔
''نہیں سائیں! پکڑا جاتا تو میری مجال تھی بھلا کہ آپ کو خبر نہ کرتا۔ بس وہی بندہ ہے جو گولی کھا کر مرا۔ باقی تو فرار ہوگئے تھے۔'' وفا علی نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے عاجزی سے جواب دیا۔
''آپ کو کوئی غلطی لگ گئی ہے ڈی ایس پی صاحب! ادھر تو نہ آپ کے بندے کو کچھ خبر ہے نہ میرے بندے کو۔'' انور سونگی نے ڈی ایس پی کو مخاطب کرکے اس سے کہا لیکن وہ جان بوجھ کر اسے نظرانداز کرگیا اور تھانیدار کی طرف رخ کرکے اس سے بولا۔

''میری ٹیم باہر انتظار میں بیٹھی ہے نیاز علی! تم جاؤ اور ان کی ہیلپ کرو۔''
''جی سر!'' وہ سیلیوٹ مار کر تیزی سے باہر نکل گیا۔
''کوئی چاپانی نہیں پلاؤ گے وفا علی؟ ہم اور ڈی ایس پی صاحب لمبے سفر سے آئے ہیں بابا! کچھ تو خاطر خدمت کرو ہماری۔'' انور سونگی نے صوفے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے اپنے خادم خاص سے کہا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ ڈی ایس پی شواہد جمع کرنے کے نام پر فارم ہاؤس کی تلاشی لینا چاہتا ہے لیکن وہ مطمئن تھا۔ اسے اپنے بندوں کی کارکردگی پر بھروسا تھا کہ وہ ہرگز بھی پولیس والوں کو اس تہ خانے تک نہیں پہنچنے دیں گے جہاں زخمی قیدی اور اعظم موجود تھے۔
''چائے تیار ہے سائیں! بس ڈی ایس پی صاحب کے فارغ ہونے کا انتظار تھا۔'' وفا علی نے مؤدبانہ جواب دیا۔
''ارے بابا! کام کاج چلتے رہتے ہیں۔ ان کے لیے بھلا کھانا پینا کون روکتا ہے۔ جاؤ، فٹافٹ چائے لگواؤ۔''
''جو حکم سائیں!'' وہ باہر نکل گیا۔
''ایکسکیوزمی، سونگی صاحب! میں ابھی آتا ہوں۔'' ڈی ایس پی نے بھی باہر کا رخ کیا۔ باہر جاکر وہ تھانیدار کو ٹٹولنے کی کوشش کررہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ عام طور پر یہ تھانیدار علاقے کے بڑے زمینداروں کے نمک خوار ہوتے ہیں اور ان کے اشارے پر بہت سے حقائق پر خوبصورتی سے پردہ ڈال دیتے ہیں۔ حقیقتاً تھانیدار نیاز علی بھی ایسا ہی ایک بندہ تھا لیکن اس کیس میں اس کی اپنی معلومات بھی بہت کم تھیں۔ وہ یہ تو بتا سکتا تھا کہ ہر کیس میں ڈاکوؤں کے حملے کا ذکر ہے اور اس پر اسی حوالے سے رپورٹ درج کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا ہے لیکن وہ اس سب کے پیچھے موجود عوامل اور مقاصد سے اتنا ہی بے خبر تھا جتنا کہ اور لوگ۔ ڈی ایس پی اس صورت حال پر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔
''اسٹوپڈ! تھانیدار تو وہ بندہ ہوتا ہے جس کے علاقے میں پتا بھی کھڑکے تو اسے اس کی وجہ معلوم ہوتی ہے اور تم اتنے قتل و غارت کے باوجود انجان اور بے خبر بیٹھے ہو۔'' اس نے اپنا سارا غصہ تھانیدار پر نکال دیا۔ وہ کان دبا کر سنتا رہا۔ افسر کی ڈانٹ کھالینا آسان تھا کہ افسر زیادہ سے زیادہ اس کی نوکری پر اثرانداز ہوسکتا تھا جبکہ زمیندار سے دشمنی مول لینے کا مطلب تھا اپنی جان، مال اور عزت سمیت ہر شے کو داؤ پر لگانا۔
''میرے پاس پکی خبر ہے کہ مرنے والے کا ایک

ساتھی اور تھا جسے ممکنہ طور پر ان لوگوں نے پکڑ کر قید کرلیا ہے لیکن اب منہ سے بھاپ نہیں نکال رہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم بھی ان کے ساتھ شامل ہو۔'' جھنجلایا ہوا ڈی ایس پی، تھانیدار پر الزام لگانے سے بھی گریز نہیں کررہا تھا۔

''قسم لے لیں سر! مجھے ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ آپ مجھے اپنی خبر کا سورس بتائیں تو میں سچ اگلوانے کے لیے ان لوگوں پر دباؤ ڈال سکتا ہوں۔''

''تم صرف اتنا کرو کہ آنکھیں کھول کر فارم ہاؤس کی تلاشی کے کام کی نگرانی کرواور دیکھو کہ یہاں کوئی خفیہ تہ خانہ وغیرہ تو نہیں ہے جہاں انہوں نے ہمارا مطلوبہ بندہ چھپا رکھا ہے۔'' ڈی ایس پی نے اسے ڈپٹا اور واپس اندر چلا گیا جہاں اس کی عدم موجودگی میں میز پر لوازمات کا ڈھیر لگ چکا تھا اور انور سونگی پورے جوش وخروش سے اس کی میزبانی پر تلا بیٹھا تھا۔ حقیقت میں وہ دونوں ہی اس بات کو جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مکمل سچ نہیں بول رہے ہیں لیکن انہیں آپس میں تعاون کی اداکاری بھی کرنا تھی سو یہ اداکاری جاری تھی۔ ڈی ایس پی لذت کام ودہن اور گفتگو کے سلسلے کے ساتھ ساتھ مسلسل موبائل پر بھی مصروف تھا۔ اچانک ہی اس نے سر اٹھایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''خبر ملی ہے کہ سائیں صداقت شاہ کو کرپشن کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا ہے۔ آج سویرے سویرے اینٹی کرپشن والوں نے حویلی پر ریڈ کرکے بہت سامان ضبط کرلیا ہے اور ان کی وزارت کے دنوں میں کی جانے والی بے ضابطگیوں کی جانچ پڑتال کی جارہی ہے۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ سائیں صداقت شاہ تو بہت اچھی شہرت کے مالک ہیں۔'' سونگی کو شدید حیرت ہوئی۔

''بندہ اینٹی کرپشن والوں کے ریڈار پر آجائے تو ساری نیک نامی دھری رہ جاتی ہے۔'' ڈی ایس پی نے ایک بڑا سا گلاب جامن اپنے منہ کی طرف لے جاتے ہوئے تبصرہ کیا۔ اس تبصرے میں ایک غیر محسوس سی تنبیہہ بھی تھی جس کو محسوس کیے بغیر سونگی اپنے موبائل پر مصروف ہوچکا تھا۔

''خبروں میں تو ایسی کسی بات کا ذکر نہیں ہے۔'' مطلوبہ خبر نہ ملی تو سر اٹھا کر سوالیہ نظر سے ڈی ایس پی کو دیکھا۔

''ابھی اس خبر کو میڈیا پر آنے سے روکا گیا ہے۔ میں تو آپ کو اندر کی خبر دے رہا ہوں اور یقین جانیے، مجھے ملنے والی اندر کی خبریں بالکل سچ ہوتی ہیں۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں سونگی کو جواب دیا۔ اس بار سونگی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ صداقت شاہ اس کے مقابلے میں بڑے زمیندار تھے اور ان کا سیاسی اثر رسوخ بھی اچھا خاصا تھا اس کے باوجود ان کے ساتھ یہ سب ہوگیا تھا تو اس کا اپنے لیے فکرمند ہونا تو بنتا تھا۔

''سر! یہ دونوں میاں بیوی یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ وفا علی کے مہمان ہیں اور کل سے فارم ہاؤس پر رکے ہوئے ہیں۔ میں انہیں آپ کے پاس لے آیا ہوں کہ اگر آپ ان سے کچھ پوچھنا چاہیں تو پوچھ لیں۔'' کمرے کی سرد اور بوجھل فضا کو تھانیدار کی آواز نے توڑا۔ وہ اپنے افسر کو کارکردگی دکھانے کے چکر میں نیلی اور مومی کو وہاں لے آیا تھا۔

''سلام صاحب!'' دونوں نے ڈی ایس پی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر سلام کیا لیکن وہ یہ دیکھ کر تھوڑی سی تشویش میں مبتلا ہوگئے تھے کہ ان پر نظر پڑتے ہی ڈی ایس پی کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ پھر اس کی طرف سے تابڑ توڑ سوالات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ نام، پیشہ، رہائش، وفا علی سے دوستی کی مدت اور یہاں آنے کی وجوہات تک سب پوچھ ڈالا اس نے۔ دونوں سنبھل کر ہر سوال کا طے شدہ جواب دیتے چلے گئے۔

''بچے کتنے ہیں تم دونوں کے؟'' کئی سوالوں کے بعد اس نے یہ سوال کیا۔

''بچے نہیں ہیں۔ اصل میں ابھی ہماری شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔'' جواب مومی نے دیا۔

''بچے نہیں ہیں تو تم دونوں کراچی میں ڈاکٹر مجاہد کمال کے کلینک پر کیا کررہے تھے؟'' ڈی ایس پی نے ان کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔

''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم کسی ڈاکٹر مجاہد کمال کو نہیں جانتے۔ نہ ہی ہمارا ابھی ان کے کلینک پر جانا ہوا ہے۔'' مومی نے ساتھ کھڑی نیلی کا ہاتھ تھام کر تسلی دینے والے انداز میں دبایا اور ڈی ایس پی کی بات سے صاف انکار کردیا۔

''پولیس کے پاس فوٹیج ہیں تمہاری۔'' وہ انکار کے باوجود مصر رہا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سر! ایک جگہ جہاں ہم کبھی گئے ہی نہیں، وہاں سے ہماری فوٹیج کیسے مل سکتی ہیں۔'' مومی کا مضبوط لہجہ نیلی کا بھی حوصلہ بڑھا گیا اور اسے یاد آگیا کہ جب وہ اعظم کے حصول کے لیے کلینک پر گئے تھے تو اس کا حلیہ یکسر مختلف تھا اور مومی نے تو حجاب ہی پہن رکھا تھا اس لیے فوٹیج والی بات جھوٹ کے سوا کچھ نہیں اور یہ پولیس افسر

انہیں بلف کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کی اس حرکت سے یہ بات بھی واضح ہوگئی تھی کہ وہ محض اپنی ڈیوٹی پوری کرنے نہیں آیا ہے بلکہ ان لوگوں کی ایما پر آیا ہے جو ہر حال میں اعظم کا حصول چاہتے ہیں۔

''نیاز علی! تمہیں خیال رکھنا ہوگا کہ اوپر سے کلیئرنس ملے بغیر یہ دونوں میاں بیوی یہاں سے کہیں اور نہ جاسکیں۔ ان کے اصرار کی وجہ سے فی الحال میں ان کی گرفتاری کا آرڈر نہیں دے رہا ہوں لیکن تصدیق ہونے تک انہیں ہمارا پابند رہنا ہوگا۔'' بظاہر اس نے موی کی بات پر اعتبار نہیں کیا لیکن فوری گرفتاری کا حکم نہ دینے کا یہی مطلب تھا کہ اس کے پاس اپنی بات ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت موجود نہیں تھا اور صرف ایک تکا ہی لگایا تھا۔ اس کے بعد وہ ان دونوں سے ڈاکے سے متعلق بھی سوال کرتا رہا۔ ان دونوں نے بھی وہی جوابات دیے جو اب تک دیگر افراد نے دیے تھے۔

ڈی ایس پی فارم ہاؤس پر اچھا خاصا وقت گزار کر واپس لوٹا تو کچھ جھنجلایا ہوا تھا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کہیں سے کوئی کھوج کھرا ملنے پر یہاں آیا ہے لیکن یہاں تک پہنچنے کے بعد گویا ساری نشانیاں گم ہوگئی تھیں۔ اس کے آدمی کسی خفیہ تہ خانے یا مقام کو ڈھونڈنے میں قطعی ناکام رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انور سونگی نے وہ تہ خانہ بہت محفوظ بنوایا تھا۔ صداقت شاہ اور قربان شاہ سے خوشگوار تعلقات اپنی جگہ لیکن مزاج و کردار کے اعتبار سے وہ ان دونوں سے خاصا مختلف تھا اور اس کے اندر عام جاگیرداروں اور زمینداروں والی خوبو پائی جاتی تھی۔ وہ اپنے مخالفین و معتوبین کو خفیہ تہ خانے میں قائم کردہ قید خانے اور ٹارچر سیل کی سیر کرواتا رہتا تھا لیکن وہ سارے کے سارے لوگ آنکھوں پر پٹی باندھ کر یا بے ہوشی کی حالت میں وہاں لے جائے جاتے تھے اس لیے کسی کو تہ خانے کے محل وقوع کا کچھ پتا نہیں تھا۔ تہ خانے کا دوسرا مقصد عیاشی تھا۔ انور سونگی کے سالے بڑے تگڑے تھے جو خود تو ہر قسم کی عیاشی کرتے تھے لیکن انہیں بہنوئی کی اپنی اکلوتی بہن سے بے وفائی منظور نہ تھی اور وہ اس پر کڑی نگاہ رکھنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ اپنے ان خوفناک سالوں سے محفوظ رہنے کے لیے وہ تہ خانے کا استعمال کرتا تھا۔ یوں اسے زیادہ سے زیادہ محفوظ بنانا اس کی اہم ضرورت تھی۔

ڈی ایس پی کی ٹیم کی ناکامی کی ایک وجہ وفا علی کی چالاکی بھی تھی۔ وہ اس طرح سے انہیں چکر دیتا رہا تھا کہ وہ اندازہ ہی نہیں لگا پائے تھے کہ تہ خانے تک پہنچنے کا راستہ کس جگہ ہوسکتا ہے۔ اس نے ٹیم کے ہر رکن پر پُرتکلف خاطر مدارت اور بھاری لفافوں کا ایسا بار ڈال دیا تھا کہ انہوں نے بھی بس ڈیوٹی ہی بھگتائی تھی۔

''آپ کا بہت شکریہ سونگی صاحب! امید ہے کہ آئندہ بھی آپ اسی طرح قانون سے تعاون کرتے رہیں گے۔'' روانگی سے قبل اس نے بادلِ ناخواستہ سونگی کا شکریہ ادا کیا۔

''بالکل بابا بالکل۔ قانون کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔'' سونگی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جس معنی خیز انداز میں یقین دہانی کروائی، اسے وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جن کی جیبیں اس کی طرف سے عطا کردہ لفافوں کے بوجھ سے بھاری ہورہی تھیں۔ پولیس والوں کے جاتے ہی اس نے قربان شاہ کا نمبر ملایا۔

''سب خیر ہے دوست؟'' قربان شاہ نے اس کی کال وصول کی اور بے قراری سے پوچھا۔

''ابھی تو سب خیر ہے اور مصیبت ٹل گئی ہے لیکن لگتا نہیں ہے کہ وہ لوگ پیچھا چھوڑیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کے پاس پکی خبر ہے۔ اور تو اور، ڈی ایس پی ان دونوں میاں بیوی پر بھی شک ظاہر کرگیا ہے۔'' اس نے قربان شاہ کو پوری تفصیل سنائی۔

''مطلب کہ ان لوگوں کو وہاں سے بھی نکالنا پڑے گا۔'' قربان شاہ بڑبڑائے۔

''یہی ٹھیک رہے گا کیونکہ جب تک دوسرے لوگوں کی بات تھی، میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں جان مال سب خرچ کرکے ان کا مقابلہ کرسکتا تھا لیکن سرکار سے ٹکر لینا میرے بس کی بات نہیں ہے۔''

''گھبراؤ مت۔ میں تھوڑی دیر میں کوئی انتظام کرتا ہوں۔'' اس کے معذوری ظاہر کرنے پر قربان شاہ نے اسے تسلی دی۔

''میں نے سائیں صداقت شاہ کے بارے میں بھی ایک اڑتی اڑتی خبر سنی ہے کہ انہیں اینٹی کرپشن والوں نے گرفتار کرلیا ہے۔ کیا یہ خبر سچ ہے؟'' اس نے اس خبر کی تصدیق چاہی جس نے اصل میں اسے کمزور کردیا تھا۔

''یقیناً تم پہلے ہی کرچکے ہو۔ اب تصدیق یا تردید سے کیا حاصل۔'' قربان شاہ کو فوراً ہی اس کے پیچھے ہٹنے کی وجہ سمجھ آگئی لہٰذا خشک لہجے میں کہتے ہوئے رابطہ منقطع کردیا۔ انور سونگی نے کھسیائی ہوئی کیفیت میں فون ہاتھ

سے رکھ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ دوستی کی آزمائش ہار گیا ہے لیکن کسی مسلسل آزمائش میں پڑنے کے مقابلے میں اس کے لیے یہ ہار قابلِ قبول تھی۔

☆☆☆

یخ بستہ برف زار میں زندگی کے کئی دن گزارنے کے بعد بیجنگ جیسے مصروف اور پرہنگام شہر کی صبح میں آنکھ کھولنا بھی زندگی کا ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اگرچہ انہوں نے اس برف زار سے سیدھے بیجنگ لینڈ نہیں کیا تھا اور راستے میں کچھ مقامات پر رکتے ہوئے یہاں پہنچے تھے لیکن ان مقامات اور بیجنگ میں بہت فرق تھا۔ پھر وہ کسی بھی جگہ محض چند گھنٹوں کے آرام کے لیے رکتے تھے۔ انہیں نہ تو اس جگہ کو دیکھنے کا موقع ملتا تھا، نہ مقامی آبادی سے بات چیت اور میل جول کی نوبت آئی تھی مگر اب بیجنگ کی بات الگ تھی۔ وہ دنیا کی سب سے بڑی آبادی رکھنے والے دارالحکومت میں موجود تھے اور امکان تھا کہ اب کئی دن تک یہیں قیام کریں گے۔ اس قیام کے عرصے میں بہت کچھ دیکھنے اور جاننے کا بھی موقع مل سکتا تھا اس لیے اس شہر میں آنکھ کھولنا اسے ایک مختلف کیفیت سے دوچار کر گیا تھا۔ کچھ دیر بستر پر لیٹے لیٹے اس کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے سجل کا چہرہ لہرایا تو شعور نے پہلی بار تسلیم کیا کہ یہ جو بیجنگ میں آنکھ کھولنا سب سے الگ محسوس ہو رہا ہے تو اس کی بنیادی وجہ بیجنگ نہیں بلکہ بیجنگ میں سجل کی موجودگی ہے۔

سجل کا خیال آتے ہی اس کی طبیعت بری طرح بے چین ہوگئی۔ یوان منگ کے اندازے کے مطابق اسے برین ٹیومر تھا جس کی تصدیق ظاہر ہے کسی اسپتال میں ہی ہوسکتی تھی۔ سجل کو دیگر افراد کے ساتھ بیجنگ آئے ہوئے اچھے خاصے دن ہوگئے تھے اس لیے یہ تو طے تھا کہ سارے ضروری ٹیسٹ انجام پا چکے ہوں گے اور یوان منگ کے اندازے کی تصدیق یا تردید بھی ہو چکی ہوگی لیکن اسے ابھی تک اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل سکی تھی۔ جہاں تک اس کی اپنی بات تھی تو اسے اپنے اندر سے کچھ اچھے اشارے نہیں مل رہے تھے۔

''نہیں، وہ ٹھیک ہوگی۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ صرف میرے اندر کا ڈر ہے جو مجھے وہم میں مبتلا کر رہا ہے۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا بھی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ چینی ہر طرح کی ٹیکنالوجی میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ اگر سجل کو ٹیومر ہوا بھی تو یہاں اس کا بہترین علاج ہو جائے گا۔'' خود اپنے آپ سے سوال جواب کرتے اور الجھتے سلجھتے اس نے بستر چھوڑ دیا۔

''مجھے شین یا ہی یا یوان منگ میں سے کسی سے رابطہ کر کے سجل کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے بلکہ سیدھے اسپتال جانے کا مطالبہ کرنا چاہیے۔'' غسل خانے میں دانتوں کو برش کرتے ہوئے وہ اپنا آئندہ کا پروگرام طے کر رہا تھا۔ اس پروگرام کو طے کرتے ہوئے اسے اس اسمارٹ سے لڑکے کا خیال آیا جو اسے اس کمرے میں چھوڑ کر گیا تھا اور جس کا کہنا تھا کہ وہ بیجنگ میں ان کا مہمان ہے۔

''کیا نام تھا اس کا؟'' اس نے کلی کرتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ یاد نہ آیا کہ اس وقت تھکن اتنی زیادہ تھی کہ کسی سے کچھ کہنے سننے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا لہٰذا اس نے اپنے میزبان کی بھی کوئی بات توجہ سے نہیں سنی تھی۔

''پہلے وکی اور جارو کو چیک کرتا ہوں پھر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔'' منہ ہاتھ دھو کر تولیا سے صاف کرتے ہوئے اس نے طے کیا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بال سنوارنے لگا۔ آئینے میں دکھائی دینے والا اپنا خود کا عکس اسے خاصا کمزور اور سنولایا ہوا محسوس ہوا۔ حالات کی سختی نے اس کی شخصیت پر کافی اثر ڈالا تھا اور یونیورسٹی کے زمانے کا بے پروا سا معاذ کہیں کھو سا گیا تھا۔ وہ اس زمانے کی یادوں میں کھوتا، اس سے قبل ہی انٹرکام کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

''السلام علیکم جناب! میں آپ کا میزبان یوسف مافوسائی ہوں اور جاننا چاہتا ہوں کہ اگر آپ جاگ گئے ہیں تو ناشتا کب تک کرنا پسند کریں گے؟'' دوسری طرف سے سنائی دیتے شستہ اور مہذب لہجے نے اسے یاد دلایا کہ رات اسے اس کمرے تک پہنچانے والے نوجوان کا نام یوسف مافوسائی تھا۔

''میں ریڈی ہوں اور ناشتے کے لیے باہر آرہا ہوں۔ براہ مہربانی میرے ساتھیوں کو بھی جگا دو۔''

''وہ آل ریڈی ناشتے کی ٹیبل پر موجود ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ اپنے کمرے سے نکل کر دائیں جانب موجود سیڑھیوں سے نیچے آجائیں۔ ہم سب وہیں لاؤنج میں آپ کو اپنے منتظر ملیں گے۔'' یوسف نے اسے اطلاع دی۔

''اوکے۔'' اس نے مختصر جواب دے کر ریسیور رکھ دیا اور ایک بار پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ وہ ابھی تک اسی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں تھا جنہیں سونے کے لیے استعمال کیا تھا لیکن دیکھنے میں یہ کپڑے برے نہیں لگ رہے تھے اور انہیں پہن کر سب کے ساتھ ناشتے میں شریک ہوا جا سکتا تھا۔

"صبح بخیر جناب!" وہ ناشتے کی میز پر پہنچا تو سب سے پہلے یوسف مافوسائی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ مسکراتے چہرے والا ایک خوش شکل نوجوان تھا جس کا قد اور آنکھیں عام چینیوں کے مقابلے میں بڑی تھیں اور وہ بہت شستہ اردو بولتا تھا۔

"صبح بخیر! میں معذرت چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ سب کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔" وہ چینی باشندہ ہو کر اتنی اچھی اردو میں بات کر رہا تھا تو اس کا بھی فرض بنتا تھا کہ خالصتاً اپنی ہی زبان کا استعمال کرے۔

"اتنے تکلف میں بھی نہ پڑیں کہ ہمیں لگے کہ ہم بیجنگ کے بجائے لکھنؤ میں ہیں۔" برابر میں بیٹھے وکی نے اس کے کان میں سرگوشی کی لیکن یہ سرگوشی اتنی بلند تھی کہ یوسف تک بھی اس کی بات بہ خوبی پہنچ گئی اور وہ دھیرے سے ہنس کر بولا۔

"آپ کا یہ خادم بھی نصف لکھنوی ہی ہے۔"

"مطلب؟" وکی نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میری والدہ کا تعلق لکھنؤ سے ہے۔ وہ یہاں اپنی تعلیم کے لیے آئی تھیں۔ میرے والد اور ان کے دل آپس میں مل گئے تو دونوں نے شادی کر لی۔ یوں وہ ہمیشہ کے لیے یہیں رہ گئیں۔" اس کے جواب نے اس کی اچھی اردو اور عام چینیوں سے قدرے مختلف دکھائی دینے کی وجہ واضح کر دی۔

"یعنی ہمیں آپ کی موجودگی میں چینی کے ساتھ ساتھ لکھنوی آداب کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا پڑے گا۔" وکی نے اس انداز میں یہ جملہ کہا کہ جیسے وہ یوسف سے بہت زیادہ مرعوب ہو گیا ہو۔ یوسف اس کے اس انداز پر ایک بار پھر ہنس پڑا اور بولا۔

"آپ کو ایسا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بس اپنی تہذیب کے مطابق رہیے گا۔ بطور میزبان مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"دیکھ لو بیٹا وقاص! بہت بھاری ذمے داری ڈال دی ہے تم پر میاں یوسف نے۔ اب تم جو کچھ بھی ارشاد فرماؤ گے، وہ تمہاری تہذیب میں شمار ہوگا۔" معاذ نے وکی کو احساس دلایا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ یہاں پر اگر کراچی والا ابے، تبے، جگر، سالا وغیرہ وغیرہ پھسل گیا زبان سے تو اپنے وطن کی بہت بے عزتی ہو جائے گی۔" اس بار وکی کی سرگوشی سچ مچ سرگوشی تھی اور وہ پریشانی سے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کے عین مقابل بیٹھا جارو جو کہ ساری گفتگو خاموشی سے سن رہا تھا، اس کی اس حالت پر شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

"میرے خیال میں باتیں تو چلتی رہیں گی اس لیے ہمیں پہلے ناشتا کر لینا چاہیے۔ میرے والد فرماتے ہیں کہ رزق کو انتظار نہیں کروانا چاہیے۔" یوسف نے وکی کی سرگوشی کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی توجہ ناشتے کی طرف مبذول کی۔

"چین میں بھی والد اس طرح کی نصیحتیں کرتے ہیں؟ ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ شعبہ صرف ہمارے ہاں کے اباؤں نے سنبھال رکھا ہے۔" وکی کہاں خاموش رہ سکتا تھا۔ اس کی زبان میں خارش ہوئی اور بے ساختہ ہی بول پڑا۔

"یہ بھی تو دیکھو کہ حضرت طویل عرصے سے ایک ہندوستانی خاتون کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ یقینی طور پر کچھ عادتیں وہاں سے بھی منتقل ہوئی ہوں گی۔" جارو نے نکتہ پیش کیا جسے سن کر وکی یوں سر ہلانے لگا جیسے پسندیدہ ترین کلام سن کر سر دھن رہا ہو۔ یوسف نے بھی سمجھ لیا کہ گفتگو کا یہ سلسلہ رکنے والا نہیں اس لیے آدابِ میزبانی نبھاتے ہوئے انہیں ناشتے کے لوازمات پیش کرنے لگا۔ ہلکی پھلکی گپ شپ کے دوران آخر کار ناشتا ختم ہو ہی گیا۔ ناشتے کے بعد وہ لوگ ڈائننگ کے ساتھ ہی متصل سٹنگ ایریا میں آ بیٹھے۔

"میرے کچھ ساتھی مجھ سے قبل بیجنگ پہنچ گئے تھے۔ کیا آپ ان کے بارے میں مجھے کچھ بتا سکتے ہیں؟ خاص طور پر یہ کہ ہماری ان سے ملاقات کب تک ممکن ہو سکے گی؟" معاذ کا دھیان ناشتے کے دوران بھی ادھر ہی لگا رہا تھا اس لیے اب مزید صبر نہیں کر سکا۔

"مجھے آپ کے ساتھیوں کے بارے میں آگاہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے مس سونیا سے تو آپ فوری ملاقات کر سکیں گے البتہ باقی دو سے میں آج آپ کو بعد از نمازِ جمعہ ملوانے لے چلوں گا۔"

"نمازِ جمعہ...؟" اس کی بات سن کر ان تینوں کو ہی جھٹکا لگا۔ اتنے عرصے سے وہ جس بھاگ دوڑ میں وقت گزار رہے تھے، اس میں نماز کے لیے تو پھر بھی مہلت نکل آتی تھی لیکن اس طرح کی اجتماعی عبادات تو بالکل چھوٹ ہی گئی تھیں۔

"جی، نمازِ جمعہ۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ لوگ مسلمان ہیں تو اس لیے میں نے یہ پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔ اگر

آپ لوگ اسے پسند نہیں کرتے تو میں پروگرام میں آپ کی حسب منشا تبدیلی کردوں گا لیکن یہ واضح رہے کہ نماز کے اوقات میں آپ کو میری خدمات دستیاب نہیں ہوں گی۔''
یوسف نے اس کے انداز سے کوئی اور ہی نتیجہ اخذ کرلیا۔
''ایسی کوئی بات نہیں ہے میرے بھائی! میں تو بس اس لیے ٹھٹک گیا تھا کہ کافی طویل عرصے بعد ہمیں یہ موقع ملنے جارہا ہے کہ ہم باقاعدہ نمازِ جمعہ ادا کرنے کی سعادت حاصل کرسکیں گے۔'' معاذ نے اسے وضاحت دی پھر فرمائشی لہجے میں بولا۔
''کیا یہ ممکن ہے کہ ہم نمازِ جمعہ مسجد نیوجیہ میں ادا کرسکیں؟''
''بالکل، آپ کو یہ سن کرخوشی ہوگی کہ ہم نماز کے لیے مسجد نیوجیہ ہی جانے والے ہیں لیکن وہاں تک جانے کے لیے آپ لوگوں کو کافی پہلے تیار ہونا پڑے گا۔ مسجد یہاں سے لگ بھگ ایک گھنٹے کے فاصلے پر ہے اور میں چاہوں گا کہ ہم نماز سے قبل وہاں قائم فوڈ اسٹریٹ کے کسی ریسٹورنٹ میں لنچ کریں۔ وہاں کئی اچھے حلال فوڈز کے ریسٹورنٹ بھی موجود ہیں جہاں سے چاہیں تو پاکستانی اور ہندوستانی کھانا بھی مل سکتا ہے۔'' یوسف نے پوری تفصیل سے آگاہ کیا۔
''فکر مت کرو۔ ہم بالکل وقت پر تیار ہوجائیں گے۔'' معاذ نے اسے یقین دہانی کروائی اور تائیدی نظروں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔
''کیوں نہیں۔ ہم اس موقع کو ہرگز بھی ضائع کرنا پسند نہیں کریں گے۔'' وکی نے جلدی سے کہا جبکہ جارو نے محض تائید میں سرہلانے پر اکتفا کیا۔
''اس وقت تک آپ لوگ چاہیں تو آرام کریں یا پھر ٹی وی وغیرہ دیکھ کر وقت گزار لیں۔ مجھے اس دوران کچھ دوسرے کام انجام دینا ہیں اس لیے اس عرصے میں، میں آپ کی خدمت سے معذور رہوں گا۔'' یوسف نے معذرت خواہانہ لہجے میں انہیں بتایا۔
''اس کا کوئی مسئلہ نہیں لیکن کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ اگر میں مسٹر شین یا ہی یا یوان منگ سے رابطہ کرنا چاہوں تو اس کا کیا ذریعہ ہوگا؟'' اسے اور اس کے ساتھیوں کو چین تو لے آیا گیا تھا لیکن ابھی تک یہ واضح نہیں تھا کہ ان کی یہاں آمد کا کیا مقصد تھا اس لیے وہ اس سلسلے میں کسی ذمے دار سے دوٹوک بات کرنا چاہتا تھا۔
''ان میں سے جو آپ سے بات کرنے کی ضرورت محسوس کرے گا، خود آپ سے رابطہ کرلے گا۔ میری ذمے داری صرف آپ لوگوں کا خیال رکھنے کی ہے۔'' اس نے نرم لہجے میں انہیں آگاہ کیا اور شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ انہیں جو ناشتا فراہم کیا گیا تھا، وہ اسی نے تیار کیا تھا اور ناشتے کے بعد ڈش واشر میں برتنوں کی صفائی بھی اسی نے انجام دی تھی۔
''اور ہاں، ایک بات اور...'' وہ جاتے جاتے رکا۔
''آپ میں سے کوئی بھی اکیلا باہر نکلنے کی غلطی نہ کرے۔ آپ سب غیر مقامی ہیں اور دور ہی سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ اگر کہیں بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں میں سے کسی فرد نے روک لیا تو قانونی دستاویزات کی عدم موجودگی کے باعث آپ مشکل میں پڑسکتے ہیں۔'' وہ تنبیہہ کرنے کے بعد وہاں سے روانہ ہوگیا تو وہ تینوں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔
''کیا یہاں ہماری حیثیت قیدی کی ہے؟'' سب سے پہلے وکی نے لب کشائی کی۔
''میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ قیدیوں کو اتنی سہولیات کوئی نہیں دیتا۔'' جارو نے اس کی تردید کرتے ہوئے دلیل دی۔
''سنا ہے اے کلاس میں قیدیوں کو ساری سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔'' وکی کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ ون یونٹ بنگلے کے طرز پر بنا ہوا وہ گھر بہت زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس نے مین گیٹ جاکر چیک کیا تو پتا چلا کہ گیٹ لاک ہے اور وہ اپنی مرضی سے باہر نہیں جاسکتے۔ وہ تھوڑا اپنا ہوا سا ان کے درمیان واپس آیا۔
''میں نے کہا تھا نا کہ یہاں ہماری حیثیت اے کلاس قیدی کی ہے۔ موصوف جاتے ہوئے گیٹ لاک کرگئے ہیں اور گھر کی تعمیر اس نوعیت کی ہے کہ گیٹ کے سوا باہر جانے کا کوئی دوسرا راستہ موجود نہیں ہے۔''
''تمہیں جانا کہاں ہے جو اتنے بے چین ہورہے ہو؟'' معاذ نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں اس سے پوچھا تو وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔
''جانا تو کہیں نہیں ہے لیکن پھر بھی اس طرح لاک کرکے جانا انسلٹنگ ہے۔'' اس نے منہ بنا کر جواب دیا اور جارو کے برابر میں دھپ سے بیٹھ گیا۔ جارو اس کے مقابلے میں پُرسکون تھا اور اب تک ایک بار بھی نہ تو کسی چیز پر اعتراض کیا تھا نہ ہی شک وشبہے کا اظہار۔
''انسلٹنگ......!'' معاذ اس کے الفاظ کے انتخاب پر ہنسا۔
''تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے پاکستان سے کسی سفارتی

وفد کے ساتھ چین آئے ہو اور تمہیں حسب مرتبہ پروٹوکول نہ دیا جا رہا ہو۔"

"آپ بھی نا....." وکی اس کی بات پر جھینپ گیا۔

بعد کا سارا وقت پھر سکون سے گزرا۔ معاذ نے یہ سارا وقت اپنے لیے فراہم کردہ کمرے میں گزارا۔ کرنے کے لیے اس کے پاس بھی کچھ نہیں تھا اس لیے ماضی کو دہراتا رہا اور غور کرتا رہا کہ اس سے کہاں کہاں اور کون کون سی غلطی ہوئی ہے۔ اس سارے حساب کتاب میں اچھا خاصا وقت گزر گیا پھر اس نے اٹھ کر نماز کے لیے تیاری شروع کر دی۔ ملبوسات کے بارے میں رات ہی یوسف نے بتا دیا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کے سائز کے لباس ان کے کمروں کی وارڈروب میں موجود ہیں۔ اس نے الماری کھول کر دیکھی تو پراستری شدہ دو تین جوڑے الماری میں ٹنگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک جوڑا ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص کا بھی تھا۔ اس نے وہی منتخب کیا اور غسل کے لیے چلا گیا۔ پورے اطمینان سے نماز کے لیے تیاری کرنے کا موقع عرصے بعد اس کی زندگی میں آیا تھا۔ اس ساری الجھن میں پڑنے سے پہلے بھی وہ اپنی روزمرہ کی مصروفیت میں اتنا مگن رہتا تھا کہ اس طرح اہتمام کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ ہاں عیدین پر امی اتنی محبت سے ساری تیاری کرتی تھیں کہ وہ بھی اپنی بے پروائی چھوڑ کر ان کے حکم کی تعمیل میں اچھی طرح تیار ہو کر ابو اور سعد کے ساتھ نمازِ عید کے لیے چلا جاتا تھا۔

عید کے دن کی یاد کے ساتھ ہی یادوں کی ایک برات سی اتر آئی۔ عید کے دن کی رونق، امی کے ہاتھ کے تیار کردہ لذیذ پکوان، علینہ کی لباس سے لے کر چوڑی، چپل اور مہندی تک ایک ایک شے کے لیے فکرمندی، ابو کی طرف سے بغیر مطالبہ کیے بھاری عیدی کی ادائیگی، دن بھر مہمانوں کی آمدورفت..... اور نہ جانے کیا کیا تھا جو یاد آنا شروع ہوا تو آتا چلا گیا اور پھر یوسف کی واپسی پر ہی یہ سلسلہ ٹوٹ سکا۔

"بہت اچھی بات ہے کہ آپ لوگ پہلے ہی سے تیار ہیں۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔" وہ ان تینوں کو تیار پا کر خوش ہو گیا۔ خود وہ صبح سے ہی نک سک سے تیار تھا۔ اس لیے اسے کسی قسم کی تیاری کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک آرام دہ گاڑی میں ان کے سفر کا آغاز ہوا۔ گاڑی یوسف خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ سڑکوں پر ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چھوٹی بڑی بے شمار گاڑیوں کا سیلاب بہہ رہا تھا اس کے باوجود سائیکل سواروں کے لیے الگ سے ٹریک موجود تھا۔ راستے میں یوسف انہیں مختلف مقامات کے بارے میں بتاتا رہا۔

"مسجد نیوجیہ ژوان وو کے علاقے میں ہے۔ اس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو وہاں جا کر اپنائیت کا احساس ہوگا۔" یوسف نے انہیں بتایا تو وہ سر ہلا کر رہ گئے۔ اچھا خاصا طویل فاصلہ طے کر کے وہ ژوان وو کے علاقے میں داخل ہوئے تو یوسف سیدھا انہیں اس جگہ لے گیا جہاں مختلف ریسٹورنٹس اور کھانے پینے کی دکانوں کی وجہ سے فوڈ اسٹریٹ کا سماں تھا۔ یوسف نے گاڑی جس ریسٹوران کے آگے روکی، اس پر آویزاں ہوٹل کے نام کے بورڈ پر ایک جانب عربی زبان میں "مؤتمر اسلامی" لکھا ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ مسلمان اس ریسٹورنٹ میں بلاجھجک حلال کھانا کھا سکتے ہیں۔ ریسٹورنٹ میں اطمینان سے خوش ذائقہ کھانا تناول کرنے کے بعد انہوں نے مسجد نیوجیہ کا رخ کیا اور یوسف ایک اچھے میزبان کی طرح انہیں مسجد کے بارے میں معلومات فراہم کرنے لگا۔ اس نے بتایا۔

"مسجد نیوجیہ کی بنیاد 996ء میں ایک عرب عالم نصرتین نے رکھی تھی۔ اس وقت سے اب تک چین میں مختلف افراد کی حکمرانی رہی اور متعدد بار مسجد کی تعمیر اور تزئین و آرائش کا کام سرکاری خرچ پر ہوا۔ یہاں تک کہ جمہوریہ چین کے قیام کے بعد بھی تین بار مسجد کی بھرپور تزئین و آرائش کا کام ہو چکا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ چینی حکمران ہر دور میں روشن خیال تھے اور مذہبی رواداری و آزادی کا خیال رکھتے تھے۔" وکی نے اس کی بات سن کر تبصرہ کیا۔ جب سے وہ رہائش گاہ سے نکلے تھے، گفتگو کی زیادہ ذمے داری اسی نے سنبھال رکھی تھی کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ معاذ پر عجیب سی کیفیت طاری ہے اور وہ بولنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ جارو ویسے ہی کم کم بولتا تھا تو اسے ہی اخلاقیات نبھانی پڑ رہی تھی۔

"ہم چینی عمومی طور پر روشن خیال لوگ ہیں اور کسی بھی انسان سے محض مذہب کی بنیاد پر نفرت نہیں کرتے۔" یوسف نے تفاخرانہ لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ وہ اپنے اس دعوے میں کتنا درست تھا، اسے پرکھنے کا تو موقع نہیں تھا لیکن یہ بات قابلِ قدر تھی کہ اسے اپنے چینی ہونے پر فخر تھا اور وہ اپنے ہم وطنوں کے لیے بھی مثبت سوچ رکھتا تھا ورنہ پاکستانیوں کی عمومی کیفیت تو یہ ہے کہ وطن کے مستقبل سے ناامید ہیں اور ہم وطنوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ ان کے کردار و اخلاق میں کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

"مذہب کی بنیاد پر کسی سے نفرت کرنا صحت مندانہ

رجحان ہے بھی نہیں۔ انسان کو صرف اس کے ذاتی کردار کی بنیاد پر پرکھنا چاہیے۔ اگر کوئی انسان دوسرے انسانوں کے لیے ضرر رساں نہیں ہے اور کسی بھی بنیاد پر ان کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچاتا ہے تو ہمیں بھی اس کی چھوٹی موٹی خامیوں سے صرف نظر کرنا چاہیے۔'' وکی نے یوسف کی تائید میں اظہار خیال کیا تو وہ خوش ہو گیا۔

باتوں باتوں میں وہ مسجد پہنچ گئے تو یہ دیکھ کر سب کو خوشی ہوئی کہ وہاں اچھی خاصی رونق تھی اور چینی مسلمانوں کی خاصی تعداد مسجد میں آئی ہوئی تھی۔ ان میں عورتیں بھی تھیں جن کے لیے مسجد میں ایک الگ حصہ مقرر تھا۔ مسجد چینی اور اسلامی طرز تعمیر کا ملاپ تھی اور اس میں ایک عدد میوزیم بھی تھا جس میں مسجد سے متعلق نوادرات رکھے گئے تھے۔ چونکہ خطبہ شروع ہونے والا تھا تو طے پایا کہ میوزیم بعد از نماز دیکھا جائے گا۔

نماز کے بعد دعا کا مرحلہ آیا تو معاذ نے اپنا دل بھاری ہوتا محسوس کیا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اپنے سارے پیاروں کی شبیہات ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آنے لگیں۔ خصوصاً علینہ اور سجل کے لیے اس کا دل کچھ زیادہ ہی تڑپ رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے لیے بہت دیر تک خصوصی دعائیں مانگتا رہا۔ دعا سے فارغ ہو کر دیکھا تو نمازیوں کی اکثریت جا چکی تھی۔ جارد اور یوسف ایک جانب بیٹھے ان کے منتظر تھے جبکہ وکی اس کے برابر میں بیٹھا اب بھی، دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے دعا میں مصروف تھا۔ وہ دعا سے فارغ ہوا تو معاذ نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اور غیر معمولی سرخی ہے۔

''کیا بات ہے وقاص! تم ٹھیک تو ہو؟'' اس نے وکی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر فکر مندی سے پوچھا۔

''جی، سب ٹھیک ہے۔ اگر کہیں کچھ غلط تھا بھی تو مجھے یقین ہے کہ اب ٹھیک ہو گیا ہوگا۔'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرایا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں۔ تھوڑی دیر پہلے تم بالکل ٹھیک تھے لیکن اب تمہاری آنکھیں اور تاثرات دیکھ کر لگتا ہے کہ تم کسی بڑے کرب سے گزر رہے ہو۔'' وہ وکی کے جواب سے مطمئن نہ ہو سکا اور جواب پر اصرار کیا تو وکی نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور بتانے لگا۔

''مجھے اچانک ہی بے چینی محسوس ہونے لگی تھی اور بار بار علینہ کا چہرہ نظروں کے سامنے آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ شدید تکلیف میں مبتلا ہو۔ اسی لیے میں نے جب دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو بس دل کی گہرائیوں سے اسی کے لیے دعا مانگتا چلا گیا اور دعا مانگتے مانگتے میرا دل ٹھہر سا گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے اب علینہ ٹھیک ہو۔ اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اگر کہیں کچھ غلط تھا بھی تو ٹھیک ہو گیا ہے۔'' اس کی بتائی تفصیل نے معاذ کو دم بخود کر دیا اور وہ سکتہ زدہ سا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''میرے ساتھ بھی ابھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ دعا مانگتے ہوئے علینہ کا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے آ رہا تھا تو میں نے اس کے لیے خصوصی دعا مانگی۔'' سجل کا نام حذف کر کے اس نے وکی کے ساتھ خود پر بیتی کا اشتراک کیا۔

''ہم دو افراد کا بیک وقت ایک جیسی کیفیت سے دوچار ہونا ظاہر کر رہا ہے کہ معاملہ صرف وہم کا نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ تھا جس نے ہم دونوں کو علینہ کی طرف سے تشویش میں مبتلا کیا اور ہمارے دل اس کے لیے خصوصی دعا مانگنے پر مائل ہوئے۔''

''کیا وہ کسی مصیبت میں ہے؟'' وہ وکی کا تجزیہ سن کر ڈر گیا۔

''میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ جس مشکل یا تکلیف میں تھی، اس سے نکل گئی ہے۔ آپ نے سنا ہوگا نا کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے اور یہ بھی کہ دعا انسان پر آنے والی مصیبت کی راہ میں حائل ہو کر اسے ٹال دیتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ علینہ کو بھی میری اور آپ کی دعاؤں نے مشکل سے نکال لیا ہے اور اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔'' وکی بہت مطمئن تھا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ دشمنوں کو اس کی کوئی بھنک پڑ گئی ہو؟'' معاذ اب بھی تشویش محسوس کر رہا تھا۔

''ان شاء اللہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی بلکہ شاید کوئی خوشی کی خبر ہو۔'' وکی کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔

''خوشی کی خبر.....؟'' معاذ کو اس کی ذہنی حالت پر شک ہوا۔

''وہ ایکسپیکٹ کر رہی تھی۔ مجھے لگتا ہے اللہ نے اسے وقتی تکلیف سے گزار کر خوشی سے نوازا ہے۔'' وکی نے کچھ شرمائے ہوئے سے انداز میں اپنی بات کی وضاحت کی تو معاذ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''کیا سچ مچ.....؟'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ علینہ جو ابھی تک اس کے لیے خود بچی تھی، کسی بچے کی ماں بن چکی ہوگی۔

''مان لیں معاذ بھائی کہ ان شاء اللہ العزیز آپ ماموں جان بن چکے ہیں۔'' وکی کو اس کی بے یقینی پر ہنسی آنے لگی تھی۔

''اللہ تمہارے وجدان کو سچ ثابت کرے۔ میرا تو دل مچل رہا ہے کہ کسی طرح اڑ کر پاکستان پہنچوں اور اس خوشی کو مجسم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔'' وہ اتنا پُرجوش ہوا کہ وکی کو گلے لگالیا۔ وکی کے چہرے پر بھی ایک روشن مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''یہ آپ دونوں نے دن دہاڑے کون سا عید کا چاند دیکھ لیا ہے جس کی خوشی میں یوں ایک دوسرے سے گلے ملا جارہا ہے۔'' جارو اور یوسف ان سے بہت پہلے نماز سے فارغ ہوکر ان دونوں کے انتظار میں ایک جانب بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں طویل دعا کے بعد ایک دوسرے سے گفتگو میں مصروف ہوگئے تو انہوں نے مداخلت مناسب نہ سمجھی اور دور بیٹھے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے رہے لیکن ان دونوں کو خوشی خوشی ایک دوسرے سے گلے ملتے دیکھا تو جارو سے مزید برداشت نہیں ہوا اور اٹھ کر ان کے قریب آگیا۔

''خوش ہونے کے لیے عید کا چاند نظر آنا ضروری تو نہیں ہے۔ کبھی کبھی دل کو ملنے والے کسی خوش کن اشارے پر بھی انسان خوش ہوجاتا ہے۔'' معاذ کو معلوم تھا کہ بے شک وہ دور کی آوازیں سن لینے پر بھی قادر ہے لیکن اس نے اخلاقاً ان کی گفتگو کا کوئی لفظ نہیں سنا ہوگا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' اس کے جواب نے جارو کی الجھن دور نہیں کی۔

''یہ معرفت کی باتیں ہیں میاں جارو! ان کو سمجھنے کے لیے بڑے چلے کاٹنے پڑتے ہیں اس لیے ابھی آپ اس بات کو چھوڑیں اور مسٹر یوسف مافوسائی کے پاس چلیں جو ہمارے انتظار میں سوکھتے جارہے ہیں۔'' جو کچھ تھا، اس کے دل کا وجدان تھا اس لیے وکی نے اسے کچھ بتانے کے بجائے ٹال دینا مناسب سمجھا۔ جارو نے بھی جواب حاصل کرنے پر اصرار نہ کیا۔

وہ نماز کے وسیع و عریض ہال سے باہر نکلے تو یوسف انہیں مسجد اور مسجد سے ملحقہ مختلف حصوں کی زیارت کروانے لگا۔ اس نے مسجد سے ملحق خانقاہ، درس گاہ، حمام و وضوخانہ اور پویلین وغیرہ دکھائے۔ ساتھ ساتھ وہ ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتاتا بھی جارہا تھا لیکن معاذ کی کیفیت میں دوبارہ ایک اضطراب سا پیدا ہوگیا تھا اور وہ ایک بار پھر چپ سادھ کر بے دھیانی سے یوسف کی باتیں سن رہا تھا۔ سب سے آخر میں انہوں نے میوزیم کی سیر کی۔ یہاں مختلف ممالک کی جانب سے بھیجے گئے قرآنی نسخے اور دیگر نوادرات محفوظ کیے گئے تھے۔ یوسف ان کی تفصیل بتاتے ہوئے بہت شوق سے بتانے لگا۔

''حکومت چین نے 1988ء میں مسجد نیوجیہ کو اہم ثقافتی ورثہ قرار دے کر اسے اپنی نگہداشت اور تحفظ میں لے چکی ہے اور آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ یہاں کا سارا انتظام کتنی خوبصورتی سے جاری و ساری ہے۔''

''آپ کے ہاں تو ہر شعبے کا انتظام ہی بہت خوب ہے۔ پاکستان کے بعد قائم ہونے کے باوجود چین نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے، وہ پوری دنیا کے لیے ایک مثال ہے۔'' وکی نے مرعوبیت سے تبصرہ کیا۔

''یہ صرف اس لیے ہے کہ ہم نے اپنے وطن سے زبانی محبت کے دعوے کرنے کے بجائے عملی طور پر انتھک محنت کرکے اس محبت کو ثابت کیا ہے۔'' یوسف کے لہجے میں وہ فخر تھا جو کسی بھی زندہ قوم کے فرد میں ہوسکتا ہے۔ وہ انہیں جتا نہیں رہا تھا لیکن شرمندگی تو بہرحال محسوس ہورہی تھی کہ اپنے جس واحد پڑوسی سے ہم بے حد محبت اور انسیت کے دعویدار ہیں، ان سے ہم نے یہ تک نہیں سیکھا کہ وطن کی محبت کے کیا تقاضے ہوتے ہیں۔ وطن صرف گولی کھا کر سینے سے ابلتا لہو نہیں مانگتا، یہ خونِ جگر بھی مانگتا ہے۔ محبت صرف جان دینے سے ثابت نہیں ہوتی۔ اسے ثابت کرنے کے لیے اپنی پوری جان بھی لگانا پڑتی ہے۔ چینیوں نے یہی کیا تھا۔ انہوں نے اپنے وطن کی تعمیر کے لیے اپنی پوری جان لگادی تھی۔

''ہم اسپتال کب چلیں گے؟'' معاذ جو پہلے ہی بے چین تھا، اس شرمندگی کو سہار نہ سکا اور بے تابی سے پوچھا۔

''شیڈول کے مطابق ہمیں یہاں سے سیدھا وہیں جانا تھا لیکن میرے پاس مسٹر یوان منگ کا پیغام آیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ اسپتال جانے سے پہلے آپ ان سے ملاقات کرلیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس ملاقات میں مسٹر شین یا ہی بھی شامل ہوں۔'' یوسف نے رسان سے اسے بتایا۔

''کیا اس میٹنگ میں میرے ساتھی بھی شامل ہوں گے؟'' وہ کچھ بے آرام سا ہوا۔

''مجھے صرف آپ کے حوالے سے پیغام ملا ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھی بھی اس موقع پر آپ کے ساتھ موجود ہوں؟'' یوسف نے بتانے کے ساتھ ہی پوچھا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

دنیا کا معاشرہ اور تہذیب کوئی بھی ہو... انسانی جان ہر جگہ قیمتی تصور کی جاتی ہے مگر... ان کا تعلق تہذیب یافتہ معاشرے سے ہونے کے باوجود ان کی حالت انتہائی خطرناک اور تباہ کن تھی کیونکہ... وحشی فطرت ہمیشہ دنگا فساد کا باعث بنتی ہے اور اس کا ثبوت ان کی خوں ریزی اور قتل و غارت گری نے دے دیا تھا۔

انتہائی خطرناک گورکھ دھندے میں ملوث مجرمانہ کارروائیوں کا احوال

گورکھ دھندا

عابدہ نرجس

مجھے اکثر عجیب وغریب کالیں آتی رہتی ہیں۔ کبھی کچھ اور کبھی کچھ... بلکہ اکثر لوگ تو دوسروں کا وقت ضائع کرنے میں بڑا لطف محسوس کرتے ہیں۔ اپنی لمبی رام کہانی وہ یوں شروع کرتے ہیں جو کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی اور مزے کی بات یہ کہ اس کا کوئی سر پیر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ ابتدا میں تو میں اکثر لوگوں کی بات سن لیتا تھا لیکن اب میں فون اٹھاتے ہی انہیں اپنے آفس میں آنے کے لیے کہہ کر فوراً بند کر دیتا ہوں۔

اس روز بھی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ ''کیا تم ڈیوڈ ہو؟''

''کیوں؟'' مجھے اس کی یہ بے تکلفی بالکل پسند نہیں آئی۔

میں ریسیور رکھنے کو تھا کہ وہ بولا۔ ''مسٹر ڈیوڈ! اب سے کچھ دیر بعد کسی بھی لمحے ایک لڑکی تمہارے پاس آئے گی۔ تم اسے روک کر رکھنا، وہ جانے نہ پائے۔ میں راستے میں ہوں۔ جلد تمہارے آفس میں پہنچ رہا ہوں..... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''نہیں..... بالکل نہیں.....'' میں نے جل کر کہا۔

''تو پھر میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ ابھی ایک لڑکی تمہارے پاس آئے گی۔ وہ تمہیں اپنی گمشدہ بہن کی کہانی سنائے گی۔ تم اسے کسی بہانے سے اپنے پاس روک کر رکھنا۔ اسے جانے مت دینا۔ وہ نفسیاتی مریضہ ہے۔ کل وہ ایک ادارے سے غائب ہوگئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے ہی پاس آئے گی..... تم اسے اپنے پاس روکنا..... میں پہنچ رہا ہوں۔''

''مگر تم ہو کون؟''

''تمہیں تمہاری فیس سے کچھ زیادہ ہی ملے گا۔ تم فکر نہ کرو۔'' اور فون بند ہوگیا۔

اگرچہ اس میں فیس کا تذکرہ بھی تھا لیکن میں نے اس کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ میرا خیال تھا کہ کوئی شخص وقت گزاری کے لیے دل لگی کر رہا ہے۔ میں اپنے کام میں مصروف ہوگیا لیکن میں اس وقت چونکا جب واقعی ایک لڑکی میرے آفس میں آگئی۔ میری سیکریٹری نے مجھے اطلاع دی اور میں نے اسے اندر بلانے کے لیے کہہ دیا۔

وہ کھوئی کھوئی سی نیلی آنکھوں والی لڑکی عام لڑکیوں سے زیادہ دراز قد تھی۔ اس کا متناسب جسم کسی ماڈل کے جسم کی طرح جاذبِ نگاہ تھا۔ گھنگرالے سنہری بالوں پر اس نے چھوٹا سا قیمتی ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا لباس جدید اور عمدہ تھا۔ وہ کم سن، دلکش مگر ڈری ہوئی لگتی تھی۔ میری سیکریٹری پاؤلا دروازہ بند کرکے چلی گئی۔

میں جلدی سے سیدھا ہو بیٹھا۔ ''پلیز..... بیٹھیے!''

''نہیں..... میں ٹھیک ہوں۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''میں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گی۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے نرمی سے کہا اور سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ اسے مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے یا نہیں۔

چند لمحے ہماری آنکھیں چار ہوئیں مگر وہ کچھ بول نہیں پائی۔ میں نے اس کی وحشت زدہ دلکش نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم آرام سے بیٹھ جاؤ اور جو کچھ مجھے بتانا چاہتی ہو..... بے تکلفی سے سب بتا دو۔ یہاں ہمارے کلائنٹ کی گفتگو راز کی طرح محفوظ رکھی جاتی ہے۔''

میری اس تسلی تشفی کے باوجود اس کا خوف دور نہیں ہوا۔ وہ یوں کھڑی رہی جیسے ابھی موقع دیکھ کر بھاگ نکلے گی۔

چند لمحے بعد وہ گلے میں پھنسی ہوئی آواز کے ساتھ بولی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ تم میری بہن کو تلاش کرو۔ میں اس کے لیے بہت پریشان ہوں۔ پلیز! آپ کی فیس کیا ہے؟''

''فی الحال فیس کی بات رہنے دو۔ پہلے مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟ مجھے کچھ پتا چلے گا تو میں کچھ بتا سکوں گا۔ اچھا، پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟''

ابھی اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا کہ فون کی گھنٹی زور سے بجی۔ لڑکی اچھل پڑی۔ میری میز سے دو تین قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وحشت سے اس کی خوب صورت نیلی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ایک منٹ..... میں بات کرلوں۔'' میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہہ کر ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو!''

''کیا وہ آگئی ہے؟'' میں آواز پہچان گیا۔ یہ وہی شخص تھا۔

''نہیں..... اس کا دور دور تک کچھ پتا نہیں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''وہ آنے والی ہوگی۔ تم اسے روک کر رکھنا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''نہیں..... میں بالکل نہیں سمجھا۔'' میں نے برجستہ کہا۔

''تمہارے بودے دماغ کو سمجھانے کے طریقے ہمیں آتے ہیں۔ تمہیں جو کہا ہے، وہ کرو۔'' اس نے بڑے رعب سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

لڑکی ڈری ڈری، ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ ''یہ کس کا فون تھا؟''

''میرے ایک کلائنٹ کا تھا۔'' میں نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ میں اسے کچھ بتا کر بے ہوش نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے سر جھٹکا اور پلکیں جھپکاتے ہوئے اپنی نیلی خوب صورت آنکھوں کو یوں اردگرد گھمایا جیسے کوئی چابی والی گڑیا ہو پھر جیسے وہ خود اپنے آپ سے بولی۔ ''یہ یقین دلانا بہت مشکل ہے..... کہ میں پاگل نہیں ہوں..... نہ ہی نفسیاتی مریضہ ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا بیگ میز پر رکھ

دیا۔ اپنے دستانے اتارے، اپنا کوٹ بھی جلدی سے اتار دیا۔ اس نے ایک سسکاری سی لی اور جلدی جلدی اپنے بلاؤز کے بٹن کھولنے لگی۔

"او ہو محترمہ! یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" میں بوکھلا گیا کہ اگر پاؤلا اندر آگئی تو کیا سوچے گی۔

لڑکی نے لمحوں میں اپنا بلاؤز اتار لیا۔ میں اور گھبرا گیا۔ آخر یہ لڑکی کرنا کیا چاہتی تھی۔ وہ واقعی نفسیاتی مریضہ تو نہیں تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ میری نظر اس کی پشت پر پڑی اور میں لرز گیا۔

لڑکی کی پشت زخموں کے نشانات سے بھری ہوئی تھی۔ کچھ انگلیوں کے نشانوں جیسے تھے۔ اس کی سفید نازک مجروح جلد کا منظر بہت ہی افسوس ناک تھا۔ میں ساکت سا رہ گیا۔ میرے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔

لڑکی نے جلدی جلدی بلاؤز پہن کر بٹن لگاتے ہوئے کہا۔ "اب تمہیں یقین آیا کہ میں کتنی مشکل میں ہوں؟"

"ہاں... اور اگر تم مجھے یہ نہ بھی دکھاتیں تو بھی میں تمہاری بات غور سے سنتا اور تمہاری مدد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم یہاں محفوظ ہو۔"

وہ چند لمحے ہونٹ کاٹتی رہی پھر اس نے اپنا بیگ کھولا۔ اس میں سے کرنسی نوٹوں کی موٹی گڈی نکالی اور اسے میز پر رکھ کر بولی۔ "کیا یہ فی الحال کافی ہوگی؟"

میرے دل نے میرے سینے میں خوشی سے ایک چھلانگ لگائی۔ گویا لڑکی لین دین کی کھری بھی تھی۔ اگر وہ پاگل بھی تھی تو کوئی حرج نہیں تھا۔ اس گڈی کو گنے بغیر بھی میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کافی رقم تھی۔

میں نے نوٹوں کی گڈی اٹھائی اور لڑکی سے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو... جانا مت۔"

میں باہر آیا جہاں میری سیکریٹری بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تم فوراً تیار ہو جاؤ۔ میں اس لڑکی کو تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ تم اس کو ہوٹل میں ایک کمرا لے کر دو۔ اسے تاکید کر دینا کہ وہ دروازہ لاک کر کے رکھے۔ کسی کے کہنے پر ہرگز نہ کھولے۔ جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ وہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہے۔ اس کے بعد اس رقم کو بینک میں جمع کروا دینا۔ اسے یقین دلانا کہ وہ محفوظ ہے۔"

میں دروازہ کھول کر آفس میں آیا۔ لڑکی اپنے ہاتھ ایک دوسرے میں جکڑے ہوئے پریشان سی کھڑی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ماریہ.....!" وہ بولی اور پھر اِدھر اُدھر ہراساں نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں کہاں جاؤں؟"

تب تک پاؤلا بھی اندر آگئی۔ میں نے ماریہ کا شانہ تھپتھپا کر اسے تسلی دی۔ "تم پاؤلا کے ساتھ جاؤ۔ وہ تمہیں پچھلے دروازے سے لے جائے گی۔ تم اب محفوظ ہاتھوں میں ہو۔ تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے میری طرف دیکھا۔ "اب تمہیں پتا چل گیا ہے نا کہ میں کتنی مصیبت میں ہوں۔ یہی کچھ میری بہن کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔"

میں نے اسے دروازے کی طرف بڑھایا۔ "گھبراؤ مت... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ پاؤلا کے ساتھ باہر چلی گئی اور میں گہرا سانس لے کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سوچنے کے لیے بہت ساری باتیں تھیں۔ یہ لڑکی ابنارمل نہیں لگتی تھی البتہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ اس کا لباس اور اس کا انداز بتاتے تھے کہ وہ کسی اچھے گھر کی ہے پھر اس نے ایک خطیر رقم یوں فراخدلانہ دے ڈالی تھی۔ وہ شخص کون تھا جو اس کا پیچھا کر رہا تھا؟

میں نے گھڑی دیکھی۔ کافی وقت ہو چکا تھا۔ میں بھی اٹھا کہ چل کر پتا کروں کہ پاؤلا نے ماریہ کو کمرا لے دیا ہے تو اس سے تفصیلی بات کروں۔ میں آفس کا دروازہ بند کر کے باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹے قد کا آدمی باہر کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ پرانا سا کالا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے اپنا ہیٹ اپنے چہرے پر یوں جھکا رکھا تھا کہ اس کا چہرہ اس میں چھپ گیا تھا۔

میں آگے بڑھا اور اس کا ہیٹ اٹھایا..... اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ کوئی اچھا منظر نہیں تھا۔ وہ شخص مُردہ تھا۔ اس کا گلا کاٹ کر کسی نے بڑی صفائی سے ٹانکے لگا کر سی دیا تھا۔ وہ شخص شکل وصورت سے چینی معلوم ہوتا تھا۔ ایک بار تو مجھے دانتوں تلے پسینا آگیا۔ میں ابھی اس سوچ میں تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کہ میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف پاؤلا تھی۔ وہ پریشانی سے کہہ رہی تھی۔

"سر..... وہ لڑکی چلی گئی۔"

"وہ کیسے.....؟ اسے کوئی تم سے چھین کر لے گیا ہے؟"

"نہیں..... خود اس لڑکی نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ میں ابھی ہوٹل کے کاؤنٹر پر دستخط کر رہی تھی کہ مجھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔ میں اس کے پیچھے لپکی لیکن وہ لمحوں میں غائب ہو گئی۔ کہیں نظر ہی نہیں آئی۔" پاؤلا کافی

پریشان معلوم ہوتی تھی۔
"اور وہ رقم......؟"
"رقم میں نے بینک میں جمع کروادی ہے۔"
"اچھا، ابھی تم ہوٹل میں ہی رہو۔ کھانا وغیرہ کھاؤ۔ میں ایک کلائنٹ سے نمٹ لوں تو وہاں پہنچتا ہوں۔" میں نے فون بند کیا اور چینی کی لاش کے قریب جا کر کہا۔ "آؤ دوست! ذرا سیر کر آئیں۔"

☆☆☆

جب میں ہوٹل پہنچا تو پاؤلا روہانسی ہو رہی تھی۔
"آخر تم اتنی دیر سے کیا کر رہے تھے؟"
"میں سوچ رہا تھا کہ آخر وہ لڑکی تم جیسی ہوشیار خاتون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کہاں چلی گئی؟"
"ہاں..... یہ بات تو ہے۔ میں جیسے ہی اس کے پیچھے لپکی، وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں دوڑ کر سڑک پر آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ یوں غائب ہو چکی تھی جیسے اسے زمین نگل گئی ہو یا آسمان کھا گیا ہو۔"
"لگتا ہے کوئی شخص اسے اٹھا کر لے گیا ہے۔"
"ہاں، ایسا ہی لگتا ہے۔"
"اور ایک نئی بات بھی سن لو کہ آفس کے باہر کچھ لوگ ایک چینی کی لاش رکھ گئے تھے۔ میں نے مقتول میں اسے اٹھا کر ایک خالی آفس میں رکھ دیا اور واپس آ گیا۔"
"اوہ، لاش! اس کا کیا مطلب ہے؟"
"ہمیں خوفزدہ کرنے کے لیے ایک پیغام۔"
"اور اس کی جو رقم ہمارے پاس ہے؟"
"وہ یقیناً ہم سے دوبارہ رابطہ کرے گی..... تو یہ کام آئیں گے۔ فی الحال انہیں محفوظ رکھو۔"
ہم دونوں کھانا کھا کر واپس آئے۔ پاؤلا ابھی دروازہ کھول رہی تھی کہ میں نے سیاہ سوٹ میں ملبوس دو افراد کو ایک طرف کھڑے دیکھا۔ وہ دونوں مجھے کچھ مشکوک سے معلوم ہوئے۔ دونوں نے ایک جیسے سوٹ پہن رکھے تھے اور دونوں کا ایک ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا۔ میں نے انہیں اس طرح کھڑے دیکھ کر پوچھا۔ "تم یہاں اس طرح کیوں کھڑے ہو؟ تمہیں کس سے ملنا ہے؟"
"ہمارا خیال ہے کہ ہمیں تم سے ہی ملنا ہے۔" وہ عجیب سی آواز میں بولا۔
دونوں کے ہاتھ ایک ساتھ جیب سے باہر نکلے جن میں پستول تھے۔ انہوں نے مجھے آفس میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ اس وقت مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ پستول میرے پاس کیوں نہیں تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں ان کے حکم کی تعمیل کرتا۔
میں نے جیسے ہی دروازہ کھولا، پاؤلا نے سر اٹھا کر دیکھا اور میرے پیچھے ان دو مشکوک لوگوں کو پستول تانے ہوئے دیکھا تو اس نے دراز کھولنے کی کوشش کی تاکہ میرا پستول نکال سکے۔
"خبردار......!" ان میں سے ایک تیز آواز میں بولا۔
پاؤلا ایک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی اور اس نے اپنے ہاتھ گود میں رکھ لیے۔
میں نے دوستانہ لہجے میں یوں کہا جیسے مجھے ان کے پستول کی کوئی پروا نہیں۔ "اگر تم لوگ پسند کرو تو ہم تمہیں بہت اچھا کھانا کھلا سکتے ہیں۔"
ان میں سے ایک نے میز پر سے بھاری ایش ٹرے اٹھائی اور اسے یوں دیکھنے لگا جیسے اس کی بناوٹ پر غور کر رہا ہو پھر اس نے بجلی کی سی تیزی سے اس کے ساتھ ایک شدید ضرب میرے چہرے پر اس طرح لگائی کہ مجھے دن میں تارے نظر آ گئے۔ دوسرے نے اپنا پستول پاؤلا کی پسلی میں جیسے چبھو دیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔
"اگر تم دونوں نے کوئی حرکت کی تو تمہیں اس پر بہت افسوس ہوگا۔"
میں نے جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے کو سہلایا تو دیکھا کہ اس پر خون کے دھبے ہیں۔ میں سخت جھلا گیا۔
"میرا خیال ہے، مجھے پھر تم سے ملنا پڑے گا۔"
"فی الحال تو تم اپنی بکواس بند کرو اور دیوار سے لگ جاؤ۔ ہم ذرا تمہارے آفس کا سروے کرنا چاہتے ہیں۔" ایک بولا۔
"اس سے پہلے کہ ہم تمہارا بدصورت چہرہ کچھ اور بدصورت بنا دیں..... دیوار کے ساتھ لگ جاؤ۔" دوسرا دبنگ لہجے میں بولا۔
میرا خون کھول گیا۔ اگر پاؤلا یہاں موجود نہ ہوتی تو میں ان دونوں کی طبیعت صاف کرنے میں جان لڑا دیتا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے دیوار کے ساتھ لگ جانا پڑا۔ ایک نے میری مکمل تلاشی لی، میرا کوٹ اتار پھینکا۔ میرے ہاتھ اس کی گردن دبوچ لینے کے لیے بے قرار تھے مگر یہ وقت جوش کا نہیں، ہوش کا تھا اس لیے میں خاموشی سے اپنے آفس میں ان کی یہ مجرمانہ سرگرمیاں دیکھتا رہا۔
انہوں نے میز کی درازوں کا جائزہ لینے کے بعد پاؤلا سے کہا۔ "تم ادھر آؤ۔"
پاؤلا اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ بے حد سنجیدہ

تھی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی اور مضبوط لہجے میں بولی۔
''اپنے یہ گندے ہاتھ مجھے نہ لگانا۔''
انہوں نے کسی اور زبان میں آپس میں بات کی اور مجھ سے بولے۔ ''تو پھر تم ادھر آؤ۔''
میں آگے بڑھا اور جیسے ہی اس شخص کے قریب پہنچا، اس نے اپنے پستول کا بٹ میرے سر کے پچھلی طرف اتنے زور سے مارا کہ میں لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ میری آنکھوں کے سامنے شرارے سے ناچنے لگے۔
پاؤلا نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن دوسرے نے اس کی کنپٹی پر پستول رکھ دیا۔ پہلے نے اس کی تلاشی لی۔ پاؤلا اپنے منہ پر ہاتھ رکھے بڑے ضبط سے کام لے رہی تھی۔ میں نے اٹھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن میری آنکھوں کے سامنے سرخ دھند چھائی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرے کی تلاشی لے کر وہ لوگ دھڑ سے دروازہ بند کر کے چلے گئے۔
میں میز کا سہارا لے کر بہ مشکل اٹھا۔ میرا سر بری طرح سے چکرا رہا تھا۔ میں نے تمام آفس پر ایک نگاہ ڈالی۔ پاؤلا ایک صوفے پر بیٹھی چپکے چپکے رو رہی تھی۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ آنسو پونچھتے ہوئے برہمی سے بولی۔
''اب یہ الوؤں کی طرح اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو۔ تمہیں اپنی بزدلی پر شرم آنا چاہیے۔''
میں خاموش رہا۔ اس کی کسی بات کا جواب دینا بے سود تھا۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے واش روم گیا اور چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ سر کو کئی بار جھٹکا۔ بیسن میں گرنے والے پانی میں میرے خون کی آمیزش تھی۔ میں تولیے سے منہ خشک کر کے اندر کمرے میں آیا تو پاؤلا اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں ڈھانپے ابھی تک رو رہی تھی۔ میں نے اپنے ذہن کو حاضر کرنے کے لیے سگریٹ سلگایا اور پاؤلا نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔
''تم بہت بہادر بنتے ہونا...... تمہارے سامنے وہ دونوں بدمعاش کس طرح اندر گھس آئے...... جو ان کا دل چاہا، انہوں نے کیا اور تم سے کچھ نہیں ہوسکا۔ انہوں نے ہمارے ساتھ کتنا توہین آمیز سلوک کیا۔ میں نے اس لیے تو یہاں کام نہیں کیا تھا کہ کوئی بھی غنڈا یہاں گھس کر اپنی من مانی کرتا پھرے۔'' اس نے غصے میں کشن پر کئی مکے مارے اور پھر رونے لگی۔ ''اوہ......! یہ سب ہمارے ساتھ کیوں ہوا؟''
میں نے اب بھی اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جب وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال چکی تو میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''تھوڑا صبر کرو...... مجھے کچھ سوچنے دو۔''
''سوچنے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟''
''وہ یہ کہ تم آفس کا دروازہ اندر سے بند کرلو۔ میں تھوڑا سا کام کر کے آتا ہوں۔'' اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے دراز کھینچ کر اپنا پستول نکالا، اسے اپنے بیلٹ میں اڑسا، اپنا کوٹ سیدھا کرتے ہوئے میں پچھلے دروازے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

میں جانتا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ ان خدائی فوجداروں اور پاؤلا کے ہاتھوں ذلیل ہونے کے بعد میں نے اپنے ذہن میں سارا منصوبہ مرتب کرلیا تھا۔ میں اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آیا تو بھی میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ مجھے سانس لینا دشوار تھا۔ اتنی بے عزتی میری کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے نہا دھو کر خود کو نارمل کیا اور چل پڑا۔
ایک چھوٹی سی گلی میں پہنچ کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک سن رسیدہ عورت نے دروازہ کھولا۔
''اکی گھر پر ہے؟ اس سے کہو کہ ڈیوڈ آیا ہے۔''
تھوڑی ہی دیر میں وہ واپس آکر مجھے اندر لے گئی۔ کھانا پکنے کی عجیب سی مہک چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اکی اوپر کی منزل پر اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔ وہ ایک موٹا، تازہ مشٹنڈا آدمی تھا جس کا بھرا ہوا گول چہرہ ربڑ کا معلوم ہوتا تھا۔
وہ مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھے کمرے کے دوسرے حصے میں لے جا کر بولا۔ ''خیریت! کچھ کام ہے کیا؟ پریشان لگتے ہو۔''
''کالے سوٹ میں ملبوس دو غنڈوں نے آج میرے دفتر پر حملہ کیا ہے۔ ان کے بارے میں پتا چلاؤ کہ وہ کون لوگ ہیں؟''
''ہم......!'' اکی نے لمبی سے ہوں کی۔ وہ ایک مشہور غنڈا تھا اور جرائم کی دنیا میں اثر رسوخ رکھتا تھا۔ وہ مجھے اس وقت سے جانتا تھا جب میں نے اپنے کیریئر کا آغاز صحافت سے کیا تھا اور رپورٹنگ کے سلسلے میں اس کے ساتھ میرے اچھے مراسم ہو گئے تھے۔
''تم ان غنڈوں کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟'' اکی نے پوچھا۔
''ان دونوں نے میرے آفس پر دھاوا بولا اور مجھے یہ زخم لگایا۔'' میں نے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا جہاں انہوں نے مجھے ایش ٹرے ماری تھی۔
''اچھا......!'' اکی نے سر ہلایا اور کمرے کے

دوسرے کونے میں جاکر فون پر کچھ دیر رازداری سے گفتگو کرتا رہا پھر وہ فون بند کر کے میرے پاس آیا۔

''کچھ پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ..... کچھ سراغ تو ملا ہے۔'' وہ بولا۔ ''یہ لوگ اس شہر میں ایک ہفتے سے موجود ہیں۔ انہوں نے ایک آراستہ گھر بھی کرائے پر لے رکھا ہے۔ ابھی یہ تو معلوم نہیں ہوسکا کہ انہیں کس نے بلایا ہے اور ان کا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔ ہاں میں نے ایڈریس لے لیا ہے۔''

''مجھے ایڈریس دے دو۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

''تم ان کے ساتھ ٹکر لینا چاہتے ہو؟ کچھ لڑکے تمہیں چاہئیں .....؟''

''نہیں..... فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔'' میں نے اکی کا پُرگوشت شانہ تھپتھپایا اور وہ ایڈریس جیب میں ڈال کر باہر نکل آیا۔

میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس ایڈریس پر جا پہنچا جسے تلاش کرنے میں مجھے کچھ زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

شام ہوچکی تھی۔ وہ گھر ایک کونے میں واقع تھا جو ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ کھڑکیاں تاریک تھیں، یوں جیسے گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے جیب سے پستول نکال کر ہاتھ میں لیا اور آہستگی سے گیٹ کو دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ میں چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہوا گیٹ کے اندر داخل ہوا۔ وہاں کوئی نہیں تھا پھر میں محتاط قدموں سے گھر کی پچھلی طرف گیا۔ ٹارچ کی روشنی ڈال کر کھڑکیوں کو دیکھا۔ ایک کھڑکی مجھے تھوڑی سی کھلی ہوئی نظر آئی۔ تھوڑی سی کوشش سے میں اسے کھولنے میں کامیاب ہوگیا اور بڑی احتیاط سے بغیر کوئی آواز پیدا کیے کھڑکی کے راستے اندر اتر گیا۔

میں نے غور سے سنا۔ اردگرد کوئی آواز نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی نہیں رہتا۔ اس کمرے میں ایک بڑی الماری اور چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے کچھ دور سیڑھیاں نظر آئیں۔ میں نے بڑی احتیاط سے وہ زینہ طے کیا تو مجھے فضا میں ایک عجیب سی ناگوار بو کا احساس ہوا۔ سامنے تین کمرے تھے جو بند تھے۔

میں نے محتاط انداز میں پہلے کمرے کے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔ اسی ناگوار بُو کا ایک بھبکا سا میری طرف لپکا۔ میرا جی مالش کرنے لگا۔ میں نے اپنی ناک کو ایک ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔ یہ بُو ایسی تھی جیسے کسی بوچڑ خانے سے آرہی ہو۔ میں نے دیوار پر بجلی کا سوئچ تلاش کیا اور لائٹ جلا دی۔ یکایک کمرا روشنی سے بھر گیا۔ میں نے ایک تیز نگاہ کمرے پر ڈالی۔ یہ ایک جدید انداز میں سجا ہوا بیڈ روم تھا جو کسی خاتون کا معلوم ہوتا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ کا سامان پڑا ہوا تھا۔ سنگل بیڈ سائز میں چھوٹا تھا جس پر زنانہ کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں مجھے ایک لباس جانا پہچانا لگا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ وہی لباس تھا جو ماریہ پہنے ہوئے تھی جب وہ میرے آفس آئی تھی۔

میں نے ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں کی تلاشی لی مگر وہاں کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھی۔ مجھے وہاں ماریہ کا ہیٹ اور پرس بھی نظر آیا۔ میں نے اسے بیڈ پر الٹا دیا۔ اس میں وہی چیزیں تھیں جو عموماً خواتین اپنے پرس میں رکھتی ہیں۔ البتہ ایک چھوٹے سے رقعے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک جلدی میں لکھی ہوئی تحریر تھی جو ماریہ کے نام تھی۔

''ڈیئر ماریہ!

فکر مت کرو..... نولان نے مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ پال کو ابھی کچھ علم نہیں..... بہت جلد سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

نیچے لکھنے والے کا نام نہیں تھا۔ میں نے کمرے میں ادھر اُدھر نگاہ ڈالی مگر کام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میں جلدی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ رقعہ میری جیب میں تھا۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے میں نے اگلے کمرے کا دروازہ کھولا۔ بدبو کے مارے مجھے قے آنے لگی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور لائٹ جلا دی۔

یہ ایک وسیع واش روم تھا جس کی دیواروں اور فرش پر خون کے چھینٹے تھے۔ ٹب کے ساتھ پڑی ہوئی میز پر کوئی چیز خون سے بھرے ہوئے تولیے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں نے ہمت کر کے تولیا ہٹایا اور ٹھٹک کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہاں ایک نسوانی بازو پڑا تھا۔ ٹب پلاسٹک کی ایک بڑی شیٹ سے ڈھکا ہوا تھا۔ بدبو سے مجھے ابکائی آرہی تھی۔ میں نے شیٹ اٹھائی..... اور وہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

میں صدمے میں ڈوب گیا۔ یہ لاش تو ماریہ کی تھی جو آج میرے دفتر میں آئی تھی۔ وہ جیتی جاگتی حسین لڑکی..... اس کا انجام دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں نے بطور کرائم رپورٹر بھی کام کیا تھا اور میں نے کئی بار ایسے مناظر دیکھے تھے لیکن اس ہولناک منظر نے میرا سارا وجود لرزا کر رکھ دیا۔ میری پیشانی پسینے میں بھیگنے لگی۔ میں نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

کچھ دیر کے لیے تو میرے حواس بالکل مختل ہو گئے پھر میں نے سگریٹ سلگا کر دو چار لمبے لمبے کش لیے کہ خود کو پُرسکون کر سکوں۔ مجھے ابھی یہاں اس وقت تک رکنا تھا جب تک ان دونوں غنڈوں کا کچھ پتا نہ چل جاتا۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا سگریٹ کے کش پر کش لیتا رہا پھر مجھے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ میں چوکنا ہو گیا۔ سگریٹ اپنے پاؤں تلے مسل کر میں تیزی سے بیڈ روم میں داخل ہو گیا اور تھوڑا سا دروازہ کھلا رہنے دیا تاکہ باہر کا منظر دیکھ سکوں۔

مجھے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ میں ہوشیار ہو گیا۔ وہ دونوں بدمعاش اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے یوں اوپر آ رہے تھے جیسے کسی کی موجودگی سے باخبر ہوں۔ میں نے بغیر کوئی لحاظ کیے اپنے سائلنسر لگے ہوئے پستول سے تین فائر کیے جو سیدھے سامنے آنے والے کے سینے میں لگے۔ وہ الٹ کر گرا اور اس کے بوجھ سے اس کے پیچھے آنے والا بھی گرا اور دونوں سیڑھیوں پر لڑھکنے لگے۔

جیسے ہی ان کے گرنے کی آواز آنا ختم ہوئی، میں تیزی سے باہر نکلا۔ ایک وقت میں دو دو سیڑھیاں اترتا میں نیچے پہنچا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے اوپر گرے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کی گردن کے زاویے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اچانک گرنے سے اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے جلدی جلدی ان کی تلاشی لی لیکن مجھے کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ملی۔ میں انہیں اسی طرح جہنم رسید چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

جلد ہی مجھے ٹیکسی مل گئی۔ میں اپنے آفس پہنچا تو دیکھا اندر لائٹ جل رہی تھی۔ میرا ہاتھ میرے پستول پر تھا۔ میں ہینڈل گھما کر اندر داخل ہوا۔ پاؤلا ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ شاید وہ سو رہی تھی۔

''میں انتظار کر رہی تھی کہ شاید وہ لڑکی فون کرے۔ میرا موبائل نمبر تو اس کے پاس تھا نہیں۔''

میں قریب پڑی ہوئی کرسی پر جیسے گر گیا۔ تھوڑی خاموشی کے بعد میں نے اسے بتا دیا۔ ''وہ اب فون نہیں کرے گی کیونکہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔''

☆☆☆

مجھے ایک لمحہ بھی چین نہیں آ رہا تھا۔ اس لڑکی کا معصوم چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ اس کی دی ہوئی خطیر رقم اب بھی میرے پاس تھی اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کا ایک ایک پیسا اس کام میں لگاؤں گا اور سراغ لگاؤں کہ اس مظلوم لڑکی کو اتنی بے دردی سے کیوں قتل کیا گیا تھا۔ اس کے پرس سے نکلنے والے رقعے میں جن ناموں کا تذکرہ تھا، میں ان کے بارے میں بھی جاننا چاہتا تھا کہ ان کا اس مقتولہ سے کیا تعلق تھا۔

اس کے لیے مجھے پھر اکی کی مدد حاصل کرنا پڑی۔ اکی بہت کام کا آدمی تھا۔ ہمیشہ میرے ساتھ تعاون کرتا تھا۔ اس نے مجھے ایک شخص کا ایڈریس دیا۔ میں اسی وقت اس طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے وہ ایڈریس تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

وہ ایک مشہور دکان تھی جہاں انسان کو اس کی آخری منزل تک پہنچانے کے لیے انتظامات کیے جاتے تھے۔ وہ مرحوم لوگوں کو دفن کرنے کا ایک مرکز تھا۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا، ایک خودکار گھنٹی بجی۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ مخمل کے سیاہ پردے، سیاہ رنگ کی کرسیاں اور صوفے ایک پراسرار سا سوگوار منظر پیش کر رہے تھے۔ میرے دائیں جانب شیشے کا ایک بڑا سا شوکیس تھا جس میں مختلف قسم کے تابوتوں کے ڈیزائن بنے ہوئے تھے۔ ان میں لکڑی اور دھات دونوں طرح کے تابوتوں کے ماڈل موجود تھے۔

سیاہ مخملیں پردہ اٹھا اور ایک خاتون باہر آئی۔ اس نے سیاہ ریشمی لباس پہن رکھا تھا جس کا کالر اور کف سفید تھے۔ اس نے گہرا میک اپ کر رکھا تھا۔ سنہری بالوں والی یہ حسینہ جنازے تیار کرنے والی اس دکان میں کچھ اوپری اوپری سی محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟'' وہ بہت نرم آواز میں آہستگی سے بولی۔ ''کیا واقعی تمہیں تابوت کی ضرورت ہے یا کوئی اور کام ہے؟''

''کیا مسٹر لِش سے ملاقات ہو سکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''انتظار کریں۔'' اتنا کہہ کر وہ پردے کے پیچھے چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ واپس آئی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''ہاں..... تم آ سکتے ہو۔''

اس نے پردہ اٹھایا اور میں بھی اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اس خاتون نے جو خوشبو لگا رکھی تھی، وہ مجھے پسند آئی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے بتایا۔ اس نے ایک ابرو اچکا کر میری طرف دیکھا اور مسکرائی۔

''شکریہ.....! اب اس کے جواب میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا میں شرماؤں یا میرا چہرہ سرخ ہو جائے؟'' لہجہ طنزیہ تھا۔

''جب بھی کوئی لڑکی اچھی لگے تو اسے ضرور بتانا چاہیے۔ یہ میرا اصول ہے۔''

اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے دروازے کی

طرف اشارہ کیا۔ ''مسٹر بش وہاں ہیں۔'' پھر اس نے تھوڑا توقف کیا اور معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''تم مجھے پسند آئے ہو۔ تمہاری آنکھیں بہت خوب صورت ہیں۔'' وہ اپنی شمع کی لَو ایسی لمبی سفید انگلیوں سے اپنے سنہری بال سنوارتی سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔

میں اندر داخل ہوا۔ وہ کمرا ایک ورکشاپ کی طرح تھا۔ وہاں چار تابوت پڑے ہوئے تھے جن میں سے ایک پر وہ تانبے کی پلیٹ لگا رہا تھا۔ وہ چھوٹے سے قد کا ایک سانولا سا شخص تھا۔ اس نے سونے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس نے اپنے کام سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ اپنے ہاتھ سے پیچ کش رکھا اور بولا۔ ''اوپر آجاؤ۔'' وہ اٹھا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر والا کمرا کافی کشادہ تھا جس میں دو بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ کمرا ہوادار تھا اور باہر کا منظر اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ بش نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور گلاس میں مشروب انڈیلا۔ اپنی عینک کو ناک پر درست کرتے ہوئے بولا۔

''اکی میرا اچھا دوست ہے۔ اس کے مجھ پر بہت احسان ہیں۔ اس نے مجھے تمہاری مدد کرنے کے لیے کہا ہے۔ بس یہی کافی ہے۔ اب بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں نولان اور پال میں سے کسی کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ نام سن کر وہ چونکا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''نولان تو نہیں...... ہاں، پال شاید تم سے کوئی کام لے سکے۔'' اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور اپنا گلاس میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تھوڑا سا کام ہے۔ تم انتظار کرو۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

میں ہوشیار ہوگیا اور سوچنے لگا کہ یہ شخص باہر کیا کرنے گیا ہے۔ شاید وہ کسی سے فون پر بات کرنا چاہتا ہے۔ کسی سے کوئی مشورہ لینے کے لیے...... مجھے بھی ذرا دیکھ بھال کر چلنا ہوگا۔

دروازہ کھلا، میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہی سنہری بالوں والی حسینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دروازہ بڑی آہستگی سے بند کر کے لاک کر دیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا اور بولی۔ ''بیٹھو، بیٹھو! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔''

''تو پہلے اپنا تعارف کراؤ۔'' میں نے اپنی سب سے دل موہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میرا نام کرلی رابن ہے۔''

''بہت اچھا نام ہے۔'' میں نے بے تکلفی سے کہا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''میں تمہیں یہی مشورہ دینا چاہتی ہوں کہ تم آرام سے اپنے گھر چلے جاؤ۔ یہاں تم جیسے لوگ نہیں چل سکتے۔''

''مشورے کا شکریہ...... لیکن تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''میں نے تمہیں ایک مشورہ دیا ہے۔ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ تم اس پر عمل کرو۔'' وہ رکھائی سے بولی۔

''تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ تمہارا مشورہ بھی بہت اچھا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے مشورے پر عمل نہیں کرسکتا۔ تم اسے گستاخی نہ سمجھنا۔'' میں نے کہا۔

''بہرحال، میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ تم ذرا سوچ سمجھ کر چلنا اور کسی پر بھروسا نہ کرنا۔ بش پر بھی نہیں۔ یہ بہت خطرناک اور قاتل شخص ہے۔ اپنا برا بھلا تم بہتر سمجھ سکتے ہو۔''

''بہت شکریہ کرلی! میں تمہاری بات کو ذہن میں رکھوں گا...... اور اب تم جاؤ...... اس سے پہلے کہ بش واپس آجائے اور تمہیں یہاں دیکھ لے۔''

وہ ایک میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''میں نے یہ سب تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ تم بہت پیارے ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم جیسے ڈارلنگ کو کسی پریشانی کا سامنا ہو۔''

''تمہاری مہربانی...... تم بے فکر ہو جاؤ۔'' میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

وہ میری جانب پلٹ کر میری ٹائی کی گرہ ٹھیک کرنے لگی۔ ''تم واقعی بہت سویٹ ہو۔'' اس نے اپنے ریشمی بازو میری گردن میں حمائل کر دیے۔ میں نے اس کی دلکش آنکھوں کی آمادگی کو دیکھ کر چند لمحے اس کی قربت کی نذر کر دیے اور جب میں اس سے علیحدہ ہوا تو وہ گلابی چہرے کے ساتھ بولی۔ ''میں بھی کتنی پاگل ہوں۔''

''اور کہیں تم مجھے پاگل نہ کر دینا۔ بس ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ہوسکتا ہے ہماری اگلی ملاقات چرچ میں ہو۔'' میں نے انگلیوں سے اپنے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ 'امید ہے مجھے یہاں ملازمت خوب راس آئے گی۔'

☆☆☆

میں اور بش لفٹ کے ذریعے ہوٹل کی پانچویں منزل پر پہنچے تو بش بولا۔ ''میں خود تمام معاملہ طے کروں گا۔ تم خاموش رہنا۔ ویسے تو شاید ہی کسی انجان شخص کو وہ اپنے

ساتھ شامل کرنے پر راضی... ہوں لیکن کوشش کرکے دیکھ لیتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ بش نے ایک کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور کالے سوٹ میں ملبوس ایک شخص نے باہر جھانکا۔ وہ بش کا شناسا معلوم ہوتا تھا اس لیے اس نے بغیر کسی تعرض کے ہمیں اندر آنے دیا۔ سیاہ سوٹ والے کی جیب میں پستول رکھا ہوا صاف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دروازے کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔

یہ ایک بڑا لاؤنج تھا جس کے سامنے تین کمرے تھے۔ بش نے درمیان والے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ کمرے میں چار لوگ تھے اور چاروں سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔ ان میں سے ایک پستول صاف کر رہا تھا۔ بش کو دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔

"یہ کون ہے؟" اس کا لہجہ اکھڑ تھا۔

"یہ رالف ہے۔ ہمارے شہر میں نووارد ہے۔" بش نے اس سے کہا پھر مجھ سے اس کا تعارف کروایا۔ "یہ راجر ہے۔"

راجر کی سبزی مائل پیلی آنکھیں عجیب سی مشکوک تھیں۔ اس کے سر پر گھنے سیاہ بال تھے جو چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے تھے۔ مجھے وہ کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔

راجر نے میری طرف دیکھ کر اپنے سر کو سوالیہ انداز میں جنبش دی۔ "تم کام کی تلاش میں ہو؟"

میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر بے نیازی سے کہا۔ "یہ باقی مشٹنڈے بھی تمہارے ساتھ ہیں یا بس رعب ڈالنے کے لیے رکھے ہوئے ہیں؟"

راجر نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کب تک یہاں رہو گے؟"

"میں نے سن لیا ہے... مگر تم سے مطلب؟" میں نے درشتی سے کہا۔

بش نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر جیسے مجھے محتاط رہنے کے لیے کہا البتہ راجر نے خلاف توقع کوئی ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے خود ہی اپنے تینوں ساتھیوں کا تعارف کروادیا۔

"یہ کولن، بورگ اور طرتیب۔"

تینوں نے میری طرف دیکھ کر سر ہلایا مگر ان کی آنکھوں میں کوئی دوستانہ جذبہ نہیں تھا۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی لیکن میرا خیال ہے کہ تمہارے یہاں کسی کی تواضع کا رواج نہیں۔" میں نے جان بوجھ کر انہیں چھیڑا۔

راجر غصے میں بش کی طرف پلٹا۔ "یہ کون ہے جس کا منہ اتنا کھلا ہوا ہے؟"

"اس کو یہاں کے آداب سکھانا پڑیں گے۔" بورگ بولا۔

میں نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر دو زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دیے۔ بش نے یکدم جیب سے پستول نکالا اور اس کا رخ ان کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

"خبردار! کوئی بدمزگی نہیں ہونا چاہیے۔"

مجھے اس کی یہ جرأت بہت پسند آئی۔ وہ چاروں ٹھٹک گئے۔ بش مجھ سے بولا۔ "بورگ سے دور ہٹ جاؤ۔" اس کی آواز میں ایک ایسی تنبیہ تھی کہ مجھے سوچنا پڑا کہ وہ کوئی ایسا شخص ہے جس سے خطرہ ہوسکتا ہے۔ میں نے پیچھے ہٹ کر ہاتھ جیبوں میں ڈال لیے۔

بش نے تلخی سے کہا۔ "جب میں اپنا کوئی دوست یہاں لے کر آؤں تو اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگوں میں سے کچھ کے لیے تابوت تیار کرنے کی ضرورت ہے۔"

مجھے ہنسی آگئی جو میں نے بہ مشکل روکی۔ ان لوگوں

مختلف بیویاں اپنے شوہروں سے لڑتی ہوئیں

☆ پائلٹ کی بیوی...... زیادہ مت اڑو، سمجھے؟

☆ ٹیچر کی بیوی...... مجھے مت سکھاؤ۔ یہ اسکول نہیں۔

☆ ڈینٹسٹ کی بیوی...... دانت توڑ کر ہاتھ میں دے دوں گی۔

☆ حکیم کی بیوی...... نبض دیکھے بغیر طبیعت درست کردوں گی۔

☆ ڈاکٹر کی بیوی...... تمہارا الٹرا ساؤنڈ تو میں ابھی کرتی ہوں۔

☆ فوجی کی بیوی، تم اپنے آپ کو بڑی توپ چیز سمجھتے ہو۔

☆ شاعر کی بیوی...... تمہاری ایسی تقطیع کروں گی کہ ساری بحریں اور نہریں بھول جاؤ گے۔

☆ ایم بی اے کی بیوی...... مائنڈ آن یور بزنس۔

☆ وکیل کی بیوی...... تیرا فیصلہ تو میں کرتی ہوں۔

☆ ڈرائیور کی بیوی...... گیئر لگا اور نکل یہاں سے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

نے گلاس میز پر رکھے اور مشروب سے انہیں بھرنے لگے۔

میں نے اپنا سوال پوچھنا ضروری خیال کیا۔

''کیا نولان اس وقت یہاں موجود ہے؟''

راجر نے ایک نگاہِ غلط انداز مجھ پر ڈالی۔''نولان کے پاس بیکار لوگوں سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا۔ اسے تمہارے بارے میں بتا دیا جائے گا۔''

میں نے اٹھ کر انہیں مخاطب کیا۔''یہ میری غلطی تھی جو میں یہاں چلا آیا۔ تم لوگ میرے کام کے نہیں ہو۔ فارغ بیٹھ بیٹھ کر تم نے خود پر منوں چربی چڑھا لی ہے۔ مجھے تمہارے بجائے کسی اور سے بات کرنا ہوگی۔''

راجر نے پھنکار کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن بش اس سے پہلے ہی پستول ان کی طرف سیدھا کر چکا تھا۔

''اس کی سفارش اکی نے کی ہے اور اکی ہمارا بہت اچھا دوست ہے۔ اس لیے یہ بھی ہمارا دوست ہے اور میں اپنے دوستوں کے ساتھ کسی کو بدتمیزی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' بش نے کہا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔

☆☆☆

میں اپنے کمرے میں آیا تو تھکن سی ہو رہی تھی۔ میں کچھ پُرامید تھا کہ شاید میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔ میں بستر پر دراز ہوا اور بہت جلد سو گیا۔ نہ جانے میں کتنی دیر سویا رہا کہ فون کی گھنٹی نے مجھے جگا دیا۔ میں نے بدمزہ ہو کر فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف کوئی بولا۔

''فوراً ہوٹل پہنچو۔ باس تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

''تمہارا باس جائے بھاڑ میں..... اسے بتا دو کہ میں اس سے ہی ملنے ہوٹل آیا تھا۔ میں ایک ہی جگہ دوبارہ نہیں جاتا۔'' میں نے فون بند کر کے سونے کے لیے آنکھیں پھر بند کر لیں۔

دو منٹ کے وقفے کے بعد پھر فون آیا۔''تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ فوراً پہنچو۔ باس کو انتظار کرنا پسند نہیں ہے۔''

''باس سے کہہ دو کہ اگر اسے ملاقات کا اتنا ہی شوق ہے تو یہاں آ جائے ورنہ جہنم میں جائے۔'' میں نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کے بعد فون کی گھنٹی کئی مرتبہ بجی مگر میں نے پروا نہیں کی۔

نیند تو خراب ہو ہی چکی تھی۔ میں واش روم میں جا کر تازہ دم ہوا اور اپنا کوٹ اور ہیٹ اٹھا کر نیچے آ گیا۔ دوپہر کے سورج نے تمام لابی کو چمکا رکھا تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ کر بے مقصد سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جلد یا بدیر ان لوگوں کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ وہ میری یہ گستاخیاں خاموشی سے تو برداشت نہیں کریں گے مگر ان پر یہ ظاہر کرنا بہت ضروری تھا کہ میری بھی کوئی اہمیت ہے اور میں ان سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک گاڑی بڑی تیزی کے ساتھ سڑک پر نمودار ہوئی۔ اس نے ہوٹل کے گیٹ کے پاس آ کر اس طرح بریک لگائے کہ اس کی تیز آواز ہر طرف گونج اٹھی۔

دھڑ دھڑ دروازے کھلے اور اس میں سے وہی چار مشٹنڈے نکلے جنہیں میں پہچانتا تھا۔ وہ اندر آئے، لابی پر ایک نگاہ ڈالی پھر راجر کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ میری طرف آیا۔ میں نے ایک نگاہِ غلط انداز اس پر ڈالی۔''تمہیں کیا کسی سے ملنا ہے؟'' میں نے بے نیازی سے پوچھا۔

راجر نے دانت بھینچ کر اپنے غصے پر قابو پایا۔''ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔ نولان تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

میں نے نفی میں سر کو جنبش دی اور بیزاری سے کہا۔ ''اس وقت بہت گرمی ہے۔ نولان سے کہو کہ پھر کسی وقت دیکھیں گے۔''

ان غنڈوں میں سے دو آگے بڑھے اور میرے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ راجر بولا۔''تم اپنی ٹانگوں پر چلنا پسند کرو گے یا تمہیں اٹھا کر لے جایا جائے؟''

''میری ٹانگیں سلامت ہیں ..... سمجھے تم ..... ! اور اگر تم میں سے کسی نے مجھے ہاتھ لگایا تو وہ اپنی اس فضول حرکت پر بہت پچھتائے گا۔'' میں اتنا کہہ کر اٹھا اور ان کی گاڑی کی طرف چل پڑا۔

انہوں نے گاڑی بہت تیز چلائی اور سیدھے ہوٹل پہنچے۔ انہوں نے اسی کمرے کے دروازے پر دستک دی جہاں میں پہلے بش کے ہمراہ آ چکا تھا۔ دروازہ کھلا۔ راجر نے مجھے آگے چلنے کے لیے کہا۔ ہم کمرے میں داخل ہو گئے۔

نولان بڑی کھڑکی کے سامنے ایک کاؤچ پر نیم دراز تھا۔ وہ کریم رنگ کا ریشمی گاؤن پہنے ہوئے تھا جس پر سرخ رنگ سے کوئی ڈیزائن بنا ہوا تھا۔ سنہری رنگ کا ایک رومال اس کی گردن میں بندھا ہوا تھا۔ اس نے سرخ ترکی جوتے پہن رکھے تھے۔ وہ دیکھنے میں نوخیز لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمر بیس بائیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے باریک ہونٹ سرخ اور اتنے پتلے تھے کہ ایک لکیر کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ اس کی چھوٹی ناک کے نتھنے بہت بڑے تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی پلکیں دراز اور خمیدہ تھیں۔ اس نے سیاہ بالوں کا ایک عجیب سا جدید اسٹائل بنا رکھا تھا جس سے اس کی

ہیئت کذائی اور بھی بے ڈھنگی ہوگئی تھی۔ بظاہر وہ خوب صورت تھا مگر اچھا انسان معلوم نہیں ہوتا تھا۔

''یہ ہے راس!'' راجر اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں اس سے کچھ دور ایک کرسی پر بیٹھ گیا کیونکہ اس کی انگلیوں میں دبے سگریٹ کے دھوئیں میں کسی نشے کی ناگوار بُو تھی۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں...... بولو...... کیا بات ہے؟'' لہجہ متکبرانہ تھا۔

''میں بش کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ تمہارے کارندوں نے کہا کہ تم مصروف ہو۔ میں اس قسم کے رویّے کا عادی نہیں ہوں۔ اب تو میں تم سے کسی بھی موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔''

''اُس کا کہنا ہے کہ تم قابلِ اعتبار ہو۔ میں نے اس لیے تمہیں بلایا ہے۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تو پھر......؟'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

''تم ہمارے کام کے آدمی ہو سکتے ہو مگر یہ تمہیں ثابت کرنا ہوگا۔'' نولان مسکرایا۔ ''تم پُراعتماد لگتے ہو...... چلو دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے شانے اچکائے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔ مجھے ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی وہ دلچسپ معلوم ہوگا۔''

ہم باہر آئے تو وہ چاروں بھی ہمارے ساتھ ہو گئے۔ ان میں سے بورگ کا رویّہ نسبتاً دوستانہ تھا، باقی تینوں کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت تھی۔ ہم سیڑھیوں سے اترے تو سامنے ہی ایک بند دروازہ تھا۔ نولان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ ایک کشادہ کمرا تھا۔ اس سے آگے ایک اور دروازہ تھا جسے کھولنے کے لیے بورگ کو کافی زور لگانا پڑا۔ کمرے میں تقریباً اندھیرا تھا البتہ کچھ دور روشنی کے دو دھندلے سے دائرے نظر آرہے تھے۔ نولان آگے بڑھ گیا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ میں نے بورگ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''یہ آفس ہے۔'' وہ دبی زبان سے بولا۔

میں بھی اندر داخل ہوا۔ نولان ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ راجر راہداری میں کہیں غائب ہوگیا۔ چند لمحوں بعد وہ ایک آدمی کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے کمرے میں آیا۔ وہ اس کے کوٹ کے کالر کو پکڑ کر اسے یوں گھسیٹ رہا تھا جیسے وہ انسان نہیں، کوئلوں کی بوری ہو۔ راجر نے نولان کے قریب آکر اسے ایک کرسی پر دھپ سے ڈال دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا، گندے سے کالے سوٹ میں وہ کوئی چینی تھا جس کے چہرے پر خوف تھا اور اس نے اپنے ہاتھ بغلوں میں دبا رکھے تھے۔ اس نے چہرہ جھکا رکھا تھا۔ راجر نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا جس پر خوف سے مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی کالی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔

''تم ابھی اور اسی وقت یہ خط لکھو گے۔'' نولان نے دبنگ لہجے میں کہا۔

راجر نے اس کے بال مٹھی میں دبا کر اس کا جھکا ہوا چہرہ اوپر اٹھا کر اسے ایک جھٹکا دیا۔ نولان مسکرایا۔ ''اس کے ہاتھ میز پر رکھو۔''

راجر نے زور لگا کر اس کے ہاتھ اس کی بغلوں سے نکالنے کی کوشش کی۔ چینی مزاحمت کرنے لگا۔ تھوڑی سی زور آزمائی کے بعد چینی کے چوڑے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں، یہاں تک کہ راجر اس کے ہاتھ میز پر رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ چینی کے ہونٹوں سے ایک دردناک کراہ نکلی۔

میں برداشت نہ کر سکا۔ مجھے دخل دینا پڑا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

بورگ نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے چینی کی میلی انگلیوں اور ناخنوں پر سرخ دھبے صاف نظر آرہے تھے۔

نولان نے ایک نوٹ بک اس کی طرف بڑھائی۔ ''لکھو اس پر۔''

چینی اسی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ نولان نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ''یہاں آؤ، دیکھو......!''

''مجھے یہیں سے سب کچھ صاف نظر آرہا ہے۔'' میں نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

نولان نے میز کی دراز سے کوئی چیز نکالی اور اسے چینی کی انگلی پر بے احتیاطی سے چڑھا دیا۔ میرے لیے یہ سب ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے بورگ کا بازو پکڑ کر سختی سے کہا۔ ''اگر تم نے مجھے نہیں بتایا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے تو میں اس نولان کے بچے کا سر توڑ دوں گا۔ یہ ظالم شخص کر کیا رہا ہے؟''

بورگ کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ دبی زبان سے بولا۔ ''اس شخص کے چار بیٹے ہیں۔ نولان انہیں یہاں بلانا چاہتا ہے تاکہ انہیں اپنے ریکٹ میں شامل کر سکے۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ شخص اب کچھ لکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد تحریر مکمل کر کے وہ بے دم سا ہو کر کرسی پر پیچھے کو گر گیا۔ نولان نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پستول اس کے ہاتھ میں چمکا۔ اس نے اس شخص کے سر کے پیچھے نال رکھ کر

ٹریگر دبا دیا۔ پستول میں سائلنسر لگا تھا۔ کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی اور وہ شخص کرسی پر ایک طرف لڑھک گیا۔

نولان نے اس کی تحریر اٹھا کر جیب میں رکھی اور راجر سے بولا۔ ”بش سے کہو اس کا انتظام کرے۔“ پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا میرے پاس آیا۔ ”کیوں...... تمہیں میرا ریکٹ پسند آیا؟“

میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کا گلا دبا دوں۔ میں نے خود پر بہ مشکل قابو پایا اور پُرسکون لہجے میں اس سے کہا۔ ”تمہارے نزدیک اس کی کوئی معقول وجہ ہوگی مگر میرے نزدیک یہ کچھ زیادہ ہی سنگدلی کا مظاہرہ تھا۔“

نولان فخریہ لہجے میں بولا۔ ”تم اوپر آؤ، میں تمہیں بتاتا ہوں۔“

میں نولان کے ساتھ اوپر آیا۔ وہ اپنے پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ پیئے تمباکو میں ایک عجیب سی بو تھی۔ ایک لڑکی دو کپ بلیک کافی لے آئی۔ جب وہ چلی گئی تو نولان مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اب تم اس ریکٹ میں ہو لیکن ابھی وقت ہے۔ اگر تم اس ریکٹ میں شامل نہیں ہونا چاہتے تو فیصلہ کرلو۔ اگر تم ایک بار اس میں شامل ہوگئے تو پھر باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔“

”میں تمہارے پاس اسی لیے آیا تھا کہ تم مجھے اس میں شامل ہی سمجھو۔“

”ایک بار پھر سوچ لو۔“ وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا۔

”تمہیں اس پر کیا اعتراض ہے؟ اگر میں نے کہہ دیا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو پھر اس سے میرا یہی مطلب ہے۔“

”ہم ان لوگوں کو غیر قانونی طور پر سرحد سے باہر بھیجتے ہیں۔ ہمیں مختلف لوگ آرڈر دیتے ہیں کہ انہیں کتنے لوگوں کی ضرورت ہے۔“ وہ تفصیل سے بتانے لگا۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے کہا کہ باقی معلومات مجھے بورگ فراہم کردے گا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

میرا خیال تھا کہ واپس اپنے ہوٹل جا کر کچھ دیر آرام کروں۔ میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو لمحے بھر کو ٹھٹک کر رہ گیا۔ سامنے ہی ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس میں ایک خاص کشش تھی۔ وہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھی جو اس کے متناسب جسم پر بہت جچ رہا تھا۔ میں اس کا جائزہ لینے کے لیے کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اس حسینہ کی نگاہ بھی مجھ تک آئی۔ اس نے ایک فراخدلانہ مسکراہٹ بکھیری۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں نے اس لڑکی کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ میں نے دماغ پر زور دیا تو مجھے یاد آیا کہ اس کی شکل ماریہ سے بہت ملتی جلتی تھی جو میرے آفس آئی تھی لیکن اب قتل ہوچکی تھی۔ یقیناً یہ اس کی بہن تھی جس کا تذکرہ اس نے کیا تھا لیکن یہ تو بھلی چنگی اپنے ساتھی کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف تھی جبکہ ماریہ نے بتایا تھا کہ وہ مشکل میں ہے۔

مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے بے خبر نہیں تھی۔ کبھی کبھی وہ ایک نگاہِ غلط انداز مجھ پر بھی ڈال لیتی اور پھر اپنے ساتھی کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوجاتی۔ میں بھی وہیں کھڑا رہا کہ دیکھوں وہ کیا کرتی ہے۔

چند لمحوں بعد وہ اپنے ساتھی سے کچھ کہہ کر اٹھی اور ایک ناز بھری چال چلتے ہوئے میرے برابر آ کھڑی ہوئی۔ وہ مجھ سے لاتعلقی ظاہر کررہی تھی حالانکہ وہ میری موجودگی سے باخبر تھی۔

”اکیلے کچھ کھانا پینا گناہ کی طرح لگتا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ شریک ہونا پسند کروگی؟“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

اس نے اَن سنی کردی۔ اپنے پرس میں سے ایک نوٹ نکال کر اس نے آرڈر دیا اور نرمی سے بولی۔ ”مجھے گناہ کرنا پسند ہے۔“

وہ مجھ سے تھوڑا سا رخ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ میں اس کے کان کی لو اور اس کی بلوریں تھوڑی کو دیکھنے لگا۔ اس کے کان میں پہنا ہوا سفید موتی ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ اس کا آرڈر آ گیا۔ میں نے دوبارہ سے مخاطب کیا۔

”کیا میں تمہارا نام معلوم کرسکتا ہوں؟“

وہ بے اعتنائی سے بولی۔ ”گلوریا!“

”میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں مس گلوریا!“ میں نے کہا۔

”مجھ سے......؟“ اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا تو میں کچھ عجیب سا محسوس کرنے لگا۔ لگتا تھا جیسے وہ مجھے اندر تک جانچ رہی ہے۔ ایسا احساس مجھے کبھی نہیں ہوا تھا۔

”میرا نام راس ہے۔ کیا تم......“

میری بات ادھوری ہی رہ گئی۔ ایک شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر آیا اور جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تم اپنا یہ پینا پلانا ذرا جلدی ختم نہیں کرسکتیں؟“

وہ مترنم سی ہنسی ہنس کر صاف آواز میں بولی۔ ”یہ شخص بہت ہی شاندار ہے، زبردست۔“ اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

اس شخص نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ ”جلدی کرو گلوریا! میں کہہ رہا ہوں......“

وہ اس کے غصے کی پروا کیے بغیر بڑے اطمینان سے کہتی چلی گئی۔ ”دیکھو ذرا... یہ کتنی خوبصورت چیز ہے۔ اس کا دراز قد، اس کی وجاہت، اس کی گردن... واہ، اس کا خوبصورت سر اس کے اوپر کتنے فخر سے ٹکا ہوا ہے۔ میں نے ایسا بندہ، اتنا حسین شخص زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔“

میں نے اس کی بکواس کی طرف بالکل دھیان نہیں دیا۔ کاؤنٹر پر گلاس رکھ کر میں نے بل ادا کیا۔ گلوریا ہنستی چلی گئی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ ابھی اس نے مجھے کیا کہا تھا... اکیلے کھانا پینا گناہ ہے۔“

وہ شخص میری طرف متوجہ ہوا۔ ”یہ تم اس سے کیا بات کر رہے تھے۔“ وہ اکھڑ... لہجے سے بولا۔

وہ ہنس ہنس کر دہری ہوگئی۔ ”اوہ... آرام سے بات کرو۔ اتنے اسمارٹ اور وجیہہ بندے کے ساتھ بات کرنے کا یہ طریقہ تو نہیں ہے۔“

میں نے بے نیازی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”منے! اس قسم کی بات کرنے کے لیے تم بہت چھوٹے ہو۔“

وہ شخص دانت پیس کر میری طرف جھپٹا لیکن ہوٹل کا منیجر ہمارے درمیان آگیا جو غالباً ہماری اس تکرار کو دیکھ رہا تھا۔ وہ منیجر کے سر پر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ منیجر نے دبے لہجے میں اس سے کچھ کہا تو اس نے جھپٹ کر گلوریا کی کلائی پکڑی اور اسے کھینچتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا۔

میں نے منیجر کو آنکھ ماری۔ ”غضب کی لڑکی ہے۔“

منیجر سنجیدہ ہی رہا۔ ”بہتر ہے کہ اب تم بھی جاؤ۔“

☆☆☆

شام کو میں بش کی ورکشاپ میں پھر جا پہنچا۔ وہ ایک تابوت پر کام کر رہا تھا کہ راجر وہاں آیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ ”رات آٹھ بجے تمہارے لیے ایک کام ہے۔ میں تمہیں یہیں سے لے چلوں گا۔“

”کیا کام ہے؟“ میں نے سگریٹ سلگایا۔

”تمہیں پتا چل جائے گا۔“ وہ بولا۔

”میری بات غور سے سنو راجر! میں اس طرح کام نہیں کیا کرتا۔ مجھے سیدھی طرح سے کام بتاؤ ورنہ میں اس معاملے میں نہیں ہوں۔“

راجر نے تھوڑی کھجائی۔ ”ہمیں آج رات کچھ لوگوں کو وصول کر کے انہیں مقررہ جگہ پہنچانا ہے۔“

”ٹھیک ہے... میں چلوں گا۔“

راجر چلا گیا تو بش نے میری طرف دیکھا۔ ”تم اس شخص کے ساتھ غلط طریقے سے چل رہے ہو۔ یہ بہت کمینہ ہے۔ ذرا خیال کرنا۔“

”بہت بہتر... میں اس کا خیال رکھوں گا۔“ میں وہاں سے اٹھ آیا۔

میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو کرلی اپنی سیٹ پر بیٹھی کمپیوٹر پر کوئی کام کر رہی تھی۔ میری آہٹ پر اس نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔

میں بھی مسکرا دیا۔ ”تمہارا دلکش چہرہ دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔“

کرلی نے اپنی حسین آنکھوں کو گردش دی۔ ”مجھے اس قسم کی باتیں متاثر نہیں کرتیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ تمہاری اس سنگدلی کی وجہ سے ہم اپنے دل کی بات کہنے سے باز تو نہیں رہ سکتے۔“ میں نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

وہ مسکرائی نہیں اور کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”تو اب تم بھی اس ریکٹ میں ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اچھا خوبصورت آدمی ہے... ہیں نا...؟“

”میں تو ایسا نہیں سمجھتا اور تمہیں بھی اس کے بارے میں زیادہ نہیں سوچنا چاہیے۔“

”میں جو مرضی سوچوں، تمہیں اس سے مطلب۔“

میں دونوں ہاتھ اس کے ڈیسک پر رکھ کر تھوڑا سا جھکا۔ ”مجھے لگتا ہے... تم نولان سے...“ میں نے بات ادھوری چھوڑ کر اسے زیادہ بامعنی بنا دیا۔

کرلی نے چڑ کر سر جھٹکا اور بدمزاجی سے بولی۔ ”کوئی شخص میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور تم میرے معاملات سے دور ہی رہو تو بہتر ہے۔“

میں نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ ”میں تو چاہتا ہوں کہ تم اپنا پیارا سا گھنگرالے بالوں والا سر میرے شانے پر رکھ کر مجھ سے اپنے دل کی ساری باتیں کہہ دو۔“

”شکریہ! میں ایسی حماقتیں نہیں کیا کرتی۔“ وہ روکھائی سے بولی اور اپنے کام کی طرف اس طرح متوجہ ہوئی جیسے مجھ سے جان چھڑانا چاہتی ہو۔

میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کرلی کے دل میں نولان کے لیے کوئی نرم گوشہ ضرور تھا۔ مجھے افسوس ہوا کیونکہ نولان ایسا شخص نہیں تھا جس پر اپنے جذبوں کو ضائع کیا جائے۔ وہ ایک خطرناک اور بے رحم شخص تھا۔

☆☆☆

میں راجر کے ساتھ وعدے کے مطابق ٹھیک بارہ

بجے ساحلِ سمندر پر پہنچ گیا۔ موٹر بوٹ تیار تھی۔ وہ سب اس میں سوار ہوئے۔ جیسے ہی موٹر بوٹ سمندر کے درمیان پہنچی، ہوا ٹھنڈی اور تیز ہوگئی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہونے لگی تھی۔ چاند کا کہیں پتا نہیں تھا۔ سمندر کے سیاہی مائل نیلے پانیوں اور تاریکی میں ڈوبے آسمان کے درمیان کچھ بھی دیکھنا محال تھا۔ راجر نے اپنی پیشانی پر ایک لائٹ باندھ رکھی تھی جسے وہ وقفے وقفے سے جلا بجھا کر اس سے راستہ دیکھنے کا کام لے رہا تھا۔

''تمہیں شاید سردی محسوس ہو رہی ہے تو تم انجن روم میں چلے جاؤ۔'' بورگ مجھ سے بولا لیکن میں انسانوں کی اسمگلنگ کا سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا اس لیے میں نے اس کی بات کو نظرانداز کردیا۔

موٹر بوٹ سمندر کی لہروں سے کھیلتی، جھٹکے کھاتے ہوئے چلی جارہی تھی کہ دور سے ایک روشنی وقفے وقفے سے کئی بار چمکی۔

''میرا خیال ہے، یہ ہمارے ہی لوگ ہیں۔'' راجر بولا۔

اس نے اپنی ہیڈ لائٹ ایک مرتبہ جلا کر پھر بجھادی۔ موٹر بوٹ آگے بڑھتی رہی پھر تاریکی میں روشنی کا سگنل ہوا۔ سامنے سے ایک کشتی آتی ہوئی نظر آئی جس میں چار لوگ تھے۔ بورگ نے موٹر بوٹ کی اسپیڈ بالکل کم کردی۔ وہ کشتی قریب آئی اور ایک شخص نے کہا۔ ''آرڈر آگیا ہے۔''

''ٹھیک ہے اور اسپیشل آرڈر۔'' ادھر سے کہا گیا۔

''ہاں۔''

''تو پھر شروع کرو۔''

وہ لوگ خوفزدہ سے ایک ایک کر کے موٹر بوٹ پر منتقل ہوتے رہے۔ میں غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ان کی تعداد گن سکوں۔ مجھے نیم تاریکی میں ایک کمزور سا لاغر جسم نظر آیا۔ مجھے شک ہوا۔ میں نے اپنی ٹارچ سے اس پر روشنی ڈالی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ ایک لڑکی تھی جو بہ مشکل پندرہ سولہ سال کی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ڈری سہمی ہوئی سردی سے کانپ رہی تھی۔ راجر بولا۔ ''ان سب کو لاک کردو۔''

بورگ نے ایک پیکٹ اس کشتی والے کے سپرد کیا۔ وہ چھلانگ لگا کر اپنی کشتی میں پہنچا اور تھوڑی ہی دیر میں کشتی سمندر کے سیاہ پانیوں کو چیرتی نظروں سے غائب ہوگئی۔

بورگ نے موٹر بوٹ اسٹارٹ کردی۔ راجر مجھ سے بولا۔ ''اندر کیبن میں چلے جاؤ اور ان لوگوں کو زنجیروں میں باندھ دو۔''

میں ایک کونے میں زنجیروں کا ڈھیر پڑا ہوا دیکھ چکا تھا۔ میں نے سوال کیا۔ ''مگر کیوں؟''

''احمق! تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں ہے۔'' وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہماری حفاظت کے لیے یہ سب ضروری ہے کیونکہ اگر کوسٹ گارڈ اس طرف آگئے تو ہم انہیں سمندر میں دھکیل دیں گے۔ زنجیروں کے وزن کی وجہ سے یہ لوگ ذرا جلدی تہ میں چلے جائیں گے۔''

میں اس کی سنگدلی پر کانپ گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے موٹر بوٹ کا اسٹیئرنگ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اس قسم کے کام کرنا پسند نہیں کرتا۔ تمہیں کرنا ہے تو خود کرلو۔''

''عجیب بے کار شخص ہو تم بھی۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''اگر تمہیں یہی کچھ کرنا تھا تو ہمارے ساتھ آئے ہی کیوں تھے؟'' وہ زنجیریں گھسیٹتا ہوا چلا گیا۔

میں ان کے کرتوت دیکھ کر یہی سوچ رہا تھا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ کام نہیں کرسکتا تھا۔ ان کے بارے میں جتنی بھی ضروری معلومات ہوسکتی تھیں، میں اکٹھی کرچکا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ایک انسانی چیخ کے بعد پھر خاموشی چھاگئی۔ صرف موٹر بوٹ کی آواز فضا میں گونجتی رہ گئی۔

راجر واپس آیا۔ اس نے اسٹیئرنگ میرے ہاتھ سے لیا تو میں نے پوچھا۔ ''سب ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں!... وہ لوگ زنجیریں نہیں پہننا چاہ رہے تھے۔ خوامخواہ ہنگامہ کررہے تھے۔ آخر مجھے ایک کی ٹانگ میں گولی مارنا پڑی۔''

میری پریشانی بڑھنے لگی۔ راجر مجھ سے بولا۔ ''تم جا کر ذرا بورگ سے کہو کہ لڑکی کا دھیان رکھے۔ اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی تو مصیبت ہوجائے گی۔''

میں جیسے ہی کیبن میں داخل ہوا، لمحے بھر کو ساکت سا رہ گیا۔ بورگ لڑکی کے ساتھ دست درازی کررہا تھا۔ وہ مزاحمت کررہی تھی۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ میں برداشت نہ کرسکا۔ میں نے بے ساختہ بورگ کے کالر میں ہاتھ ڈال کر اسے پیچھے کھینچ کر دور پھینکا۔ وہ سیدھا دیوار کے ساتھ ٹکرا کر گر پڑا۔ میں نے غصے میں کئی بار اسے زوردار ٹھوکریں لگائیں۔ وہ کوشش کر کے بہ مشکل اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کا چہرہ پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ وہ شدید طیش میں لفظ چبا کر بولا۔

''دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' وہ غرایا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے قدم بڑھایا اور لڑکی پر جھپٹ پڑا۔ میں نے جیب سے

پستول نکالا اور آگے بڑھ کر اس کا بٹ اس کے سر پر بہت زور سے مارا۔ وہ لڑکھڑایا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑنے لگا اور وہ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ میں نے اپنا پستول جیب میں ڈالا اور اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹ کر کیبن سے باہر لے آیا۔

راجر نے پکار کر کہا۔ ''وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ بورگ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کے منہ سے مغلظات کی بارش ہونے لگی۔ میں اس کی کوئی پروا کیے بغیر راجر کے پاس آ گیا۔ اس نے تشویش سے میری طرف دیکھا۔ ''یہ کیا ہو رہا تھا ابھی؟''

''یہ بدمعاش، لڑکی کے ساتھ زبردستی کر رہا تھا۔ میں نے ذرا اسے بتایا ہے کہ اپنی حد میں رہے۔''

ابھی راجر کچھ بولا نہیں تھا کہ مجھے دور سے ایک روشنی نظر آئی۔ بورگ جو اب اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا تھا، اس نے دور ہی سے چلّا کر خبردار کیا۔ راجر نے موٹر بوٹ کو جلدی سے گھمایا۔

''اوہ...... یہ تو کوسٹ گارڈز ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ہمیں نہیں دیکھ سکیں گے۔'' اس نے موٹر بوٹ کی وہ مدھم روشنیاں بھی بجھا دی تھیں جو پہلے جل رہی تھیں۔ موٹر بوٹ تاریک پانیوں پر پھسلتی جا رہی تھی مگر تھوڑی ہی دیر میں چاند بادلوں سے باہر آ گیا اور اس کی مدھم روشنی میں کچھ چیزیں واضح ہو گئیں۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

تو وہ لوگ پہنچ گئے تھے۔ میں نے دن میں اس بارے میں پولیس کو رپورٹ کر دی تھی۔ وہ موٹر بوٹ ہماری طرف ہی آ رہی تھی۔ میں نے دبی زبان سے کہا۔ ''شاید ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔''

راجر نے بورگ کو پکارا۔ ''جلدی سے اسٹیئرنگ سنبھالو۔ میں بندوقیں لاتا ہوں۔''

راجر بہت جلد واپس آ گیا۔ اس نے ایک بندوق مجھے دی۔ ''ان پر مسلسل فائر کرتے رہو۔''

راجر وہاں چت لیٹ گیا۔ میں بھی ایک طرف اوندھے منہ لیٹ گیا اور میں نے دو راؤنڈ فائر کیے لیکن اس کا خیال رکھا کہ فائر ان کے سروں پر سے گزر جائیں اور انہیں کوئی نقصان نہ ہو۔ کوسٹ گارڈز کی جانب سے جوابی فائرنگ ہونے لگی۔ فائرنگ اتنی مسلسل اور تیز تھی کہ میں اور راجر ایک لمحے کے لیے بھی سر نہیں اٹھا سکتے تھے پھر راجر نے بلند آواز میں کہا۔

''اسی طرح لیٹے رہو۔ زمین کے ساتھ لگ جاؤ۔'' اس نے ایک ہینڈ گرینیڈ کوسٹ گارڈز کی کشتی کی طرف اچھالا۔

ایک زوردار دھماکے کے ساتھ ساری فضا روشن ہو گئی۔ نشانہ ٹھیک بیٹھا تھا۔ موٹر بوٹ چکرانے لگی۔ راجر بولا۔ ''نولان کی ہوشیاری داد کے قابل ہے۔ اگر ہمارے پاس یہ نہ ہوتا تو ہماری مہم ناکام ہو جاتی۔''

میں فکرمندی سے کوسٹ گارڈ کی موٹر بوٹ کو دیکھ رہا تھا جسے آگ لگ چکی تھی اور وہ پانی میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ بورگ موٹر بوٹ کو ان کی موٹر بوٹ سے دور ہٹانے لگا پھر دور سے ایک سبز روشنی نظر آئی۔ راجر اٹھ کر کاک پٹ میں گیا اور اپنے دوسرے ساتھی سے بولا۔ ''وہ لوگ آ گئے ہیں۔ ہم کامیاب ہیں۔''

میں بھی اس کے پیچھے کاک پٹ میں آ گیا۔ وہ سبز روشنی قریب آتی جا رہی تھی۔ راجر اور بورگ دونوں مطمئن تھے۔

☆☆☆

میں تقریباً دو بجے اپنے اپارٹمنٹ پہنچا۔ ابھی میں نے لائٹ نہیں جلائی تھی کہ مجھے احساس ہوا جیسے کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ تاریکی میں کچھ نظر تو نہیں آ رہا تھا، نہ ہی کوئی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں یہاں اکیلا نہیں ہوں۔ ہوا میں ایک نامانوس سی خوشبو تھی جو کسی کے ہونے کا پتا دے رہی تھی۔

میں نے اپنا پستول اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بجلی کا سوئچ دبایا۔ کمرا روشنی سے بھر گیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا۔ گلوریا میرے بستر میں تھی۔ یکدم روشنی میں آ جانے کی وجہ سے وہ اپنی دلکش آنکھیں بار بار جھپک رہی تھی۔ اس کے سنہری مائل سرخ بال میرے تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔

میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ وہ جیتی جاگتی تھی۔ یہ اس کی لاش نہیں تھی۔ گلوریا نے نیند میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا لیکن میں بہت تھکا ہوا تھا۔ اس وقت کسی خوب صورت مسئلے کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو؟'' میں نے رکھائی سے سوال کیا۔

''تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم مجھ سے بات کرنا چاہتے ہو تو میں نے سوچا کہ ذرا اطمینان سے بات کر لی جائے۔ میں تو گیارہ بجے ہی یہاں آ گئی تھی۔ انتظار کرتے کرتے تھک گئی تو تمہارے بیڈ پر لیٹ گئی کہ ہو سکتا ہے آج رات تم آ ؤ ہی نہیں۔''

''تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟''

اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ اس وقت اتنی شوخ نظر نہیں آ رہی تھی جتنی وہ اس روز معلوم ہوتی تھی۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''تم تو مجھ سے پولیس والوں کی طرح سوال جواب کرنے لگے ہو۔''

''میں تمہیں اس کی مشق کرا رہا ہوں کیونکہ تمہیں کبھی بھی پولیس والوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔''

وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''ابھی تم نے کیا کہا؟''

میں اس کے خون آلود جوتے دیکھ چکا تھا جس سے کچھ داغ قالین پر بھی لگ چکے تھے۔ میں نے اس کا جوتا ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا۔ اس کے جوتوں میں لگا ہوا خون سوکھ چکا تھا۔ میں نے جوتا اس کی طرف اچھال دیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور اس نے جوتا جلدی سے دور پھینک دیا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے اپنا کوٹ اتارا۔ ایک سگریٹ سلگا کر گلی میں جھانکا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے پلٹ کر گلوریا کی طرف دیکھا۔

''تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ بتادو کہ کیا ہوا ہے؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں۔'' وہ سسکی لے کر بولی۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ تم جتنی جلدی یہاں سے چلی جاؤ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ میں ویسے بھی بہت تھکا ہوا ہوں۔''

''وہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اسے کسی نے قتل کیا ہے۔'' وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔

''وہ کون تھا؟''

''ہیری......! وہ لولان کے قریبی لوگوں میں سے تھا۔'' اس کا چہرہ پرسکون ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بھی رونے کا پتا نہیں دیتی تھیں۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ رونے اور پریشان ہونے کی اداکاری کر رہی تھی لیکن میں نے اسے جتایا نہیں مگر اسے چونکانے کے لیے میں نے اچانک پوچھا۔ ''تمہاری بہن ماریہ کہاں ہے؟''

وہ جیسے اچھل سی پڑی پھر فوراً ہی سنبھل گئی۔ میں نے اس کے شانے تھام کر اسے جھٹکا دیا۔ ''تمہاری بہن کہاں ہے؟ بتاتی کیوں نہیں؟''

''تم اسے کیسے جانتے ہو؟''

میں نے ایک انگلی اس کی ٹھوڑی تلے رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ''تمہاری شکل ہو بہو تمہاری بہن جیسی ہے۔ شاید تم جڑواں ہو۔ تم کب سے اپنی بہن سے نہیں ملیں؟''

وہ کچھ ہچکچائی پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ''بہت عرصہ ہوا۔ میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''کتنا عرصہ......؟''

''چار یا پانچ سال۔ میں تو اسے بھول چکی تھی۔ دراصل ہم دونوں میں کبھی اتنی دوستی نہیں تھی۔ وہ میرے بارے میں عجیب عجیب باتیں سوچتی رہتی تھی جس پر ہم دونوں میں خوب لڑائی ہوتی تھی۔ جب ہمارے والدین کا انتقال ہوا تو ہم علیحدہ ہو گئے۔''

''جھوٹ مت بولو۔ اگر تم دونوں اتنے سالوں سے نہیں ملے تھے تو وہ میرے پاس کیوں آئی تھی کہ تم گم ہو گئی ہو۔ وہ تمہیں تلاش کرنا چاہتی تھی۔''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ گیا۔ ''مجھے کیا معلوم کہ وہ تمہارے پاس آئی تھی یا نہیں۔ ویسے تم ہو کیا جو وہ تمہارے پاس آئی تھی؟''

''اس بات کو چھوڑو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ آخری مرتبہ تم ماریہ سے کب ملی تھیں؟''

''ایک ہوٹل میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی پھر کچھ بدمزگی ہو گئی اور میں چلی آئی۔ اس کے بعد میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔'' اس نے بتایا۔

''تم جھوٹ پر جھوٹ بول رہی ہو لیکن تمہیں یہ علم تو ہوگا کہ تمہاری بہن قتل ہو چکی ہے۔''

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ''میں تمہارا یقین نہیں کر سکتی۔''

''تمہاری مرضی، نہ مانو لیکن یہ سچ ہے کہ وہ قتل ہو چکی ہے۔ وہ بظاہر ایک اچھی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ وہ اتنے ہولناک انجام تک پہنچی۔ تب سے میں نے خود سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کے قتل کا انتقام لوں گا۔''

''اوہ خدایا!'' وہ افسردگی سے ہاتھ ملنے لگی۔ ''یہ تم نے مجھے کتنی بری خبر سنا دی ہے۔ اف میری بہن ماریہ...... میری پیاری بہن......!''

''بند کرو اپنی یہ تھرڈ کلاس اداکاری۔'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ تمہیں اپنی بہن سے ذرہ بھر محبت نہیں۔ تمہیں اس کے دردناک انجام سے کوئی افسوس نہیں ہوا۔''

گلوریا بے ساختہ ہنس پڑی پھر فوراً ہی اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ''اوہ! مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ذرا سوچو، عجیب بات ہے...... ماریہ قتل ہو گئی۔ کتنی عجیب بات ہے۔'' وہ بستر پر اس طرح گر پڑی جیسے اپنی ہنسی روک نہ سکتی ہو پھر تکیے میں منہ چھپا کر ہنستی چلی گئی۔

مجھے اس وقت وہ زہر لگ رہی تھی۔ میں نے اس کا بازو کھینچ کر اسے اٹھایا۔ "بند کرو اپنی یہ فضول حرکتیں۔"
وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور رونے لگی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہتے چلے گئے۔ میں کھڑکی کے قریب چلا گیا۔ میں پہلے ہی بہت تھکا ہوا تھا، اوپر سے یہ لڑکی مصیبت بن کر نازل ہوئی تھی۔ اس وقت ذہن میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔
"باقی باتیں کل ہوں گی۔" اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو کمرا سورج کی کرنوں سے روشن تھا۔ میرا سر بھاری تھا اور تھکن اب تک نہیں اتری تھی۔ میں نے کسلمندی سے آنکھیں ایک مرتبہ پھر بند کرلیں مگر مجھے لگ رہا تھا کہ بیڈ کے پائنتی کوئی بیٹھا ہے۔ میں نے تھوڑا سا سر اٹھا کر اس طرف دیکھا۔ مجھے گلوریا کی مترنم ہنسی سنائی دی، پھر مجھے اس کا حسین چہرہ نظر آیا۔ وہ بیڈ کے پچھلے حصے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اس کی بڑی بڑی دلکش آنکھوں میں شرارت جھلکی۔
"تم سوتے ہوئے بہت پیارے لگتے ہو... معصوم اور مہربان!"
میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے بالوں کو اپنی انگلیوں سے ہموار کرتے ہوئے گلوریا سے کہا۔ "تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ جب میں نے تم سے بات کرنا ہوگی تو تمہیں بتادوں گا۔ مجھے اپنے بیڈ روم میں خواتین کا ہونا پسند نہیں۔ میں ذرا پرانے دور کا ہوں۔ میں ایسی باتوں سے بہکنے میں آجاتا ہوں۔"
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اف! تم کتنے شریر ہو۔"
میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "بس تم بھاگو... اپنے کمرے میں جاؤ۔"
گلوریا نے بازو پھیلائے۔ "اتنے بے حس نہ بنو۔ کیا میں خوبصورت نہیں ہوں؟"
"پلیز... تم جاتی ہو یا...!" میں نے دانت پیسے۔
وہ ہنستے ہوئے بیڈ سے اتری اور سارے کمرے میں ادھر اُدھر ناچتی پھری۔ اس کی ان حرکتوں سے چڑنے کے باوجود مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بے حد خوبصورت ہے۔ وہ ناز سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اب مان جاؤ کہ تم مجھے پسند کرنے لگے ہو۔"
میں نے جھلا کر کہا۔ "اب تم جاؤ گی یا میں...!"
"کیا تم واقعی ایسا چاہتے ہو؟" وہ بے یقینی سے بولی پھر میرے بیڈ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔ "تم سچ کہہ رہے ہو؟"
"اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں ہمشیرہ!"
مجھے لگا کہ وہ ابھی مجھے تھپڑ لگائے گی مگر وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور دروازہ کھلا ہی چھوڑ گئی۔
میں اسے کوستا ہوا اٹھا۔ میں نے ٹھوکر مار کر دروازہ بند کیا اور واش روم میں گھس گیا۔ نہا دھو کر تازہ دم ہوا اور کافی کا آرڈر دیا۔ دو کپ کافی پی کر میرے حواس ٹھکانے آئے۔ تھکن میں کچھ کمی ہوئی تو میں گلوریا کے کمرے میں آیا۔
وہ کھڑکی کے پاس خاموش بیٹھی تھی۔ میری آہٹ سن کر بھی وہ متوجہ نہیں ہوئی۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔
"ہاں... کیا ارادہ ہے تمہارا؟"
گلوریا نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ "میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"
"پہلے میرا خیال تھا کہ تمہارے اس طرح اچانک ٹپک پڑنے سے مجھے بہت پریشانی اٹھانا پڑے گی لیکن خیر، ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔"
"میرا خیال ہے کہ تم بہت ہی پیارے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں دل دے بیٹھوں۔"
ابھی میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا کہ اس نے ایک چیخ ماری اور سامنے کی طرف لڑھک گئی۔ میں نے دوڑ کر کھڑکی سے جھانکا۔ سڑک پر ایک کالی گاڑی بڑی تیزی کے ساتھ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔
گلوریا جو گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھی، فرش پر گر پڑی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا۔ اس کے پہلو میں ایک زخم تھا۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا اور وہ کراہتے ہوئے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ میں نے ایک کشن اس کے سر کے نیچے رکھ کر اسے فرش پر ہی لٹا دیا۔ خود واش روم سے پانی لے کر آیا اور اپنے بیگ میں سے وہ فرسٹ ایڈ باکس نکالا جو میں ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔
اس نے خوفزدہ آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔
"کیا میں بہت زخمی ہوں؟"
"ہمت کرو... میں دیکھتا ہوں۔" میں نے قینچی سے اس کا لباس کاٹا۔
"شکر ہے کہ تم میرے ساتھ تھے ورنہ میں کیا کرتی۔" وہ اتنا کہہ کر رو پڑی۔
میں نے اس کا زخم دیکھتے ہوئے کہا۔ "بس یہ رونا دھونا ختم کرو۔ تم خوش قسمت ہو کہ گولی تمہیں صرف چھو کر گزر

گئی ہے۔ زخم زیادہ خطرناک نہیں۔''

''اوہ خدایا! شکر ہے...... ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ میں مرنے والی ہوں۔''

''ایسا ہو بھی سکتا تھا پر تمہاری قسمت اچھی تھی ورنہ اس کا نشانہ بالکل ٹھیک تھا۔'' میں نے اس کے زخم پر پٹی وغیرہ لگادی۔

''اف... مجھے درد ہو رہا ہے۔''

''یہ تم جیسی شریر لڑکی کے لیے بہت اچھا ہے کہ تم کچھ دن تو آرام سے بیٹھو۔ اب بتاؤ کہ تمہارا گھر کہاں ہے تا کہ میں تمہیں وہاں پہنچا دوں۔''

اس نے نگاہیں چرالیں۔ ''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔''

''تو تم کہاں رہتی ہو؟''

''کہیں نہیں۔''

میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''سنو لڑکی! تم یہ بودی اداکاری چھوڑو اور سیدھے سیدھے بتاؤ کہ تمہیں کہاں جانا ہے تا کہ میں ایمبولینس منگواؤں۔''

''میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں یہاں تمہاری تیمارداری کروں گا؟ ہرگز نہیں...... مجھے اور بھی کام ہیں۔'' میں نے ناگواری سے کہا۔

''میں یہاں محفوظ رہوں گی۔'' وہ بولی۔

''اچھا!'' میں نے اسے سہارا دے کر فرش سے اٹھایا۔

☆☆☆

میں نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں تو مجھے اپنے سر کے اوپر ایک تیز روشنی لٹکتی ہوئی نظر آئی۔ میری آنکھوں کے سامنے شرارے سے لہرا رہے تھے۔ میں نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ میرے سر میں بھاری پن اور درد تھا۔ تیز روشنی آنکھوں میں چبھ رہی تھی لیکن میں نے صورت حال کو سمجھنے کے لیے سر اٹھا کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ میں ایک پرانے سے گندے میٹرس پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے بازو بیڈ کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔

کمرا خالی تھا۔ فرش پر گرد، مٹی اور سگریٹوں کے ٹکڑے تھے۔ آتش دان میں بہت ساری کالک چمٹی ہوئی تھی۔ یہ بہت ہی برا کمرا تھا۔ گندگی، سیلن اور سستے تمباکو کی بو تعفن بن کر ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دماغ پر زور دیا کہ میں یہاں کس طرح پہنچا تھا۔ مجھے یاد آنے لگا...... میں بش کے یہاں اس لیے آیا تھا کہ گلوریا کے بارے میں پتا چلاؤں کہ وہ کون ہے؟ اسی دوران کسی نے عقب سے میرے سر کے پیچھے کوئی چیز بہت زور سے ماری تھی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے گھومتے ہوئے دماغ کو سکون دینے لگا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کوئی اقدام کرتا۔ اس دوران شاید مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد میں ہوشیار ہوا تو پہلے کی نسبت کچھ بہتر محسوس کررہا تھا۔

مجھے تالا کھلنے کی آواز سنائی دی تو میں نے فوراً آنکھیں بند کرلیں۔ کمرے میں کوئی آیا تھا۔ قدموں کی آہٹ میرے بیڈ تک آئی۔ میں بے ہوشی کی اداکاری کرتا رہا اور دل ہی دل میں خود کو کسی غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار کرتا رہا۔ پھر کوئی کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں نے ایک لمبا اور گہرا سانس لیا اور اپنے ہاتھوں کو رسّی سے نجات دلانے کی سعی کرنے لگا۔ میں نے زور لگا کر رسّی توڑنے کی کوشش کی مگر وہ مضبوط تھی۔ مجھے پسینے آگئے مگر میں اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ صبر و تحمل سے اپنی کوشش میں مصروف رہا۔ بالآخر میں اپنا بایاں ہاتھ آزاد کرانے میں کامیاب ہوگیا۔

مجھے روشنی کی کرن نظر آئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے بائیں ہاتھ ہی کی مدد سے میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی گرہ تھوڑی سی کوشش سے کھول لی لیکن جیسے ہی میں آزاد ہوا، مجھے پھر دروازے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں وہیں بیڈ پر دبک گیا اور میں نے اپنے ہاتھ رسیوں میں ڈال لیے جواب ڈھیلی ہوچکی تھیں۔

دروازہ کھلا اور نولان اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ راجر اور بورگ بھی تھے۔ میری آنکھوں کو کھلا دیکھ کر وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''بالآخر تم ہوش میں آہی گئے، پیارے بدمعاش!''

تو میرا اندازہ درست تھا کہ یہ کارنامہ نولان کا ہی تھا۔ وہ قریب آیا اور بیڈ پر میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''ہاں...... تو تم ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہو؟''

میں خاموش رہا۔ چند لمحے نولان بھی چپ رہا۔ نولان نے اچانک ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر دے مارا۔ میرا سر گھوم گیا لیکن میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ نولان نے ایک تھپڑ اور مارا۔ یہ بھی زناٹے دار تھا مگر میں برداشت کرگیا۔

''تمہارا یہاں آنے کا مقصد کیا تھا؟ تم کس بات کا سراغ لگانے کے لیے یہاں آئے تھے؟''

''میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اپنی حد میں رہو۔ اگر تم

نے کچھ کیا تو خدا کی قسم، میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔‘‘
راجر زور سے ہنس پڑا۔ ’’اس پاگل کو دیکھو۔ بے چارہ کیسے کیسے دعوے کررہا ہے۔‘‘
نولان نے خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ’’میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ سب کچھ سچ سچ بتا دو ورنہ ہمیں دوسرا طریقہ استعمال کرنا پڑے گا۔‘‘
میں بہت آہستگی سے اپنے ہاتھ آزاد کرانے لگا۔ نولان اپنی جگہ سے اٹھا اور راجر سے بولا۔ ’’تم ذرا اسے ذہن نشین کراؤ کہ اس کے ساتھ کیا ہوسکتا ہے۔‘‘
جیسے ہی راجر میرے قریب آیا، میں نے اپنے ہاتھ آزاد کرالیے اور اپنی لات اس انداز میں چلائی کہ وہ سیدھی راجر کے گھٹنوں پر لگی۔ اس ضرب میں میری پوری طاقت تھی۔ راجر درد سے بے حال ہوگیا اور لڑکھڑانے لگا۔
بورگ دوڑ کر مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن میں اس حملے کے لیے تیار تھا۔ میں نے ایک زبردست مکا بورگ کے پیٹ میں مارا۔ وہ اپنا موٹا پیٹ پکڑ کر فرش پر لوٹنے لگا۔ اس کے ماتھے پر پسینا آگیا۔
نولان جلدی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اپنے چیلوں کی درگت بنتے دیکھ کر وہ خوفزدہ ہوگیا تھا۔ وہ نشے کا عادی تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرا مقابلہ نہیں کرسکے گا۔
میں پلک جھپکتے ہی بیڈ سے اتر کر اپنے قدموں پر کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی میں نے لوہے کا بیڈ بھی گھسیٹ لیا۔ میں بیڈ کو گھسیٹتے ہوئے نولان کی طرف بڑھا۔
نولان پیچھے ہٹا۔ راجر نے بیڈ کی ایک ٹانگ پکڑ کر مجھے روکنا چاہا۔ میں اپنی پوری طاقت سے بیڈ کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا آگے بڑھا۔
نولان چلّایا۔ ’’بے وقوفو......! اس کو پکڑو۔ وہاں فرش پر پڑے کیوں مر رہے ہو۔‘‘
تب تک بورگ بھی اٹھ کر یکدم مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے حملے سے میں بیڈ سمیت گر پڑا۔ راجر نے دو تین مکے میرے منہ پر مارے جنہوں نے میرا توازن بگاڑ دیا۔ میں لڑکھڑا کر بیڈ کے ساتھ ہی بڑے زور سے گرا۔ اب راجر کو موقع مل گیا۔ وہ کسی خونخوار درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں نے حفاظت خود اختیاری میں اسے اپنی ٹانگیں زور سے ماریں۔ وہ پیچھے ہٹا تو بورگ نے آکر میری گردن دبوچ لی۔ راجر نے مجھے کئی گھونسے مارے۔
میرا سر گھومنے لگا لیکن میں نے اپنے جسم کو اکڑا کر اپنے قدم فرش پر گاڑ لیے اور بیڈ سے ایک دھکا راجر کو دیا۔ وہ لڑکھڑایا تو میں نے بیڈ سے اسے دھکیل کر زمین پر گرا دیا اور بیڈ کی لوہے کی ٹیک پورے زور سے اس کی گردن پر رکھ دی۔ راجر کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس کے حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکلنے لگیں۔
بورگ میرے عقب سے مجھ پر مکے برسانے لگا لیکن میں نے راجر کی گردن پر اپنا دباؤ برقرار رکھا۔ راجر کا چہرہ نیلا پڑ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہاتھ پیر مارنے لگا۔ نولان دوڑا اور اس نے راجر کو کھینچ کر میری گرفت سے آزاد کرایا۔ راجر تڑپنے لگا اور اس کے حلق سے کسی بیمار کتے جیسی آوازیں نکلنے لگیں۔
میں نے بیڈ کے ساتھ ایک حملہ بورگ پر کیا تو وہ زمین پر آرہا۔ میں نے نولان کو دوڑتے اور پکارتے ہوئے سنا۔ شاید وہ کسی کو اپنی مدد کے لیے بلا رہا تھا۔
مجھے معلوم تھا کہ اگر وہ دوسرے لوگوں کو بلا لایا تو میں تن تنہا ان کا مقابلہ کس طرح کرسکوں گا۔ میں نے زور زور سے بیڈ کو جھٹکا دیا۔ یہاں تک کہ پرانے بیڈ میں سے ایک سریا علیحدہ ہوگیا۔ میں نے اسی سریے سے راجر پر وار کیے جو اٹھنے کی کوشش کررہا تھا اور ایک سریا پوری طاقت سے بورگ کو لگایا۔ وہ دونوں زمین پر لوٹنے لگے۔ میں وہ سریا ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح لے کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن ابھی میں دروازے کے نزدیک نہیں پہنچا تھا کہ دروازہ دھڑ سے کھل گیا اور تین چار غیر ملکی اندر داخل ہوئے۔
انہوں نے آتے ہی پوری قوت سے مجھے دھکا دیا۔ میں لڑکھڑا گیا لیکن میں نے سنبھل کر ان کا مقابلہ کرنے کی پوری کوشش کی لیکن میں اکیلا کب تک ان کا مقابلہ کرتا۔ ان میں سے دو نے مجھے گردن سے پکڑا اور دو نے ٹانگوں پر سے مجھے اٹھالیا۔ میں نے نولان کو یہ کہتے ہوئے سنا۔
’’ٹھہرو......! زیادہ زور سے نہ مارنا۔‘‘
پھر کوئی چیز میرے سر پر زور سے لگی اور میری آنکھوں کے سامنے تاریکی کا پردہ گرتا چلا گیا۔ میرے ساتھ کیا ہوا؟ مجھے کچھ خبر نہیں تھی لیکن جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں اسی کمرے میں ہوں لیکن اب میں فرش پر پڑا تھا۔ انہوں نے میری خوب مرمت کی تھی۔ شاید اسی لیے انہوں نے مجھے باندھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔
مجھ میں ہلنے جلنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ میرے سارے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے خود کو ہوشیار کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور ایک بار پھر بے

ہوش ہوگیا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا تو مجھے لگا جیسے کوئی میری پسلیوں میں ٹھوکریں مار رہا ہے پھر مجھے راجر کی آواز سنائی دی۔

''کیوں مسٹر......! کیا حال ہے؟''

میں غصے سے کھول اٹھا۔ راجر اب بھی میرے پہلو میں ٹھوکریں مارتا جارہا تھا۔ تذلیل کے اس احساس نے مجھے ہمت دلائی کہ اس راجر کے بچے کو مزہ چکھاؤں۔ میں نے اچانک دونوں بازوؤں میں راجر کی ٹانگوں کو جکڑا اور اسے پوری طاقت سے نیچے کھینچا۔ راجر کو یقیناً اس کی توقع نہیں تھی۔ اس نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ وہ دھڑام سے نیچے آرہا مگر فوراً ہی میری گرفت سے نکل گیا۔

غصے سے پاگل ہوکر اس نے مجھے قمیص کا گریبان پکڑ کر اٹھایا اور زور سے نیچے زمین پر پھینک دیا۔

''راجر......! یہ تم کیا کررہے ہو؟'' مجھے نولان کی آواز سنائی دی۔

''میں ذرا اس کا دماغ ٹھکانے لگا رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

نولان نے اپنے پاؤں سے مجھے ہلایا مگر میں گم صم سا بنا رہا۔ نولان بولا۔ ''اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ ہمیں اس سے بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔ آخر یہ یہاں آیا ہی کیوں تھا؟''

''یہ تو چٹکی بجاتے میں سب بک دے گا۔'' راجر بولا۔

''نہیں...... ابھی اس کو ذرا کچھ بہتر ہوجانے دو۔'' نولان بولا۔

دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کی اس گفتگو نے میرے حواس ٹھکانے لگا دیے تھے۔ وہ لوگ پرلے درجے کے ظالم اور درندے تھے۔ پہلے بھی انہوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا، اس نے مجھے اٹھنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اب اگر انہوں نے مجھ سے کچھ اگلوانے کی کوشش کی تو نہ جانے میرا کیا حشر کریں گے۔

یہی وقت تھا کہ کچھ کیا جاسکتا تھا۔ میں کوشش کرکے اپنی جگہ پر اٹھ کے بیٹھ گیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ مجھے کوئی کھڑکی، کوئی روشن دان نظر نہیں آیا۔ دروازہ لاک تھا۔ میں سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ میں ان سے کس طرح چھٹکارا حاصل کرسکتا ہوں لیکن موت کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ صرف خودکشی ہی اس تذلیل سے بچنے کا واحد راستہ تھا مگر اس پر عمل کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی میں اتنی بزدلی پر اتر آؤں گا۔ مجھ میں مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہے گی لیکن اس طرح میں ان کے منصوبے پر پانی پھیر سکتا تھا۔ وہ جو مجھ سے حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ نہیں کرسکیں گے۔

میں نے ایک نکیلی کیل تلاش کی جو اتفاق سے مجھے مل گئی اور جی کڑا کرکے اپنی کلائی میں اسے گہرا اتار دیا۔ پہلے خون کا ایک قطرہ نکلا...... جیسے جیسے میں دباؤ بڑھاتا گیا، خون تیزی سے نکلنے لگا۔ میری آستین سرخ ہونے لگی۔ چند لمحوں میں ہی میرا سر گھومنے لگا۔ زندگی قطرہ قطرہ میرے جسم سے جدا ہونے لگی۔ میرا حال پہلے ہی خراب تھا۔ خون بہنے کے ساتھ ضعف بڑھتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں بے سدھ ہوکر وہیں لڑھک گیا۔

نہ جانے میں اس کیفیت میں کتنی دیر رہا پھر مجھے لگا جیسے کوئی مجھ پر جھکا ہوا ہے۔ میں نے اپنی بند آنکھوں کو... بہ مشکل کھولا۔ مجھے کرلی کا دھندلا دھندلا سا چہرہ نظر آیا۔

''کرلی...... ! یہ تم ہو؟''

میری آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دھند آہستہ آہستہ غائب ہوئی۔ مجھے کرلی کے پیچھے ایک منحنی سا شخص کھڑا ہوا نظر آیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''یہ جلد ٹھیک ہوجائے گا مگر اس کو آرام کرنا ہوگا۔ اگر میری ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا۔''

میرا حلق خشک ہورہا تھا۔ مجھے شدید پیاس لگی ہوئی تھی مگر میں پانی نہ مانگ سکا اور شاید پھر غنودگی میں چلا گیا۔

نہ جانے میں کتنی دیر اس کیفیت میں رہا پھر مجھے ہوش آیا تو میں پہلے کی نسبت بہتر محسوس کررہا تھا۔ میرے سر کا درد اور بھاری پن کم ہوگیا تھا۔ میں اب سننے اور سمجھنے کے قابل ہوگیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کرلی میرے بیڈ کے قریب ہی کرسی ڈالے بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کی دلکش آنکھیں نیند سے بوجھل لگ رہی تھیں۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ کتنے مخدوش حالات اچانک کس طرح بدل گئے تھے۔

''کرلی......! یہ تم ہو یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟''

''خاموش رہو...... تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ سونے کی کوشش کرو۔'' وہ بولی۔

''مجھے پیاس لگی ہے۔'' میں نے بہ مشکل کہا۔

اس نے مجھے پانی دیا۔ میں نے کرلی سے پوچھا۔

''میں کہاں ہوں؟''

''تم میرے کمرے میں ہو۔''

''اوہ......! مگر کیسے...... مجھے یہاں کون لایا ہے؟''

''تم اپنے دماغ پر زور مت ڈالو۔ میں بہت جلد تمہیں بتادوں گی کہ تم یہاں کیسے پہنچے ہو۔''

میں نے تکیے سے سر اٹھایا۔''میں نے بہت آرام کرلیا ہے۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ پلیز، مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟''

کرلی نے ایک گہرا سانس لیا اور بولی۔''بش نے مجھے بتایا تھا کہ نولان کے بندے تمہیں بندرگاہ والے کیبن میں لے گئے ہیں۔ بش تمہارے بارے میں فکرمند تھا کیونکہ تم اسی کے بندے ہو۔ اس کی سفارش پر ہی بش نے تمہارا تعارف نولان سے کرایا تھا۔ بش نے کچھ کارآمد بندوں سے بات کی اور وہ تمہیں نولان کے چنگل سے چھڑا لانے میں کامیاب ہو گئے لیکن تمہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ انہوں نے تمہاری خوب ٹھکائی کی تھی۔ بش نے ڈاکٹر کو بلایا۔ تم اس کے زیر علاج رہے ہو۔ اسی لیے تمہاری حالت کچھ سنبھلی ہے۔''

''آج کیا تاریخ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

کرلی نے مجھے تاریخ بتائی تو مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے ہوٹل سے آئے ہوئے پورے چار روز ہو چکے تھے۔ گلوریا کو میں نے وہیں ہوٹل میں چھوڑ دیا تھا۔ نہ جانے وہ وہاں کیا گل کھلا رہی تھی لیکن اس کے بارے میں مجھے کوئی کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ میری حالت کافی سنبھل گئی تھی۔ میں نے کرلی کا شکریہ ادا کرنا ضروری خیال کیا۔

''تمہارا بہت شکریہ کرلی! تم نے میرا اتنا خیال رکھا لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''مجھے تم ایک اچھے انسان لگتے ہو...... شاید اس لیے۔'' کرلی نے میرا رخسار یوں تھپتھپایا جیسے کسی بچے کو بہلایا جاتا ہے پھر وہ بولی۔''میں تمہارے لیے ناشتا بناتی ہوں تب تک تم فریش ہو جاؤ۔''

میں واش روم میں گھس گیا۔ گرم پانی کے غسل نے میری تھکن اتار دی۔ میں واپس آیا تو ناشتا تیار تھا۔ میں نے میز پر نگاہ ڈال کر توصیفی انداز میں کہا۔''بہت خوب! تم نے تو کمال کر دیا۔''

ناشتا گرم تھا۔ کافی بھی مزیدار تھی۔ میں نے خوب ڈٹ کر ناشتا کیا جس سے میری توانائی بحال ہوگئی۔ میں ابھی کافی کے آخری گھونٹ لے رہا تھا کہ بش کمرے میں آیا۔ وہ بہت سنجیدہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''مسٹر بش! آپ کی بہت مہربانی۔ آپ نے مجھے ایک بہت بڑی مصیبت سے بچایا ہے ورنہ وہ لوگ تو میری جان لینے پر تلے ہوئے تھے۔''

''اب تم فوراً یہاں سے غائب ہو جاؤ۔ اگر نولان کو پتا چل گیا کہ میں نے تمہیں وہاں سے نکالا ہے تو وہ مجھے چھوڑے گا نہیں۔'' بش نے اپنی جیب سے پستول نکال کر میز پر رکھا۔''یہ تمہیں یہاں سے بہ حفاظت نکلنے میں تمہاری مدد کرے گا۔ اسی کے مجھ پر بہت احسان ہیں۔ میں اسی لیے یہ خطرہ مول لے رہا ہوں۔ تم یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔'' وہ اتنا کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں پستول ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ کرلی کمرے میں آئی۔

''تم چلنے کے لیے تیار ہو تو میں تمہیں اپنی گاڑی میں چھوڑ دوں گی جہاں تم جانا چاہو۔'' وہ فراخ دلی سے کہنے لگی۔

''تمہاری مہربانی . . . میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔''

''تم آؤ..... میں گاڑی نکالتی ہوں۔'' وہ اپنا بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا تو مجھے احساس ہوا کہ میری چوٹیں ابھی پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئی تھیں۔ مجھے سیڑھیاں اترنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ دوسرے زینے تک پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ کرلی نیچے کی سیڑھیوں پر گری پڑی تھی۔

میں چند لمحے کھڑا اس کی طرف حیرت سے تکتا رہا۔ میں نے جیب سے پستول نکالا اور سیڑھیاں تیزی سے اتر کر نیچے پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس کی پشت میں ایک چاقو گڑا ہوا ہے۔ میں اس کے برابر رکا اور میں نے کرلی کو سیدھا کیا۔ اس کا سر جھول رہا تھا مگر وہ ابھی سانس لے رہی تھی۔ میں بڑی دقتوں کے ساتھ اسے اوپر لایا۔ اسے بستر پر لٹایا اور جلدی جلدی بش کا نمبر ملا کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

کرلی بہت اذیت میں معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دینے کو اس کا شانہ تھپتھپایا۔

''کرلی......! اگر تم ہمت کرو تو میں چاقو باہر نکالتا ہوں۔''

''نہیں ..... شاید بہت دیر ہو چکی ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے کہنے لگی۔

اس پر کرب کی شدید کیفیت طاری تھی۔ اس کا رنگ سفید پڑتا جا رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے چاقو اس کی کمر سے باہر نکال لیا۔

میں نے تسلی دینے کے لیے اس کے گال تھپتھپائے۔

''تم فکر نہ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نولان کا کوئی بندہ تھا۔ انہیں اس کا حساب دینا ہوگا۔''

''ہاں...... تم ضرور اس کا حساب لیتا مگر مجھے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' اس نے ہانپتے ہوئے بہ مشکل یہ الفاظ کہے۔ اس کا رنگ بالکل سپید پڑ گیا تھا۔ اس کا سانس اکھڑ رہا تھا اور ہونٹ لرز رہے تھے۔

مجھے کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ بش گرتا پڑتا اندر آ رہا تھا۔ وہ مجھے راستے سے ہٹاتا ہوا بیڈ کی طرف دوڑا لیکن لاحاصل ... کرلی اس دنیا سے جا چکی تھی۔ میں فوراً ہی کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا تو مجھے بش کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

میں ہوٹل واپس آیا تو گلوریا، لاری کے ساتھ تاش کھیل رہی تھی۔ لاری کو میں یہاں گلوریا کی حفاظت کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

گلوریا نے تاش پھینک دیے۔ ''کہاں تھے تم؟ خیریت سے تو ہو؟ کیا ہوا تمہارے ساتھ؟'' وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولی۔

''بہت کچھ ہوا ہے... اور تم اٹھو... ہم ابھی روانہ ہو رہے ہیں۔'' میں نے لاری سے کہا۔ ''تم فوراً کرائے کی گاڑی لے آؤ۔''

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''تمہیں پتا چل جائے گا۔''

''نہیں...... جب تک تم بتاؤ گے نہیں، میں نہیں چلوں گی۔''

''تم چلتی ہو یا تمہارے ساتھ زبردستی کرنا پڑے گی؟''

تب تک بٹلر بل لے آیا۔ میں نے بل ادا کیا اور گلوریا کا بازو تھام کر ہوٹل سے باہر نکل آیا جہاں لاری کرائے کی گاڑی لیے ہمارا منتظر تھا۔ میں نے گلوریا سے کہا۔

''ہم وہاں ٹھہریں گے جہاں تم رہتی ہو۔''

وہ چونکی۔ ''کیا مطلب......؟ بس تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے اپنے ساتھ کسی بھی معاملے میں ملوث نہ کرنا۔''

''میں نے کہا نا کہ ہم تمہارے گھر چل رہے ہیں۔'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔''

''ہم وہاں چل رہے ہیں جہاں تم اپنی ضرورت کی چیزیں رکھتی ہو۔''

''تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟''

''نہیں...... یہ بہت مشکل ہے...... اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ تم اس میں ملوث ہو چکی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اچانک آئے اور تمہیں گولی مار کر چلا جائے۔ جس طرح انہوں نے تمہاری بہن کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے ہیں۔''

گلوریا نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے گھر کا ایڈریس بتا دیا۔

وہ پام کے درختوں میں گھری ہوئی ایک خوبصورت جگہ تھی۔ گلوریا کا بنگلا چھوٹا مگر شاندار تھا۔ کھڑکیوں پر سبز پردے پڑے تھے۔ چھوٹا سا لان اور سرسبز و شاداب باغ عمدہ ذوق کو ظاہر کر رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی خوب دیکھ بھال ہوتی ہے۔

گلوریا نے لاری سے کہا۔ ''گیراج پچھلی طرف ہے۔''

''تمہارے پاس کار ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ہے۔''

''زبردست... تو گویا ہم تمہاری گاڑی استعمال کر سکتے ہیں اس لیے کرائے کی گاڑی واپس کر دو۔''

ہم مرکزی دروازے کے قریب پہنچے تو میں نے گلوریا سے پوچھا۔ ''تمہارے پاس کوئی ملازم ہے؟''

''ہاں...... ایک ہاؤس کیپر ہے جو یہاں کا خیال رکھتی ہے۔''

ہم اندر داخل ہوئے تو ایک دبلی پتلی سی غیر ملکی عورت نہ جانے کہاں سے نمودار ہوگئی۔ گلوریا نے اسے کھانا تیار کرنے کے لیے کہا اور ایک دروازہ کھولا جس کے آگے لابی تھی۔ وہ مجھ سے بولی۔ ''تم کچھ دیر آرام کرلو۔ میں فریش ہو کر ابھی آتی ہوں۔''

میں نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ ایک پُرآسائش کمرا تھا۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ملازمہ بھی کمرے میں آگئی اور کھانا میز پر لگانے لگی۔ میں سگریٹ سلگا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں گلوریا بھی وہاں آگئی۔ اس نے سفید ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ جدید تراش خراش گلوریا پر بہت جچ رہی تھی۔ اس کے سینڈل بھی سفید تھے۔ اس نے اپنے سنہری مائل سرخ بالوں کو ایک سرخ ربن سے باندھ رکھا تھا۔ اس کی لپ اسٹک کا رنگ بے حد سرخ اور چمک دار تھا۔

پھر وہ میرے مقابل آن کھڑی ہوئی اور ایک ناز آمیز ادا سے بولی۔ ''میں اچھی لگ رہی ہوں نا؟''

''ہاں۔'' میں نے ایسے ہی غائب دماغی سے کہہ دیا۔

ملازمہ نے کھانا لگا دیا۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ گلوریا میری طرف بہت غور سے دیکھ رہی ہے لیکن جب بھی میں نگاہ اٹھاتا تو فوراً نگاہ چرا لیتی۔

کھانا ختم ہوا تو میں پھر اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔
گلوریا کمرے میں بے چینی سے گھومنے لگی۔ میں اس کو نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔
''تم وہاں بے کار بیٹھے ہوئے کیا کر رہے ہو؟''
''تم کیا چاہتی ہو کہ میں کیا کروں؟''
''اچھا آؤ، میں تمہیں گھر دکھاتی ہوں۔''
مجھے مجبوراً اٹھنا پڑا۔ ہم ایک ساتھ لابی میں سے ہوتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں پہنچے جو قیمتی فرنیچر سے آراستہ خوبصورت کمرا تھا۔ قالین نرم اور دبیز تھے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ''ہاں، یہ بہت خوب صورت ہے۔''
وہ دیوان پر بیٹھ گئی اور اپنے نزدیک اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''آؤ، بیٹھو۔ مجھے اپنا ہاتھ دو۔''
میں نے اپنا ہاتھ اس کے گورے گداز ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے ہلکے سے میرا ہاتھ دبایا اور دوسرا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔
''تم بہت پیارے ہو ڈارلنگ...... کیا کبھی کسی نے تمہیں یہ بتایا ہے؟'' اس کا لہجہ خوابناک تھا۔
میں نے اس کا ہاتھ شانے سے ہٹایا۔ ''ہاں تم جیسی نادان لڑکیاں اس طرح کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔''
''تو تم کیا کرتے ہو... جب نادان لڑکیاں اس طرح کی باتیں کرتی ہیں؟'' وہ دلکش آنکھوں میں سپردگی کی ایک دلربا کیفیت لیے ہوئے تھی۔
''میں ان سے ایک فاصلہ برقرار رکھتا ہوں...... اس طرح...'' میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور اس سے دور ہٹتے ہوئے بولا۔
''تم اتنے ہی بے نیاز ہو یا بن رہے ہو؟'' وہ قدرے تیز لہجے میں بولی۔
''کہیں میں واقعی بے نیاز ہوتا ہوں اور کہیں بن جاتا ہوں۔''
''اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟''
''اس وقت میں بے نیاز بننے کی اداکاری کر رہا ہوں اور بڑی مشکل میں ہوں کیونکہ تم اتنی خوبصورت ہو کہ تمہیں نظر انداز کرنا بہت مشکل ہے۔'' میں نے اس کے حسین گلابی لبوں کو ایک انگلی سے چھو کر کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا اور چھوٹے سے باغیچے میں آ کر ٹہلنے لگا۔

☆☆☆

شام کو میں واپس آیا تو لاری موبائل پر کسی کے ساتھ گپیں ہانک رہا تھا۔ میں اس کے پاس نہیں رکا اور سیدھا گلوریا کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ کھڑکی کے قریب ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ہلکے زرد رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ شام کے کاسنی دھندلکے میں وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ میں نے لائٹ جلا دی تو اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔
''یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟'' وہ جلے کٹے لہجے میں بولی۔
میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ، میں تمہیں ایک کہانی سناؤں۔ اس کی کڑیاں جوڑنے میں تو مجھے بہت محنت کرنا پڑی ہے مگر اب یہ کافی حد تک مکمل ہو چکی ہے۔''
اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔
''یہ بہت ہی دلچسپ کہانی ہے۔'' میں نے مسکرا کر تمہید باندھی۔ ''یہ ایک خوبصورت لڑکی کی کہانی ہے جس نے ایک سیاسی عہدیدار سے شادی کی اور جلد ہی اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس کے عیش و عشرت کی خاطر فنڈز میں گھپلے کرے۔ کچھ عرصہ تو وہ اس مفت کے پیسے پر خوب گلچھرے اڑاتے رہے پھر اس لڑکی نے کہیں اور دلچسپی لینا شروع کر دی اور اس سیاسی عہدیدار کو کرپشن کے جرم میں جیل کاٹنا پڑی جہاں اس نے ایک جرائم پیشہ گروہ میں شمولیت اختیار کر لی۔
''وہ شخص اس لڑکی کو تلاش کرتا رہا بالآخر ایک مرتبہ پھر اس سے تعلقات استوار کرنے میں کامیاب ہو گیا مگر اس لڑکی کی آوارہ مزاجی میں کوئی فرق نہیں آیا۔''
گلوریا نے ناگواری سے سر جھٹکا۔ ''تم کیا فضول داستانیں لے کر بیٹھ گئے ہو۔''
''اگر تمہاری بہن اچانک میرے آفس میں نہ آ جاتی اور مجھ سے مدد کی درخواست نہ کرتی تو شاید میں اس میں اتنی دلچسپی نہ لیتا لیکن جس بے دردی سے اسے قتل کیا گیا، اس نے مجھے مجبور کیا کہ پتا چلاؤں کہ اصل کہانی کیا ہے؟''
گلوریا نے سر جھٹکا۔ ''بس یہی کچھ ہے جو تم جانتے ہو؟''
''نہیں...... بہت کچھ ایسا ہے جو تم جانتی ہو اور مجھے بتا سکتی ہو کیونکہ وہ خوبصورت لڑکی تم ہو اور تمہارا شوہر نولان ہے جس سے تم جان چھڑانا چاہتی ہو۔'' میں نے اس کے حسین چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔
وہ درشت لہجے میں بولی۔ ''پلیز! تم یہاں سے جاؤ۔ میں کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔''
میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم سوچو...... خوب سوچو۔ میں دوسرے کمرے میں تمہارا انتظار کروں

گا۔'' میں دروازے تک گیا اور پھر پلٹ کر اس سے پوچھا۔
''تمہارا اپنی بہن کے بارے میں کیا خیال ہے؟''
گلوریا نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''ہماری کبھی نہیں بنی۔ میں نے کبھی اسے پسند نہیں کیا۔''
''یہ تو تم صحیح کہہ رہی ہو کیونکہ تمہیں اپنی بہن کا ذرا بھی خیال نہیں۔ تمہیں اس کے بُرے انجام پر کوئی افسوس نہیں ہوا۔''
''مجھے کیوں افسوس ہو؟'' وہ تنک کر بولی۔ ''وہ اپنے انجام کی خود ذمے دار تھی۔''
''اچھا......!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اب تو مجھے شک ہونے لگا ہے کہ کہیں تم ہی تو اس کے انجام کی ذمے دار نہیں ہو۔''
گلوریا نے دانت پیسے۔ ''تم یہاں سے جاتے ہو یا نہیں...... تم نے تو مجھے اس سے بھی زیادہ بُرا بنا دیا ہے جتنی کہ میں ہوں۔''
میں کمرے میں پھر واپس آ گیا۔ ''کیا تم واقعی ماریہ کے قتل میں شریک ہو؟''
''فضول مت بکو۔'' وہ زہرخند سے بولی۔ ''یقین رکھو کہ میں نے یہ کام نہیں کیا۔''
میں کمرے سے باہر آ گیا اور اس تمام گورکھ دھندے کے بارے میں سوچتا رہا لیکن فی الحال میری سمجھ میں کچھ زیادہ نہیں آ رہا تھا۔ جب تک کہ گلوریا کچھ اور سچ نہ اگل دیتی۔ کچھ دیر بعد گلوریا نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں باہر لابی میں بیٹھا تھا۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور نرم لہجے میں بولی۔ ''کیا تم نے کبھی کسی لڑکی سے محبت کی ہے؟''
''کام کی بات کرو گلوریا! جب میں کام کر رہا ہوتا ہوں تو ایسی باتوں میں نہیں پڑتا۔''
گلوریا نے شانے اچکائے۔ ''مرد یا تو عورتوں کا پیچھا کرتے ہیں یا اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیتے ہیں کہ وہ کسی عورت کے جذبات کا احترام کریں۔ وہ اس میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں کہ وہ عورتوں کو لفٹ نہیں کراتے۔''
''فی الحال تو نولان تمہیں اچھی طرح سے لفٹ کرائے گا۔ تم اس کے بہت سے راز جانتی ہو۔ اس نے پہلے بھی تم پر قاتلانہ حملہ کروایا تھا۔ اب بھی اگر اس کے بندوں میں سے کسی نے تمہیں دیکھ لیا تو وہ تم کو نہیں چھوڑیں گے۔ سمجھیں تم؟''
''تم مجھے ڈرا رہے ہو؟'' وہ جھرجھری سی لے کر بولی۔
''تم ڈر جاؤ تو بہتر ہے۔ تمہارے حق میں اچھا ہوگا۔''
اس کا دلکش چہرہ یکدم متغیر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا جذبہ جھانکنے لگا جس میں کرب اور خوف تھا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں کیا ہوا ہے؟''
''کچھ نہیں۔'' وہ سر جھٹک کر بولی۔
اگرچہ وہ انکار کر رہی تھی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اقرار کر رہے تھے کہ اس کے اندر کوئی پریشانی یا تردد ہے۔ میں اس بات کو کسی حد تک سمجھ گیا تھا مگر چاہتا تھا کہ وہ خود اس کی وضاحت کرے مگر شاید ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ میں اس کو اسی طرح کسی سوچ میں الجھا ہوا چھوڑ کر چلا آیا۔

☆☆☆

میں بندرگاہ کے علاقے میں پہنچا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ نولان نئے لوگوں کی کھیپ کب لاتا ہے۔ پچھلی بار تو میں انہیں گرفتار کرانے میں کامیاب نہیں ہو پایا تھا لیکن اس مرتبہ میں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں سڑک پر ایک جانب اس طرح چل رہا تھا جیسے کوئی عام شخص کسی کام سے یہاں آیا ہو کہ دفعتاً مجھے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک گیا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا مگر مجھے کوئی گاڑی کہیں نظر نہیں آئی۔ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ اچانک ایک گاڑی پام کے درختوں کے جھنڈ میں سے نکلی۔ اس کی رفتار غیر معمولی طور پر بہت تیز تھی۔ وہ چند ہی لمحوں میں میرے اتنا نزدیک آ گئی کہ اگر میں ایک لمبی چھلانگ لگا کر ایک طرف کچے میں نہ اتر جاتا تو وہ مجھے کچل چکی ہوتی۔ میں نے جیب میں اپنے پستول پر ہاتھ رکھا مگر اس وقت ان سے مقابلہ کرنا عقل مندی نہیں تھی۔
میں دیکھ چکا تھا کہ کار میں تقریباً چار افراد تھے۔ میں تیزی سے ایک موڑ مڑ کر بھاگتا چلا گیا۔ مجھے اپنے پیچھے گولی چلنے کی آواز بھی سنائی دی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ گیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ یکایک مجھے ایک آواز سنائی دی۔
''تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اندر آ جاؤ۔''
میں نے پلٹ کر دیکھا۔ جس گھر کی دیوار سے میں لگا ہوا تھا، اس کی کھڑکی تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی۔ یہ آواز وہیں سے آئی تھی۔ میں نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کی اور سوچنے لگا کہ کیا مجھے اندر چلے جانا چاہیے کیونکہ اس کا قوی امکان تھا کہ وہ گاڑی میرا پیچھا کرتے ہوئے اس طرف

آسکتی تھی۔

میں ابھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا مجھے کیا کرنا چاہیے کہ اس گھر کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر عورت نے جھانکا۔

''اندر آجاؤ.....جلدی.....!''

مجھے دور سے کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں۔ میں نے اس عورت کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے ایک سادہ سی ملاح عورت معلوم ہوئی جو عموماً بندرگاہوں پر کام کرتی ہیں۔ میں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اندر چلا جاؤں۔ وہ عورت دروازے سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''آگے چلے جاؤ اور جاکر کچن میں بیٹھ جاؤ۔''

میں اندر داخل ہوا۔ کچن سامنے ہی تھا جو چھوٹا مگر صاف ستھرا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے کچھ کرنسی نوٹ نکال کر ایک پلیٹ کے نیچے رکھ دیے۔ مجھے باہر سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور وہ عورت اندر آئی۔ ''وہ چلے گئے ہیں۔'' وہ بولی۔

میں کرسی سے اٹھا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ میں بھی چلوں۔''

''اجنبی.....! میری ایک بات کا جواب دو۔ کیا یہ نولان کے لوگ تھے؟''

مجھے حیرت ہوئی۔ ''تم ان لوگوں کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''بہت کچھ..... اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو آج میرا شوہر میرے پاس ہوتا۔''

''تمہارا شوہر.....؟''

''ہاں، میرا شوہر..... وہ کوئی امیر آدمی نہیں تھا لیکن محبت کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کی اپنی موٹر بوٹ تھی۔ ہمارا گزارہ سہولت سے ہوتا تھا۔ نولان کے لوگوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ ان لوگوں کو لائے اور لے جائے جنہیں وہ غیر قانونی طور پر باہر بھیجتے تھے۔ میرا شوہر ایک ایماندار شخص تھا۔ اس نے یہ غیر قانونی کام کرنے سے انکار کردیا تو ان ظالموں نے اسے ماردیا۔ آہ.....! میں اسے کبھی نہیں بھول سکتی..... کبھی نہیں۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔ ''کاش میں ان لوگوں سے انتقام لے سکتی۔''

میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ''صبر کرو، حوصلے سے کام لو۔ ان لوگوں کو ان کے بُرے کاموں کا بدلہ ایک نہ ایک دن ضرور ملے گا۔''

وہ اپنے ایپرن کے کونے سے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے میرے ساتھ دروازے تک آئی۔ میں نے خم ہوکر اسے تعظیم دی۔ ''تم فکر نہ کرو۔ تمہیں بہت جلد یہ خبر ملے گی کہ نولان اپنے انجام تک پہنچ گیا ہے۔''

☆☆☆

میں نے ٹیکسی لی اور گلوریا کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ بنگلے کی تمام لائٹس جل رہی تھیں۔ میری چھٹی حس نے مجھے خطرے کا احساس دلایا۔ میں ٹیکسی کو فارغ کرکے تیزی سے بنگلے کی طرف بڑھا۔ میں نے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور ٹھٹک گیا۔

سامنے ہی لاری قالین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر کے گرد خون کا ایک چھوٹا سا دائرہ بن چکا تھا جس کا رنگ سرخ سے سیاہ پڑ رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اس کے چہرے سے نگاہ ہٹالی۔ کمرے میں کرسیاں لڑھکی ہوئی تھیں۔ میں پستول ہاتھ میں لیے احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ گلوریا کہیں نہیں تھی۔ میں نے دوسرے کمرے میں دیکھا، کچن میں جھانکا تو میں ٹھٹک گیا۔ بش ایک کرسی کو پکڑے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور چہرے پر بے پناہ اذیت۔ میں نے پستول نیچے کرلیا اور اس سے پوچھا۔ ''کیا تم زخمی ہو؟''

''ہاں۔'' وہ لڑکھڑاتے ہوئے بہ مشکل کرسی پر بیٹھا۔ اس کا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھا۔

''یہاں کیا ہوا ہے؟''

''مجھے پتا چلا تھا کہ نولان یہاں آنے والا ہے۔ میں اسے ختم کرنے کے لیے یہاں آیا تھا لیکن مجھ سے پہلے رابرٹ نے مجھ پر گولی چلادی۔'' اس کے انداز میں اذیت تھی۔

''مگر تم نولان کو کیوں مارنا چاہتے تھے؟''

اس نے ایک آہ سی بھری۔ ''کیونکہ انہوں نے کرلی کو مارا تھا۔ میں ان کے سارے ٹولے کو مزہ چکھاتا لیکن.....!'' اس نے اذیت سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے سپید چہرے سے مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ تیزی سے موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔

میں نے تسلی کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''بش! حوصلہ رکھو۔ نولان جو کچھ کرتا پھرتا ہے، اسے اس کا حساب چکانا پڑے گا۔ آؤ، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔''

''نہیں..... کرلی کے بغیر زندگی عذاب ہے۔'' لفظ اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔

مجھے اس کے اس جذبے پر حیرت ہوئی۔ مجھے ایک شائبہ سا ہوا تھا کہ وہ کرلی کو پسند کرتا ہے لیکن اس کی محبت میں اتنی شدت سے مبتلا تھا، مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر اس کے رخساروں کو تھپتھپا کر اسے ہوشیار کیا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ گلوریا اور نولان کہاں جا سکتے ہیں؟''

''تہ خانہ۔'' اس نے بہ مشکل ایک لفظ اگلا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے سنبھالتا، وہ کرسی سے لڑھک گیا۔ میں چند لمحے اس کے قریب کھڑا رہا پھر احتراماً سر جھکایا اور باہر نکل آیا۔

بش کے اس ایک لفظ سے واضح نہیں ہوا تھا کہ اس نے جس تہ خانے کا ذکر کیا تھا، وہ اسی بنگلے میں تھا یا کہیں اور تھا۔ میں نے پستول اپنے ہاتھ میں لیا اور پہلے اسی بنگلے میں تہ خانہ تلاش کرنے کا فیصلہ کیا جو تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے مل گیا۔

میں نے دروازے کو دھکیلا مگر وہ سختی سے بند معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اسے اپنے شانے سے دھکیلا۔ وہ نہیں کھلا۔ میں نے دوسری کوشش کی۔ دروازہ اچانک کھلا اور میں اپنے زور میں تیزی سے اندر داخل ہوا لیکن سنبھل گیا کیونکہ میں اس دھچکے کے لیے تیار تھا۔ میرے سامنے سیڑھیاں تھیں جنہیں طے کرتا میں نیچے اترا تو ان کے سامنے تھا۔ اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھ اپنے پستول کی طرف بڑھتے، میں نے انہیں اپنی زد میں لے لیا۔

نولان ایک صوفہ نما بیڈ پر نیم دراز سگریٹ پی رہا تھا۔ راجر اور اس کا ساتھی دونوں فرش پر بیٹھے تھے۔ وہ تینوں مجھے دیکھ کر ساکت سے ہوگئے۔ راجر کا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا لیکن میں نے اس سے پہلے ہی فائر کر دیا۔ وہ اوندھے منہ گرا اور اس کا خون تیزی سے بہنے لگا۔ وہ خوفزدہ آنکھوں سے میری طرف تکنے لگے۔ میں نے پستول لہراتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں میری بات غور سے سنو۔ اگر تم اپنا یہ انجام نہیں دیکھنا چاہتے تو اپنے لیے دوسرا راستہ چن لو۔ دونوں آپس میں مقابلہ کرلو۔ جو جیت گیا، وہ چھوٹ جائے گا اور یہ سمجھ لو کہ میں اپنے وعدے کا پکا ہوں۔''

ملر کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ ''میں ابھی اسے ٹھکانے لگا دوں گا تو تمہیں اپنا وعدہ نبھانا ہوگا۔''

نولان غصے سے بھنایا۔ ''اس کی باتوں میں نہ آؤ۔ میں تمہارا باس ہوں۔''

''اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو اور دیوار کی طرف اپنا منہ کرلو۔'' میں نے ملر سے کہا اور نولان کی قمیص کا گریبان پکڑ کر اسے ایک جھٹکا دیا۔ وہ ہمت چھوڑ چکا تھا۔ نشے نے اسے کہیں کا نہیں رہنے دیا تھا۔ میں پیچھے ہٹ کر دیوار سے لگ گیا اور انہیں مخاطب کیا۔

''اب تمہیں کس کا انتظار ہے۔ دونوں میں سے کون ہے جو اپنی جان بچانا چاہتا ہے؟''

نولان ایک مرتبہ پھر چلایا۔ اس نے ملر کو دھمکانے کی کوشش کی لیکن اسے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ اس کی ایک نہیں چلے گی۔ ملر کے چہرے پر عجیب غیر انسانی تاثرات تھے۔ وہ اپنے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے جھکے جھکے نولان کی طرف بڑھا۔ نولان نے پیچھے ہٹتے ہوئے اسے جھکائی دینے کی کوشش کی مگر کمرا بہت چھوٹا تھا۔ اس میں داؤ پیچ آزمانے کے لیے زیادہ جگہ نہیں تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر دشمنوں کی طرح حملے کررہے تھے۔ یہاں تک کہ نولان کا پاؤں پھسلا اور ملر اس کے اوپر جا پڑا۔ نولان نے اپنی دو انگلیاں ملر کی آنکھوں میں ماریں۔ اس کا نشانہ اتنا شدید تھا کہ ملر کے منہ سے ایک ہولناک چیخ نکلی۔ وہ الٹ کر گرا۔

ایک ہاتھ دونوں آنکھوں پر رکھے وہ بے تابی سے کمرے میں چکر لگانے لگا۔ نولان اٹھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا اور چوکنا ہو کر ملر کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے ہی ملر اس کے قریب آیا، اس نے اپنا پاؤں اس کے راستے میں رکھ دیا۔ ملر لڑکھڑا کر گرا۔ آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے اس کے حلق سے کربناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ منہ کے بل زمین پر پڑا اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔

نولان اپنی جان بچانے کے لیے ہر کوشش کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس کی خونخوار نظریں ملر پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ دفعتاً اس پر جھپٹا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے ملر کی گردن دبوچ لی۔ اس کی گرفت اتنی شدید تھی کہ ملر کے حلق سے غرغراہٹ کی آوازیں نکلنے لگیں۔ اس نے خود کو چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے لیکن جلد ہی وہ بے دم ہوگیا۔ نولان نے اسے اس طرح ایک طرف پھینک دیا جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی بے کار شے ہو۔ وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

میں اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی نولان کی نظریں مجھ سے ملیں، اس کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ میں نے اپنے پستول سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم خوش قسمت ہو۔ تم یہ جنگ جیت گئے ہو۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں، تم فوراً یہاں سے دفع ہوجاؤ حالانکہ تم اس قابل نہیں

ہو کہ تمہیں زندہ چھوڑ دیا جائے۔''

وہ تیزی سے پلٹا اور لڑکھڑاتے قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ گلوریا کہاں ہو سکتی ہے کہ مجھے ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو دیکھا نولان زمین پر چت پڑا تھا اور اس کے سینے سے خون کا فوارہ سا ابل رہا تھا۔

میں اس کے برابر سے گزر کر آگے بڑھا لیکن اردگرد کوئی نہیں تھا۔ مجھے کسی کار کے جانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے نولان کی طرف دیکھا۔ وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ نہ جانے کس کے ہاتھوں وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر تہ خانے میں آیا کہ اس طرف سے اطمینان کرلوں کہ وہاں کوئی اور تو نہیں۔ مجھے ایک طرف دو کمرے نظر آئے جن کے دروازے بند تھے۔ میں ایک کا ہینڈل گھما کر اندر داخل ہوا اور حیران رہ گیا۔ گلوریا ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کا خوبصورت چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے اس کے ساتھ ٹیک لگالی اور گلوریا کو مخاطب کیا۔ ''تمہیں اتنا زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے تھوڑی دیر کے لیے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''نہیں..... میں اس وقت کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔''

میں ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ گلوریا نے سگریٹ سلگایا اور بے حد برہمی سے بولی۔ ''سنا نہیں تم نے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔''

''بکواس مت کرو۔'' میں نے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے میں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں تم سے بات کرنے آیا ہوں اور میری بات تمہیں سننا پڑے گی۔''

وہ غصے میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے اس کی کلائی پکڑی اور اسے جانے سے روک دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح مجھ پر جھپٹی اور اس نے اپنے لمبے ناخنوں سے میرا چہرہ نوچ لینا چاہا۔ میں نے اس کی دونوں کلائیاں اپنے ایک ہاتھ میں پکڑیں اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔

گلوریا کے ہونٹوں سے ایک کربناک چیخ نکلی اور اس کے گداز رخسار پر انگلیوں کے نشان ابھر آئے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے رخسار کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں اس کے لیے پچھتانا پڑے گا۔''

میں بھی اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''بعد میں پچھتا بھی لیں گے مگر پہلے تم یہ تو بتاؤ کہ تم نے یہ سارا ڈراما کیوں رچایا ہے؟''

گلوریا نے دانت پیسے اور اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں کو اضطراب میں کھولتے اور بند کرتے ہوئے بولی۔ ''تم یہاں سے دفع کیوں نہیں ہو جاتے۔ میں تمہاری کوئی بکواس سننا نہیں چاہتی۔''

''کیوں.....؟ تمہیں اپنے نامۂ اعمال سے کوئی دلچسپی نہیں؟'' میں نے طنزیہ کہا۔

وہ خاموش رہی اور اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی جھلکنے لگی پھر وہ ٹوٹے ہوئے سے لہجے میں بولی۔ ''نولان نے میری زندگی اجیرن کردی تھی۔ اس نے مجھے قید کر رکھا تھا۔ میں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میں اس سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ میں اس کی قید سے نکلنا چاہتی تھی۔'' وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''میں نے تمہارے بارے میں سن رکھا تھا کہ تم ایک کامیاب سراغ رساں ہو۔ میں نے تمہاری مدد حاصل کرنے کا پروگرام بنایا۔ میں نے کالے بالوں والی ایک وگ خریدی اور ماریہ کے روپ میں تمہارے آفس آئی اور اپنی بہن کو تلاش کرنے کے لیے تمہیں رقم دی۔''

میں مسکرایا۔ ''میں کافی پہلے سمجھ چکا تھا کہ یہ سارا چکر تمہارا چلایا ہوا ہے۔ میں اس کے ثبوت فراہم کررہا تھا اور چاہتا تھا کہ تم اس کا اعتراف اپنی زبان سے کرو۔''

''نولان انسان نہیں، شیطان تھا۔ میں اس کے ظلم سے بچنے کے لیے ایک بار پھر تمہارے پاس پناہ لینے کے لیے آئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم میری حفاظت کرو گے۔''

''نولان کے مظالم بہت بڑھ گئے تھے۔ اسے کبھی نہ کبھی تو اس کا حساب دینا ہی تھا۔ وہ میرے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا ہے۔ اس کا گینگ ختم ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ میرا کام بھی ختم ہو گیا ہے۔ رہی تمہاری بات..... تو اب تم آزاد ہو..... جیسی چاہو زندگی گزارو..... جو چاہو کرو..... لیکن نولان کے ساتھ جن کاموں میں شریک رہیں..... نولان کی طرح تمہیں بھی اس کا حساب بھی نہ کبھی تو دینا ہی ہوگا۔''

میں اتنا کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

گلوریا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں اس کی کوئی بات سنے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

⌘⌘⌘

دو پہیے

مرزا امجد بیگ

یہ حقیقت ہے کہ ازدواجی زندگی میں میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں مگر اس سے بڑا اور کڑوا سچ یہ ہے کہ دونوں پہیوں میں توازن برقرار رہے تو گاڑی سہولت سے اپنا سفر مکمل کرتی ہے لیکن یہ پہیے متوازن انداز میں آگے نہ بڑھ پائیں تو رستے کی طرح زندگی میں بھی بہت سارے نشیب و فراز انسان کی آزمائش کرنے چلے آتے ہیں... ان کی زندگی میں بھی کچھ لوگوں کی آمد اپنے ساتھ بہت سے امتحان لے آئی تھی کیونکہ چمکتی دمکتی زندگی کے تاریک پہلو اکثر نظروں سے اوجھل رہتے ہیں لیکن اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ زندگی پر اثر انداز بھی نہیں ہوتے۔

تباہی کے دہانے پر پہنچنے والے ایک جوڑے کی بے اعتباری کا قصہ

وکیل کی غفلت، کوتاہی، ناتجربہ کاری ہو یا پھر بے خبری اور بددیانتی..... نتیجے میں اگر سو جرائم پیشہ افراد عدالت سے بری ہو جائیں تو یقیناً یہ عمل قابلِ مذمت ہے لیکن اتنا سنگین نہیں جتنا کہ کسی ایک معصوم اور بے گناہ شخص کا سزا پا کر جیل کی بے رحم سلاخوں کے پیچھے چلے جانا۔

اس مختصر تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

وہ موسمِ خزاں کی ایک اداس سہ پہر تھی۔ میں عدالت سے فارغ ہونے کے بعد اپنے آفس پہنچا تو معمول کی ڈاک میں ایک دعوت نامہ بھی میری میز پر رکھا ہوا تھا۔ اس پر کوئی ٹکٹ یا مہر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یقیناً وہ دعوت نامہ کسی نے دستی میرے آفس پہنچایا تھا۔ بعد ازاں آفس اسٹاف سے پوچھنے پر میرے اس اندازے کی تصدیق ہو گئی تھی۔

میں نے وہ لفافہ کھول لیا۔ وہ ملائکہ نامی ایک لڑکی کی شادی کا دعوت نامہ تھا جو نفیس صدیقی اور ریحانہ صدیقی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ملائکہ نے حال ہی میں ملائیشیا سے ایم بی اے کی تعلیم مکمل کی تھی۔ میں نفیس صدیقی کو ایک خاص سبب سے جانتا تھا۔ وہ قتل کے ایک کیس میں پھنس گیا تھا اور میں نے اس کیس میں اس کی پیروی کر کے اسے بے گناہ ثابت کرنے کے بعد باعزت بری کروا دیا تھا۔ یادو الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرے اور نفیس صدیقی کے درمیان ایک وکیل اور موکل کا رشتہ تھا۔

ایسا بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے کہ کیس ختم ہونے کے بعد کسی ملزم نے ڈیفنس یا پراسیکیوٹر کے ساتھ رابطہ رکھا ہو۔ ادھر مقدمہ ختم، ادھر کلائنٹ غائب۔ نفیس صدیقی جیسے کلائنٹ خال خال ہی ہوتے ہیں۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے اس کے کیس میں پیروی کی تھی اور اس نے مجھے نہ صرف یاد رکھا تھا بلکہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی میں مدعو بھی کر ڈالا تھا۔

ایک تو یہ شادی ہفتہ وار تعطیل کی شام میں تھی، دوسرے مجھے ان میاں بیوی سے ایک دو ضروری سوالات بھی کرنا تھے لہٰذا میں نے ملائکہ کی شادی میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ نفیس صدیقی کی باعزت رہائی کے چند ماہ بعد مجھے معلوم ہوا تھا کہ واقعے کی تفصیل بیان کرنے کے دوران میں اس نے مجھ سے ایک دو غلط بیانیاں کی تھیں۔ اپنے کلائنٹ کی اس ”حرکت“ کا مجھے دکھ ہوا تھا اور میں نے

دروغ گوئی کا سبب جاننا چاہتا تھا۔

کیس کے بعد پیش آنے والے واقعات پر ہم بعد میں بات کریں گے پہلے "ماریہ مرڈر کیس" کا ذکر ہو جائے۔

☆☆☆

اس کیس کو عدالت میں لگے لگ بھگ تین ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا۔ پہلی چند پیشیاں ابتدائی کارروائیوں کی نذر ہو گئی تھیں۔ اب کہیں جا کر کیس کی اصل شکل نکل کر سامنے آئی تھی۔ گزشتہ پیشی پر میں نے اپنے مؤکل کی ضمانت کرانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن بدقسمتی سے مجھے اس سعی میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ وجہ آپ کو بھی معلوم ہے۔ قتل کے کیس میں نامزد ملزم کی ضمانت ناممکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے۔

جج کرسیِ انصاف پر براجمان ہو چکا تو عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ منصف نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ یہ کم و بیش وہی بیان تھا جو میرا مؤکل اس سے پہلے پولیس کو دے چکا تھا۔ بس چند ایک باتیں ملزم نے میرے مشورے پر اس بیان میں شامل کی تھیں جن کی قانونی اور تکنیکی اہمیت تھی۔

استغاثہ کی جانب سے آٹھ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی۔ میں نے بھی تین چار صفائی کے گواہوں کا بندوبست کر رکھا تھا لیکن میں یہاں پر دونوں اطراف کے صرف اہم گواہوں کا ہی ذکر کروں گا۔

قبل اس کے کہ استغاثہ کی طرف سے گواہیوں کا سلسلہ آغاز ہوتا، میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جنابِ عالی! میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں اور اس کام کے لیے میں عدالت کا زیادہ وقت برباد نہیں کروں گا۔"

میری اس درخواست میں خرابی یا دقت والی کوئی بات نہیں تھی چنانچہ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواباً کہا۔

"پرمیشن گرانٹیڈ۔"

انکوائری آفیسر عہدے کے اعتبار سے سب انسپکٹر تھا۔ اس کی عمر پینتیس سے چالیس کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ متناسب بدن کا مالک ایک چاق و چوبند پولیس اہلکار تھا۔ اس کا نام جاوید خان تھا۔

کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ عدالت کی اجازت سے آئی او وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہوا تو میں اس کے نزدیک چلا گیا۔

"خان صاحب!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر پوچھا۔ "اس واقعے کی اطلاع آپ کو کب اور کس نے دی تھی؟"

"ہمارے روزنامچے کے مطابق اس واردات کی اطلاع پچیس اگست کی صبح ساڑھے دس بجے دی گئی تھی۔" اس نے بتایا۔ "فون کرنے والے شخص کا نام اشتیاق بھائی تھا۔"

"اشتیاق بھائی......!" میں نے الجھن زدہ انداز میں دہرایا اور سوال کیا۔ "کیا لفظ "بھائی" اس کے نام کا حصہ ہے؟"

"نہیں جناب!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "لوگ اسے اشتیاق بھائی کہہ کر پکارتے ہیں اس لیے "بھائی" کا لفظ اس کے نام کے ساتھ جڑ گیا ہے۔"

"یہ اشتیاق بھائی وہی شخص تو نہیں جو مقتولہ والی بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر رہتا ہے اور کسی بینک میں کام کرتا ہے۔" میں نے استفساریہ نظر سے انکوائری آفیسر کی طرف دیکھا۔ "استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں اس کا نام بھی شامل ہے؟"

وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"جی، بالکل وہی۔"

"آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"گیارہ بجے۔" اس نے جواب دیا۔

"آپ نے وہاں کیا دیکھا؟"

"مقتولہ ماریہ اپنے بیڈ روم میں بستر پر مُردہ پڑی تھی۔" اس نے بتایا۔ "اس کی ایک کلائی کی رگ کٹی ہوئی تھی جہاں سے خارج ہونے والے خون نے بستر کو بُری طرح بھگو دیا تھا۔ قریب ہی ایک خون آلود بلیڈ بھی موجود تھا جس پر مقتولہ کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔"

"کیا مقتولہ کے فلیٹ میں اس کے علاوہ کسی اور مرد و زن کے فنگر پرنٹس بھی آپ کو ملے تھے؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "جی نہیں۔"

"ٹھیک ہو گیا۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "جب آپ کرائم سین پر گئے تو آپ نے مُردہ ماریہ کو کس لباس میں دیکھا تھا؟" لحاتی توقف کے بعد میں نے اضطراری انداز میں اضافہ کر دیا۔ "دراصل آپ نے جائے واردات کا جو نقشہ تیار کیا تھا، اس میں مجھے مقتولہ کے لباس کا کہیں ذکر

دکھائی نہیں دیا۔ ہوسکتا ہے آپ لکھنا بھول گئے ہوں۔''
ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمودار ہوئے پھر وہ جلدی سے سنبھلتے ہوئے بولا۔
''مجھے اچھی طرح یاد ہے مقتولہ نے کاٹن کا سرخ پاجامہ اور لون کا سرخ پھول دار کرتہ پہن رکھا تھا۔''
''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں کیا کہیں گے؟''
''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق ماریہ کی موت پچیس اگست یعنی چوبیس اور پچیس اگست کی درمیانی رات ایک اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''اور اس کی موت کا سبب کٹی ہوئی کلائی سے خارج ہونے والا حد سے زیادہ خون تھا۔''
''میڈیکولیگل کی رپورٹ بتاتی ہے کہ مقتولہ کے معدے سے خواب آور دوا۔ کی بھاری مقدار ملی ہے یعنی اپنی موت سے قبل مقتولہ نے کوئی نشہ آور شے کھائی تھی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا آپ مقتولہ کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ سے اتفاق کرتے ہیں؟''
''جی، مکمل اتفاق۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''قاتل نے پہلے مقتولہ کو کوئی زوداثر نشیلی شے کھلائی اور پھر اس کی بے خبری میں کلائی والی رگ کاٹ کر اسے موت کی گہری نیند سلا دیا۔ اس واقعے کو خودکشی کا رنگ دینے کے لیے قاتل نے نہایت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے بلیڈ پر مقتولہ کی انگلیوں کے نشانات بھی ثبت کر دیے تاکہ بادی النظر میں یہی لگے کہ مقتولہ اپنی موت کی ذمے دار خود ہے۔''
''بہت خوب۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''آپ تو قاتل کی کارروائی کو اس طرح بیان کر رہے ہیں جیسے یہ سارا منظر آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔''
''ایسی بات نہیں ہے وکیل صاحب!'' وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''انسان کا تجربہ، مشاہدے کا محتاج نہیں ہوتا۔''
''خان صاحب! آپ نے بڑی گہری بات کر دی ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں آپ کے مشاہدے اور تجربے کے فلسفے کو تنقید کا نشانہ نہیں بنانا چاہتا۔ آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ مقتولہ کے فلیٹ کے کسی بھی حصے میں آپ کو ملزم کی انگلیوں کے نشانات کیوں نہیں ملے تھے؟''
''اس کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''نمبر ایک، قاتل نے یعنی ملزم نے واردات کے وقت اپنے ہاتھوں پر دستانے پہن رکھے تھے۔ نمبر دو، مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس نے ان تمام مقامات کو اچھی طرح صاف کر دیا ہوگا جہاں پر اس کے فنگر پرنٹس پائے جانے کا امکان تھا۔ میں نے بتایا ہے ناکہ ملزم نہایت ہی مکار اور چالباز شخص ہے۔'' بات کے اختتام پر اس نے نفرت بھری نظر سے میرے مؤکل کی طرف دیکھا۔
''حیرت کی بات ہے۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''آپ جیسے دانشمند اور تجربہ کار پولیس آفیسر کی نگاہ تیسرے سبب کی طرف کیوں نہیں گئی۔''
''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں وکیل صاحب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔
''آپ نے ملزم کے جائے واردات پر فنگر پرنٹس کی عدم موجودگی کے ذیل میں دو اسباب کا ذکر کیا ہے، آئی او صاحب!'' میں نے تحمل انداز میں کہا۔ ''لیکن میں سمجھتا ہوں ایک تیسرا سبب بھی ہو سکتا ہے۔''
وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کون سا تیسرا سبب؟''
''یہی کہ وقوعہ کی رات میرا مؤکل اور اس کیس کا ملزم مقتولہ کے فلیٹ پر گیا ہی نہ ہو۔'' میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''اسی لیے مذکورہ فلیٹ کے کسی بھی حصے میں آپ کو ملزم کی انگلیوں کے نشان نہیں ملے۔ اس صورت میں صاف ہو جاتا ہے کہ مقتولہ ماریہ نے خود اپنی جان لی ہے۔ یہ سیدھا سیدھا خودکشی کا کیس ہے۔''
''یہ کسی بھی صورت خودکشی نہیں ہو سکتی وکیل صاحب۔'' وہ قدرے تیز آواز میں بولا۔ ''مقتولہ خود اپنی کلائی کی رگ کاٹ ہی نہیں سکتی تھی۔''
''یہ بات آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں خان صاحب؟'' میں نے اکسانے والے انداز میں استفسار کیا۔
''اس لیے کہ مقتولہ لیفٹ ہینڈر تھی۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔
''اس سے کیا ہوتا ہے؟'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''اس دنیا میں لاتعداد لیفٹ ہینڈر لوگ موجود ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا یا کسی سے یہ نہیں سنا کہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے افراد میں خودکشی کا رجحان نہیں پایا جاتا ہے اور نہ ہی میری نظر سے کوئی ایسا تجربہ گزرا ہے جس میں بتایا گیا ہو کہ خودکشی کرنے والے افراد میں غالب تعداد رائٹ ہینڈرز کی ہے۔''
''آپ سمجھے نہیں وکیل صاحب!'' وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔
''تو مجھے سمجھائیں نا خان صاحب!'' میں نے اپنے چہرے پر مصنوعی معصومیت طاری کرتے ہوئے کہا۔

"میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ..." وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "مقتولہ لیفٹ ہینڈر تھی اور جائے وقوعہ پر اس کی لیفٹ کلائی ہی کٹی ہوئی ملی تھی۔"

میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ تو بہت دور کی کوڑی لائے ہیں، آئی او صاحب!"

"اب آپ ہی بتائیں وکیل صاحب!" وہ چوٹ کرنے والے انداز میں بولا۔ "بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی کوئی شخص اپنی بائیں کلائی کی رگ کیسے کاٹ سکتا ہے؟"

اس نے اپنی دانست میں مجھے لاجواب کرنے کا پکا بندوبست کر دیا تھا۔ آئی او کی اس کارکردگی پر وکیل استغاثہ بھی خاصا مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ان دونوں مخالفین کے ارمانوں پر اوس کا یخ بستہ چھڑکاؤ کرتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کے نچلے حصے یعنی "چاپ" کو بائیں کلائی پر چھری چلانے والے انداز میں حرکت دیتے ہوئے... بہ آوازِ بلند کہا۔

"ایسے......"

میری اس ڈرامائی حرکت پر حاضرینِ عدالت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ آئی او نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔

"وکیل صاحب! یہ تو آپ نے اپنے دائیں ہاتھ سے اپنی بائیں کلائی کو کاٹنے کی اداکاری کی ہے جبکہ مقتولہ کا معاملہ مختلف تھا۔ آپ معزز عدالت کو متاثر کرنے میں ناکام رہے ہیں۔"

مجھے انکوائری آفیسر سے کسی ایسے ہی جواب کی توقع تھی لہٰذا میں نے اس کے وار کا برا ماننے کے بجائے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں کمرائے عدالت میں اداکاری کرنے نہیں بلکہ حقائق کو اجاگر کرنے آیا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ......" میں نے دانستہ لمحاتی توقف کر کے حاضرینِ عدالت پر نگاہ ڈالی اور بہ آوازِ بلند استفسار کیا۔

"آپ میں سے کوئی مرد یا عورت لیفٹ ہینڈر ہے؟"

ایک خاتون نے اپنا بایاں ہاتھ کھڑا کر کے میرے سوال کا اثبات میں جواب دیا تو میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یور آنر! میں ان خاتون کو چند منٹ کے لیے وٹنس باکس میں بلانے کی اجازت چاہتا ہوں تاکہ انکوائری آفیسر کی تشفی کے لیے میں ایک چھوٹا سا ڈیمو پیش کر سکوں۔"

"اجازت ہے۔" جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

اگلے ہی لمحے وہ عورت گواہوں والے کٹہرے میں موجود تھی۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا تو میں نے وٹنس باکس کے قریب جا کر نہایت ہی شائستہ لہجے میں پوچھا۔

"معزز خاتون! آپ کا نام کیا ہے؟"

"نیلوفر!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"نیلوفر جی! آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟"

"میں ایک ہاؤس وائف ہوں۔" اس نے بتایا۔ "گریجویشن کے بعد میری شادی ہو گئی تھی لہٰذا تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ چند سال کے بعد اپنے شوہر کے بے حد اصرار پر میں نے دوبارہ اسٹڈی شروع کی ہے۔ اسی سلسلے میں کبھی کبھار عدالت کے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ یہاں بہت کچھ سیکھنے کو مل جاتا ہے۔"

"انٹرسٹنگ!" میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "نیلوفر جی! اللہ آپ کے شوہر جیسے معقول اور حوصلہ افزا مرد ہر عورت کو نصیب کرے۔"

"آمین۔" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بڑے فخر سے بولی۔

"بائی دی وے......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ "آپ کیا اسٹڈی کر رہی ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں پرائیویٹ ایل ایل بی کی تیاری کر رہی ہوں۔"

"ویری گڈ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے استفسار کیا۔ "کیا آپ واقعی لیفٹ ہینڈر ہیں؟"

"جی ہاں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "میں بھلا آپ سے غلط بیانی کیوں کروں گی۔ لکھنا پڑھنا، کھانا پینا، الغرض ہر کام کے لیے میں اپنا بایاں ہاتھ ہی استعمال کرتی ہوں۔"

"اوکے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "میں نے بھی ایک کام کے سلسلے ہی میں آپ کو کٹہرے میں بلایا ہے۔ کیا آپ تیار ہیں؟"

"جی، میں تیار ہوں۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "آپ کام بتائیں وکیل صاحب!"

اس وقت جج، وکیل استغاثہ، انکوائری آفیسر، ملزم، حاضرینِ عدالت، الغرض ہر ذی نفس کی نظریں مجھ ہی پر ٹکی ہوئی تھیں جیسے میں کوئی مداری ہوں اور کوئی انوکھا، ناقابلِ یقین کرتب دکھا کر انہیں ورطۂ حیرت میں ڈالنے والا ہوں۔

"سمجھ لیں کہ یہ ایک تیز دھار بلیڈ ہے۔" میں نے اپنا قلم نیلوفر کی جانب بڑھاتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "آپ نے اس قلم کو اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ کر، اپنی

بائیں کلائی پر اس طرح حرکت دیتا ہے کہ دیکھنے میں لگے آپ اپنی بائیں کلائی کی رگ کاٹ رہی ہیں۔ یہ محض اداکاری ہے۔ آپ کرلیں گی نا؟''

''اس میں کیا مشکل ہے۔'' اس نے بایاں ہاتھ میری جانب بڑھاتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''ابھی کر کے دکھاتی ہوں۔''

نیلوفر نے بائیں ہاتھ سے مجھ سے میرا قلم وصول کیا پھر اسے اپنے دائیں ہاتھ میں منتقل کرنے کے بعد اپنی بائیں کلائی پر چھری کے مانند چلا کر دکھا دیا۔

عدالت میں ایک مرتبہ پھر مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ حاضرینِ عدالت اپنے اپنے انداز میں اظہارِ خیالات کر رہے تھے۔ جج نے چوبی ہتھوڑے کی ضرب کے ساتھ تحکمانہ انداز میں کہا۔

''آرڈر پلیز...... آرڈر، آرڈر!''

کمرۂ عدالت میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔

''ڈیفنس! پلیز پروسیڈ فردر!'' جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''خان صاحب!'' میں نے روئے سخن انکوائری آفیسر کی جانب موڑتے ہوئے تلخی بھرے لہجے میں کہا۔ ''میری تحقیق کے مطابق مقتولہ ماریہ کا دایاں ہاتھ فریکچرڈ تھا اور نہ ہی مفلوج۔ اس کا دایاں بازو کندھے سے کٹا ہوا بھی نہیں تھا۔ یہ عین اس کے اختیار میں تھا کہ وہ دائیں ہاتھ میں ایک بے وزن، تیز دھار بلیڈ پکڑ کر اسے بہ آسانی اپنی بائیں کلائی کی رگ پر آزما ڈالے اور وقوعہ کی رات اس نے ایسا ہی کیا تھا۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر مرچیں لگانے والے انداز میں اضافہ کر دیا۔

''مائی ڈیئر آئی او! امید ہے میری اور نیلوفر جی کی اس لائیو پرفارمنس نے معزز عدالت کے ساتھ ہی آپ کو بھی متاثر کیا ہوگا؟''

وہ خجل سا ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔

''جناب عالی! میرا موکل بے قصور ہے۔'' میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک گہری سازش کے تحت اسے قتل کے اس مقدمے میں پھنسایا گیا ہے۔ وقت آنے پر میں معزز عدالت کے روبرو یہ ثابت کردوں گا کہ وقوعہ کی رات وہ مقتولہ کے فلیٹ پر نہیں گیا تھا۔ یہ سیدھا سادہ خودکشی کا معاملہ ہے۔ مقتولہ کی موت سے ملزم کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ دیٹس آل یور آنر!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

اس روز ہمارے کیس کا نمبر بہت نیچے لگا ہوا تھا لہٰذا ہمیں بہت کم وقت مل سکا تھا۔ میں نے اپنے بل بوتے پر ذاتی تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے متعلقہ عدالتی عملے کو اس بات پر راضی کرلیا کہ آئندہ پیشی پر ہمارا کیس سرفہرست ہوگا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو ملزم کی اہلیہ ریحانہ صدیقی میرے ساتھ تھی۔ ریحانہ کی عمر پچپن کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ اپنے شوہر نفیس صدیقی سے چند سال بڑی تھی۔ ریحانہ ایک تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی عورت تھی۔

''وکیل صاحب!'' وہ کوریڈور میں میرے ہمراہ چلتے ہوئے بولی۔ ''نیلوفر نے تو کمال کی گواہی دی ہے۔ اس کے عملی مظاہرے سے ہمارے موقف کو تقویت ملی ہے۔ میرا خیال ہے ہم درست سمت میں جا رہے ہیں۔''

''میں آپ کے خیال کی تائید کرتا ہوں ریحانہ جی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میری زندگی کا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ اگر انسان کی نیت صاف، سمت درست اور کوشش پُرخلوص ہو تو اس کے مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کائنات کی تمام قوتیں یکجا کر حرکت میں آجاتی ہیں۔ سو، ہماری کامیابی بھی یقینی ہے۔''

''ان شاءاللہ...... ضرور!'' وہ پورے تیقن سے بولی پھر الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''نفیس جن حالات سے گزر رہا ہے، ظاہر ہے وہ پریشان کر دینے والے ہیں لیکن میں ملائکہ کے لیے بھی خاصی فکرمند ہوں۔''

میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''آپ کی بیٹی کو کیا ہوا ہے؟''

یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ نفیس اور ریحانہ کی اکلوتی اولاد ملائکہ بزنس کی تعلیم کے لیے ملائیشیا گئی ہوئی ہے۔ میرے استفسار کے جواب میں ریحانہ نے بتایا۔

''ملائکہ کے ایم بی اے کا لاسٹ سمسٹر شروع ہو چکا ہے۔ میں نے اسے نفیس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ باپ کے لیے فکرمند ہے اور فوراً کوالا سے کراچی آنا چاہتی ہے۔ میں نے سمجھا بجھا کر اسے یہاں آنے سے روک رکھا ہے۔''

''اسے کوالا (کوالالمپور) ہی میں رو کے رکھیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ملائکہ کو یقین دلانے کی کوشش کریں کہ یہاں حالات قابو میں ہیں لہٰذا وہ اپنی تعلیم کی تکمیل پر توجہ دے۔ ہم اسے بہت جلد ایک خوشخبری دینے والے ہیں۔''

''نفیس کی بریت کی خوشخبری؟'' اس نے تصدیق طلب نظر سے مجھے دیکھا۔''میں ٹھیک سمجھ رہی ہوں نا؟''
میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔'' وہ تہِ دل سے بولی۔
میں نے تسلی، دلاسے اور پُرامیدی کے ساتھ مسز نفیس صدیقی کو رخصت کر دیا اور خود پارکنگ ایریا کی جانب بڑھ گیا۔
کہانی کو آگے بڑھانے سے پہلے میں آپ کو اس کیس کے کرداروں اور ان کے پس منظر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ایک بات کی وضاحت کردوں کہ اس میں سے کئی ایک باتیں مجھے بعد میں پتا چلی تھیں لیکن واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے میں نے انہیں شاملِ خلاصہ کر لیا ہے۔ اسی طرح بعض باتیں میں نے آپ سے چھپا بھی لی ہیں جن کا ذکر مناسب مواقع پر کیا جائے گا تاکہ کہانی میں سنسنی خیزی اور تجسس کا عنصر موجود رہے۔
☆☆☆
جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میرے موکل کی فیملی تین افراد پر مشتمل تھی یعنی نفیس صدیقی، اس کی بیوی ریحانہ صدیقی اور ان کی اکلوتی بیٹی ملائکہ صدیقی جو کوالا کی ایک یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھی۔ ملزم کی رہائش گلستان جوہر کے ایک لگژری اپارٹمنٹ میں تھی۔ وہ عالیشان اپارٹمنٹ اس کی ذاتی ملکیت تھا جہاں ان کی زندگی عیش و آرام سے گزر رہی تھی۔
نفیس صدیقی کا تعلق رنگ و نور کے جہان سے تھا۔ محمد علی سوسائٹی میں ٹیپو سلطان روڈ پر اس کا ایک پروڈکشن ہاؤس تھا جس کا نام ''آرٹ اینڈ آرٹسٹ پروموٹرز'' تھا۔ وہ اس اکیڈمی میں پرائیویٹ پروڈکشن کے علاوہ نئے آرٹسٹ کی راہنمائی اور گرومنگ بھی کرتا تھا۔ ماریہ سے اس کی پہلی ملاقات اسی پروڈکشن ہاؤس میں ہوئی تھی۔
ماریہ کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا۔ جب وہ محض دس سال کی تھی تو ایک حادثے میں اس کے والد سلامت علی کا انتقال ہو گیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد ماریہ کی والدہ راشدہ بیگم نے گھر کی معیشت کی ذمے داری اٹھالی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ عورت تھی۔ اس نے سائنس پڑھ رکھی تھی لہٰذا ایک فارماسیوٹیکل کمپنی کی لیبارٹری میں اسے جاب مل گئی۔ گھر اپنا تھا چنانچہ ان ماں بیٹی کو زندگی گزارنے میں کسی بڑی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

ماریہ نے انٹر تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد عملی دنیا میں قدم رکھ دیا۔ اس کے دماغ میں ڈراما نگاری کا کیڑا پیدائشی طور پر موجود تھا جس نے اسے ڈراما لکھنے کی جانب راغب کر دیا۔ وہ اسکرپٹ لکھ لکھ کر ڈھیر لگانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مختلف پروڈکشن ہاؤسز اور اِکادُکا ٹی وی چینلز کے چکر بھی لگانا شروع کر دیے تھے لیکن بدقسمتی سے کہیں بھی اسے کامیابی حاصل ہوئی اور نہ ہی حوصلہ افزائی نصیب ہوئی۔
اس نے ہمت نہیں ہاری جس کے نتیجے میں اس کے لکھے ہوئے اسکرپٹس کے ذخیرے میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ اسی دوران میں اس کی والدہ اچانک بیمار پڑ گئی۔ اسے ایک خطرناک چیسٹ انفیکشن ہو گیا تھا۔ راشدہ بیگم کے پھیپھڑے سکڑنے لگے تھے۔ کمپنی کی جانب سے میڈیکل ٹریٹمنٹ کی سہولت حاصل تھی مگر سچی بات تو یہ کہ ڈاکٹرز اس کے مرض کو سمجھ نہیں پائے تھے۔ وہ لوگ تین سال تک راشدہ بیگم کے علاج کے نام پر مختلف تجربات کرتے رہے لیکن مریض کو رتی برابر فائدہ نہیں ہوا بلکہ اس کے پھیپھڑوں کے سکڑاؤ میں تیزی سے اضافہ ہوتا چلا گیا پھر ایک روز راشدہ بیگم، ماریہ کو اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی۔
راشدہ کے انتقال کے بعد فارماسیوٹیکل کمپنی نے ماریہ کو وہی جاب آفر کی تھی یعنی اپنی ماں کی جگہ پر کام کرنے کی پیشکش ...... لیکن ماریہ نے کمپنی کی یہ پیشکش ٹھکرادی تھی۔ وہ اس منحوس لیبارٹری میں کام کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی جہاں اس کی ماں ایک موذی مرض کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔
فارماسیوٹیکل کمپنی کے قواعد وضوابط کے طفیل ماریہ کو ماں کی موت کے سبب ایک معقول رقم مل گئی تھی لیکن یہ اتنا بڑا اماؤنٹ نہیں تھا کہ وہ ساری زندگی گھر بیٹھ کر کھاتی رہے۔ اس کے والد نے اچھے وقتوں میں جھیل پارک کے نزدیک ایک بلڈنگ میں چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا تھا لیکن سر چھپانے کا ٹھکانا کافی نہیں ہوتا۔ انسان کو عزت سے زندہ رہنے کے لیے اور بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ظاہر ہے ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے ہاتھ، جیب اور بینک میں پیسا ہونا ضروری ہے۔
راشدہ بیگم کے چہلم کے بعد ماریہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے گھر میں بیٹھی رہتی تو زیادہ سے زیادہ وہ ایک سال تک

زندہ رہ سکتی تھی اور یہ کوئی تسلی بخش نہیں بلکہ تشویش ناک صورت حال تھی۔ آئندہ روز سے وہ بقا کے محاذ پر کمربستہ ہوکر میدانِ جنگ میں کود پڑی۔

اس کی پہلی ترجیح تو یہی تھی کہ کوئی بھی پروڈیوسر اس کے اسکرپٹ کو اپروو کرے تاکہ اس کی آمدنی کا سلسلہ چل نکلے۔ یہ کام اس کی سوچ اور طبع سے میل کھاتا تھا اور اس کے لیے روحانی سکون کا باعث بھی تھا۔ تخلیق کے عمل سے گزرنے کے دوران میں وہ خود میں کھوکر کچھ نیا کھوجنے کی جستجو میں مصروف رہتی تھی۔

یہ سب تو تھا ہی، اس کے ساتھ ہی وہ چھوٹی موٹی کسی صاف ستھری جاب کی تلاش میں بھی سرگرداں تھی۔ یہ کوشش ماریہ کو نفیس صدیقی کی اکیڈمی تک لے گئی۔ لگ بھگ ایک سال پہلے وہ دونوں ایک دوسرے سے پہلی بار ملے تھے یعنی وقوعہ سے ایک برس قبل۔

''تو آپ کو لکھنے کا شوق ہے؟'' نفیس نے رسمی ہیلیک سلیک کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یس سر!'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''کئی سال سے تگ ودو کررہی ہوں مگر کوئی کام دینے کو تیار نہیں حالانکہ میں اچھا لکھتی ہوں۔ کسی نے مجھے آپ کی اکیڈمی کے بارے میں بتایا تو قسمت آزمانے یہاں چلی آئی ہوں۔ سنا ہے آپ نئے لوگوں کو حوصلہ دیتے ہیں اور اپنے انداز میں ان کی تربیت بھی کرتے ہیں۔''

اس وقت نفیس صدیقی کے کمرے میں ان دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ نفیس نے ماریہ کے لیے چائے، بسکٹ اور پانی وغیرہ منگوالیا تھا اور نہایت ہی نرم لہجے میں اس سے بات کررہا تھا۔ اس سے پہلے کوئی اس سے اتنے اخلاق سے پیش نہیں آیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہورہی تھی کہ آج بات بن کر ہی رہے گی۔

''آپ نے میری ''آرٹ اینڈ آرٹسٹ'' اکیڈمی کے بارے میں بالکل ٹھیک سنا ہے، مس ماریہ!'' وہ اس کے چہرے پر نگاہ جماکر معتدل انداز میں بولا۔ ''میں نئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی ضرور کرتا ہوں لیکن بنیادی چیزیں بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں جیسا کہ لگن، محنت اور صلاحیت۔ ان میں سے اگر کوئی ایک شے بھی کم ہو تو انسان کسی قابلِ فخر منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھ میں یہ تینوں چیزیں موجود ہیں لیکن قسمت ابھی تک ساتھ دینے کو تیار نہیں۔''

''قدم قدم پر قسمت کو قصوروار ٹھہرانا ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے کہا کہ آپ اچھا لکھتی ہیں...... پھر آپ کی یہ پیشہ ورانہ اچھائی فیلڈ کے لوگوں کو نظر کیوں نہیں آتی، مس ماریہ؟''

''میں اس راز کو سمجھنے سے قاصر ہوں سر!'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''مجھے تو ابھی تک خود کو منوانے کا ایک موقع بھی نہیں مل سکا۔ میں نے جہاں جہاں بھی اپنا اسکرپٹ جمع کرایا، کچھ عرصے کے بعد یہ کہہ کر واپس کردیا گیا کہ میری تحریر میں ناپختگی ہے۔ مجھے سیکھنے میں بہت وقت لگے گا۔''

نفیس صدیقی چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے تکتا رہا پھر گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ''آپ نے کبھی اداکاری کے بارے میں کیوں نہیں سوچا؟''

''یہ...... یہ آپ......'' وہ جھجکتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''کیوں پوچھ رہے ہیں سر؟''

''میرے اس سوال کے پیچھے دو اسباب چھپے بیٹھے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''نمبر ایک...... میں بنیادی طور پر آرٹ اور آرٹسٹ کو پروموٹ اینڈ گروم کرتا ہوں۔ میرے پاس آنے والے لوگوں میں زیادہ تعداد اداکاری کے شوقین افراد کی ہے اور نمبر دو......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کو قدرت نے اچھی خاصی صورت دی ہے۔ آپ کی نشست و برخاست، گفتگو کا انداز اور ڈائیلاگ ڈیلیوری بھی ٹھیک ہے۔ اگر چند ماہ تک دل لگاکر محنت کریں گی تو سب سیکھ جائیں گی۔''

''سر! میں آپ کے مشاہدے اور تجربے کو چیلنج نہیں کروں گی۔'' ماریہ نے نہایت ہی ادب سے کہا۔ ''لیکن اگر آپ مجھے لکھنے کا کام دے دیں تو مہربانی ہوگی۔ مجھے کبھی بھی ایکٹنگ کا شوق نہیں رہا۔ دوسرے میں چاہتی ہوں فوراً میری آمدنی شروع ہوجائے۔ یہ میری بقا کا مسئلہ بھی ہے۔ میں اداکاری سیکھنے کے چکر میں سال چھ مہینے برباد نہیں کرسکتی۔''

''ہوں۔'' صدیقی نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت آپ مالی مشکلات کا شکار ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ کا اندازہ کسی حد تک درست ہے، سر!'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' وہ اس کے معاملے میں دلچسپی لیتے

ہوئے مستفسر ہوا۔ ''یہ کس حد تک..... کیا ہوتا ہے؟''

''میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ سردست تو گزارہ ہو رہا ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''لیکن کچھ عرصے کے بعد کھانے کے لالے پڑ سکتے ہیں۔''

''کیا آپ کے گھر میں اور کوئی کمانے والا نہیں ہے؟'' نفیس صدیقی نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

اس دل آزار اور دل فگار سوال کا جواب ماریہ کی زبان کے بجائے اس کی آنکھوں نے دیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ نفیس صدیقی نے اس کے ضبط و صبر کے بند میں کوئی بڑا شگاف ڈال دیا ہو۔

ماریہ کو نارمل ہونے میں دس سے پندرہ منٹ لگ گئے۔ جب ماحول گفتگو کے لیے سازگار ہوا تو نفیس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مس ماریہ! آپ کے حالات نے مجھے بری طرح متاثر کرنے کے علاوہ تشویش میں بھی ڈال دیا ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ جلد از جلد آپ کے لیے روزگار کا بندوبست کروں۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ خیر کرے گا۔''

''سر! میری خواہش ہے کہ میں لکھنے کے کام میں ہی کہیں فٹ ہو جاؤں۔'' ماریہ نے کہا۔ ''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

''آپ کے پاس اس وقت اپنا کوئی اسکرپٹ ہے؟'' نفیس نے مہربان سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

ماریہ گھر سے نکلتے وقت اپنے دو تین اسکرپٹس بیگ میں رکھ لیا کرتی تھی۔ ''جی سر! ہے.....'' اس نے اپنے بیگ کو کھولتے ہوئے کہا۔ ''دو اسکرپٹس اور تین چار ون لائنرز بھی ہیں۔'' وہ مذکورہ مواد کو نفیس صدیقی کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ سب آپ اپنے پاس رکھ لیں۔ مجھے امید ہے میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔''

''دیکھیں مس ماریہ! میں ہوا میں قلعے تعمیر کرنے اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے حق میں نہیں ہوں کیونکہ میری نظر میں یہ خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کے یہ اسکرپٹس اپنے پروڈکشن ہاؤس کے متعلقہ شعبے کو دے دوں گا۔ وہ لوگ انہیں پڑھنے کے بعد فیصلہ کریں گے کہ آپ کی تحریر میں جان ہے یا نہیں۔ تھوڑی بہت کمی اور کمزوری تو ٹھیک کی جاسکتی ہے مگر مُردے میں جان ڈالنے کی کوشش کرنا اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر آپ اسکرپٹ اور اسکرین پلے کے شعبے میں چلنے کے قابل ہوئیں تو میں آپ کو کچھ رقم ایڈوانس میں دے کر کام سے لگا دوں گا۔ باقی آپ کا نصیب۔''

''بہت شکریہ سر!'' وہ تشکرانہ نظر سے نفیس صدیقی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں دوبارہ کب آؤں؟''

''کم از کم دو ہفتے بعد۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''تاکہ میرا اسکرپٹ ڈیپارٹمنٹ آپ کی قابلیت اور صلاحیت کے بارے میں کوئی رائے قائم کرلے۔ خوامخواہ چکر لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ گئی ہوں گی۔''

''میں سمجھ گئی سر!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے بولی۔ ''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔''

''یہ جملہ قبل از وقت ہے مس ماریہ!'' نفیس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کیونکہ ابھی تک میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔''

''پھر بھی سر..... آپ مجھے ایک موقع تو دے رہے ہیں۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''آج سے پہلے کسی کو اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی۔ مجھے ہر جگہ مایوسی اور حوصلہ شکنی کے سوا کچھ نہیں ملا ہے سر!''

وہ چند لمحات تک ماریہ کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''شاید وہ لوگ اندھے تھے۔''

''میں سمجھی نہیں سر!'' وہ الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''آپ کن لوگوں کو اندھا کہہ رہے ہیں؟''

''جن کے پاس آپ اپنے اسکرپٹس لے کر جاتی رہی ہیں۔'' وہ اپنے کہے کو بڑی خوبصورتی سے نبھاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ ان کی نگاہ میں آپ کی تحریر سے ناتجربہ کاری اور کچا پن جھلکتا ہوگا جس کی وجہ سے انہیں آپ سے لکھوانا مناسب نہیں لگا ہوگا مگر اسکرپٹ سے پہلے آپ کی صورت ان کے سامنے آئی ہوگی۔ وہ آپ کو کسی پلے میں چھوٹا موٹا رول تو دے سکتے تھے۔''

اگرچہ نفیس صدیقی نے بڑے بھرپور انداز میں وضاحت کر دی تھی لیکن ماریہ اس کے بیان سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اس نے نفیس کی آنکھوں میں اپنے لیے کچھ دیکھا تھا۔ وہ پسندیدگی کے جذبات سے بڑھ کر کچھ تھا۔ اسے اپنے رگ و پے میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی تھی تاہم اس موضوع پر اس نے مزید کوئی بات نہیں کی اور نفیس صدیقی کا شکریہ ادا

کر کے وہ اس کے آفس سے نکل آئی تھی۔

☆☆☆

اس پیشی پر استغاثہ کی جانب سے اشتیاق بھائی کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ وہ اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کروا چکا تو وکیل استغاثہ وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا اور اکیوزڈ باکس میں سر جھکا کر کھڑے میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم نفیس صدیقی کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔

''اشتیاق بھائی! کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟''

''جی ... کسی حد تک جانتا ہوں۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''مثلاً...... کس حد تک؟''

''بس اتنا کہ یہ بندہ مقتولہ ماریہ سے ملنے اس کے فلیٹ پر آیا کرتا تھا۔'' استغاثہ کے گواہ نے بتایا۔

''وقوعہ کے روز کیا ہوا تھا؟'' وکیل استغاثہ اپنے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''یہ عدالت آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہے کیونکہ مقتولہ کی لاش کو سب سے پہلے آپ ہی نے دیکھا تھا۔''

''میں ایک نجی بینک میں جاب کرتا ہوں اور وہ بینک برانچ میری رہائش کے نزدیک ہی واقع ہے۔'' گواہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں جس بلڈنگ میں رہتا ہوں، اس کی مینٹی نینس وغیرہ کے معاملات کو میں ہی دیکھتا ہوں۔ وقوعہ سے چند روز قبل میں نے پانی والی موٹروں کا کچھ کام کروایا تھا اور اس سلسلے میں ہونے والے خرچے کو تمام رہائشیوں پر تقسیم کر دیا تھا۔ مقتولہ کے ذمے جو رقم واجب الادا تھی، وہ اس نے مجھے پچیس اگست کی صبح دینے کو کہا تھا۔ مجھے اس کے الفاظ اچھی طرح یاد ہیں...... اشتیاق بھائی! آپ صبح بینک جاتے ہوئے مجھ سے پیسے لے لیجیے گا۔ میں صبح جلدی اٹھ جاتی ہوں۔''

یہاں تک بتانے کے بعد گواہ اپنی سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا تو وکیلِ استغاثہ نے سوال داغ دیا۔

''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟''

''اس وقت نو بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔'' گواہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے مقتولہ کے دروازے کی گھنٹی بجائی لیکن اندر سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ میرا بینک، گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لہٰذا مجھے بروقت جاب پر پہنچنے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ میں نے تین چار مرتبہ گھنٹی بجائی لیکن نتیجے میں جب مقتولہ دروازے پر نہیں آئی تو میں نے دستک دینے کے بارے میں سوچا۔ میں نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جیسے ہی دروازے کو بجایا، وہ کھلتا چلا گیا۔ دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی کیونکہ مقتولہ اس فلیٹ میں بالکل اکیلی رہتی تھی۔ اسے تو ہر صورت میں اپنے فلیٹ کے داخلی دروازے کو اندر سے بند ہی رکھنا چاہیے تھا۔ اندرونی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اسے آواز دی مگر اس کی جانب سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ واش روم یا کچن سے پانی گرنے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ کسی نامعلوم جذبے کے تحت میں فلیٹ کے اندر داخل ہو گیا اور پھر میں نے بیڈ روم میں مقتولہ کو مُردہ پایا۔'' بات کے اختتام پر اس نے ایک جھرجھری لی اور سہمے ہوئے لہجے میں اضافہ کر دیا۔

''اس کے بیڈ پر خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔''

''اس کے بعد آپ نے اپنے علاقے کے تھانے میں فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی؟'' وکیل استغاثہ نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی، میں نے ایسا ہی کیا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پولیس والوں نے مجھ سے کہا کہ وہ فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ رہے ہیں۔ میں مطمئن ہو کر بینک چلا گیا۔ شام میں جب میں واپس گھر آیا تو مجھے پتا چلا کہ پولیس نے جائے واردات کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد ملزم کو لگ بھگ تین بجے سہ پہر اس کے آفس سے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ میرا بیان بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا لہٰذا میں نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا۔''

''جنابِ عالی!'' وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

''ڈیفنس......!'' جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

اپنی باری پر میں جج کا اشارہ ملتے ہی وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

''سچ پوچھیں تو میں آپ کا نام سنتے ہی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ آپ کا تعلق انڈر ورلڈ سے ہو گا اسی لیے آپ کے نام کے ساتھ ''بھائی'' لگا ہوا ہے لیکن جب میں نے آپ کو اور آپ کی صحت مبارک کو دیکھا تو سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی کیونکہ آپ تو ایک چیئر نکلے اور وہ بھی بے ضرر...... منحنی سے۔''

استغاثہ کے گواہ اشتیاق بھائی کی عمر چالیس سے متجاوز تھی تاہم قامت کے معاملے میں وہ اچھی خاصی مار کھایا

ہوا لگتا تھا اور اس کی صحت بھی گویا الّا ماشاء اللہ ہی تھی۔
گواہ کی ذات کے حوالے سے میرے تبصرے نے حاضرین عدالت کو محظوظ ہونے پر مجبور کر دیا جس کے نتیجے میں دھیمے سروں کا ایک شور سا اٹھا تھا جس نے گواہ کو خجالت میں مبتلا کر دیا تھا۔ قبل اس کے کہ منصف کا چوبی ہتھوڑا ''آرڈر آرڈر'' کی صدا کے جلو میں حرکت کرنے پر مجبور ہو جاتا، میں اشتیاق بھائی کی جانب متوجہ ہو گیا۔
''آپ کو دیکھنے کے بعد میرا سارا ڈر اور خوف چٹکی بجاتے ہی زائل ہو گیا تھا، خیر..... آپ نے اپنے وکیل کو بتایا ہے کہ آپ ملزم کو تھوڑا بہت جانتے ہیں؟''
''جی..... میں نے غلط نہیں کہا ہے۔''
''اس جانکاری کا اسٹیٹس کیا ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔
اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''میں نے اس کی گاڑی کو کئی بار اپنی بلڈنگ کے نیچے کھڑے دیکھا ہے۔''
''بہت خوب!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔
''کیا آپ معزز عدالت کو ملزم کی گاڑی کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟''
''سفید رنگ کی ٹویوٹا کرولا۔'' اس نے بتایا۔
''گاڑی کا نمبر مجھے یاد نہیں۔''
''یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ انسان ہر کسی کی گاڑی کا نمبر یاد نہیں رکھ سکتا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے تلخی بھرے لہجے میں سوال کیا۔ ''کیا آپ ایسا سمجھتے ہیں کہ کسی بھی اجنبی کی گاڑی اگر آپ والی رہائشی بلڈنگ کے نیچے پارک ہوگی تو اس کا مطلب ہے وہ گاڑی والا/والی مقتولہ سے ہی ملنے وہاں آیا/آئی ہوگی؟''
''ایسی بات نہیں ہے وکیل صاحب!'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔
میں نے پوچھا۔ ''تو پھر کیسی بات ہے اشتیاق بھائی؟''
''دیکھیں.....'' وہ سنبھلے ہوئے انداز میں وضاحت پیش کرنے لگا۔ ''میں اس بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر رہتا ہوں اور مقتولہ ماریہ کا فلیٹ میرے عین نیچے فرسٹ فلور پر ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس بندے کو.....'' وہ انگلی سے میرے مؤکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''مقتولہ کے فلیٹ میں داخل ہوتے اور وہاں سے نکلتے دیکھا ہے۔''
''گڈ!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا پھر کریدنے والے لہجے میں پوچھا۔ ''مقتولہ کے اپارٹمنٹ پر ملزم کی آمد و جامد دن کے وقت ہوتی تھی یا رات میں؟''
''میں نے تو اسے شام کے وقت ہی دیکھا ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''ہوسکتا ہے کبھی رات میں بھی دیکھا ہو۔''
''عدالت میں 'ہوسکتا ہے' جیسی چیزیں لائق توجہ نہیں سمجھی جاتیں اشتیاق بھائی!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''خیر، آپ یہ بتائیں کہ اس دوران میں کبھی آپ کی ملزم سے کوئی بات بھی ہوئی؟''
''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔''
''کیا آپ کو معلوم ہے کہ ملزم، مقتولہ کے فلیٹ پر کس مقصد سے آیا کرتا تھا؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ان دونوں کے درمیان کیا رشتہ، کیا تعلق تھا..... وغیرہ وغیرہ؟''
''جی نہیں۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلا دی۔
''آپ اپنی بلڈنگ کے مینٹی ننس کے معاملات کو دیکھتے ہیں؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔ ''آپ کے بیان کے مطابق مقتولہ نے وقوعہ کے روز یعنی پچیس اگست کی صبح آپ کو واجب الادا رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا وہ رقم اتنی بڑی تھی کہ اگر مقتولہ اسی روز، اسی وقت آپ کے ہاتھ پر نہ رکھتی تو آپ کی سانس رک جانا تھی اور آئندہ روز سے سورج نے مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہونا شروع کر دینا تھا؟''
''نہیں وکیل صاحب! وہ تو ایک معمولی سی رقم تھی۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''آپ نے جو ابھی سب کہا، میں نے ایک لمحے کے لیے بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ آپ کہیں گے تو میں قسم بھی اٹھانے کو تیار ہوں۔''
''آپ کا حلفیہ بیان عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے لہٰذا اب مزید کوئی قسم اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں نے آپ کی ذات کے حوالے سے ابھی جو 'سانس رکنے' اور سورج کے معاملات کے سلسلے میں 'مشرق و مغرب' کے الفاظ استعمال کیے ہیں، یقیناً آپ نے ایسا نہیں سوچا ہوگا لیکن .....'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک آسودہ سانس لی پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کر دیا۔
''لیکن آپ نے اس سے کہیں بڑھ کر دکھایا ہے۔''
''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔
''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ فوراً سے پیشتر

اپنے گواہ کی مدد کو لپکا۔ ”میرے فاضل دوست اپنی بے تکی اور لچھے دار باتوں سے استغاثہ کے معزز گواہ کو پریشان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔“

”بیگ صاحب! کیا آپ کے استفسارات کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق ہے؟“ جج نے مجھ سے پوچھا۔

”بالکل ہے جناب عالی!“ میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”میں معزز عدالت کے روبرو ایک بھی فضول، بے معنی اور بے تکا لفظ استعمال کرنے کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”آبجیکشن اوور رولڈ!“ جج نے میری وضاحت سے مطمئن ہونے کے بعد گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ڈیفنس! پلیز کنٹینیو۔“

”تو ہم کہاں پر تھے؟“ میں نے استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں..... یاد آ گیا۔ میں بتا رہا تھا کہ آپ نے اپنی سوچ سے بڑھ کر وقوعہ کے روز کارکردگی دکھائی تھی۔ آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ ایک معمولی سی رقم لینے کے لیے مقتولہ کے دروازے پر پہنچے تھے۔ آپ نے یہی کہا تھا نا؟“

”جی۔“ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

”اب آپ ذرا اپنی ایفی شینسی کا بھی اندازہ لگائیں۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”آپ ایک بینکر ہیں۔ آپ سے زیادہ حساب کتاب بھلا اور کون جانتا ہوگا؟“

”لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آخر آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“ وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں سمجھائے دیتا ہوں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”آپ پچیس اگست کی صبح لگ بھگ پونے نو بجے مقتولہ کے گھر کے دروازے پر پہنچے اور اس کی گھنٹی بجائی۔ تین چار مرتبہ گھنٹی بجانے پر بھی مقتولہ اندر سے برآمد نہیں ہوئی تو تقاضائے شرافت تو یہی تھا کہ آپ چپ چاپ وہاں سے چلے جاتے اور پھر کسی اور وقت مونرزینی منس والی رقم وصول کر لیتے لیکن آپ نے تو تہیہ کر لیا تھا کہ سورج مغرب سے طلوع ہو یا آپ کی سانس کی آمد و شد رک جائے مگر آپ وہ قلیل سی رقم وصول کیے بنا مقتولہ کے دروازے سے ٹلیں گے نہیں۔ سو، آپ نے دستک بھی دے ڈالی اور بداخلاقی بلکہ ڈھٹائی کی انتہا تو دیکھیے کہ مقتولہ کا دروازہ کھلا پا کر آپ اس کے فلیٹ کے اندر بھی داخل ہو گئے۔ کیا آپ کو دوسروں کے گھروں میں گھسنے کا خطرناک مرض لاحق ہے... خصوصاً اکیلی رہنے والی خواتین کے گھروں میں؟“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں وکیل صاحب!“

”تو صحیح آپ سمجھا دیں۔“ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

”جب میرے گھنٹی بجانے پر مقتولہ نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تو میں اس کے لیے فکرمند ہو گیا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ایسا لگا کہ وہ کسی مشکل میں ہے۔ میں اندرونی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر فلیٹ کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ یہی بات میں دوسرے وکیل صاحب کو بھی بتا چکا ہوں اور.....“ وہ لمحے بھر کو تھما پھر بڑے اعتماد سے بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”دیکھ لیں، میری تشویش درست ثابت ہوئی۔“

”تو آپ معزز عدالت کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آپ کوئی بہت ہی پہنچی ہوئی ہستی، کوئی انتریامی ہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظر گاڑ کر چبھنے والے انداز میں کہا۔ ”آپ کی تیرھویں حس مقتولہ کے حوالے سے آپ کو جو کچھ بتا رہی تھی، وہ بعد ازاں صحیح نکلا۔“

وہ بے ساختہ مستفسر ہوا۔ ”یہ تیرھویں حس کیا ہوتی ہے؟“

”یہ بھی حسیات فیملی کی ایک رکن ہے۔“ میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”مرتبے اور مقام کے لحاظ سے یہ چھٹی حس سے کافی سینئر سمجھی جاتی ہے۔ آپ کبھی میرے آفس تشریف لائیں پھر میں آپ کو تیرھویں حس کے بارے میں تفصیلاً بتاؤں گا۔ فی الحال ہم دونوں کرائم سین کا رخ کرتے ہیں۔“

”لیکن یہ واقعہ تو کئی ماہ پہلے کا ہے۔“ وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب ہم وہاں جا کر کیا کریں گے؟“

”ہم جسمانی طور پر وہاں نہیں جا رہے۔“ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرا مطلب تھا، تصوراتی اور تخیلاتی پرواز کیونکہ یہ تو ثابت ہو چکا کہ آپ انتریامی ہیں۔ آپ کے دھیان گیان کی کوئی حد نہیں۔“

اس کی آنکھوں میں عجیب سی الجھن تیرنے لگی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میری بات اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی ہو۔ میں نے اسے زیادہ سوچنے اور اس کے وکیل کو حرکت میں آنے کا موقع نہیں دیا اور تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

”جب آپ نے مقتولہ کے بیڈروم میں قدم رکھا تو کیا وہاں کی لائٹ آن تھی؟“

”جی، آن تھی۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"آپ نے دیکھا، مقتولہ اپنے بیڈ پر مردہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔" میں نے بدستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اس کی کٹی ہوئی کلائی میں سے خارج ہونے والے خون نے بستر کو بھگو دیا تھا اور ایک خون آلود بلیڈ مقتولہ کی لاش کے نزدیک ہی پڑا ہوا تھا۔ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا اشتیاق بھائی؟"

"نہیں جناب! آپ نے جائے وقوعہ کی بالکل درست منظر نگاری کی ہے۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"لیکن یہ منظر نگاری ابھی ادھوری ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اور اس کی تکمیل آپ کے ہاتھوں ہونے والی ہے۔ میرا مطلب ہے آپ کا جواب جائے وقوعہ کے منظر میں مزید رنگ بھر دے گا۔"

"وہ کیسے وکیل صاحب؟" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

"آپ نے جتنی تفصیل کے ساتھ جائے وقوعہ کا نقشہ بیان کیا ہے، اتنی تفصیل تو اس کیس کی چارج شیٹ میں بھی مجھے نظر نہیں آئی۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "اب میں آپ سے ایک آخری سوال کرنے جا رہا ہوں۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا.....اوکے؟"

وہ ہمہ تن گوش ہونے کی کوشش میں خاصا مضطرب اور ہونق نظر آنے لگا تھا۔ اضطراری انداز میں سر کو اثباتی حرکت دیتے ہوئے اس نے جواب میں کہا۔ "اوکے سر!"

"جب آپ نے مقتولہ ماریہ کو مردہ حالت میں بیڈ پر پڑے دیکھا تو اس کے بدن پر کون سا لباس تھا؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"اس نے سیاہ شلوار پر سفید قمیص پہن رکھی تھی۔" وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ "اور اس کی قمیص پر چھوٹے چھوٹے نیلے رنگ کے پھول بنے ہوئے تھے۔"

"ہیئر از پوائنٹ یور آنر!" میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے دبنگ لہجے میں کہا۔ "استغاثہ کی جانب سے تیار کردہ چالان میں بہ وقتِ موت مقتولہ کے لباس کی تفصیل کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے..... کاٹن کا سرخ ٹراؤزر (پاجامہ)، پھول دار لون کا کرتا...... وغیرہ ہاں!" میں نے لمحاتی توقف کر کے سب انسپکٹر جاوید خان کی طرف دیکھا اور اس کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"گزشتہ پیشی پر اس کیس کے انکوائری آفیسر نے میرے سوالات کے جواب میں بھی مقتولہ کے لباس کا یہی سب بتایا ہے جو چالان میں درج ہے اور اب استغاثہ کا ایک معزز گواہ اشتیاق بھائی مقتولہ کے اسی لباس کی بالکل مختلف تشریح کر رہا ہے۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ......"

"وہ دراصل بات یہ ہے کہ....." وٹنس باکس میں کھڑا گواہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "اس وقت بیڈروم میں اچھا خاصا اندھیرا تھا اس لیے شاید میں ٹھیک سے مقتولہ کے لباس کو دیکھ نہیں پایا تھا۔"

اس لولی لنگڑی توجیہہ کے بعد وہ الجھن زدہ، گھبرائی ہوئی نظر سے کبھی آئی او (انکوائری آفیسر) کو اور کبھی وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔ میں نے اس پر چڑھائی کر دی۔

"تم نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے سامنے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ جب تم مقتولہ کے بیڈروم میں داخل ہوئے تو وہاں کی لائٹ آن تھی اسی لیے مردہ ماریہ کی خون آلود لاش تمہاری نگاہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ آ گئی تھی۔" میں نے "آپ" سے "تم" تک کا سفر طے کرتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا۔ "اور اب تم کہہ رہے ہو کہ بیڈروم میں اندھیرا تھا اس لیے مقتول کے لباس کو اچھی طرح دیکھ نہیں پائے۔ تمہارے کس بیان کو درست مانا جائے؟"

وہ بوکھلاہٹ بھرے انداز میں "آئیں، بائیں، شائیں" کرنے لگا۔ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! استغاثہ کی تیار کردہ رپورٹ اور اس کے گواہ اشتیاق بھائی کا بیان لگا نہیں کھاتا جس سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ میرے موکل کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں پھنسایا گیا ہے۔ لائٹ کے آن آف ہونے کی طرح مقتولہ کا لیفٹ ہینڈر ہونا بھی ایک ایسا معاملہ ہے جو میرے موکل کے بجائے استغاثہ کے خلاف جاتا ہے۔ اس سلسلے میں گزشتہ پیشی پر حاضرین عدالت میں موجود ایک خاتون نیلوفر صاحبہ عدالت کے سامنے بڑے بھرپور انداز میں ڈیمو بھی دے چکی ہیں۔ ان حالات و واقعات کی روشنی میں اس عدالت سے میری استدعا ہے کہ میرے موکل کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ وہ اس معاشرے کا ایک باعزت شخص ہے۔ اس کیس نے میرے موکل کی ساکھ کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ دیٹس آل یور آنر! مجھے استغاثہ کے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"

اشتیاق بھائی کے بعد استغاثہ کی جانب سے ایک

ضعیف العمر شخص شکور احمد کو گواہی کے لیے کٹہرے میں لایا گیا۔ شکور ستر کے پیٹے میں دکھائی دیتا تھا۔ وہ اپنا بیان ریکارڈ کرا چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا۔

''شکور صاحب!'' وہ اپنے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا کہنا ہے کہ وقوعہ کی رات آپ نے ملزم نفیس صدیقی کو مقتولہ والی رہائشی عمارت سے نکلتے دیکھا تھا۔ معزز عدالت جاننا چاہتی ہے کہ اس وقت کیا بجا تھا؟''

''میں نے گھڑی میں وقت تو نہیں دیکھا لیکن یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ دو بجے کے آس پاس کا عمل تھا۔''

شکور احمد کی رہائش جس بلڈنگ میں تھی اس کے سامنے والی بلڈنگ میں مقتولہ ماریہ کا فلیٹ تھا یعنی دونوں عمارتوں میں سے ایک دوسرے کو بہ آسانی دیکھا جاسکتا تھا۔ اس لحاظ سے شکور کے دیکھنے کے عمل کو یکسر رد نہیں کیا جاسکتا تھا البتہ اس امر کا سراغ لگانا ضروری تھا کہ بڑے میاں نے کیا دیکھا تھا اور کیا فرض کیا تھا۔

''آپ اتنی رات کو جاگ رہے تھے؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''جی وکیل صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس رات میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ مجھے عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی حالانکہ میں نے نیند کی گولی بھی کھائی تھی مگر اس کا مجھ پر بالکل اثر نہیں ہوا تھا۔ تمام تر کوشش کے باوجود بھی میں سونے میں کامیاب نہیں ہو پارہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے میں بستر پر جاکر لیٹ جاتا تھا اور پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا تھا۔ ایسے ہی بے قراری سے ٹہلتے ہوئے ایک بار جو میں کھڑکی کے پاس گیا تو میں نے ملزم کو مقتولہ کے گھر سے نکل کر ایک طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

استغاثہ کے اس گواہ کے بارے میں یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ اس کی عمر زیادہ تھی یا اس کا اسٹیمنا...... کیونکہ ابھی اس نے وکیل استغاثہ کے مختصر سے سوال کا جتنا طویل و عریض جواب دیا تھا، وہ کسی توانائی سے بھرپور جوان کے لیے ہی ممکن ہوسکتا تھا۔

وکیل استغاثہ نے اکیوزڈ باکس میں موجود ملزم نفیس صدیقی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تصدیق طلب انداز میں گواہ سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے وقوعہ کی رات اسی شخص کو مقتولہ والی بلڈنگ سے نکلتے دیکھا تھا؟''

''جی بالکل!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

ایک دو ضمنی سوالات کے بعد وکیل استغاثہ نے جرح کا سلسلہ موقوف کردیا۔ اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا اور بڑے احترام سے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

''شکور صاحب! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے اس پراسرار بیماری کا شافی علاج ہو چکا جس نے وقوعہ کی رات آپ کو بے چین کر رکھا تھا؟'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''آپ نے ایلو پیتھک علاج کرایا یا ہومیو پیتھک؟''

''آپ کو میرے علاج سے کیا دلچسپی؟'' وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ اپنے کام سے کام رکھیں تو اچھا ہوگا۔''

''اتنا ڈر مجھے اشتیاق بھائی کا نام سن کر نہیں لگا تھا جتنا خوفزدہ میں آپ کی ڈانٹ سن کر ہوگیا ہوں۔'' میں نے سراسیمگی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''اور جہاں تک آپ کے علاج میں میری دلچسپی کا تعلق ہے تو یس ..... میں اس معاملے میں گہری دلچسپی رکھتا ہوں کیونکہ آپ کی گواہی میرے موکل کی مخالفت میں جارہی ہے لہٰذا آپ کا علاج ہونا بہت ضروری ہے۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ''ڈیفنس، استغاثہ کے معمر گواہ کا مذاق اڑانے کی کوشش کررہا ہے۔ بھلا بزرگوں سے کوئی اس طرح بھی بات کرتا ہے؟''

''بزرگوں کا احترام ہم سب پر فرض ہے یور آنر کیونکہ ایک دن ہم سب کو عمر کے اس حصے میں پہنچنا ہے۔'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر ہم اپنے بڑوں کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے تو بڑھاپے میں ہمارا حشر بھی عبرت ناک ہوگا مگر جہاں تک استغاثہ کے معزز معمر گواہ شکور احمد کا معاملہ ہے تو میں سمجھتا ہوں اور وقت آنے پر ثابت کرسکتا ہوں کہ انہیں دماغی علاج کی اشد ضرورت ہے اور میں اپنے انداز میں وہی کررہا ہوں۔ معزز عدالت سے میرا وعدہ ہے کہ انکل شکور آج یہاں سے صحت یاب ہوکر جائیں گے، ان شاءاللہ!''

''انکل کس کو بولا وکیل صاحب؟'' شکور احمد نے بگڑے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''دیکھ لیں جناب عالی! ڈیفنس اپنے تیز ابی جملوں سے کس طرح استغاثہ کے گواہ کو پریشان کرنے کی مہم میں

لگے ہوئے ہیں۔'' وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے معترض لہجے میں کہا۔

جواب اعتراض کے طور پر میں نے جج سے کہا۔

''یور آنر! گواہِ استغاثہ عمر میں مجھ سے دوگنا ہیں۔ میرا ان کو انکل کہنا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ اینی ہاؤ...... اگر انہیں پسند نہیں ہے تو میں اب انکل کے بجائے بھائی کہہ کر مخاطب کروں گا۔'' پھر میں نے سلگانے والے انداز میں وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ''میرے فاضل دوست! میں گواہ مخالف کو ''بڑے بھائی'' کہہ کر مخاطب کروں یا ''چھوٹے بھائی'' کہہ کر؟''

''یور آنر! ڈیفنس اپنی شرارتوں سے باز نہیں آرہا۔'' وکیل استغاثہ نے فریادی لہجے میں جج سے کہا۔

''آبجیکشن سسٹینڈ!'' جج نے وکیل استغاثہ کی داد رسی فرماتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ استغاثہ کے گواہ کے لیے ''صاحب'' کا لفظ استعمال کرتے ہوئے اپنی جرح جاری رکھیں۔''

''تھینک یو یور آنر!'' میں نے جج کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں کہا پھر گواہ شکور احمد کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''شکور صاحب!'' میں نے بزرگ گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں سوال کیا۔ ''آپ نے اپنے وکیل کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم لگ بھگ دو بجے یعنی وقوعہ کی رات مقتولہ والی بلڈنگ سے نکل کر ایک طرف چلا گیا تھا۔ آپ نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ مذکورہ رات آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اسی لیے آپ نے بے خوابی اور بے چینی کی کیفیت میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے توسط سے ملزم کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ میرے بیان کی تصدیق کریں تو میں جرح کے سلسلے کو آگے بڑھانے کی جرأت کروں۔''

''آپ نے کوئی بھی بات غلط نہیں کہی۔'' وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ''اس رات سب کچھ بالکل ایسے ہی پیش آیا تھا۔''

''آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ شکور صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک عجیب سا بچکانا سوال پوچھ رہا ہوں۔ امید ہے آپ برا نہیں منائیں گے اور آپ کے وکیل صاحب کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میرے اس سوال کا تعلق انسان کی قوتِ مشاہدہ اور اس کے حسابی دماغ سے ہے۔''

''جی، پوچھ لیں۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

جب سے میں ادب و احترام کی پالیسی پر چلتے ہوئے اسے بھڑکنے کا کوئی موقع نہیں دے رہا تھا، وہ پہلے سے بھی زیادہ مضطرب اور الجھن زدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ وکیل استغاثہ کی حالت بھی نارمل نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر لاتعداد بے نام خدشات اور اندیشہ ہائے دور دراز چمک رہے تھے جیسے میں پتا نہیں کس وقت کون سا وار کردوں گا۔

''ٹھیک ہے، پوچھتا ہوں۔'' میں نے کٹہرے کے نزدیک جاتے ہوئے معتدل انداز میں استفسار کیا۔ ''شکور صاحب! آپ کی سمجھ بوجھ کے مطابق، کسی انسان کا چہرہ اس کے پورے جسم سے سائز میں بڑا ہوتا ہے یا چھوٹا؟''

''ظاہر ہے، انسان کے مکمل جسم کے مقابلے میں اس کا چہرہ کافی چھوٹا ہوتا ہے۔'' وہ شک زدہ نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں سمجھ نہیں پارہا ہوں کہ کس قسم کا سوال تھا۔''

''آپ میرے سوال کی کیمسٹری اور جیوگرافی پر دھیان دے کر اپنے دماغ کو پریشان نہ کریں محترم! بس، چپ چاپ کامن سینس کا استعمال کرتے ہوئے جواب دیتے جائیں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا وقوعہ کی رات، اپنی طبیعت کی ناسازی کے باوجود بھی آپ کسی انسان کے سر (چہرے) اور اس کے مکمل بدن کے فرق کو بہ آسانی دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے...... آپ نے اس رات ملزم کا صرف چہرہ دیکھا تھا یا اس کا باقی کا جسم بھی آپ کو نظر آیا تھا؟''

''میں نے نہ صرف ملزم کا چہرہ دیکھا تھا بلکہ اس کے مکمل جسم کو مقتولہ والی بلڈنگ میں سے نکل کر ایک طرف جاتے دیکھا تھا۔'' وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''اور یہ بات میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔''

''میں معافی چاہتا ہوں شکور صاحب!'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''میں اب آپ سے یہ سوال نہیں کروں گا لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ آپ کا ذریعۂ آمدنی کیا ہے؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست اپنی اور اس عدالت کی حدود کو پھلانگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں تو یہ بھی یاد نہیں رہا

کہ اس وقت عدالت میں ایک قتل کے مقدمے کی شنوائی جاری ہے نہ کہ کسی انکم ٹیکس کے مقدمے کی۔''

''میں مختلف مقدمات کی نوعیت کو اگر آپ سے زیادہ نہیں تو آپ سے کم بھی نہیں جانتا ہوں۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہاں پر ''ماریہ مرڈر کیس'' کی سماعت جاری ہے لیکن لگتا ہے آپ معاندانہ انداز میں سوچتے ہوئے اتنا زیادہ آگے بڑھ گئے ہیں کہ آپ نے میرے سوال پر غور کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر سپاٹ آواز میں اضافہ کر دیا۔

''میں نے گواہ کی کمائی کا حساب نہیں پوچھا بلکہ اس کا ذریعۂ آمدنی جاننے کی کوشش کی ہے۔ مطلب، آپ کے گواہ کی گزر بسر کا بندوبست کون کرتا ہے کیونکہ میری معلومات کے مطابق وہ کوئی کام کرتا ہے نہ اس کے بینک اکاؤنٹ میں رقم بھری ہوئی ہے اور نہ ہی روزانہ صبح اس کے تکیے کے نیچے سے پانچ سو کا نوٹ نکلتا ہے۔''

''بہت سے لوگ وقتاً فوقتاً میری مدد کر دیتے ہیں۔'' گواہ نے ناگوار نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بتایا۔ ''میں اپنے ان مہربانوں کا نام ظاہر نہیں کر سکتا۔''

''ایسا کرنے کے لیے آپ سے کوئی کہہ بھی نہیں رہا شکور صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کٹیلے لہجے میں استفسار کیا۔ ''بس، عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ ان مہربان افراد میں پولیس کب سے شامل ہوئی ہے؟''

''یہ کیسی بے ہودگی ہے...... کیسا مذاق ہے؟'' وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''کیا آپ کو ایسا لگتا ہے کہ میں کسی انعام کے لالچ میں، پولیس کے کہنے پر جھوٹا بیان دینے یہاں آیا ہوں؟''

''مجھے ایسا لگتا نہیں بلکہ یقینِ واثق ہے جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''اور میں اسے ابھی ثابت بھی کر سکتا ہوں۔''

''پرمیشن گرانٹیڈ!'' جج نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''شکور صاحب!'' میں نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''جب آپ نے ملزم کو مقتولہ والی بلڈنگ سے نکل کر کہیں جاتے دیکھا تو اس نے کون سا لباس پہن رکھا تھا؟''

اس کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں نمودار ہوئیں۔

خوش رہنے کا فارمولا

☆ شکوے شکایات کم کیجیے اور اللہ تعالیٰ سے ان نعمتوں کے لیے شکر ادا کیجیے جو آپ کے پاس ہیں۔

☆ اپنے مسائل کے بارے میں کم سوچیں۔ مسائل کے حل کے بارے میں پوری کوشش کریں۔ نتائج کے لیے فکرمند نہ ہوں۔ وہ اللہ کی رضا پر چھوڑ دیں۔

☆ صرف اتنی ذمے داریاں قبول کریں جتنی آپ کر سکتے ہوں۔ اپنی سکت سے زیادہ کام لینے سے گریز کریں۔

☆ اپنے لیے بھی وقت نکالیں۔ اللہ تعالیٰ سے باتیں کریں۔ تہجد کا وقت اس عمل کے لیے بہترین وقت ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

ان لمحات میں وہ سخت مشکل میں نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی مصیبت میں اضافہ کرتے ہوئے کڑے لہجے میں کہا۔

''یہ نہیں سمجھیے گا کہ عدالت آپ کی اس بات پر یقین کر لے گی کہ آپ نے ملزم کے لباس پر توجہ نہیں دی تھی یا وہ رات کا وقت تھا۔ آپ نے ملزم کے وہاں سے جانے کی گواہی دی ہے یعنی آپ نے اس کی صورت واضح طور پر دیکھی تھی جبھی آپ نے اسے پہچانا تھا اور یہ تو آپ تھوڑی دیر پہلے تسلیم کر چکے ہیں کہ انسان کا وجود اس کے سر یا چہرے کی بہ نسبت سائز میں کافی بڑا ہوتا ہے لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ آپ نے ملزم کے چہرے کی تو شناخت کر لی لیکن اس کے جسم پر موجود لباس آپ کو نظر نہیں آیا...... آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

میں نے گویا اسے باندھ کر رکھ دیا تھا۔ ان لمحات میں وہ مجھے ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' ایسی کیفیت میں دکھائی دیا۔ وہ گھبرائی ہوئی نظر سے کبھی وکیل استغاثہ کو اور کبھی جج کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جج نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''مسٹر شکور! اِدھر اُدھر دیکھنے کے بجائے آپ وکیل صاحب کے سوال کا جواب دیں۔''

اب اس کے پاس فرار یا احتراز کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے بے چارگی سے بولا۔ ''ملزم نے کاٹن کا کلف والا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔''

''استغاثہ کے سب سے طاقتور عینی شاہد شکور احمد نے

تو استغاثہ کا کھوتا ہی کھوہ میں ڈال دیا ہے۔" میں نے... بہ آواز بلند کہا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"جناب عالی! وقوعہ کے روز صبح گھر سے نکلنے سے لے کر رات واپس گھر جانے تک ملزم ایک ہی لباس میں تھا یعنی انگوری رنگ کے سفاری سوٹ میں۔ گھر میں ملزم کی بیوی اور آفس میں اس کا تمام اسٹاف اس امر کا گواہ ہے کہ مذکورہ روز ملزم انگوری سوٹ میں ملبوس تھا۔ وہ آفس سے اٹھنے کے بعد اپنے ایک ڈائریکٹر سے ملنے گلشن اقبال گیا تھا۔ مذکورہ ڈائریکٹر کا نام انجم فاروقی ہے۔ ملزم وقوعہ کے روز رات دس بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک انجم فاروقی کے ساتھ ایک ٹیلی فلم کی ڈبنگ کے موضوع پر گفتگو کرتا رہا تھا اور اس دوران وہ اسی انگوری سفاری سوٹ میں تھا اور جب رات میں وہ دس منٹ کم بارہ پر اپنے گھر پہنچا تو اس کے بدن پر وہ انگوری سوٹ موجود تھا۔ پھر اگلی صبح تک وہ اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا۔" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے ڈائریکٹر انجم فاروقی اور ملزم کی اہلیہ ریحانہ صدیقی کو لائن اپ کر رکھا ہے۔ آئندہ پیشی پر میں انہیں صفائی کے گواہوں کی حیثیت سے عدالت میں حاضر کرنے والا ہوں پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔ معزز عدالت پر واضح ہوجائے گا کہ وقوعہ کی رات ایک اور تین بجے کے درمیان جب وہ اپنے گھر واقع گلستان جوہر میں مزے کی نیند سو رہا تھا تو اس نے اپنے گھر سے کئی کلومیٹرز کے فاصلے پر، جھیل پارک کے نزدیک واقع ایک فلیٹ میں رہنے والی مقتولہ ماریہ کی کلائی کی رگ کاٹ کر اسے موت کی نیند کیسے سلا دیا تھا اور وہ رات دو بجے کلف لگا شلوار سوٹ پہنے شکور احمد کو کیسے نظر آیا تھا۔ اب یہی ہوسکتا ہے کہ میرا موکل کوئی چھلاوا ہو یا کوئی جن ہو اور یا پھر ٹائم ٹریولر جو ایک سے زیادہ مقامات پر مختلف گیٹ اپ میں دکھائی دینے پر قادر ہو۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا جناب عالی!"

عدالت کا مقررہ وقت قریب اختتام تھا۔ جج نے انکوائری آفیسر سے کہا۔

"استغاثہ کے باقی گواہوں کو اگلی پیشی پر عدالت میں لانے کا بندوبست کیا جائے۔"

اس کے بعد جج نے آئندہ سماعت کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

"دی کورٹ از ایڈجارنڈ!"

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا لیکن اس پیشی پر ایک عجیب تماشا ہوا جو سراسر ہمارے حق میں چلا گیا حالانکہ استغاثہ کی جانب سے پیش کیا جانے والا یہ تماشا میری گزشتہ پیشی کی محنت پر پانی پھیرنے کے لیے رچایا گیا تھا۔

جب جج کرسی انصاف پر براجمان ہوچکا تو وکیل استغاثہ نے عرض کیا۔ "جناب عالی! استغاثہ کا گواہ دوبارہ کچھ کہنا چاہتا ہے، میرا مطلب ہے شکور احمد!"

"مگر شکور احمد کی گواہی تو پچھلی پیشی پر مکمل ہوگئی تھی؟" جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔

"یس سر!" وکیل استغاثہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "مگر وہ اپنے بیان کی تصحیح کرنا چاہتا ہے۔ پچھلی پیشی پر وہ خاصا کنفیوز ہوگیا تھا اور اسی کنفیوژن میں وہ کچھ الٹا سیدھا بول گیا تھا۔ میرا اشارہ ملزم کے لباس کی جانب ہے۔"

"انٹرسٹنگ!" جج نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "ڈیفنس کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"یور آنر!" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے ہلکے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اعتراضات اٹھانے کا شعبہ میرے فاضل دوست کے پاس ہے لہٰذا ڈیفنس ایسی جرأت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

جج میری گہری بات کی تہ میں اتر گیا اور اس نے وکیل استغاثہ سے کہا۔ "اگرچہ آپ کے عینی شاہد مسٹر شکور احمد کی گواہی ہوچکی ہے لیکن اس کے دوبارہ پیش ہونے اور اپنے بیان کی تصحیح کرنے سے زیر سماعت کیس کی صحت پر خوشگوار اثرات مرتب ہوسکتے ہیں تو عدالت کی طرف سے اس کی اجازت ہے۔"

آئندہ ایک منٹ کے اندر شکور احمد وٹنس باکس کے اندر کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر گہری ندامت بڑی وضاحت کے ساتھ نظر آرہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر حلف اٹھایا اور اپنے بیان کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

"جج صاحب! پچھلی پیشی پر صفائی کے وکیل نے الٹے سیدھے سوال پوچھ کر میرا دماغ خراب کردیا تھا جس کی وجہ سے میں کنفیوز ہوگیا تھا اور مجھ سے ملزم کے لباس کے حوالے سے غلط بیانی ہوگئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وقوعہ کی رات میں نے ملزم کو انگوری رنگ کے سفاری سوٹ ہی میں دیکھا تھا۔ یہ مقتولہ والی بلڈنگ سے نکلنے کے بعد ایک جانب بڑھ گیا تھا۔ پچھلی پیشی پر مجھ سے جو خطا ہوگئی اس پر

میں بہت شرمندہ ہوں۔ عدالت مجھے معاف کردے۔''

''ڈیفنس!'' جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ گواہ پر جرح کرنا چاہیں گے؟''

''جناب عالی! میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کیونکہ میرے پاس اس امر کا ٹھوس ثبوت موجود ہے کہ وقوعہ کے وقت میرا مؤکل جائے وقوعہ سے کئی کلومیٹرز کی دوری پر اپنے گھر میں تھا۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''لہٰذا اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ استغاثہ کے عینی شاہد شکور احمد نے وقوعہ کی رات ملزم کو کلف دار شلوار قمیص میں دیکھا یا سفاری سوٹ میں۔ میں اس خیال بلکہ اس خدشے کے باعث استغاثہ کے گواہ سے کوئی سوال نہیں کرنا چاہتا کہ پچھلی پیشی پر میری جرح نے اسے کنفیوز کردیا تھا تو کہیں یہ میری پوچھ تاچھ سے فیوز ہی نہ ہوجائے۔ البتہ مجھے ایک بات کا انتظار رہے گا۔''

''کس بات کا انتظار؟'' وکیل استغاثہ نے سرسراتی ہوئی بے چین آواز میں مجھ سے استفسار کیا۔

میں اس وقت براہِ راست جج سے مخاطب تھا جب وکیل استغاثہ نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ بہرحال میں نے اسے منہ توڑ جواب دینے میں کسی سستی یا تاخیر سے کام نہیں لیا۔

''اس بات کا انتظار کہ آپ اپنے ایک گواہ اشتیاق بھائی کو دوبارہ گواہی کے لیے کب عدالت میں پیش کریں گے میرے فاضل دوست!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کاٹ دار آواز میں کہا۔ ''کیونکہ لباس کے معاملے میں اس نے بھی خاصا بھونڈا بیان دیا تھا۔ آپ کے چالان میں مقتولہ کے لباس کی جو تفصیل درج ہے، اشتیاق بھائی نے اس کے برعکس بیان دیا تھا۔ عین ممکن ہے اسے بھی اپنے بیان میں تصحیح کی ضرورت پیش آجائے۔ ویسے ایک بات کے لیے میں آپ کا شکرگزار ہوں۔''

میرے آخری جملے نے وکیل استغاثہ کو چونکا دیا۔ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''آپ کس بات کے لیے میرا شکریہ ادا کررہے ہیں؟''

''میرا کام آسان بنانے کے لیے میرے فاضل دوست!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''وہ......وہ کیسے؟'' وہ الجھن آمیز حیرت کے ساتھ مستفسر ہوا۔

میں نے وکیل استغاثہ کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کے سوال کا جواب جج کو دیا۔ ''جناب عالی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''استغاثہ کے گواہ شکور احمد کا بیان ثانی اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ وقوعہ کے روز میرے مؤکل نے انگوری رنگ کا سفاری سوٹ زیب تن کررکھا تھا لہٰذا میرے خیال میں اب مجھے صفائی کے گواہ ڈائریکٹر انجم فاروقی یا ملزم کے اسٹاف کے کسی بندے کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ ایم آئی کریکٹ سر؟''

''یو آر ابسولیوٹلی کریکٹ!'' جج نے تصدیقی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میری دوسری صفائی کی گواہ یعنی ملزم کی اہلیہ ریحانہ صدیقی اگلی پیشی پر عدالت میں حاضر کردی جائے گی۔'' میں نے کہا۔

''پراسیکیوشن!'' جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کارروائی شروع کی جائے۔''

''جناب عالی! میں اپنی اگلی گواہ اور مقتولہ کی ایک دوست نازیہ بتول کو کٹہرے میں بلانا چاہوں گا۔'' وکیل استغاثہ نے کہا۔

''اجازت ہے۔'' جج نے بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔

نازیہ بتول وٹنس باکس میں آکر کھڑی ہوگئی۔ نازیہ کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ عام سی شکل وصورت کی مالک ایک فربہ اندام عورت تھی۔ اس کا قد میانہ، رنگت گندمی اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا۔ وہ اپنا بیان حلفی ریکارڈ کراچکی تو وکیل استغاثہ وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔

''نازیہ صاحبہ!'' وہ اپنی گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ اس شخص کو جانتی ہیں؟'' بات کے اختتام پر اس نے ملزم کی جانب اشارہ بھی کردیا تھا۔

''صرف نام کی حد تک۔'' اس نے ناگواری سے جواب دیا۔ ''آج پہلی بار اسے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اس سے پہلے میں نے ماریہ کی زبان سے صرف اس کا ذکر ہی سنا تھا۔''

''ذکرِ خیر یا پھر... ذکرِ شر؟'' وکیل استغاثہ نے شرارت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''شروع میں تو یہ ذکر خیر وعافیت ہی سے بھرا ہوا تھا۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''لیکن ایک سال کے اندر ہی اس ذکر نے شر اور منافقت کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اس شخص نے میری دوست کے ساتھ بہت برا کیا ہے۔''

جذباتی انداز میں اپنی بات مکمل کرکے وہ اکیوزڈ

باکس میں کھڑے میرے مؤکل اور اس مقدمے کے ملزم نفیس صدیقی کو نفرت بھری نگاہ سے گھورنے لگی۔

''آپ اس دنیا میں وہ واحد ہستی ہیں، مقتولہ جس کے سب سے زیادہ قریب تھی۔''

''یہ خوش فہمی مجھے بھی تھی وکیل صاحب!'' وہ اپنے وکیل کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''لیکن جب اسے ایک بے وفا اور مطلبی شخص کا قرب حاصل ہوا تو وہ مجھ سے دور ہوگئی۔ پہلے ہفتے میں ہماری ایک دو ملاقاتیں ہوجایا کرتی تھیں پھر ان ملاقاتوں میں مہینوں کا تفاوت حائل ہوگیا۔ بہرحال ......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے لمحے بھر کو تھمی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جب وہ ایک دغاباز انسان سے ٹھوکر کھانے کے بعد اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی تو دوبارہ میرے کندھے کی ضرورت پیش آئی جبھی مجھے اس کی برباد محبت کی کہانی پتا چلی تھی۔''

''آپ نے کس دغاباز، بے وفا، مکار اور مطلبی شخص کا ذکر کیا ہے جس نے آپ کی دوست مقتولہ ماریہ کو دلی صدمات اور ذہنی اذیت سے دوچار کیا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''عدالت اس بندے کا نام جاننا چاہتی ہے؟''

''یہ وہی شخص ہے جس نے میری دوست کو دھوکا دیا تھا۔'' وہ ملزم نفیس صدیقی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں ماریہ کی بربادی سے موت تک، ہر واقعے کا ذمے دار اسی غلیظ انسان کو سمجھتی ہوں وکیل صاحب!''

''آپ نے عدالت میں آکر سچ بیان کرنے کی جرأت کی، اس کے لیے استغاثہ آپ کا مشکور ہے نازیہ جی!'' وکیل استغاثہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عدالت آپ کی زبان سے جاننا چاہتی ہے کہ پچھلے ایک سال سے یعنی وقوعہ سے پہلے والے ایک سال میں ملزم اور مقتول کے بیچ کس نوعیت کے معاملات تھے۔ آپ کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا ہے تو اس حلف کی پاسداری کرتے ہوئے حقائق کو عدالت کے سامنے لائیں تاکہ آپ کی دوست مقتولہ ماریہ کو انصاف مل سکے۔ مقتولہ تو اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے لیکن اس کی موت کے ذمے دار کو قرار واقعی سزا مل جائے تو اس عمل سے مقتولہ و مرحومہ ماریہ کی روح کو ضرور سکون حاصل ہوگا۔''

''میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ ماریہ کا قاتل عبرت ناک سزا پائے۔'' وہ نہایت ہی کڑوے لہجے میں گویا ہوئی۔ ''میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔ اگر میرے دل میں کسی قسم کا خوف موجود ہوتا تو میں بھی منظرِ عام پر نہ آتی۔ کوئی مجھے گواہی دینے کے لیے مجبور نہیں کرسکتا تھا۔''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں نازیہ جی!'' وکیل استغاثہ نے نرمی سے کہا۔ ''پلیز! آپ عدالت کو تلخ حقائق سے آگاہ کریں۔''

آئندہ دس منٹ میں استغاثہ کی گواہ نازیہ بتول نے عدالت کے روبرو جو کچھ بیان کیا، اس کا مغز کچھ ایسا تھا۔

ملزم نے مقتولہ کی لکھنے والی صلاحیت کی بنا پر اسے اپنے ادارے میں نہیں رکھا تھا بلکہ وہ اس کے حسن و جمال اور جوانی پر فدا ہوگیا تھا۔ اگر مقتولہ میں تخلیقی مادہ ہوتا تو کوئی نہ کوئی پروڈیوسر اس کے اسکرپٹ پر توجہ دینے کی ضرور زحمت کرتا لیکن ملزم کے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ وہ مقتولہ کو حاصل کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے ایک جامع منصوبہ بنایا اور قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگا۔ پہلے مرحلے پر اس نے مقتولہ کو یہ یقین دلایا کہ اس کے اندر لکھنے کی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مقتولہ کے ایک اسکرپٹ کو کسی دوسرے رائٹر سے ری رائٹ کروا کر اس نے ایک لانگ بھی بنا ڈالا۔ ''ری رائٹ'' والی بات مقتولہ کے علم میں نہیں تھی۔ وہ تو پہلے یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ ایک عظیم قلم کار ہے۔ بہرحال وہ تہِ دل سے ملزم کی شکرگزار بھی تھی کہ اس نے مقتولہ کے ٹیلنٹ کو نہ صرف پہچانا بلکہ اسے ٹی وی اسکرین تک بھی پہنچادیا۔ اس کے بعد ملزم نے دوسرا قدم اٹھایا۔ مقتولہ اس سے متاثر اور اس کے احسانات تلے دب چکی تھی لہٰذا اب اس نے مقتولہ کو یقین دلایا کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوچکا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مقتولہ بھی ملزم کی ذات اور شخصیت کے اثر میں آچکی تھی۔ وہ اسے اپنا آئیڈیل ماننے لگی تھی چنانچہ جب ملزم نے اسے شادی کا یقین دلایا تو وہ پوری طرح اس کی جانب جھک گئی مگر ایک حد میں رہتے ہوئے..... لیکن ملزم اس نازک اور باریک حد کو عبور کرنے کا مشتاق اور متمنی تھا۔ اس نے یہ ساری ''انویسٹمنٹ'' مقتولہ کے حصول کے لیے ہی تو کی تھی مگر مقتولہ نکاح سے پہلے اس کی خواہش کی تکمیل کے لیے کسی بھی صورت راضی نہیں تھی۔ ملزم اور مقتولہ کے بیچ یہ چوہے بلی کا بلکہ چوہیا اور بلے کا کھیل جاری ہی تھا کہ ملزم کی بیوی ریحانہ صدیقی کو ان کے معاملات کی بھنک پڑگئی۔

ملزم اپنی بیوی سے بہت ڈرتا ہے لہٰذا وہ محتاط ہو گیا۔ اس نے مقتولہ اور اپنے درمیان فاصلے کی ایک دیوار کھڑی کر دی۔ دوسری جانب مقتولہ اپنی محبت کی ناکامی اور بربادی پر بہت دل گرفتہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی مقتولہ پر یہ جنون بھی سوار ہو گیا کہ وہ ملزم کو یا تو حاصل کرے گی اور یا پھر اسے بھی تباہ کروا دے گی۔ اس نے اپنے اس خطرناک ارادے سے ملزم کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ نتیجے میں ملزم نے اس سے ایک سنجیدہ ملاقات کرنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ پچیس اگست کو ان کے بیچ یہ سنجیدہ ملاقات ہونا تھی۔ چنانچہ مقتولہ نے نازیہ بتول کو بتا دیا کہ اگر اس ملاقات کے نتیجے میں اس کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو اس کا ذمے دار صرف اور صرف نفیس صدیقی ہی کو سمجھا جائے۔

استغاثہ کی گواہ نازیہ بتول کے بیان کو آدھا سچ یا آدھا جھوٹ کہا جا سکتا تھا۔ اس نے جو غلط بیانی کی تھی وہ اس کے اپنے ذہن کی پیداوار تھی یا یہ بات مقتولہ ماریہ نے اس تک پہنچائی تھی، اسے چیک کرنا آسان نہیں تھا کیونکہ فریق ثانی یعنی ماریہ بقید حیات نہیں رہی تھی۔ بہرکیف، نازیہ بتول کے بیان کے بعض زاویے میرے مؤکل کی مخالفت میں جاتے تھے لیکن مجھے اس کی قطعاً پروا نہیں تھی۔ اس نوعیت کی مخالفانہ صورت حال سے نمٹنا مجھے اچھی طرح آتا تھا۔

گواہ کا سنسنی خیز بیان اختتام پذیر ہوا تو وکیل استغاثہ جلدی سے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور اپنے گواہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”نازیہ صاحبہ! آپ نے ابھی معزز عدالت کو بتایا ہے کہ مقتولہ نے آپ پر واضح کر دیا تھا کہ اگر اس ملاقات میں اس کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ جائے تو اس کی ذمے داری ملزم پر ہوگی...... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”جی بالکل!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے یہی بیان دیا ہے۔“

”اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مقتولہ کو ملزم پر بھروسا نہیں تھا۔“ وکیل استغاثہ نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے سوال کیا۔ ”وہ ملزم کی جانب سے اپنے لیے کس قسم کا خطرہ محسوس کر رہی تھی؟“

”جان کا خطرہ، وکیل صاحب!“ وہ آنکھیں پھیلا کر بولی۔ ”جب سے میڈم ریحانہ کو ان کے تعلقات کا علم ہوا تھا، ملزم کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔ مقتولہ سے شادی کا ارادہ تو کبھی تھا ہی نہیں۔ یہ تو اس نے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے مقتولہ کو جھوٹا آسرا دیا ہوا تھا۔ خیر، جب میڈم نے ملزم پر دباؤ ڈالا تو اس نے مقتولہ سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ مقتولہ سے کسی ویران اور اجنبی جگہ پر ملنا چاہتا تھا لیکن مقتولہ نے صاف کہہ دیا کہ یہ ملاقات یا تو ملزم کے آفس میں ہوگی اور یا پھر مقتولہ کے فلیٹ پر۔ مقتولہ کی ضد کے جواب میں اس نے فلیٹ والے آپشن کو اوکے کر دیا۔ ملزم گاہے بہ گاہے مقتولہ کے فلیٹ پر جاتا رہتا تھا۔ اسے یہ جگہ محفوظ لگی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس ملاقات کے بارے میں اس کی بیوی کو کچھ پتا چلے۔ مقتولہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ ملزم اس سے ملاقات میں کوئی مثبت بات کرے گا جس سے ان کے تعلقات کی بحالی میں مدد ملے گی لیکن اسے بے یقینی کا ایک دھڑکا سا بھی لگا ہوا تھا اور اس کا یہ دھڑکا شعوری اور لاشعوری دونوں حوالے سے کچھ غلط بھی نہیں تھا کیونکہ ملزم نے اپنے دماغ میں کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔ اس ملاقات کا جو بھی نتیجہ برآمد ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔“

”یور آنر!“ گواہ کے خاموش ہونے پر وکیل استغاثہ نے دلائل دینے والے انداز میں کہا۔ ”صورت حال روشن اور واضح ہے۔ ملزم، مقتولہ کے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ اس نے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کی خاطر مقتولہ کے گرد محبت اور چاہت کا ایک سنہرا جال بچھا دیا۔ مقتولہ یہی سمجھ رہی کہ وہ کوئی بہت ہی قابل اسکرپٹ رائٹر ہے اسی لیے ملزم نے اسے سر آنکھوں پر بٹھا رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی ذات میں ملزم کی دلچسپی کو بھی محسوس کر لیا تھا۔ ملزم نے اپنے جذباتی مکالمات کے زور پر مقتولہ کو یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ اس کی چاہت میں گرفتار ہو چکا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مقتولہ خود بھی اسے پسند کرتی تھی۔ مقتولہ کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ملزم نے اسے اتنی توجہ دی کہ وہ اسے اپنا محافظ، خیر خواہ، دوست اور سب کچھ سمجھنے لگی پھر شادی والی پیشکش نے تو مقتولہ کو خوشی سے نہال کر دیا تھا۔ وہ گویا ہواؤں میں اڑنے لگی تھی لیکن ملزم دوسری جانب کچھ اور ہی سوچے بیٹھا تھا۔ اسی دوران ملزم کی بیوی کو ان کے تعلقات کی خبر ہو گئی۔ ملزم اپنی بیوی کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اس کی بیوی عمر میں بھی اس سے بڑی ہے اور قد کاٹھ میں بھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ملزم کی ساری ترقی اور شہرت کے پیچھے بھی اس کی بیوی ہی کا ہاتھ ہے۔ ملزم اپنی بیوی کے کسی حکم سے انکار کی مجال نہیں رکھتا۔ ریحانہ صدیقی نے کہہ دیا کہ اس معاملے کو ختم کرو تو ملزم نے ہر حال میں اس حکم کی تعمیل کرنا تھی۔ اس نے اپنے

طور پر مقتولہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ملزم کی محبت اور چاہت میں اس قدر آگے بڑھ چکی تھی کہ واپسی کا تصور اسے موت کے مترادف محسوس ہوتا تھا۔ وہ ملزم پر شادی کے لیے دباؤ ڈالنے لگی۔ مقتولہ، ملزم سے خفیہ شادی کے لیے بھی راضی تھی لیکن ملزم اپنی بیوی کی طاقت اور رسوخ سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ تو مقتولہ سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہ لولی پاپ تو اس نے مقتولہ کو صرف اس لیے دیا تھا تاکہ وہ اس کی ناپاک خواہش کی تکمیل کردے۔ جب مقتولہ کسی بھی طور اس کی تمنا پوری کرنے کے لیے راضی نہیں ہوئی اور اس نے شادی کی شرط عائد کردی تو ملزم کی سازش ناکام ہوگئی۔ علاوہ ازیں جب ریحانہ صدیقی کو ان کے معاملات کا علم ہوا تو ملزم بے حد محتاط ہوگیا۔ کسی بھی ظاہری یا خفیہ شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے جلد از جلد مقتولہ سے جان چھڑانا تھی اور حالات کچھ ایسے ہوگئے تھے کہ مقتولہ لڑنے مرنے کو تیار تھی لیکن ملزم اس کے ہاتھ سے نکل جائے، یہ اسے کسی بھی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں ملزم کے پاس بچت کا ایک ہی راستہ بچا تھا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ملزم نے مقتولہ کے ساتھ اس کے فلیٹ پر ایک خصوصی میٹنگ فکس کی۔ وہ اپنے آفس سے اٹھ کر کسی ڈائریکٹر سے ملنے گلشن اقبال چلا گیا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ مقتولہ کے فلیٹ پر آگیا۔ یہاں وہ پہلے بھی اکثر آیا کرتا تھا۔ مقتولہ یہی سمجھ رہی تھی کہ ملزم کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ ملزم اپنے نرم اور پیار بھرے رویے سے بھی یہی ظاہر کررہا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتی۔ مقتولہ کا اعتماد جیتنے کے بعد ملزم نے کھانے پینے کی کسی شے میں کوئی نشہ آور دوا... ملادی۔ اس زود اثر دوا نے جب مقتولہ کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کردیا تو ملزم نے تیز دھار بلیڈ سے اس کی بائیں کلائی کی رگ کاٹ ڈالی جس کی وجہ سے مقتولہ کا بیشتر خون بدن سے خارج ہوگیا اور وہ اپنی بے ہوشی کی حالت ہی میں دوسرے جہان پہنچ گئی۔ ملزم نے اس قتل کو خودکشی کا رنگ دینے کے لیے بلیڈ پر مقتولہ کے فنگر پرنٹس ثبت کرکے اسے مقتولہ کی لاش کے قریب ہی بیڈ پر پھینک دیا اور اس کے فلیٹ سے نکل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی صبح جب گواہ اشتیاق بھائی نے مقتولہ کے فلیٹ کے داخلی دروازے پر ہاتھ سے دستک دی تو وہ دروازہ اسے کھلا ہوا ملا تھا۔ موت کی آغوش میں ابدی نیند سونے والی مقتولہ ماریہ، ملزم کے جانے کے بعد بھلا کس طرح دروازے کو اندر سے بند کرسکتی تھی۔''

وکیل استغاثہ نے اپنا تقریر نما بیان مکمل کیا تو جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ استغاثہ کی گواہ سے کچھ پوچھنا چاہیں گے؟''

میں نے سر کو اثباتی جنبش دی اور وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں کہا۔

''نازیہ جی! میں کافی دیر سے آپ کو سن رہا ہوں۔ پہلے آپ نے اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ کے سوالات کے بھی خاصے مفصل جوابات دیے ہیں جس سے میرے ذہن میں ایک سوال، ایک خیال پیدا ہوا ہے۔ اگر اجازت ہو تو آپ سے شیئر کروں؟''

''جی ضرور۔'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔

''اس کیس میں پبلک پراسیکیوٹر آپ کو ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''آپ کی کارکردگی وکیل استغاثہ سے کہیں بہتر ہے۔''

''اس تعریف کا شکریہ وکیل صاحب!'' وہ خوش اخلاقی سے بولی۔ ''مجھے وکالت کا کبھی شوق نہیں رہا۔ میں جہاں ہوں، ایک دم خوش اور مطمئن ہوں۔''

''ویری گڈ!'' میں نے ستائشی نظر سے اسے دیکھا۔ ''انسان زندگی کے کسی بھی شعبے سے وابستہ ہو، اسے خوشی سے انجوائے کرنا چاہیے۔ آپ ایک سمجھ دار اور بہادر خاتون ہیں۔ بائی دی وے ..... آپ کرتی کیا ہیں؟''

''میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ریسپشنسٹ ہوں۔''

''بہت خوب۔'' میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ''ریسپشن سنبھالنے والے افراد کے تعلقات خاصے وسیع ہوتے ہیں۔ انہیں ہر ٹائپ کے لوگوں سے بات کرنے اور انہیں ہینڈل کرنے کا تجربہ ہوتا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نازیہ صاحبہ؟''

''آپ نے بجا فرمایا وکیل صاحب!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''آپ کی دوست مرحومہ و مقتولہ ماریہ جاب کے لیے بہت پریشان تھی۔ خصوصاً اپنی ماں کے انتقال کے بعد اس کی یہ پریشانی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ آپ اپنے تعلقات کا استعمال کرکے اسے کہیں بھی کوئی چھوٹی موٹی جاب دلاسکتی تھیں۔ آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟''

"آپ چھوٹی موٹی جاب کی بات کررہے ہیں وکیل صاحب......!" وہ بیزاری سے بولی۔ "میں نے ماریہ کے لیے کئی ایک اچھی خاصی جابز بھی نکالی تھیں لیکن اس کے سر پر ایک ہی جنون سوار تھا۔ ڈراما نگار بننے کا خیال۔ وہ اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے خود کو منوانا چاہتی تھی اور یہی ضد اسے ایک بھیڑیے کے پاس لے گئی۔ وہ بھیڑیا اس کے حسن وشباب پر مرمٹا اور اسے یقین دلا دیا کہ وہ صفِ اول کی رائٹر بن سکتی ہے۔ اس موقع پر میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اگر اس میں لکھنے کی صلاحیت ہوتی تو وہ کسی اور پروڈیوسر کی نظر میں بھی ضرور آتی لیکن ملزم نے اس کمال سے اسے اپنی محبت کے فریب میں جکڑ لیا تھا کہ اسے میری باتیں اور نصیحتیں بالکل بکواس اور فضول لگتی تھیں۔ نتیجے میں اس نے مجھ سے میل ملاقات کم کردی لیکن میں اس کے لیے فکرمند رہتی تھی اور میری یہی فکر ایک دن نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔"

پہلے میں یہی سمجھا تھا کہ وکیل استغاثہ کے سوالات کے جوابات دینے کے لیے اس نے اچھی خاصی ریہرسل کی ہوگی لیکن جب اس نے میری جرح کے جواب میں بھی اتنا ٹیمپو اور روانیِ گفتار کو برقرار رکھا تو سمجھ میں آیا کہ وہ ایک باتونی عورت ہے اور خوش قسمتی سے حاضر دماغ بھی۔ میں نے اس کے ہوش اڑانے کی غرض سے پوچھ لیا۔

"آپ اپنی فکر کے کس نتیجے کی بات کررہی ہیں؟"

"میرا اشارہ ماریہ کی بھیانک موت کی جانب ہے وکیل صاحب!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "ملزم کو حاصل کرنے کی ضد نے اس کی جان لے لی۔"

"تو آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ محبت میں ناکامی کے بعد مقتولہ نے اپنی کلائی کی رگ کاٹ کر خود کو موت کے سپرد کردیا تھا؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"آپ نے میری بات کا غلط مطلب نکالا ہے وکیل صاحب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں نے آپ کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ملزم کو حاصل کرنے کی ضد نے ماریہ کی جان لے لی یعنی ملزم اس کی شادی کی ضد سے اس قدر پریشان ہوگیا تھا کہ اس سے نجات پانے کے لیے ملزم کو ایک ہی راستہ نظر آیا۔ ملزم نے مقتولہ کو کچھ اس انداز سے موت کے گھاٹ اتارا کہ اس کی موت خودکشی نظر آئے۔ اس سے آپ ملزم کی عیاری کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

"فی الحال تو میں آپ کے دعوے کو ناپنے اور تولنے کی کوشش کررہا ہوں نازیہ جی!" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"میرا کون سا دعویٰ؟" وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی۔

"یہی دعویٰ کہ مقتولہ نے خودکشی نہیں کی بلکہ میرے مؤکل نے اسے موت کی نیند سلایا ہے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ دقوعہ کے وقت آپ بھی مقتولہ کے فلیٹ میں موجود تھیں اور کہیں چھپ کر قتل کی اس واردات کو دیکھ رہی تھیں۔"

"یہ آپ کس قسم کی بات کررہے ہیں وکیل صاحب؟" وہ برہمی بھرے انداز میں بولی۔ "اگر میں جائے وقوعہ پر موجود ہوتی تو اپنی دوست کو ایسی بے رحمی سے موت کے منہ میں جانے دیتی؟"

"آپ نے میرے مؤکل کے قاتل ہونے پر اس قدر زور دیا ہے کہ مجھے ایسا ہی لگا کہ آپ اس قتل کی واردات کی چشم دید گواہ ہیں۔"

"ایسا ہی کچھ میں آپ کے بارے میں بھی سوچ سکتی ہوں وکیل صاحب!" وہ جواب آں غزل کے انداز میں بولی۔ "آپ اپنے مؤکل کو بچانے کے لیے میری دوست کی موت کو خودکشی کا نام دے رہے ہیں۔ کیا آپ نے ماریہ کو اپنی جان لیتے دیکھا تھا؟ کیا آپ ان لمحات میں ماریہ کے آس پاس موجود تھے جب بقول آپ کے، وہ اپنی بائیں کلائی کی رگ کاٹ کر خود کو موت کے حوالے کررہی تھی۔ میرے اس سوال کا کوئی جواب ہے آپ کے پاس؟"

وکیل استغاثہ کی بہ نسبت استغاثہ کی گواہ نازیہ بتول سے بحث کرنے میں مجھے زیادہ مزہ آرہا تھا۔ وہ وکیل سرکار سے کہیں زیادہ مضبوط گفتگو کررہی تھی۔ اس کے دلائل میں وزن تھا اور معقولیت بھی۔

"ہاں، ہے میرے پاس جواب۔" میں نے نازیہ بتول کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے ہاتھ میں ایسے ٹھوس ثبوت ہیں جو میرے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرسکتے ہیں بلکہ یہ کام تو میں تقریباً کرہی چکا ہوں۔ بس، ملزم کی اہلیہ کی گواہی باقی ہے۔ آئندہ پیشی پر وہ بھی نمٹ جائے گی جس کے بعد میرے مؤکل کی باعزت بریت تو یکی ہے۔ باقی جہاں تک آپ کی دوست کی خودکشی کا معاملہ ہے تو قرائن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مقتولہ نے اپنی جان خود ہی لی ہے۔ اگر آپ کو اس معاملے میں کسی قسم کا کوئی شک ہو تو آپ پولیس کے پاس جا کر اپنی دوست کی موت کی تحقیقات کراسکتی ہیں۔ فی الحال میں آپ کو ایک چھوٹا سا مشورہ دینا چاہوں گا۔"

"کیسا مشورہ؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

"اگلی پیشی پر آپ ضرور عدالت میں آیئے گا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیوں؟" اس کی حیرت الجھن میں بدل گئی۔ "آئندہ پیشی پر یہاں کیا ہونے والا ہے؟"

"بہت ہی خاص ہونے والا ہے۔" میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "آپ کو اپنے ہر سوال کا تسلی بخش جواب مل جائے گا کیونکہ وہ اس کیس کی آخری پیشی ہوگی۔"

وہ بے یقینی اور تعجب کی ملی جلی کیفیت سے مجھے دیکھنے لگی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

☆☆☆

میں نے نازیہ بتول سے غلط نہیں کہا تھا۔ اگلی پیشی واقعتاً اس کیس کی فیصلہ ساز ساعت ثابت ہوئی تھی۔ میں مختلف مراحل پر استغاثہ کے گواہوں کی دروغ گوئی ثابت کرچکا تھا۔ میں نے چالان کی بعض خامیوں کو بھی ہائی لائٹ کردیا تھا۔ عدالت میری تمام کوششوں اور ان کے نتائج سے اچھی طرح واقف تھی اور یہ سب کچھ عدالتی ریکارڈ کا ایک گراں قدر حصہ تھا لیکن استغاثہ کے تابوت میں آخری کیل ریحانہ صدیقی کے بیان اور گواہی نے ٹھونکی تھی۔

ریحانہ صدیقی نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے بڑے اعتماد سے بتایا تھا کہ وقوعہ کی رات ملزم یعنی اس کا شوہر رات بارہ بجے سے چند منٹ پہلے گھر پہنچ گیا تھا۔ وہ لوگ رات ڈیڑھ بجے تک آپس میں باتیں کرتے رہے تھے اور دو بجے کے قریب وہ سونے کے لیے لیٹ گئے تھے پھر اگلی صبح نو بجے ملزم بیدار ہوا تھا اور ناشتا وغیرہ کرنے کے بعد وہ اپنے آفس چلا گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتولہ ماریہ کی موت وقوعہ کی رات ایک اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور یہ دو گھنٹے وقت کا وہی حصہ تھا جب میرا مؤکل اپنے گھر میں بیوی کے ساتھ موجود تھا لہٰذا اس کی ذات ہر شک سے بالاتر ثابت ہوگئی تھی۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل نفیس صدیقی کو قتل کے اس مقدمے سے باعزت بری کردیا تھا۔

بعدازاں مجھے کچھ ایسی باتیں پتا چلیں جو نفیس صدیقی اور اس کی بیوی کی دروغ گوئی کی جانب اشارہ کرتی تھیں۔ ان لوگوں نے مجھے ایک حقیقت سے لاعلم رکھا تھا۔ میں نے اسی لیے ان کی اکلوتی بیٹی ملائکہ کی شادی میں جانے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ ان میاں بیوی کی گوشمالی کرسکوں۔

شادی والے گھر میں صاحب خانہ سے ملاقات کرنا کوئی سہل کام نہیں ہوتا لیکن میں نے ان میاں بیوی سے بات کرنے کا موقع نکال ہی لیا۔

"نفیس صاحب!" میں نے اپنے سابق مؤکل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس کیس کے ختم ہونے کے بعد مجھے اپنے بعض ذرائع سے پتا چلا تھا کہ وقوعہ کی رات آپ ماریہ کے فلیٹ پر گئے تھے۔ آپ نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی؟"

"میں ڈر گیا تھا۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ "کس چیز سے ڈر گئے تھے؟"

"اس رات میں ماریہ کو سمجھانے گیا تھا کہ وہ شادی کا خیال دل سے نکال دے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن وہ کسی بھی طرح میری بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اس کی بس ایک ہی ضد تھی کہ یا تو وہ مجھے حاصل کرلے گی اور یا پھر اپنی جان دے دے گی۔ پہلے میں اس کی باتوں سے ڈرا اور جب بعد میں اگلے روز مجھے پولیس نے ماریہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا تو میرا یہ ڈر اور بھی پختہ ہوگیا۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ کسی کو بھی اپنے، ماریہ کے فلیٹ پر جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا حتیٰ کہ میں نے آپ سے بھی یہ راز چھپالیا۔ آپ مجھے معاف کردیں۔"

"اگر آپ مجھے سچ بتادیتے، میں تب بھی آپ کو جیل نہ جانے دیتا۔" میں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا پھر ریحانہ صدیقی کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"اور آپ نے اپنے شوہر کو بچانے کے لیے اتنی بڑی قربانی دی؟"

"اس میں قربانی والی کوئی بات نہیں وکیل صاحب!" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "میں نے آپ سے اور عدالت میں غلط بیانی اس لیے کی کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیوں کے مانند ہوتے ہیں۔ ہر اچھے بُرے وقت میں اگر وہ ایک دوسرے کا ساتھ نہ دیں تو پھر اس گاڑی کا ٹھیک سے چلنا ممکن نہیں رہتا۔"

ریحانہ صدیقی کے وضاحتی جواب نے مجھے لاجواب کردیا۔ میں باری باری ان میاں بیوی کو تکنے لگا۔ ازدواجی زندگی کی گاڑی کے ایسے دو پہیے میری نظر سے پہلے کبھی نہیں گزرے تھے۔

(تحریر: حُسام بٹ)

اندھیرے کی دبیز چادر میں رات منہ چھپائے اونگھ رہی تھی...... دو کمروں پر محیط فلیٹ میں سکوت اور اندھیرے کا راج تھا ماسوائے اس ایک کمرے کے...... جہاں وہ بیٹھا کام کر رہا تھا۔ دھیمی روشنی اندھیرے کو چیرنے کی سعی میں جتی تھی۔

اس کی انگلیاں میز پر پڑے لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر تیزی سے متحرک رہی تھیں۔ گردن کو پہلے دائیں اور پھر بائیں جانب ہلکا سا خم دے کر اس نے تھکن اتارنے کی کوشش کی۔ نجانے وہ کتنی دیر سے کام میں مصروف تھا۔

منشیات فروشوں اور حاسد دوستوں کی ملی بھگت کا احوال

تعلق کوئی بھی ہو... اعتبار اور بھروسے کا متقاضی ہوتا ہے اور جہاں بھروسے کا خوف ہوجائے وہاں زندگی نہیں رہتی بلکہ وہ دل خوابوں کا مدفن بن جاتا ہے... وہ بھی عمر کے اُس حصے میں تھے جہاں خواہشوں اور امنگوں کی تحریک پر بڑے سے بڑا مرحلہ بہ آسانی طے کرلیا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے انہیں جو دوست ملے وہ ان کی تباہی کا سبب بن گئے۔

نگہبان

تنزیلہ احمد

تبھی اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی۔ کوئی خاص پیغام موصول ہوا تھا۔ ایک بھی لمحہ ضائع کیے بنا اس نے پیغام پڑھا۔ اس کے چہرے کے یکلخت تاثرات بدلے تھے۔ بعجلت اس نے لیپ ٹاپ بند کیا۔ بستر پر بچھا نرم گدا اٹھایا۔ خفیہ خانہ کھول کر لیپ ٹاپ اس میں منتقل کیا اور خانہ بند کر دیا۔ کوئی عام انسان دیکھتا تو جان ہی نہ پاتا کہ وہاں کوئی پوشیدہ خانہ بھی ہے۔ اس نے گدے اور بستر کی چادر کو برابر کیا، جیکٹ پہنی، گلے میں مفلر لپیٹا اور گھر کی چابی اٹھائے باہر چلا آیا۔

رات کے دو بجے بیرونی دروازہ مقفل کر کے قریباً بھاگتا ہوا وہ سڑک تک آیا تھا..... گھر سے دور آتے ہی اس نے محتاط نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ہر سو ویرانی اور خاموشی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ تیز قدموں سے چلتا، چھپتا چھپاتا وہ بڑے سے آہنی کوڑے دان کے پاس چلا آیا۔ کسی ذی روح کی موجودگی کا یقین نہ پا کر اس نے بجلی کی تیزی سے کالے شاپر میں لپٹا مشکوک پیکٹ اٹھایا اور اپنی جیکٹ میں چھپا لیا۔ قدموں کا رخ دوسری سمت موڑ کر تیز تیز چلتے ہوئے وہ جلد نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک نامور نجی جامعہ کے شعبۂ معاشیات کی عمارت کا منظر تھا..... کلاس شروع ہونے میں پانچ منٹ رہتے تھے جب وہ شاہانہ انداز میں اپنی بڑی سی گاڑی سے اتر کر راہداری تک پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اپنی دوستوں کو "ایکسکیوز می" کہہ کر اس کی جانب لپکی۔

"ہے ہینڈسم کیسے ہو؟"

"گڈ! ہاؤ آر یو؟" حسان نے اسے لگاوٹ سے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"تمہارے سامنے ہوں!" اپنے کندھوں سے نیچے ڈھلتے کھلے بال اِک ادا سے جھٹکتے ہوئے وہ مسکرائی۔

"لکنگ گڈ!" اس نے جوابی مسکراہٹ اچھالتے ہوئے کہا تو نظر اس ہونق سے جا ٹکرائی جو بعجلت کلاس کی طرف آ رہا تھا۔

"ہونہہ! ٹیچر نہ ہو تو....." دل ہی دل میں کہتی وہ اس کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے کلاس روم میں داخل ہوئی تو وہ اس سے ٹکرانے سے بال بال بچا تھا۔

الجھے بکھرے حلیے والا عفان پچھلی نشستوں پر بیٹھنے والا عام سا طالب علم تھا۔ اس میں ایسی کوئی بات نہ تھی کہ کوئی لڑکی اس کی جانب متوجہ ہوتی۔ وہ سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ سیمسٹر کے پہلے دن ہی غانیہ نے اس کا نام ہونق رکھ دیا تھا اور وہ اس پر مضبوطی سے قائم تھی۔ جلد ہی ان کے پہلے سمسٹر کے امتحانات ہونے والے تھے۔

حسان کلاس کا لائق فائق لڑکا تھا..... ایک نامی گرامی کاروباری شخصیت کا اکلوتا سپوت جس کی ذہانت، امارت اور خوب صورتی پر قریباً سبھی ہم جماعت لڑکیاں فدا تھیں مگر اس کی منظورِ نظر غانیہ ٹھہری۔ بے حد حسین اور طرح دار جس کے والدین وفات پا چکے تھے۔ بس ایک بڑا بھائی اور بھابی تھیں مگر وہ ان کے ساتھ نہیں بلکہ لڑکیوں کے ایک نجی ہاسٹل میں رہائش پذیر تھی۔

سر زاہد کو کلاس روم میں داخل ہوتا دیکھ سب طلباء سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ حاضری کے بعد دیوار گیر پردے پر پروجیکٹر کی روشنی پڑتے ہی ایک کے بعد ایک سلائیڈ نمودار ہونے لگی تھیں۔ کمرے میں روشنی بہت مدھم تھی۔ قریباً سبھی طلبا کی توجہ لیکچر کی جانب مبذول تھی ماسوائے اس ہونق کے جو اپنی جگہ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ فکرِ معاش میں الجھے عفان کی معاشیات کے لیکچر میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔

وہاں سے چالیس پچاس میل دور اسی شہر کی ایک دس منزلہ عمارت کی سب سے اوپر والی منزل پر موت کی سی خاموشی نے پر پھیلا رکھے تھے۔ پرتعیش آفس میں چار جوان مرد ہاتھ باندھے مؤدب کھڑے تھے۔ جب کہ وہ اپنی کرسی پر براجمان کسی گہری سوچ میں غرق نظر آ رہے تھے۔ کافی دیر بعد وہ میز پر مکا مارتے ہوئے بولے تو ان کی آواز غصے سے پھٹ رہی تھی۔

"وہاٹ دی ہیل..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کچھ ہی منٹوں میں کروڑوں کا نقصان ہو گیا اور تم لوگوں کو پتا بھی نہ چلا۔ کہاں مر گئے تھے تم لوگ؟"

"سوری سر! ہمیں جتنا کہا گیا ہم نے اتنا ہی کیا۔ ہماری طرف سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔"

ایک مرد نے نظریں نیچی رکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا تو وہ دھاڑے۔ "شٹ اپ! تم لوگوں کی طرف سے گڑبڑ نہیں ہوئی تو پھر ان کے فرشتوں کو کیسے خبر ہو گئی؟ منشیات سے بھرا پیکٹ حساس ادارے کے ہاتھ لگ کر بے کار ہو چکا ہے۔ قیمتی منشیات کا نقصان الگ اور وہ نوجوان جو متاثر ہونے سے بچ گئے وہ بھاری نقصان الگ....."

"پیکٹ مطلوبہ مقام پر چھوڑ کر ہمیں وہاں سے ہٹ جانے کا حکم ملا تھا۔ ہمارے مخبر کے مطابق پیکٹ اٹھانے والے آدمی کا حلیہ اسی لڑکے جیسا تھا جیسا آپ نے بتایا تھا۔"

"اپنی بکواس بند کرو اور میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔"

ان کے آگ بگولہ ہونے پر اگلے ہی لمحے چاروں

کمرے سے نکلتے چلے گئے تھے۔ وہ کل رات ہی لندن سے لوٹے تھے اور آتے ہی ایک بری خبر نے ان کی ستی گم کر دی تھی۔ مرزا الطاف ملک کے طاقت ور بزنس مین تھے۔ تمام بڑے شہروں میں پھیلے چمڑے کے کاروبار کی آڑ میں وہ منشیات اور غیر قانونی اسلحے کو نوجوان نسل کی تباہی کا سامان بنا کر ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔

☆☆☆

لیکچر ختم ہونے کے بعد ان دونوں کا رخ سر جمیل کے آفس کی طرف تھا۔ وہ باہر کی نامور جامعہ سے معاشیات میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ کچھ عرصے کے لیے وطن واپس آئے ہوئے تھے۔ دروازے پر انگلی سے دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئے تو انہیں صوفے پر براجمان پایا۔ ان کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔

''ہیلو سر!'' غانیہ بے تکلفی سے ان کے برابر والے صوفے پر جا بیٹھی تھی۔

''اس بار اسائنمنٹ وقت پر مکمل کیوں نہیں دیا گیا؟'' انہوں نے سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''مکمل تو کرلیا تھا مگر عین وقت پر کسی چور اچکے کے ہاتھ لگ گیا ..... اس لیے جمع نہیں کروا سکے۔'' جواب حسان کی جانب سے آیا تو انہوں نے کڑے تیوروں سے دونوں کے چہروں کو گھورا۔ غیر محسوس طریقے سے غانیہ صوفے سے اٹھ کر میز سے ٹیک لگائے کھڑے حسان کے ساتھ جا کھڑی ہوئی تھی۔

''آکس کا کڑا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ اسے کچھ سے کچھ ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ کیسے بھول گئے تھے تم لوگ؟'' ان کی بات کا مفہوم سمجھ کر دونوں کے منہ سے ''سوری سر!'' ادا ہوا تھا۔

چہرے پر خوف ناک سنجیدگی طاری کیے رکھے ایک لسٹ انہوں نے ان کی طرف بڑھائی جسے غانیہ نے تھام لیا۔

''یہ کچھ نئے اسٹوڈنٹس کے نام ہیں۔ کمزور ہیں بے چارے۔ ان کا خاص خیال رکھنا۔ یاد رکھنا، مزید کسی غلطی کی گنجائش نہیں ہے!''

حتمی طور پر کہہ کر وہ اپنے سامنے دھرے لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ ہوئے تو وہ خاموشی سے کمرے سے نکل آئے تھے۔

حسان کال پر مصروف ہوا تو وہ اکیلی ہی آگے بڑھی اور کسی سے جا ٹکرائی۔ لڑکے کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس نے سارا غصہ اس پر نکالا تھا۔

''دیکھ کر نہیں چل سکتے۔ اندھے ہو گیا؟''

لڑکے کے گھنگھرالے بال الجھ کر پنکھے کے مانند ماتھے پر گرے ہوئے تھے۔ چہرے پر بڑا سا چشمہ درست کرتے

ہوئے وہ الٹا اسے گھور رہا تھا۔

''آنکھیں رکھتا ہوں۔ اندھوں کی طرح تو آپ چل رہی ہیں۔ ذرا محتاط رہا کریں۔'' دھیمی آواز میں کہہ کر عفان تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا۔

جب تک حسان کال پر بات کرکے آیا وہ خود کو نارمل کر چکی تھی۔

''آج رات ایک پارٹی ہے۔ تمہیں ضرور آنا ہے۔'' اس نے قریب آتے ہی خبر سنائی۔

''آں ہاں! کہاں اور کیسی پارٹی ہے؟''

''کلفٹن والے بنگلے پر ہے۔ شہر کی ایلیٹ کلاس موجود ہوگی۔ یقیناً تم اس موقع کو مس نہیں کرنا چاہوگی۔''

اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے حسان نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ وہ جھینپ گئی۔ دیوار کی اوٹ میں بیٹھے عفان کے کان بھی خبر سن چکے تھے۔ بظاہر وہاں بیٹھا وہ اپنے پرانے جوگر کے تسمے باندھ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ ہاسٹل پہنچی تو اس کا خراب موڈ مزید بگڑ گیا تھا۔ نجی ہاسٹل کا سب سے اچھا کمرا صرف اسی کے زیرِ استعمال تھا۔ جامعہ میں بھی اسے وقفے وقفے سے کئی لوگوں کو انکار کرنا پڑا تھا۔ ہاسٹل میں بھی کئی لڑکیاں اس کا سر کھا کر جا چکی تھیں۔ وہ عجیب جھنجلائی ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ جھنجلائی اور کوفت زدہ وہ تھیں جن کی ضرورت وہ پوری کرنے سے قاصر رہی تھی۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

''دیکھو شاید تمہارے پاس تھوڑی سی ہو۔ آئس کرسٹل نہ ملی تو مجھے کچھ ہو جائے گا؟''

الجھے بکھرے حلیے والی مائدہ نے ہاتھوں کی انگلیاں اضطراب کے عالم میں مروڑتے ہوئے تیسری بار التجا کی تھی۔

غانیہ اسے پہلے ہی سخت سست سنا چکی تھی مگر اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر اب اس پر رحم آنے لگا تھا۔ ہاسٹل میں آکر اس نے کیا کیا نہیں دیکھ لیا تھا۔ مائدہ ایک جدی پشتی زمیندار گھرانے کی شریف اور باپردہ لڑکی جو پڑھنے کی غرض سے شہر آئی تھی لیکن ہاسٹل اور جامعہ میں ملی بری صحبت نے اسے آئس کرسٹل جیسے نشے کی لت لگا دی تھی۔

''دیکھو مائدہ! ٹیک اٹ ایزی۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ حوصلہ رکھو......'' اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے کی کوشش کی تو وہ پھٹ پڑی۔

''تم نہیں سمجھ سکتی ہو میری حالت...... دیکھو میرے باپ کے پاس بہت پیسا ہے۔ میرے پاس بھی ہے۔ بولو کتنا لوگی...... تمہیں جتنے پیسے چاہئیں لے لو مگر پلیز انتظام کردو، تھوڑا سا۔''

جسے اپنی حویلی میں ملازمین پر رعب ڈالنے اور حکم چلانے کی عادت تھی وہ اس کے سامنے ایک بھکاری کی طرح گڑگڑا رہی تھی۔

''اچھا میری بات غور سے سنو۔ میں تمہیں کچھ دیتی ہوں۔ اس سے تمہیں سکون ملے گا۔ بہتر محسوس کروگی مگر تم کسی کو کچھ بتاؤ گی نہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں۔'' اس کی بے چینی سے تھرکتی آنکھوں کی پتلیوں میں جھانکتے ہوئے غانیہ نے دھیمی مگر سپاٹ آواز میں کہا تو اس نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔

ایک چھوٹی سی سفید گولی اس نے پانی کے ساتھ مائدہ کو نگلنے کو دی تھی۔ یہ گولی اس کے چٹختے اعصاب کو کسی حد تک بہتر کر سکتی تھی۔ مائدہ کے کمرے سے جاتے ہی غانیہ نے پارٹی پہ جانے کے لیے تیاری شروع کردی تھی۔

شوخ مگر پورا لباس پہنے اور تیز میک اپ کیے وہ پارٹی کے لیے بالکل تیار تھی جب حسان اسے پک کرنے آیا۔

گاڑی کی اگلی نشست پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے غانیہ نے کہا۔

''اپنے کلفٹن والے بنگلے پر تم مجھے پہلی بار لے کر جا رہے ہو۔''

''ڈارلنگ! وہاں بس خاص الخاص لوگ ہی آتے ہیں......'' ذومعنی انداز میں کہتے ہوئے حسان نے اس کے گال کو چھوا تھا۔

''تم بھی نا...... سامنے دیکھو۔ مجھے صحیح سلامت پارٹی میں پہنچنا ہے۔'' نامحسوس طریقے سے اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے وہ شوخی سے ہنس دی۔

''میرے ہوتے ہوئے بھلا تمہیں کیا ہوسکتا ہے؟''

باتیں کرتے اور دھیمی آواز میں گانے سنتے اس کی گاڑی کلفٹن والے بنگلے کے گیٹ پر پہنچی تو غانیہ نے جانچتی نگاہوں سے گردوپیش کا جائزہ لیا تھا۔

وسیع و عریض بنگلے کے چاروں اطراف اونچے مورچوں میں بندوقیں تھامے محافظ اس کی نظروں میں آئے تھے...... بنگلا کیا تھا اک چھوٹی سی دنیا تھی۔ عالی شان محل...... ایسے گھر کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ اندر تو جیسے رنگوں اور خوشبوؤں کا اک جہان آباد تھا۔ شہر کی نامور کاروباری اور سماجی شخصیات کو اتنے کھلے ڈلے انداز میں اس نے پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ حسان کے والد مرزا الطاف کے خاص دوست بھی آج اس کی نظر میں آئے تھے۔

جان بوجھ کر بہانے سے وہ محل نما بنگلے کی بھول بھلیاں

سلجھانے نکل پڑی تھی۔ وہ لان کے نسبتاً اندھیرے کونے میں عمارت کا جائزہ لینے کی غرض سے ٹہل رہی تھی جب اسے موبائل فون کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

''ان بارشوں سے دوستی اچھی نہیں فراز......'' رات گئے ملنے والے پیغام پر وہ مسکرا دی۔

''میرا امکان کچا نہیں ہے!'' اس نے جوابی پیغام بھیجا۔ چشم تصور میں وہ اس کا مسکراتا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

تبھی ایک نامانوس آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ ٹھٹکی۔

''رات کے اس پہر کیا لان میں کوئی پری اتر آئی ہے؟''

درمیانی عمر کے ایک گھاگ آدمی کی بے باک نگاہیں اس کے سراپا پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اتنی نادان ہرگز نہ تھی کہ اس کے لہجے اور آنکھوں کے تاثرات کو سمجھ نہ پاتی۔

''آپ کی تعریف؟'' اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟''

''آپ سے مطلب...... آپ کی تعریف؟'' اسی کے انداز میں پوچھا تھا۔

''اس کی بھی کوئی تعریف ہے جس سے آپ مسکرا کر بات کر رہی تھیں؟''

وہ چونکی۔ یعنی اس پر نظر رکھی جا رہی تھی۔ مگر وہ کسی طور ذرہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''وہ ہے ہی تعریف کے قابل! ذرا ادھر دیکھیے......'' اس نے آنکھوں سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ مرد پلٹا۔ نظروں کی سیدھ میں روشنیوں میں نہایا حسان تھا جو پارٹی کو رنگین بنانے کے لیے بطور خاص مدعو کی گئی نوجوان لڑکیوں کی ٹولی کے پاس کھڑا موبائل پر سر جھکائے دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔

''مگر آپ یہاں اکیلی کیوں کھڑی تھیں؟'' وہ مطمئن نہ ہوا۔

''واش روم جا رہی تھی۔ ادھر سے ہی جاتا ہے نا؟ یا پھر کوئی پابندی ہے نہیں جا سکتے......''

''جا سکتی ہیں...... مگر ادھر سے نہیں، اس طرف سے......'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے دوسری سمت اشارہ کیا تو وہ ''اوہ اوکے'' کہتی پُراعتمادی سے قدم اٹھاتی ادھر کو چل پڑی۔ اپنی پشت پر گندی نظروں کی تپش اسے موڑ مڑنے تک محسوس ہوئی تھی۔

''اندھوں کی طرح تو آپ چل رہی تھیں۔ ذرا محتاط رہا کریں!'' کسی کے الفاظ بازگشت کی طرح اس کے دماغ میں گونجتے رہے تھے۔

آدھے پونے گھنٹے میں ہی اس کا دل پارٹی سے اوب گیا تھا۔ وہ حسان کو ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے'' کہہ کر وہاں سے نکل آئی۔ ڈرائیور نے جب اسے ہاسٹل چھوڑا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے دو ہفتے ویسے ہی گزرے جیسے ان دونوں نے سوچا تھا۔ سب کچھ باس کی جانب سے ملی ہدایات اور ان کی منصوبہ بندی کے مطابق ہو رہا تھا۔ ادھر کچھ ایسے بھی تھے جن کا برا وقت اچھے طریقے سے شروع ہو چکا تھا۔

دسویں منزل پر واقع آفس میں وہ چوٹ کھائے ناگ کی طرح بل کھاتے ہوئے پھنکار رہا تھا۔

''ناقابلِ یقین! یہ ایک ماہ کے اندر اندر ہم پر دوسرا کاری وار ہے۔ آئی کینٹ بی لیو اٹ......''

''یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا۔ ہمارا نیٹ ورک تو بہت

فعال ہے۔ پھر کیسے ہمیں پتا نہ چل سکا کہ ہم پر نظر رکھی جا رہی ہے؟" تم میں ڈوبی یہ آواز مرزا الطاف کی تھی۔

"میں بتا رہا ہوں کہ غدار آس پاس ہی ہے... جو حساس ادارے سے ملا ہوا ہے۔ یہ حقیقت تو چوکیدار تک کو معلوم نہ تھی کہ کلفٹن والے بنگلے میں تہ خانہ ہے جسے ہم نے منشیات اور جدید اسلحے کا گودام بنا رکھا ہے۔"

"یہی تو میں سمجھ نہیں پا رہا۔ وہاں تو چیدہ چیدہ لوگوں کے سوا کسی کا آنا جانا ہی نہیں ہوتا۔"

"آپ مانیں یا نہ مانیں مگر مجھے کسی پر شک ہے۔" یہ آواز ان کی گھناؤنی سرگرمیوں میں شراکت دار رائے شہباز کی تھی۔

"کس پر شک ہے؟"

"اس رات پارٹی میں آپ کے بیٹے کے ساتھ آئی رنگین تتلی پر...... اسے ادھر اُدھر اڑتے میں نے خود دیکھا ہے۔ مجھے اس کی حرکتیں تب بھی مشکوک لگی تھیں۔" رائے شہباز کی آواز پر وہ چونکے تھے۔

"کیا کہا؟ وہ لڑکی حسان کی کلاس فیلو ہے اور آئس کرسٹل دوسری جگہوں پر پہنچانے میں پارٹنر بھی۔ وہ تو اپنی ہی بندی ہے......" ان کی سرسراتی ہوئی آواز کا رائے شہباز پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"وہ کیا ہے کیا نہیں، یہ جاننے کی ذمے داری آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ حسان کو کہیں کہ بس اسے لے کر میرے پاس آئے۔ باقی میں دیکھ لوں گا... اور سب اگلوا بھی لوں گا۔ مجھے سب طریقے آتے ہیں۔ کوئی ہمارا نقصان کرے اور بچ جائے یہ ممکن نہیں......" اس کی تحکم بھری سرد آواز پر مرزا الطاف سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ رائے شہباز کی آنکھوں میں ناچتی شرارت بھی ان کی نظریں بخوبی دیکھ چکی تھیں۔

وہ دونوں جامعہ میں ہی تھے جب حسان کو باپ کی جانب سے غانیہ کو ساتھ لانے کا پیغام ملا۔ اس پر پیغام کی نوعیت ظاہر کیے بنا اس نے لاڈ سے کہا تھا۔

"یار آج تم میرے ساتھ گھر چلو...... دل چاہ رہا ہے تم سے جی بھر کر باتیں کرنے کو......"

حسان کی اچانک فرمائش پر غانیہ کے دل میں خدشے نے سر اٹھایا۔ ایک دو بار ہی اس کے گھر گئی تھی دوستوں کی پارٹی میں شامل ہونے کے لیے مگر اب......

اس نے چہرے کے تاثرات سے خوشی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔

"وائے ناٹ ہینڈسم! مجھے ہاسٹل میں تھوڑا کام ہے۔ اسائنمنٹ کا یو نو...... ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنی ہے۔ پھر شام میں تم مجھے پک کر لینا۔"

"ہم! ٹھیک ہے۔" اس نے پرسوچ انداز میں کہا۔

وہ بآسانی مان گئی اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ زیادہ زور دیتا تو وہ شکوک و شبہات میں مبتلا ہو سکتی تھی۔

ادھر حسان اس بارے میں مزید سوچ رہا تھا تو ادھر غانیہ آگے کا لائحہ عمل اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے طے کر رہی تھی۔

☆☆☆

ہاسٹل پہنچتے ہی اس نے کمرا بند کیا اور ضروری کاغذات اور اشیا کو بڑے سے پرس میں منتقل کیا۔ وہ کپڑے بدل چکی تھی جب موبائل پر ایک پیغام موصول ہوا۔

"کھوئی منزل کی جانب لے جانے والے راستے اندھی گلی کے مانند ہوتے ہیں۔"

پیغام پڑھتے ہی وہ چونکی۔ دل کی دھڑکن بڑھی تھی۔

ہاسٹل کے باہر پہرے دار تعینات کر دیا گیا تھا تاکہ وہ ہاسٹل سے کہیں جا نہ سکے۔

"اندھی گلی میں کب راستہ نکل آئے کون جانے......"

اس نے جوابی پیغام بھیجا۔

"یا اللہ میری مدد کرنا۔" دل سے دعا نکلی۔

تبھی اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے مانند لپکا۔

"مجھے دو تین گھنٹے میں پک کر لینا......" حسان کے نمبر پر پیغام بھیج کر وہ مائدہ کے کمرے کی جانب بھاگی تھی۔

"میرے پاس بس تمہاری ضرورت پوری کرنے کی گنجائش ہے۔ تم کچھ دیر میرے کمرے میں آرام کرو۔ دروازہ اندر سے بند کر لو جب تک میں دوسروں کی ضرورت کا بندوبست کر کے آتی ہوں۔ کسی کو پتا نہ چلے کہ کمرے میں، میں نہیں تم ہو۔" تھکے ہارے اعصاب کی مائدہ نے اس کی بات [illegible] چراں کیسے مان لی تھی۔ اس کی ضرورت پوری ہو رہی تھی اور کیا چاہیے تھا۔ مائدہ کو اعصاب پُرسکون رکھنے والی گولی آئس کرسٹل کی نئی قسم کا جھانسا دے کر وہ کھلا چکی تھی۔

چند ایک دوسری لڑکیوں کے ساتھ وہ باہر نکلی تو کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوئی تھی۔ ہاسٹل سے نکلتے وقت اس نے مائدہ کا رنگین عبایہ پہن رکھا تھا۔ چہرے کا نقاب بھی ہوبہو ویسے کیا جیسے وہ کرتی تھی۔ دونوں کی جسامت تقریباً ایک جیسی تھی۔

ہاسٹل سے کچھ دور آ کر وہ پہلے سے انتظار میں کھڑی گاڑی میں سوار ہوگئی۔ ڈرائیور کی بڑی بڑی مونچھیں اور سر پر پشاوری ٹوپی تھی۔ آنکھوں کا مسکراتا تاثر اسے اپنا اپنا ظاہر کر رہا تھا۔

☆☆☆

"ہاں کیا رپورٹ ہے؟" گھر سے نکلنے سے قبل حسان

نے پہرے پر مامور شخص سے پوچھا۔
"وہ ہاسٹل میں ہے۔ابھی تک باہر نہیں نکلی۔"
"گڈ! میں پہنچ رہا ہوں۔محتاط رہنا......"
پیغام چھوڑ کر اس نے غانیہ کو کال ملائی۔
"آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا......" اس کی سماعتوں پر بھاری پڑا تھا۔
اندھا دھند گاڑی چلاتا ہوا وہ ہاسٹل پہنچا۔ایک بار پھر کال ملائی اور ایک بار پھر سماعتوں پر بوجھ بڑھا تھا۔ ہاسٹل وارڈن کو کال کر کے اس نے غانیہ کا کمرا چیک کرنے کا کہا تھا۔
"اس کا کمرا اندر سے بند ہے۔شاید آرام کر رہی ہو......"
وہ مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔پہرے دار کہہ رہا تھا کہ اسے باہر آتے نہیں دیکھا۔وارڈن نے جو بتایا اس کا مطلب تھا کہ وہ کمرے میں موجود ہے......مگر فون کیوں بند تھا۔انتظار کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔
مائیٹوا دو تین گھنٹے بعد جاگی تو کمرے کا دروازہ کھلا۔اس سے حقیقت جاننے پر وہ لوگ اپنی شکست پر سر پیٹ کر رہ گئے تھے۔تب تک عفان اور غانیہ شہر سے نکل کر کافی دور پہنچ چکے تھے۔وہ ایک چھوٹے سے قصبے کی جانب گامزن تھے۔

☆☆☆

آئس کرسٹل نامی منشیات کا پیکٹ عفان نے غانیہ کی اطلاع پر بروقت اٹھا کر وطن کے مستقبل کو نشے کی لت کی تباہ کاریوں سے بچالیا تھا۔غانیہ آئس پہنچانے کی آڑ میں نشے میں مبتلا ہاسٹل کی لڑکیوں کو اعصاب پر سکون رکھنے کی ادویات دیتی تھی جو آہستہ آہستہ بری لت چھوڑنے میں معاون ثابت ہوتیں۔
سیکیورٹی نے بھاری نفری کے ساتھ راتوں رات خفیہ کارروائی کر کے کلفٹن کے ایک بنگلے سے بھاری جدید اسلحہ، گولہ بارود اور منشیات برآمد کی تھیں۔یہ غانیہ کی بدولت ممکن ہو پایا تھا۔
پارٹی والی رات وہ بنگلے میں جگہ جگہ لگے سیکیورٹی کیمرے اور اسلحہ بردار محافظ دیکھ کر کھٹک گئی تھی۔بہانے سے لان میں ٹہلتے ہوئے اس نے عمارت کا نہ صرف جائزہ لیا بلکہ لان کے کونے سے جھانکتی جالی کا وہ حصہ بھی دیکھ لیا جس کے سامنے بڑا گملا رکھا ہوا تھا۔وہ تہ خانے کا وینٹ تھا۔
حساس ادارے کے پاس ایک خاص علاقے میں جدید اسلحے کے ذخیرے کی اطلاعات تو تھیں مگر درست مقام معلوم نہ تھا۔کڑی سے کڑی جڑتی گئی اور یوں اسلحہ بارود کے اس ذخیرے کو قبضے میں لے لیا گیا جو ملک کا امن وامان برباد کرنے کے لیے دہشت گردی اور تخریب کاری میں کام آنے والا تھا۔
عفان اور غانیہ دراصل حسین اور ایمان تھے۔

انسان کی زندگی

☆ انسان زندگی میں ایک بار جنم لیتا ہے۔دوسری بار دنیا سے ایسا جاتا ہے کہ جیسے کبھی آیا ہی نہ ہو۔
☆ انسان کی زندگی میں تین بار اس کے چہرے پر روپ یا نور آتا ہے۔ایک بار جب وہ پیدا ہوتا ہے، دوسری بار دولہے کے روپ میں اور تیسری بار جب وہ اس جہاں سے رخصت ہوتا ہے۔
☆ شیر کی گرج اور خونخواری دور سے نظر آتی ہے لیکن انسان کی مکاری اور دہشت قریب سے بھی نظر نہیں آتی۔بعض اوقات انسان حقیقی رشتے کا بھی پاس نہیں رکھتا۔
(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

......جنھیں اب نئی شناخت، حلیے اور پہچان کے ساتھ ایک اور مشن پر بھیجا جا چکا تھا۔
ایک ہی ادارے سے منسلک دو ایسی جانیں جن کے دل ایک دوسرے سے جڑ چکے تھے......مگر محبت سے زیادہ انہیں اپنا فرض پیارا تھا۔حسین کا تعلق پسماندہ علاقے کے ایک خاندان سے تھا۔اس کے والد کسان تھے۔گاؤں اور خاندان والوں کی نظر میں وہ شہر میں نوکری کرتا اور پڑھتا تھا۔جب کہ ایمان کے والد ریٹائرڈ سرکاری افسر تھے۔وہ دونوں حساس ادارے کے "انڈر کور سیکرٹ ایجنٹ" تھے۔جن کا کام ہی وطن کی حفاظت کرنا اور شر پسندوں کی کارروائیوں کو ناکام بنانے میں مدد کرنا تھا۔ایسے گمنام محافظ جو آزادی اور پاک سرزمین کے رکھوالے تھے۔وطن کی ایسی محافظ آنکھیں جن کا فرض چوکنا رہنا، وطن اور قوم کو غداروں اور دشمنوں سے بچانا تھا۔ان دونوں کو جامعہ میں بطور طالب علم رہ کر مشن پورا کرنے کا حکم ملا تھا۔
جامعہ میں اگلے دو تین روز خبر گشت کرتی رہی کہ غانیہ کے بھائی بھابی کی اچانک حادثاتی موت کی وجہ سے اسے واپس جانا پڑا اور وہ سمسٹر فریز کروا گئی۔
رہا عفان تو اس کی کسے پروا تھی......امتحانات سے قبل لگنے والی ایسے طلباء کی لسٹ جو پرچے دینے کے اہل نہ تھے ان میں عفان کا نام سرفہرست تھا۔انہیں حاضری نامکمل ہونے کی وجہ سے جامعہ سے نکال دیا گیا تھا۔
منشیات فروشوں کے گرد گھیرا تنگ ہو چکا تھا۔غیر قانونی اسلحے کا کاروبار کرنے والے پکڑ میں آ رہے تھے۔وطن کی نگہبان آنکھیں خاموشی سے اپنا فرض اور وطن دوستی نبھا کر کہیں اور فرض نبھانے جا چکی تھیں۔

☆☆☆

محفلِ شعر و سخن

❄ شاہانہ فیض ..... کراچی

پتھر جنہوں نے پھینکے تھے ان سے گلے نہیں
گھر ہی ملے تھے ہم کو نصیبے میں کانچ کے

❄ ناہید یوسف ..... اسلام آباد

بچھڑے ہوئے یاروں کی صدا کیوں نہیں آتی
اب روزنِ زنداں سے ہوا کیوں نہیں آتی
اے موسم خوشبو کی طرح روٹھنے والے
پیغام تیرا لے کر صبا کیوں نہیں آتی

❄ ارم کاشف ..... جھنگ سٹی

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لیے

❄ عظیم احمد ..... جھنگ سٹی

بادل کو کیا پتا ہے کہ بارش کی چاہ میں
کتنے بلند و بالا شجر خاک ہوگئے

❄ شاہانہ مہتاب ..... چنیوٹ

بے اعتبار وقت پہ جھنجلا کے رو پڑے
کھو کر کبھی اسے تو کبھی پاکے رو پڑے

❄ یسریٰ ریاض ..... کراچی

یہ درد کی تنہائیاں یہ دشت کا ویراں سفر
ہم لوگ تو اکتا گئے ، اپنی سنا آوارگی

❄ انور ندیم ..... حویلی لکھا، اوکاڑہ

وہ بڑا رحیم و کریم ہے مجھے یہ صفت بھی عطا کرے
تجھے بھولنے کی دعا کروں تو دعا میں میری اثر نہ ہو

❄ مہتاب احمد ..... حیدر آباد

دستک کے باوجود نہ دروازہ کھل سکا
تحفہ لیے میں عید کا جب ان کے گھر گیا

❄ مونا علی ..... ملتان

اوروں کے لیے دھوپ میں چپ چاپ کھڑے ہیں
سیکھے کوئی آدابِ وفا سنگ و شجر سے

❄ نازش ..... نواب شاہ

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

❄ کرن خان ..... کوئٹہ

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

❄ عاصم آفریدی ..... پشاور

موسم تھا بے قرار تمہیں سوچتے رہے
کل رات بار بار تمہیں سوچتے رہے
بارش ہوئی تو گھر کے دریچے سے لگ کے ہم
چپ چاپ سوگوار تمہیں سوچتے رہے

❄ افشاں ضیاء ..... سرگودھا

افسوس دل کا حال کوئی پوچھتا نہیں
سب کہہ رہے ہیں یہ تیری صورت کو کیا ہوا

❄ جنید احمد ..... سکھر

وقتِ رخصت آگیا ، دل پھر بھی گھبرایا نہیں
اس کو ہم کیا کھوئیں گے جس کو کبھی پایا نہیں

* ساجد اعوان......حافظ آباد

مجھے خاک میں ملا کر میری خاک بھی اڑا دے
تیرے نام پر مٹا ہوں مجھے کیا غرض نشان سے

* عاصم حفیظ......لیہ

میں کسی کی یاد کو دل سے نکال دوں لیکن
کسی طرح سے مجھے یہ ہنر تو آجائے

* شاہ عالم......راولپنڈی

الٰہی آبرو رکھنا بڑا نازک زمانہ ہے
دلوں میں کفر رکھتے ہیں بظاہر دوستانہ ہے

* محمود احمد......صادق آباد

کچھ یاد کر کے آنکھ سے آنسو نکل گئے
مدت کے بعد گزرے ہیں جو اس گلی سے ہم

* رانا قیصر......پسرور

انساں کے کسی روپ کی تحقیر نہ کرنا
ملتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر

* محمد ارسل......گوجرانوالہ

جن دوستوں سے ہم کو ملا تھا کبھی خلوص
ان کی نگاہ میں بھی عداوت ہے آج کل

* آفاق علی شاہ......سانگھڑ

یہ خدا کی دین عجیب ہے کہ اسی کا نام نصیب ہے
جسے تو نے چاہا وہ مل گیا جسے میں نے چاہا ملا نہیں

* راشد حبیب......خنک

دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر جانا ہے

* شعیب عباس......جہلم

یہ سال بھی اداس رہا روٹھ کر گیا
تجھ سے ملے بغیر دسمبر گزر گیا

* ارشد رشدی......چکوال

بے وفاؤں کی کوئی بات نہ ٹالی جائے
باوفاؤں سے مگر شرطِ وفا لی جائے

* آمنہ علی......ڈی جی خان

رات ہر چند کہ سازش کی طرح ہے گہری
صبح ہونے کا مگر دل میں یقین رکھنا ہے

* مسکان......کراچی

کتنی بے فیض سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کتنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

* عنبر راشد......روہڑی

ہم بھرے شہر میں تنہا تو نہیں تھے لیکن
کوئی رشتہ نہ ملا پھر تیری چاہت جیسا

* انس جاوید......ساہیوال

سانسوں کے سلسلے کو نہ دو زندگی کا نام
جینے کے باوجود بھی کچھ لوگ مر گئے

* تنزیل الرحمٰن......مانسہرہ

دسمبر کی شبِ آخر نہ پوچھو کس طرح گزری
یہی لگتا تھا ہر دم وہ ہمیں کچھ پھول بھیجے گا

* حنا خان......مری

پرانے لوگ ہیں ہم عیب ڈھانپنے والے
چرا رہے ہیں نظر بے لباس لوگوں سے

* عروسہ حبیب......گلگت

یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی

* فیاض احمد......اوکاڑہ

دل کے زخموں کا اندازہ کب ہوتا ہے چہرے سے
ساحل سے کیا جان سکو گے دریا کتنا گہرا ہے

* شازیہ خان......منڈی بہاؤالدین

جو دوستی نہیں ممکن تو پھر یہ عہد کریں
کہ دشمنی میں بہت دور تک نہ جائیں گے

* ظفر سیال......اچھرہ

بزدل ہے اسی واسطے مکار ہے دشمن
لڑنا جسے آتا ہو وہ سازش نہیں کرتا

* عامر خلیل......خانیوال

کرنے کو انتظار تیرا حشر تک کروں
لیکن سوال زندگی مختصر کا ہے

* شبیر ندیم......پنڈدادن خان

کوئی قاتل، کوئی رہزن، تو نقب زن ہے کوئی
یہی عالم ہے تو یہ شہر اجڑ جائے گا

* انجم حسنین......کوٹ لکھپت

محبت، عداوت، ادا، بے رخی
کرائے کے گھر تھے بدلتے رہے

* پرویز احمد......بی

تیری آنکھیں میری آنکھیں لگتی ہیں
سوچ رہا ہوں کہ کون یہ تجھ سا مجھ میں ہے

* منیب اشرف......سیالکوٹ

یہ تو نہیں خبر کہ لٹا دل کہاں مگر
سنتے ہیں آس پاس تیرا آشیاں بھی تھا

* عبدالرؤف......بھکر

قاصد پیامِ شوق کو اتنا نہ کر طویل
ان سے فقط یہ کہہ دے کہ آنکھیں ترس گئیں

❊ صبور احمد......کوہاٹ

ڈرتا ہوں کہیں ہاتھ سے گر کر نہ ٹوٹ جائے
مٹی کے کھلونوں سے مجھے پیار بہت ہے

❊ شاہد علی......خانیوال

صدیوں سے تجھے تکتے ہوئے سوچ رہا ہوں
جی تیرے خدوخال سے بھر کیوں نہیں جاتا

❊ ایم تاج ایاز......آزاد کشمیر

بھٹکتے دیکھا ہے ان کو بھی کچی گلیوں میں
جو لوگ شہر میں اونچے گھرانے والے ہیں

❊ نازیہ افضل......پنوعاقل

اک قیامت ہے کہ ہر روز گزر جاتی ہے
تُو نے دیکھا نہیں نقشہ میری تنہائی کا

❊ شوکت خان......خوشاب

وہ پاس آئے تو موضوعِ گفتگو نہ ملے
وہ لوٹ جائے تو پھر گفتگو اسی سے رہے

❊ حلیمہ ناز......کراچی

پھولوں میں دلکشی نہ ستاروں میں روشنی
اک تیرے روٹھنے سے زمانے بدل گئے

❊ شہزادی......کوٹ غلام محمد

لباسِ پارسائی سے شرافت آ نہیں سکتی
شرافت نفس میں ہوگی تو انسان پارسا ہوگا

❊ عرفان ہاشم......احمد پور شرقیہ

یہ حادثہ ہے کہ ناراض ہوگیا سورج
میں رو رہا تھا لپٹ کر خود اپنے سائے سے

❊ صابر علی......پنڈی بھٹیاں

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

❊ عمران نقوی......سکھر

صحرا کو بہت ناز ہے ویرانی پہ اپنی
دیکھا جو نہیں اس نے مرا اجڑا ہوا دل

❊ عروج خان......کوٹ ادو

انا کی جنگ تھی جھکنے کا تو سوال نہ تھا
وگرنہ اس کو منانا کوئی محال نہ تھا

❊ طاہر داؤ......ملتان

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

❊ حسن علی......مردان

میں اپنی ہر اک سانس اسی رات کو دے دوں
سر رکھ کے میرے سینے پہ سوجاؤ کسی دن

❊ فریال شکور......رحیم یار خان

تیرے کوچے میں تیری دید کی خاطر جاناں
ہم کسی اور سے ملنے کے بہانے آئے

❊ آصف ملک......ٹوبہ ٹیک سنگھ

وہ وقت بھی دیکھے ہیں تاریخ کی گھڑیوں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

❊ نسیم اختر......تونسہ شریف

یہ بھی آداب ہمارے ہیں تمہیں کیا معلوم
ہم تمہیں جیت کے ہارے ہیں تمہیں کیا معلوم

❊ مرزا فیاض الرحمٰن......گجرات

آنکھوں کی طرح تھک گئے پھیلے ہوئے بازو
وہ میرا پتا بھول گیا اب کے برس بھی

❊ کائنات حیدر......نواب شاہ

تم لاکھ چھپاؤ چہرے سے احساس ہماری چاہت کا
دل جب بھی تمہارا دھڑکا ہے آواز یہاں تک آئی ہے

❊ اسما امتیاز......خیرپور

کرتا نہیں ہے تم سے شکایت یہ دل مگر
کہنا یہ چاہتا ہے کہ تم، تم نہیں رہے

❊ محمد فراز......اسلام آباد

اب تو قسمت ہی اس سے ملا دے تو ملا دے محسن
وہ تو ہم سے بچھڑا ہے بارش میں پرندوں کی طرح

❊ وقاص حیدر......مری

اک بار جو ہو جائے رقم صفحۂ دل پہ
وہ نام کبھی دل سے مٹایا نہیں جاتا

❊ عادل نصیر......اٹک

بے خوابی کے اس موسم میں بھی ہم نے
آنکھوں میں اک خواب بچا کر رکھا ہے

کوپن برائے شمارہ مئی 2023

محفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --

پینڈیمک نے بڑے بڑوں کے ہوش گم کر دیے تھے۔ لوگ کھانا پینا، اوڑھنا پہننا اور سونا جاگنا بھول گئے تھے۔ ہر لمحہ یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کورونا وائرس حملہ آور ہو کر ان کی زندگی کا چراغ گل نہ کر دے۔

لاک ڈاؤن ختم ہوا تو گھر سے باہر کی دنیا میں رونق اور چہل پہل نظر آنے لگی تاہم لوگ اب بھی ڈرے سہمے اور بجھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ہمارا آفس بھی کھل گیا تھا۔ پینڈیمک کی وجہ سے ہمارا ڈھیروں کام پینڈنگ میں چلا گیا تھا جسے اب تیز رفتاری سے نمٹانا تھا۔ مجھے آفس کی جانب سے خصوصی میٹنگز کے لیے روانہ کر دیا گیا جہاں میری حیثیت ایک کیپٹن، ایک باس ایسی تھی۔

میں نے زندگی بھر اپنے پہناوے کا بہت خیال رکھا ہے اور دفتری سطح پر تو میں اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی حساس بلکہ جنونی ہوں۔ میں ڈریس اپ ہوتے ہوئے کسی معمولی شے کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔

ہماری کمپنی کی ایک برانچ ایکرون میں تھی۔ اس

دلچسپ انداز میں پسندیدہ چیزیں چرانے والی ایک حسینہ کی ہوشیاریاں

ویسے تو محتاجی کوئی بھی ہو، زندگی کو مشکل بنادیتی ہے اور اگر یہ مجبوری عادتوں کی ہو تو سمجھو مشکلات نہ رستہ چھوڑتی ہیں نہ گھر بھولتی ہیں... وہ بھی ایک ایسی ہی چور ثابت ہوئی تھی جسے چوری کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر جب عادت نے مجبور کردیا تو اس نے اپنی اس عادت کو احتیاط کے پردے میں چھپالیا لیکن... چوری کی عادت نہ چھوٹ پائی۔

معزز چور

شاہ زین رضوان

آفس میں مجھے یہ میٹنگز اٹینڈ کرنا تھیں۔ آفس کی جانب سے مجھے ایک شاندار ہوٹل میں قیام و طعام کی سہولت حاصل تھی لیکن میٹنگز والی جگہ میرے ہوٹل سے کچھ فاصلے پر تھی۔ بہرکیف میں پوری طرح تیار ہو کر میٹنگ میں پہنچ گئی۔ دیگر شرکاء بھی وقت پر وہاں پہنچ گئے تھے جن میں زیادہ تعداد مردوں کی تھی۔

کانفرنس روم میں میرے علاوہ باقی سب یا تو تیار ہونا بھول گئے تھے یا پھر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ لاک ڈاؤن ختم ہو چکا ہے اور معمولات زندگی نارمل ہو گئے ہیں۔ زیادہ تر مرد پولو شرٹ اور جینز یا ڈریس پینٹ میں تھے۔ عورتوں میں سے بھی مجھے کسی کے پاؤں میں ہیل نظر نہیں آئی۔ ان کے لباس بھی نارمل تھے۔ کہیں سے بھی ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ لوگ ایک اہم میٹنگ اٹینڈ کرنے آئے ہیں اور میٹنگز کا یہ سلسلہ ابھی کئی روز چلنا تھا۔ بہرحال، میں اپنی عادت کے مطابق مکمل تیاری سے میٹنگ میں پہنچی تھی جو دوسروں کے مقابلے میں خاصا اوور لگ رہا تھا۔ سچ پوچھیں تو ہم کہیں سے بھی ایک ٹیم نظر نہیں آتے تھے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

☆☆☆

آج کی میٹنگ نے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر بری طرح تھکا دیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں کافی دنوں بلکہ مہینوں سے گھر میں بند بیٹھی تھی۔ ایک میں ہی کیا، دنیا کے باقی لوگوں کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ فیلڈ ورک کو فل اسٹاپ لگنے کے باعث جسمانی مصروفیات نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھیں لہٰذا بدن کسرت کا عادی نہیں رہا تھا۔ ان لمحات میں دل چاہ رہا تھا کہ بیڈ پر گروں اور ایک لامحدود مدت کے لیے دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو جاؤں۔

کانفرنس ہال سے اپنے ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے اسٹار بکس نامی کیفے پڑا تو میں تھوڑی دیر کے لیے وہاں رک گئی۔ میں اس وقت کافی کی شدید طلب محسوس کر رہی تھی اور اسٹار بکس کی کافی کا کوئی جواب نہیں ہے۔

میں اپنے آرڈر کے لیے لائن میں لگی ہوئی تھی کہ میں نے ایک عورت کو ونڈو سائڈ والی ٹیبل پر بیٹھے دیکھا۔ وہ کافی پینے کے دوران میں اخبار پڑھ رہی تھی۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ جس چیز نے میری توجہ کو اس عورت کی جانب مبذول کیا، وہ اس کا کارڈیگن تھا۔ اس نے اپنے لباس کے اوپر نیلے رنگ کا ایک خوب صورت کارڈیگن (لیڈیز سویٹر جس کا سامنے والا حصہ کھلا ہوتا ہے یعنی وہاں بٹن لگے ہوتے ہیں اور اکثر کارڈیگنز کے نچلے حصے میں دائیں بائیں دو جیبیں بھی ہوتی ہیں) پہن رکھا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ کارڈیگن میرے لائٹ بلیو ڈریس کے ساتھ پرفیکٹ میچ کرے گا۔

میں نے سوچ لیا کہ اپنا آرڈر پک کرنے کے بعد میں اس عورت کے نزدیک جا کر بیٹھوں گی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ وہ بلیو کارڈیگن اس نے کہاں سے خریدا تھا مگر میری لائن بہت سستی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ لنچ کا وقت تھا اور اسٹار بکس میں اچھا خاصا رش بھی تھا۔ جب تک میں کاؤنٹر تک پہنچتی، وہ عورت اپنا سامان سمیٹ کر کیفے سے نکل گئی تھی۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتی تھی لہٰذا اپنے آرڈر کا خیال ذہن سے نکال کر میں اس کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی۔

وہ موسم بہار کا ایک خوشگوار دن تھا اسی لیے اس عورت نے کسی گرم جیکٹ کے بجائے وہ ہلکا پھلکا کارڈیگن پہن رکھا تھا۔ اس نے اسٹار بکس سے نکلنے کے بعد ایک بغلی گلی میں چلنا شروع کر دیا تھا۔ میں ایک مناسب فاصلہ رکھ کر محتاط قدموں سے اس کی جانب بڑھ رہی تھی اور کسی ایسے موقع کی منتظر تھی جب میں اس سے بات کر سکوں۔ ہمارے درمیان موجود فاصلہ رفتہ رفتہ کم ہو رہا تھا۔

ایک بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد نیلے کارڈیگن والی عورت پبلک لائبریری میں داخل ہو گئی۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور میں نے بھی لائبریری میں قدم رکھ دیا۔ اس عورت سے بات چیت کے لیے لائبریری ایک موزوں جگہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اس نے اپنے سامان کو میز پر رکھا۔ بلیو کارڈیگن کو اتار کر کرسی کے پشتے کے ایک کونے پر لٹکایا اور خود لائبریری کے اندرونی حصے میں کوئی کتاب لینے چلی گئی۔ اس نے فکشن والے پورشن کا رخ کیا تھا۔ میں مطالعہ کرنے کے ارادے سے لائبریری نہیں آئی تھی چنانچہ اس عورت کا انتظار کرنے کے لیے میں اس کے پہلو والی کرسی پر براجمان ہو گئی۔

میں نے اپنا بیگ کرسی کے پہلو میں فرش پر رکھ دیا اور اس کے اندر سے لیپ ٹاپ نکال کر اپنے سامنے میز پر سجا لیا تاکہ میں لائبریری میں خوامخواہ بیٹھی نظر نہ آؤں۔ بس مجھے اس عورت کی واپسی کا انتظار تھا تاکہ میں اس سے پوچھ سکوں کہ اس نے یہ دلکش کارڈیگن کہاں سے خریدا تھا۔ اس کے بعد میں اپنے ہوٹل روانہ ہو جاتی۔

پتا نہیں وہ عورت لائبریری کے اندرونی حصے میں

کہاں غائب ہوگئی تھی۔ میں ریڈنگ روم میں بیٹھی بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کررہی تھی۔ لیپ ٹاپ کو استعمال کرتے ہوئے میری نگاہ اپنے پہلو میں گئی تو میں نے بلیو کارڈیگن کی ایک آستین کو فرش پر پڑے اپنے بیگ سے مس ہوتے دیکھا۔ لیپ ٹاپ کو باہر نکالنے کے بعد میں نے بیگ کو کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کارڈیگن کی آستین کا آخری سرا میرے کھلے ہوئے بیگ کے تقریباً اندر ہی جھول رہا تھا۔

اس منظر نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ پہلی مرتبہ میرے ذہن میں اس کارڈیگن کو چرانے کا خیال آیا۔ اگرچہ دماغ کے کسی گوشے میں یہ سوچ بھی موجود تھی کہ مجھے اس عورت کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے مگر وہ لائبریری کے اندرونی حصے میں اس طرح غائب ہوئی تھی جیسے لوٹنے کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔

اس وقت ریڈنگ روم میں زیادہ رش نہیں تھا۔ میرے علاوہ تین افراد موجود تھے جن میں دو ضعیف العمر مرد اور ایک عورت تھی۔ دونوں مرد اپنی عمر سے بھی زیادہ قدیم اور ضخیم کتابوں کے مطالعے میں ڈوبے ہوئے تھے جبکہ وہ عورت کسی فیشن میگزین کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ ان تینوں میں سے کسی نے ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر میری جانب نہیں دیکھا تھا۔ ان کی اس بے نیازی بلکہ نظر اندازی نے میری ہمت کو مہمیز کیا اور میں کسی فوری ایکشن کے لیے تیار ہوگئی۔

میں نے لیپ ٹاپ کا استعمال جاری رکھتے ہوئے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ بلیو کارڈیگن کو دھیرے دھیرے کھسکایا اور کھینچ کر اپنے بیگ کے اندر پہنچا دیا۔ اس کام میں مجھے کسی وقت یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا کیونکہ میرا کھلا ہوا بیگ اس کارڈیگن کے عین نیچے فرش پر پڑا تھا۔ اب مزید وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں کارڈیگن کی مالک اس عورت کی واپسی کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔

میں نے اپنے لیپ ٹاپ کو بند کر کے بیگ کے اندر پہنچا دیا۔ بلیو کارڈیگن لیپ ٹاپ کے نیچے گویا چھپ سا گیا تھا۔ اس کے بعد میں لائبریری میں ایک لحہ بھی نہیں رکی۔

سب خیریت گزری۔ لائبریری کے اندر کسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی اور نہ ہی باہر کوئی میرے تعاقب میں لپکا۔ میں بہ خیر و عافیت اس علاقے سے نکل کر اپنے ہوٹل کی سمت بڑھ گئی۔

اگرچہ اس کارڈیگن کو حاصل کرنے میں مجھے دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا لیکن میرا ضمیر رہ رہ کر مجھے ملامت کررہا تھا کیونکہ وہ کارڈیگن کسی اور کی ملکیت تھا۔ میں نے اسے چرا کر ایک جرم کیا تھا جو کسی بھی لحاظ سے ایک اچھا عمل نہیں تھا۔

میں پہلے ایسی کبھی نہیں رہی تھی۔ شاید یہ اس پینڈیمک کے مابعد اثرات تھے جس کی وجہ سے مجھے مہینوں دوسرے انسانوں سے الگ تھلگ اپنے گھر میں بند رہنا پڑا تھا۔ بہرحال، وجہ کوئی بھی رہی ہو، میں اس بلیو کارڈیگن کو حاصل کرکے بہت خوش اور مطمئن تھی اور آفٹر نون والی میٹنگ میں شرکت کے لیے جب میں کانفرنس روم میں پہنچی تو وہ کارڈیگن میرے لباس کا حصہ بن چکا تھا۔

مزے کی بات یہ کہ صبح کی بہ نسبت سہ پہر والا میٹنگ سیشن زیادہ مفید اور کامیاب رہا تھا۔

☆☆☆

اگر پہلی چوری کے وقت مجھے کسی مشکل کا سامنا ہوتا یا میں رنگے ہاتھوں پکڑی جاتی تو ہوسکتا ہے آئندہ کبھی میرے دماغ میں کچھ بھی چرانے کا خیال نہ آتا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میرا پہلا تجربہ کامیاب رہا تھا جس سے میرے اندر حوصلہ پیدا ہوا اور میں نے تفریحاً چیزیں چرانا شروع کردیں۔ بلیو کارڈیگنز میری ترجیحات میں سرفہرست تھے۔ یہ رنگ مجھے دل و جان سے پسند تھا۔

پینڈیمک کے دوران میں آفس بند رہنے کی وجہ سے کام کے انبار لگ چکے تھے لہٰذا جب لاک ڈاؤن ختم ہوا اور زندگی معمول کے مطابق چلنے لگی تو ایک کے بعد ایک میٹنگز کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ ان دنوں میں بوسٹن میں تھی۔ اس کے بعد سینٹ لوئیس کا نمبر تھا۔ ہر جگہ نئے چہروں سے سامنا ہوتا تھا۔ نئی دلچسپیاں اور نت نئے لباس مگر میں ایک ہی بلیو کارڈیگن کو لے کر زیادہ مطمئن نہیں تھی۔ میں اس کے علاوہ کوئی اور بھی چاہتی تھی۔ نئے لک اور منفرد ڈیزائن والا کارڈیگن۔

میری یہ خواہش اس وقت پوری ہوتی نظر آئی جب جہاز نے لینڈنگ کی۔ مسافروں نے سیٹ بیلٹ کھول دی تھیں اور ایک کے بعد ایک اٹھ کر کھڑے ہونے لگے تھے۔ میں نے دیکھا چند قطار آگے کی ایک سیٹ سے جو عورت اٹھ کر کھڑی ہوئی اس نے ایک دلکش کارڈیگن زیب تن کررکھا تھا۔ اس نظارے نے میرے وجود میں سنسنی سی دوڑا دی۔

وہ سرخ رنگ کا ایک قیمتی کارڈیگن تھا جو نفیس قسم کی اون سے تیار کیا گیا تھا اور اس پر گولڈن سلک کی مدد سے خوشنما کام بھی کیا گیا تھا۔ وہ ریڈ کارڈیگن بُنائی، کڑھائی اور سلائی کا ایک عظیم شاہکار تھا۔

جہاز سے باہر آنے کے بعد سے لگیج ایریا تک میں ریڈ کارڈیگن والی عورت کے عقب میں تھوڑا فاصلہ رکھ کر چل رہی تھی۔ مسافروں کا اچھا خاصا رش تھا جس کی وجہ سے مجھے مذکورہ عورت سے بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا ورنہ میں اس سے ضرور پوچھتی کہ اتنا حسین اور عالیشان کارڈیگن اس نے کہاں سے خریدا۔

لگیج والے بیلٹ کے نزدیک مجھے اس عورت سے سوال کرنے کا موقع مل گیا۔ میرے استفسار میں کوئی کمی تھی اور نہ ہی خرابی لیکن اس عورت کے جواب نے مجھے خاصا مایوس کر دیا تھا۔ اس نے مجھے ایک معروف اسٹور کا نام بتانے کے بعد کہا کہ وہ ریڈ کارڈیگن اس نے کئی سال پہلے خریدا تھا۔

میں جانتی تھی کہ اگر میں اس عورت کے بتائے ہوئے اسٹور پر چلی بھی جاتی تو میں اس کارڈیگن کو خرید نہیں سکتی تھی کیونکہ اس قسم کی چیزیں بنانے والی کمپنیز سیزن ٹو سیزن اپنی مصنوعات کے رنگ، ڈیزائن اور اسٹائل تبدیل کرتی رہتی ہیں اور اس عورت نے تو وہ ریڈ کارڈیگن کئی سال پہلے خریدا تھا یعنی اس دوران درجنوں سیزن گزر چکے تھے۔ اب ایسے کارڈیگن کا کسی بھی اسٹور پر موجود ہونا ناممکنات میں تھا۔ سو، اس کارڈیگن کو حاصل کرنے کے لیے میرے سامنے ایک ہی راستہ بچا تھا۔

میں اس سے یہ تو کہہ نہیں سکتی تھی کہ تھوڑے پیسے لے لو اور یہ کارڈیگن میرے ہاتھ فروخت کر دو۔

ایسا نہیں تھا کہ میں نئے کارڈیگن خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی۔ اصل بات تھی پسند اور دل آ جانے کی۔ دل کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ جس پر آ جائے، سو آ جائے۔

میں نے اور اس عورت نے لگیج بیلٹ پر سے اپنا اپنا لگیج اٹھا لیا۔ میں اس دوران میں اسے اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے تھی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی اور اس کے پاس اس کی طاقت سے کہیں زیادہ سامان تھا۔ ایک پوری طرح بھرا ہوا شولڈر بیگ اور ایک کنگ سائز کا پہیوں والا سوٹ کیس۔ اس نے لگیج ایریا چھوڑنے سے پہلے ریڈ کارڈیگن اتار دیا۔ یہ دیکھ کر مجھے دلی اطمینان محسوس ہوا۔ گویا میرا کام آسان ہونے جا رہا تھا۔ اگر وہ کارڈیگن اس کے بدن پر موجود رہتا تو مجھے اپنی کارروائی میں بڑی دقت پیش آ سکتی تھی بلکہ اس صورت میں مجھے ناکامی کا ہی منہ دیکھنا پڑتا۔

اس عورت نے شولڈر بیگ کا اسٹریپ اپنے کندھے پر ڈالنے کے بعد ریڈ کارڈیگن کو بھی شانے پر رکھ لیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے بھاری سوٹ کیس کے ہینڈل کو تھام کر وہ ملٹی لیول پارکنگ ایریا کی سمت چل پڑی تھی۔ یقیناً اس کی گاڑی اسی پارکنگ میں کہیں موجود تھی۔

پارکنگ کی لفٹ والی لابی میں لوگوں کا اچھا خاصا رش تھا لیکن میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اس عورت کو اپنی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ وہ پارکنگ ایریا میں موجود کسی کار کی جانب بڑھنے کے بجائے زینے کی طرف مڑ گئی۔ میں نے محتاط اور محفوظ فاصلے سے اس کا تعاقب جاری رکھا۔

اگرچہ کنگ سائز سوٹ کیس میں پہیے لگے ہوئے تھے تاہم وہ عورت کافی مشکل سے اسے کھینچ پا رہی تھی۔ اس عمل کے دوران میں اس کے کندھے پر موجود ریڈ کارڈیگن بار بار کھسک کر بازو کی جانب آ رہا تھا اور بعض اوقات وہ اس کی پشت پر لٹکنے لگتا تھا تاہم وہ اپنے کارڈیگن کی ان "باغیانہ حرکات" سے غافل نہیں تھی۔ جیسے ہی کارڈیگن ادھر ادھر ہونے لگتا، وہ اسے درست جگہ پر "بٹھانا" نہیں بھولتی تھی۔

زینہ اترنے کے دوران میں اس کے لیے اپنے کارڈیگن کو سنبھالنا ناممکن ہو گیا۔ یہ اترائی کا سفر تھا جس کے باعث وزنی سوٹ کیس نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر رکھی تھی۔ اس کی ساری توانائی سوٹ کیس کو سنبھالنے میں صرف ہو رہی تھی لہٰذا کارڈیگن من مانی کے لیے آزاد تھا۔

لوگوں کی غالب تعداد آمد و رفت کے لیے لفٹ کا استعمال کر رہی تھی چنانچہ اس زینے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میرے دل کی دھڑکن اچانک بڑھ گئی اور دماغ نے گرین سگنل دیتے ہوئے [illegible] کر کہا۔ "ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔"

میں بھلا اس سنہری موقع کو کیسے ہاتھ سے جانے دیتی۔ میں اس عورت کے نزدیک پہنچ گئی۔ [illegible] ریڈ کارڈیگن اس کے کندھے سے سرک کر اس کی پشت پر کافی نیچے ڈھلک آیا تھا اور لگ بھگ وہ زمین بوس ہونے ہی والا تھا۔ میں نے عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

ریڈ کارڈیگن کی "سرکشی" کو اس عورت نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ اسے اس کی "اوقات" میں واپس لانے کے لیے رک گئی۔ وہ ایک بھاری بھرکم کنگ سائز سوٹ کیس کو بھی تھامے ہوئے تھی۔ اس کے یکدم رکنے سے کارڈیگن کو ایک جھٹکا لگا اور وہ اپنی مالکن کی پشت کو "الوداع" کہتے ہوئے زینے پر جا گرا۔ میں نے بجلی ایسی سرعت سے حرکت کی۔ اگلے ہی لمحے وہ ریڈ کارڈیگن میرے ہاتھ میں تھا۔

"یہ میرا ہے۔" وہ برہمی سے چلائی۔ "لاؤ، مجھے

دو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے کارڈیگن پر ہاتھ بھی ڈال دیا۔ میں نے وہ کارڈیگن اسے واپس کرنے کے لیے نہیں اٹھایا تھا۔ میں نے ایک زور کا جھٹکا دیا تو کارڈیگن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میرے دیے گئے جھٹکے نے اس کا توازن بگاڑ دیا تھا۔ وہ بھاری سوٹ کیس کے اوپر جا گری۔

وہ کوئی ہموار زمین نہیں بلکہ ایک چکنا زینہ تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ سوٹ کیس اس کے بوجھ سے زینے پر پھسل گیا اور وہ خود بھی سوٹ کیس کے ساتھ ہی زینہ "اترتی" چلی گئی۔

میں نے اسے بری طرح گرتے اور زینے پر لڑھکتے دیکھا تو میں تقریباً بھاگ دوڑنے والے انداز میں زینے پھلانگتے ہوئے اوپر کی سمت بڑھ گئی۔ میرے سامنے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

وہاں ایک لمحے کے لیے بھی رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں لفٹ کے ذریعے پارکنگ ایریا سے باہر نکلی اور ایک شٹل پکڑ کر اپنے ہوٹل آ گئی۔

آج پارکنگ ایریا کے زینے پر جو کچھ ہوا تھا، وہ مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ میں اس عورت کو چوٹ نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ اگر میں کارڈیگن کو چھوڑ بھی دیتی تو وہ عورت اپنی ہی جھونک میں نیچے گرتی۔ وہ کارڈیگن کو مجھ سے چھیننے کے لیے اپنی سکت سے زیادہ زور لگا چکی تھی لہٰذا یقینی طور پر اس کا گر کر زخمی ہونا طے تھا۔

اگلی صبح میں نے اپنے روم کے ٹی وی پر ایک لوکل نیوز چینل لگایا تا کہ گزشتہ روز والے واقعے کی جانکاری لے سکوں۔ یہ دیکھ کر میرے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی کہ اس افسوسناک واقعے کی خبر میں میرا یا ریڈ کارڈیگن کا کہیں کوئی ذکر نہیں تھا۔ بس اتنا بتایا گیا تھا کہ ائر پورٹ کے پارکنگ لاٹ میں ایک ادھیڑ عمر عورت زینہ اترتے ہوئے پھسل گئی اور پختہ زینے پر گرنے سے اس کی موت واقع ہوگئی ہے۔ اس نیوز چینل کے رپورٹر نے ائرپورٹ انتظامیہ کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا تھا کہ مسافروں کی سہولت اور حفاظت کے لیے فوری اقدامات کی ضرورت ہے تا کہ آئندہ ایسا کوئی حادثہ پیش نہ آئے۔

مجھے اس عورت کی موت کا دکھ ضرور تھا مگر میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ بہرحال، میرے کلیکشن میں ایک منفرد اور دلکش ریڈ کارڈیگن کا اضافہ ہو چکا تھا۔ میں جب بھی اس کارڈیگن کو پہنتی تو اس کی مالکن کے لیے میں دعائے مغفرت ضرور کر دیا کرتی تھی۔ میں اس سے زیادہ اس عورت کے لیے بھلا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس کے ساتھ جو ہوا، وہ اس کا نصیب تھا۔ اس میں میرا کیا قصور۔

اچھی باتیں

☆ کبھی بھی کسی کو حقیر نظر سے مت دیکھو کیونکہ تمہاری جو حیثیت ہے، یہ تمہاری قابلیت نہیں بلکہ اللہ کا تم پر کرم ہے۔

☆ ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں، پتھروں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔

☆ کوشش کریں کہ زندگی کا ہر لمحہ اپنی طرف سے سب کے ساتھ اچھے سے گزرے کیونکہ زندگی نہیں رہتی لیکن اچھی یادیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔

☆ رشتوں کو وقت دو۔ تاج محل دنیا نے دیکھا ہے، ممتاز نے نہیں۔

☆ سوچ اچھی ہونی چاہیے کیونکہ نظر کا علاج ممکن ہے لیکن نظریے کا نہیں۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

☆☆☆

آفس کی جانب سے کانفرنس میٹنگز کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی موسم بہار کے وسط میں مجھے ایک اور "کارروائی" کا موقع مل گیا۔ پہلے دن کے آخری سیشن کے بعد میں اپنے کولیگز کے ساتھ ڈنر کرنے ایک ریسٹورنٹ گئی۔ میرے سوا باقی لوگ بے تکلف عام سے لباس میں تھے جبکہ پُرتکلف اور منفرد لباس زیب تن کرنا شاید میرا نفسیاتی مسئلہ تھا۔

کھانے کے دوران میں گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ میں سب کے ساتھ بات چیت کا عمل جاری رکھتے ہوئے متلاشی نظر سے اِدھر اُدھر بھی دیکھ رہی تھی۔ جلد ہی مجھے اپنی "منزل" دکھائی دے گئی۔ ریسٹورنٹ کے بار والے حصے میں مجھے ایک عورت مے نوشی کرتی نظر آئی۔ اس کے پہلو میں ایک مرد بھی موجود تھا۔ وہ اس کا شوہر یا دوست یا محبوب یا کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ کسی بات پر تند و تیز لہجے سے بحث کر رہی تھی۔ اس کی آواز تو مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی مگر وہ اس مرد سے بات کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو جس انداز میں حرکت دے رہی تھی، اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے بیچ کسی بات کو لے کر پھڈا چل رہا ہے۔ مجھے ان کے لڑائی جھگڑے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری توجہ کا مرکز تو وہ کارڈیگن تھا جو

اس عورت نے اپنے کندھوں پر ڈال رکھا تھا۔
وہ کارڈیگن اپنی مثال آپ تھا۔ میں اس کے رنگ کو کوئی واضح نام نہ دے سکی۔ وہ آڑو کی طرح گلابی تھا اور نہ ہی چیکو کے مانند بھورا۔ وہ کسی الگ اور پُرکشش رنگ کا حامل ایک دیدہ زیب کارڈیگن تھا۔ میں نے اس رنگ اور شیڈ کا کارڈیگن اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں چشم تصور سے دیکھنے لگی کہ یہ کارڈیگن میرے اسکائی بلیو ڈریس کے ساتھ کیا قیامت ڈھائے گا۔ مذکورہ ڈریس میرے ہوٹل کے وارڈ روب میں ٹنگا تھا جو آئندہ صبح والی میٹنگ میں مجھے زیب تن کرنا تھا۔
میں اس عورت پر برابر نگاہ جمائے ہوئے تھی۔ میں نے دیکھا، وہ کارڈیگن اس کے کندھوں سے پھسل کر اس کی کمر اور کرسی کی پشت گاہ کے درمیان اٹک گیا تھا۔ اسی وقت اس عورت کا مرد ساتھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی جیب میں سے چند کرنسی نوٹ نکالے اور انہیں بڑی بدتمیزی سے اپنے خالی جام کے اندر گھسانے کے بعد وہ پاؤں پٹخ کر وہاں سے چلا گیا۔
اس عورت نے مرد کے پیچھے جانے کے بجائے ویٹر کو ایک اور جام کا اشارہ کر دیا۔ وہ پہلے ہی کافی پی چکی تھی۔ پتا نہیں اسے ایسا کون سا غم تھا جو اسے اس قدر مے نوشی پر مجبور کر رہا تھا۔
ویٹر نے اس کی حالت کے پیش نظر اسے مزید ڈرنک سرو کرنے سے صاف منع کر دیا۔ اس نے ویٹر کے ساتھ تھوڑی جرح بحث کی مگر ویٹر نے اس کی ایک نہ سنی۔ وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں اٹھی۔ کارڈیگن کو بددلی سے اپنے بازو پر ڈالا اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ ریسٹورنٹ سے نکل گئی۔
ہمارا ڈنر ختم ہو چکا تھا لیکن میرے کولیگز کے درمیان گفتگو کا عمل جاری تھا۔ میں نے کسی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس وقت میرے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔ میں نے سب کو گڈ نائٹ کہا اور سبک رفتاری سے کارڈیگن والی ٹُن عورت کے تعاقب میں چل پڑی۔
رات بھیگ چکی تھی لیکن سڑک پر ابھی تک ٹریفک کا ازدحام تھا۔ وہ عورت جلد ہی میری نگاہ میں آ گئی۔ اس کے قدموں کی ڈگمگاہٹ کو میں نے فوراً نوٹ کر لیا۔ اس نے بار میں اتنی زیادہ چڑھا لی تھی کہ اسے چلنے میں بھی خاصی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ راستہ بھول گئی ہو۔ میں تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ وہ خوشنما کارڈیگن ابھی تک اس کے بازو پر موجود تھا لیکن اس عورت کی زگ زیگ ناہموار چال کے باعث وہ ایک جانب لٹک سا گیا تھا۔ یہ میرے لیے ایک خوش آئند اشارہ تھا۔
وہ سڑک کے کنارے چلتے ہوئے اچانک تھم گئی۔ ایک لمحہ سوچا اور پھر واپس پلٹی اور لڑکھڑاہٹ آمیز قدموں سے میری جانب بڑھنے لگی۔ میں نے اپنے گرد و نواح میں تنقیدی نگاہ دوڑائی کہ کہیں کوئی بندہ بشر اس بے حواس عورت کو دیکھ تو نہیں رہا۔ یہ جان کر میرے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی کہ کوئی بھی ہماری جانب متوجہ نہیں تھا۔
اس وقت ہم زیبرا کراسنگ کے بہت نزدیک تھے۔ پیدل سڑک پار کرنے والوں کے لیے بلیو لائٹ جل رہی تھی۔ یہ ایک نادر موقع تھا اس کارڈیگن کو حاصل کرنے کا۔ میں نے اپنی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ میرے ایک ہاتھ میں بیگ تھا اور دوسرا ہاتھ ہنگامی کارروائی کے لیے ایک دم تیار۔
میں اس مدہوش عورت کے نزدیک پہنچی۔ اس کے بازو پر سے کارڈیگن کو اڑایا اور برق رفتاری سے اسے اپنے بیگ میں رکھنے کے بعد تیز قدموں سے روڈ کراس کرنے لگی۔
اس عورت کو یہ سمجھنے میں چند لمحے لگے کہ اس کے ساتھ کیا واردات ہو گئی ہے۔ اس دوران میں، میں سڑک عبور کر کے دوسری جانب پہنچ چکی تھی۔
وہ عورت میری جانب دیکھتے ہوئے مخمور لہجے میں زور سے چلائی بھی تھی۔ اس کی آواز نے میری سماعت تک رسائی ضرور حاصل کی لیکن میں اس کے الفاظ کو سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔ وہ کیا کہہ رہی تھی، اس سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اپنے اس مشن کی تکمیل پر میں حد درجہ مسرور اور مطمئن تھی۔
میرا اطمینان اور خوشی اس وقت غارت ہو کر رہ گئے جب میں نے اپنے عقب میں ایک خوفناک تصادم کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی مختلف گاڑیوں کے ہارن بے ہنگم انداز میں بجنے لگے اور ان کی ہیڈ لائٹس نے ماحول میں اضطراری رقص شروع کر دیا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک عبرت ناک منظر نے مجھے بری طرح جھنجوڑ کر رکھ دیا۔
وہاں رکنے والی گاڑیوں میں سے لوگ باہر نکل آئے تھے اور اپنے سیل فونز کے کیمراز سے اس حادثے کو ریکارڈ کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان سب کا فوکس سڑک پر پڑی ہوئی ایک بے سدھ عورت پر تھا جو حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے اُس دنیا میں منتقل ہو چکی تھی۔ یہ وہی

بدنصیب عورت تھی جس کا میں نے کارڈیگن پار لیا تھا۔ وہ ٹریفک لائٹ کی پروا کیے بغیر میرے پیچھے لپکی تھی لیکن اس دوران میں یلو لائٹ، ریڈ لائٹ میں بدل چکی تھی جو پیدل سڑک پار کرنے والوں کو رکنے اور گاڑیوں کو چلنے کا اشارہ تھا۔ وہ شرابی عورت اپنی بے خبری میں رواں دواں ٹریفک کی زد میں آ کر جان گنوا بیٹھی تھی۔

حادثے کے مقام پر جمع ہونے والے افراد میں مجھے اپنا ایک کولیگ بھی نظر آ گیا۔ وہ اس تصادم کی آواز سن کر ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے ہاتھ سے مجھے سوالیہ اشارہ کرنے کے بعد ایک ٹیکسٹ میسیج کیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ وہاں کیا ہوا ہے۔ میں نے ریپلائی میں ٹائپ کیا کہ میں نے دیکھا نہیں۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اس وقت مجھے شدید نیند آ رہی ہے۔ میں سونے کے لیے اپنے ہوٹل جا رہی ہوں۔ تم پتا لگاؤ کہ یہاں کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ تم کل مجھے بھی بتا دینا۔ اس کا ”اوکے“ کا ریپلائی موصول ہوا۔

میں بوجھل دل اور تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے ہوٹل کی جانب چل پڑی۔ اس وقت میری عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔

☆☆☆

میرے کولیگ نے میری معصومیت بھری وضاحت پر یقین کر لیا تھا لیکن وہ پوری رات میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں سو نہیں سکی تھی۔ میرے ایڈونچر کی وجہ سے دو عورتوں کی جان چلی گئی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس مہم جوئی میں تین کارڈیگنز میرے ہاتھ لگ چکے تھے۔ میں شرابی عورت والے منفرد رنگ کے کارڈیگن کو اپنے اسکائی بلیو ڈریس کے ساتھ پہن سکتی تھی۔ لائبریری میں غائب ہو جانے والی عورت کا بلیو کارڈیگن میرے سلک شرٹ ویسٹ لباس کے ساتھ پرفیکٹ میچ کرتا تھا جبکہ ریڈ کارڈیگن یلو اسکرٹ کے اوپر قیامت ڈھا سکتا تھا لیکن کیا یہ چرائی ہوئی خوشیاں انسانی جانوں سے زیادہ اہم، ضروری اور قیمتی تھیں؟

یہ تھا وہ سلگتا ہوا سوال جس نے میرے تن بدن میں ایک بے چینی اور اضطراب سا بھر دیا تھا۔ میں پوری رات سوچتی رہی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئی کہ آئندہ میں ایسی کوئی شے نہیں چراؤں گی جس میں کسی انسانی جان کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ مطلب یہ کہ میں چوری سے باز آنے کو تیار نہیں تھی۔

لت کوئی بھی ہو، اس سے چھٹکارا حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مجھے چوری کی لت لگ گئی تھی جس میں تجسس، سنسنی خیزی، مہم جوئی اور جانے کیا کیا تھا۔ مجھے اس کام میں بہت مزہ آتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر میں نے یہ کام چھوڑ دیا تو میری زندگی بے رنگ اور بے ذائقہ ہو کر رہ جائے گی اور مجھے بوریت سے شدید نفرت ہے۔

کافی سوچ بچار کے بعد ایک کام میری سمجھ میں آ گیا اور یہ کام تھا ائرپورٹ کے لگیج بیلٹ پر سے دوسروں کے بیگ اٹھانا۔ میں آفس کے کام سے بہت زیادہ بائی ائر ٹریول کرتی ہوں لہٰذا آئے روز لگیج بیلٹ سے میرا واسطہ پڑتا رہتا تھا۔

میں اپنے ساتھ اب ایک ایسا بیگ رکھتی ہوں جیسا اپنے رنگ، سائز اور ساخت کے اعتبار سے پچاس فیصد افراد کے پاس ہوتا ہے۔ میں اپنے بیگ پر نیم ٹیگ لگا کر رکھتی ہوں اور میرے اس بیگ میں بے قیمت اور فضول سی چیزیں بھری ہوتی ہیں۔ میرا طریقۂ واردات کچھ اس طرح ہے۔

میں جہاز کی لینڈنگ پر سب سے پہلے باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہوں اور لگیج بیلٹ والے ایریا میں پہلی یا دوسری انٹری عموماً میری ہی ہوتی ہے۔ میں اپنے بیگ سے بہت زیادہ ملتے جلتے بیگ کو بیلٹ پر سے اٹھا کر چل پڑتی ہوں۔

میں آج تک پکڑی نہیں گئی۔ اگر کبھی میں گرفت میں آ گئی تو اپنی جان بچانے کے لیے میرے پاس ایک معقول بہانہ بھی ہے۔ میں معذرت خواہانہ انداز میں کہہ دوں گی...... آئی ایم سوری۔ میں نے پریشانی میں اپنے بیگ جیسا کوئی دوسرا بیگ اٹھا لیا ہے۔ آپ چاہیں تو لگیج بیلٹ کو چیک کر سکتے ہیں۔ وہاں ایسا ہی ایک بیگ نظر آ جائے گا جس پر میرا نیم ٹیگ بھی لگا ہوا ہے...... بس، ہو گیا کام۔

آپ کو بتا رہی ہوں کہ ان چرائے جانے والے بیگز میں دیگر قیمتی سامان کے علاوہ کبھی کبھار کوئی منفرد اسٹائل کا کارڈیگن بھی میرے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ یہ سن کر آپ حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ اس وقت میرے وارڈروب میں چالیس سے زیادہ کارڈیگنز لٹک رہے ہیں جن میں سے کوئی ایک بھی میں نے نہیں خریدا۔

آپ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں، اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اپنی نظر میں، میں ایک معزز چور ہوں اور سب سے اہم بات یہ کہ میری چوری کی ان انوکھی وارداتوں سے اب کسی انسانی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔

کیا اتنا کافی نہیں ہے......؟

×××

جنگباز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط :14

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ درو دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم

زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

روشنیوں کا شہر کراچی...... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے، اَن گنت داستانوں کی امین اس مہربان گود کے کسی کونے میں سہراب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی، راحیلہ، مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ میں تو راحیلہ کو بچپن سے ہی سگی بہن سمجھ کرتا تھا مگر وہ بچپن سے ہی مجھے ایک بھائی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی ''نگاہ'' سے دیکھا کرتی۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن یہ حقیقت آشکار ہونے کے باوجود بھی میرے اس جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اب بھی اسے ایک ''بہن'' کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ راحیلہ نے میرے اس برتاؤ پر بُرا منایا مگر میں اسے بُری طرح جھڑک دیتا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ پتا چلا کہ اصل نحوست غربت کی نہیں بلکہ ایک غصہ ور شخص کی روز روز کی دانتا کل کل کی تھی۔ غربت اور عسرت کی زندگی کو ایک لعنت شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی کوکھ سے جرائم پھوٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے بھی ایک حد تک جرائم کی طرف لڑھکا ضرور دیا تھا مگر چونکہ شاید میری رگوں میں ''نسلی'' خون دوڑ رہا تھا اسی لیے میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس ''سنبھلنے'' کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجو اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلۂ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا ''باس'' کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں (سلیم، راجو، ماجد اور مجھے) ایک روز آنکھوں میں پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا جہاں ہمیں لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ میں جسامت کے لحاظ سے چھریرا، لمبا اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔ سلیم مناسب قد و قامت کا جبکہ راجو اور ماجا قدرے گٹھی ہوئی جسامت کے مالک تھے۔ گروہ نے ہمارے ناموں کے ساتھ عجیب و غریب قسم کے ''لاحقے'' نتھی کر ڈالے۔ میں سہراب لمبو کہلایا۔ سلیم کے ساتھ ''چھالیا'' نتھی ہو گیا۔ راجو ''بوری'' ہو گیا جبکہ ماجد ''ماجا''۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے ''باس'' اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میری غیرت جاگی۔ میں اور میرا باپ اس سیٹھ کا نمک کھاتے تھے۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتا دیں کہ بھتا نہ دینے کی صورت میں اس کی فیکٹری کو بم سے اڑا دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ میں نے بروقت بم کی اطلاع دے کر جہاں سیکڑوں غریب ورکروں کی جان بچالی، وہیں سیٹھ سکندر کو بھی بھاری مالی اور جانی نقصان سے بچا لیا۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری ''نمک حلالی'' سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر تو تھا ہی میرا معترف۔ عقدہ کھلا کہ سدرہ کا ماموں یعنی سیٹھ سکندر کا سالا، سدرہ کی والدہ کا بھائی، سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب ہے۔ بعد میں اس راز سے بھی پردہ ہٹا کہ وہ سدرہ کی ماں کا سوتیلا بھائی تھا۔ وہ بھائیوں والی محبت جتا کر سوتیلی بہن کا سب کچھ ہتھیانا چاہتا تھا اور اپنے گروہ کو بھی مالی فائدہ پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ فوزیہ مجھ سے متنفر نہ ہوئی تھی کیونکہ بعد میں راحیلہ نے اسے حقیقت بتا ڈالی تھی۔ میں لاک اپ ہوا۔ اسی دوران ٹھٹھہ کا رہنے والا کوئی ''پھونا خان'' نامی اجنبی میری مدد کو آیا۔ اندازہ ہوا کہ یہ گروہ کا کوئی مخالف تھا۔ اس کی مدد سے میں نے کسی طرح قانون سے رہائی پائی۔ باس اقبال، سلیم چھالیا اور راجو بوری میرے خون کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ وہاں سدرہ کا کوئی مکان خالی پڑا تھا۔ ادھر سدرہ کو اپنے نام نہاد ماموں سجاد بیگ سے بھی جان کا خطرہ تھا۔ سیٹھ سکندر کے دو وفادار محمود قریشی اور مشتاق بھی تھے۔ ٹرین کراچی سے پنجاب کے لیے روانہ ہوئی اور صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں بااثر ''چودھری جی برادران'' کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگ سے چودھری شالا جی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اسے درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام بختیار تھا۔ وہ بھولے کو بھی بے وقوف بنائے ہوئے تھی۔ بختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ جوان عورتوں کو اغوا کرنے والے خطرناک گروہ میں فوزیہ

جا پھنسی تھی اور بہت کٹھن مراحل سے گزرتے ہوئے میں نے اسے آزاد کرالیا۔ سیالکوٹ میں دو ماں بیٹیوں سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ نگہت کسی وسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی۔ اور نگہت بیٹی مگر شوہر کی مجرمانہ زندگی سے تنگ آکر شگفتہ اپنی بیٹی نگہت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھیں۔ ان کی الگ کہانی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جوجی میرا دوست بن جاتا ہے۔ نگہت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی ہے۔ سیالکوٹ میں اقبال چوک پر اس کے باپ یعنی باس کا بنگلا ہے۔ وہاں دو چوکیدار اور ملازم ارشد وغیرہ ہیں۔ ایک خفیہ گروہ ''کالی لہر'' سے میرا ٹاکرا ہوتا ہے۔ یہ جادوٹونے کرنے والا گروہ ہے۔ پتا چلا جوگی جگنو نامی شخص کا بھائی ہے۔ ان کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلۂ کار ہے۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن جاتا ہے۔ کالی لہر کے رانگا بابا اور میڈم فیھی سے میری دشمنی عروج پر ہے اور ان کے میرے صرف جادوٹونے بھی۔ مگر میں یہ سب ان کی ''شعبدہ بازی'' پر محمول کیے ہوئے ہوں۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آکر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ اس کی بیٹی نگہت میری دوست سے دشمن بن جاتی ہے جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی ہے۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی...... باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چودھری جی برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری ہے۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانگا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہوں اور اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آتا ہوں۔ رانگا نے منتر پڑھنا شروع کردیے اور چاروں طرف ہانڈیوں کی بارش ہونے لگی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

فارم ہاؤس میں ہانڈیوں کی بارش کے پیشِ نظر ہم دروازے کی طرف دوڑے اور اسے کھول کر باہر بھاگے۔

صبح صادق کا سویرا چہار اطراف پھیل چکا تھا۔ میں نے اپنے حواسوں پر قابو پارکھا تھا لہٰذا میں سمجھ چکا تھا کہ رانگا بابا کے چیلوں کو یہاں کی خبر ہو چکی تھی اور انھوں نے ہی کوئی شعبدہ گری دکھائی ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے دوڑ کر عمارت کے گرد ایک پورا چکر لگایا مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہاں مجھے کوئی بھی ذی نفس نظر نہ آیا۔

میری دیکھا دیکھی جگنو نے راڑاں اور نزاکت سے بھی یہی کہا تھا بلکہ خود بھی یہی کیا تھا۔ انہوں نے پستولیں بھی نکال لی تھیں تاکہ کوئی بھی مشکوک فرد دکھائی دے تو اسے شوٹ کردیا جائے مگر کوئی ہوتا تو ملتا۔

پھر وسیع احاطے میں آکر اپنی گاڑیوں کے سامنے ہم چاروں بری طرح ہانپتے ہوئے اکٹھے ہوئے اور عمارت کو گھورنے لگے۔

''سائیاں! بہت خطرناک جادوگر ہیں یہ لوگ۔ میں تو کہتا ہوں بھاگ چلو یہاں سے۔'' نزاکت نے منمناتی ہوئی آواز میں مشورہ دیا۔

''بکواس بند کر اپنی۔'' جگنو نے اسے جھڑک دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے خاصی پریشانی سے بولا۔

''اب کیا کریں؟ اس منحوس شیطان رانگا بابا کو گولی ماردیں؟''

''پر سائیاں! اس شیطان کو گولی مارنے اندر جائے گا کون؟'' راڑاں ایک دم ڈر کر بولا۔ ''دیکھا نہیں اندر سانپ اور بچھو پھیل چکے ہیں۔''

جگنو نے اس کی بات سنی ان سنی کردی اور بدستور مستفسرانہ نظروں سے میری جانب تکنے لگا۔ ایسے میں میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ سانپوں اور بچھوؤں والی ہانڈیوں سے یوں بلا بول دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ کالی لہر کے کارندے یہ سب چند سیکنڈوں میں نمٹا کر رفوچکر ہوگئے ہوں گے تاکہ ہم ان کی ''جادوئی'' دہشت کے زیرِ اثر آجائیں۔

میں نے فوراً راڑاں اور نزاکت کی طرف دیکھا۔ وہ معصوم بکریوں کی طرح اس عجیب و غریب صورتِ حال سے سہمے ہوئے نظر آرہے تھے۔

''تم دونوں کار لے کر اردگرد کا چکر لگاؤ اور یہ کھوجنے کی کوشش کرو کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں کون لوگ تھے۔ ذرا بھی کوئی مشکوک آدمی نظر آئے تو پکڑ کر ادھر لے آؤ۔''

میرے حکم پر دونوں نے سہمی سی نظروں سے جگنو کی طرف دیکھا تو وہ بھی دہاڑ کر ان سے بولا۔

''دفع ہوجاؤ، جو سہراب نے کہا ہے، وہ کرو۔''

وہ دلوں بدکے اور کار کی جانب دوڑے۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے اور عمارت کی جانب میری نظریں جم کر رہ گئی تھیں۔ اندر سے ہنوز رانگا بابا کے شیطانی قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں نے دانت پیسے اور دل میں تہیہ کرلیا کہ چاہے یہاں اژدھوں کی بارش ہوجائے، رانگا بابا کو میں یہاں سے

ہرگز نکلنے نہیں دوں گا۔
راڑاں اور نزا آئت چلے گئے تو میں نے جگنو سے کہا۔
''دھوئیں اور آگ کا بندوبست ہو سکتا ہے؟''
''ہو جائے گا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''لیکن اس کے لیے مجھے تھوڑی دیر کے لیے قریب میں کہیں جانا پڑے گا۔''
''کوئی پروا نہیں، چلا جا۔'' میں نے کہا۔ ''میری کار لے جا اور دیر مت کر۔''
''پر تو...... یہاں......؟'' وہ متفکر ہو کر بولا۔
''میری فکر مت کر۔ بس تُو جا اور دھوئیں اور آگ کا بندوبست کر...... جلدی، وقت نہیں ہے۔ میں ادھر ہی موجود ہوں۔'' میں نے کہا۔ وہ میری کار لے گیا۔ وہ شاید آبادی میں کسی قریبی گھر یا واقف کار کے پاس جا کر آگ وغیرہ کا بندوبست کرنے گیا تھا۔
میں عمارت کے بیرونی گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر آ جا طے تل کھڑا اسے یوں گھورے جا رہا تھا جیسے اندر کوئی عفریت موجود ہو اور ابھی وہ دہاڑتا، چنگھاڑتا باہر آ نکلے گا لیکن درحقیقت میں اندر سے ابھرنے والے رانگا پاپا کے مکروہ خراش قہقہوں کو سن کر اندر ہی اندر بری طرح کڑھ رہا تھا۔
مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنے شیطانی قہقہوں کے شور میں میرا مذاق اڑا رہا ہو کہ میں اسے مقید کرکے بھی بے بس نہ کر سکا بلکہ خود ہی بے بس ہو گیا۔ ایسے میں میرا جی چاہا کہ ابھی سانپوں اور بچھوؤں کی پروا کیے بغیر اندر جا گھسوں اور اس شعبدہ باز کا گلا دبا دوں۔
چونکہ میری یک ٹک برماتی سی نظریں عمارت پر جمی ہوئی تھیں کہ دفعتاً میں چونکا۔
اندر چھوٹی ہوئی ہانڈیوں نے جو زہریلے اور خطرناک سانپ بچھو اگلے تھے، وہ اب عمارت اور کھڑکیوں کے راستے رینگ کر باہر آ رہے تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میں ذرا گھبرا سا گیا۔
اچانک ہی ایک شائیں کی آواز کہیں قریب سے ابھری اور میں ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ کوئی سخت شے میرے سر کے پچھلے حصے سے ٹکرائی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔
نہ جانے میں کب تک بے ہوش رہا تھا۔ پتا نہیں بے ہوش بھی تھا یا جہانِ فانی سے کوچ کر چکا تھا کیونکہ آنکھ کھلنے پر میرے اردگرد قبر کی سی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے خود کو زمین پر چت لیٹے محسوس کیا۔ ہلنے جلنے کی کوشش کی تاکہ دیکھوں میں ''آزاد'' تھا یا رسن بستہ۔
یکبارگی میرے اندر ہول سا اٹھا۔ میں بندھا ہوا بھی نہیں تھا مگر اپنے جسم کے کسی حصے کو ہلانے جلانے سے بھی قاصر تھا۔ منہ خشک ہو رہا تھا۔
میں نے بہت کوشش کی کہ ایک ذرا جنبش ہی لے لوں مگر بیکار۔ بے اختیار میں نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پہ زبان پھیری، اس کے بعد حلق پر زور دے کر چلّایا۔
''میں کہاں ہوں؟ یہاں کون ہے؟''
دفعتاً مجھے یوں لگا جیسے میرا منہ بھی کھلا ہو اور میں چلّانے میں جتنا زور لگا سکتا تھا، وہ صرف بھی کیا تھا مگر نہ میرے کانوں نے آواز سنی نہ ہی میرے حلق سے کوئی الفاظ برآمد ہوئے تھے۔
میرے جیسا جنگجو فطرت اور مضبوط اعصابی قوت کا شخص بھی چند ایک لمحے کے لیے دہشت زدہ سا ہو گیا۔ یہی بھیانک خیال دوبارہ میرے اندر ابھرا۔
''کیا میں زندہ بھی تھا؟'' میں لرز گیا۔ اب تک موت کا ذائقہ چکھنے والوں کے بارے میں جو کچھ میں نے سنا تھا، وہ تمام باتیں مجھے اس وقت خود پر صادق محسوس ہوئیں۔
انسان جب مر جاتا ہے تو وہ خود کو کسی خواب کی سی کیفیات میں محسوس کرتا ہے۔ یوں جیسے انسان سوتے میں خواب دیکھا کرتا ہے۔ وہ خود اپنا آپ نہیں دیکھ پاتا مگر سب کچھ اسے نظر آ رہا ہوتا ہے۔ وہ بولتا بھی ہے مگر اپنی ہی آواز اسے سنائی نہیں دیتی حتیٰ کہ اپنے ہلنے جلنے کا بھی اسے کچھ احساس نہیں ہوتا۔ ایک جھپکے میں خود کو یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں محسوس کرتا ہے۔ تب پھر اسے اپنے قریبی عزیز لوگوں کے چہرے نظر آتے ہیں۔ وہ انہیں دیکھتا ہے پھر اسے اپنا آپ ''باہر'' کی صورت میں نظر آ رہا ہوتا ہے۔ لوگ جمع ہیں، وہ خود سفید کفن میں لپٹا پڑا ہے۔ اس کی ناک اور کان میں روئی ہے پھر اسے قبر میں اتارا جا رہا ہے۔ تب اس کی حقیقت میں آنکھ کھلتی ہے۔ وہ خود کو ایک اندھیری قبر میں پاتا ہے۔ وہ اپنے لوگوں کو چیخ چیخ کر پکارتا ہے مگر وہاں اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اسے قبر کے اندھیاروں اور تنہائی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ وہ خوفزدہ ہونے لگتا ہے۔ تب اسے احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کے بعد دو فرشتے آتے ہیں۔ جو نیک ہوتے ہیں وہ اس نیک شخص کے پاس آ بیٹھتے ہیں اور اسے تسلی دیتے ہیں۔ جو گناہ گار ہوتے ہیں وہ اسے مزید وحشت زدہ کرتے ہیں۔
''یا اللہ...!'' بے اختیار درد میرے لبوں سے نکلا۔
تب میں نے کلمہ طیبہ کا ورد کیا، درود شریف پڑھا، دل کو تسلی بھی ہوئی کہ میں یہ سب دہرا سکتا ہوں۔ الحمدللہ! میں

مسلمان ہوں اور اسی حالت میں مر چکا ہوں۔ موت کے ان اندھیاروں میں یہ تسلی میرے لیے بہت بڑی ڈھارس تھی۔

دفعتاً اندھیاروں کے بطن سے روشنی سی پھوٹی۔ روشنی کیا تھی، کچھ جگنو سے وہاں..... چمکے تھے۔ یوں جیسے سیاہ آسمان پر ذرا ذرا فاصلے سے تارے چمکتے ہیں۔ اب وہ تارے کچھ بڑے ہوکر میرے اردگرد اور قریب آنے لگے۔ میں دنگ رہ گیا۔

وہ سب جگنو یا تارے مختلف انسانی صورتوں میں میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر زبانیں خاموش، تاثرات عنقا تھے۔ میں چونک گیا۔ وہ سب جانی پہچانی صورتیں تھیں۔ میرے باپ کی صورت، میری ماں، راحیلہ، فوزیہ، سلیم، راجو، حتیٰ کہ فوزیہ کا بھائی بھابھی..... پھر وہ سب جن سے آج تک میرا واسطہ پڑتا آیا تھا۔ شاہد اقبال، بہن جی شگفتہ، ان کی بیٹی نگہت، پھر جگنو اور بس..... یہی سب چہرے اِدھر اُدھر گردش کرنے لگے اور اس کے بعد غائب ہوگئے۔

مجھے یقین سا ہونے لگا کہ میں واقعی مر چکا ہوں۔ موت کے بارے میں عام مروجہ باتوں میں، میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ مرنے کے بعد یا مرنے سے ذرا دیر پہلے وہ سب جانے پہچانے چہرے گردش کرنے لگتے ہیں جو مرنے والے کے قریب رہے ہوں، خواہ وہ دوست ہوں یا ہمدرد..... پھر وہ آخری لمحات بھی یاد آتے ہیں جس سبب موت واقع ہوتی ہے۔ میں جگنو کے فارم ہاؤس میں تھا۔ وہاں ہم نے شیطان کے چیلے رنگا بابا کو قید کر رکھا تھا مگر اس نے ہمیں بے بس کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد وہ ہانڈیاں پھوٹنے لگیں۔ ان میں سے زہریلے سانپ اور بچھو نکل نکل کر چاروں طرف رینگنے لگے تھے۔ پھر راڈیں اور زنجیر کسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگے۔ میں اور جگنو باہر آگئے۔

اس کے بعد جگنو میرے کہنے پر آگ اور دھوئیں کا بندوبست کرنے گیا تو میرے سر سے کوئی سنسناتی ہوئی شے ٹکرائی جس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔ یقیناً وہ بھی کوئی ہانڈی ہوگی جس کی ٹکر سے میں یقیناً پہلے بے ہوش ہوا ہوں گا اور اس کے بعد اس کے اندر سے برآمد ہونے والے سانپوں اور بچھوؤں نے مجھے ڈس لیا ہوگا۔ یوں میری بے ہوشی کے عالم میں ہی موت واقع ہوئی ہوگی۔

تب ہی میں نے ڈر اور خوف کو اپنے دل و دماغ سے جھٹک دیا۔ میرے اندر سے وحشت اور موت کا ڈر جاتا رہا۔ میں نے افسوس کی ایک لہر سی ضرور اپنے اندر کہیں اٹھتی ہوئی محسوس کی تھی کہ میں اب دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اپنوں اور اپنے پیاروں سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکا تھا۔

تسلی اس امر کی تھی کہ میرے لبوں پر اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کا ذکر تھا۔ نیز یہ بھی کہ میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ہی مرا تھا۔

اچانک ہی پردۂ تاریکی سے دو بانس جیسے لمبے تڑنگے اشخاص لمبا سا سیاہ جبہ پہنے نمودار ہوئے۔ تاریکی کی وجہ سے مجھے ان کی آمد ایسی ہی لگی جیسے وہ خلا میں چلتے ہوئے آرہے ہوں۔

وہ میرے قریب آئے تو میں ان کے چہرے دیکھ کر بری طرح دہل گیا۔ دونوں ہی انتہائی مکروہ صورت تھے۔ ایک کی سبز آنکھیں تھیں اور دوسرے کی لال انگارہ۔ ناک بھی گدھ کی چونچ کی طرح آگے سے مڑی ہوئی، چہروں پر استخوانی شبابہ ابھرتا تھا، سر پر کہیں کہیں بال اور باقی گنج۔ یوں جیسے گنجی کھوپڑی والے منحوس گدھ ہوں۔

''کیا یہ جہنمی فرشتے ہیں؟'' میرے دماغ میں خیال ابھرا۔ ''کیا میں گناہ گار کی حیثیت سے اٹھایا گیا ہوں؟'' ہولناک خدشات..... لیکن نہیں..... اگر ایسا ہوتا تو پھر میری زبان پر، میرے دل و دماغ پر اللہ اور اس کے پیارے حبیب ﷺ کا نام کیونکر آسکتا تھا؟ یہی وہ بات تھی جس سے مجھے تسلی تھی۔

میرے قریب آتے ہی ان میں سے ایک نے میرے چہرے پر کچھ چھڑکا۔ اس کے چھینٹے میرے چہرے پر پڑے اور نتھنوں سے بھی ٹکرائے۔ اس محلول کی عجیب سی مگر تیز بو تھی۔ یکلخت مجھے لگا جیسے میرے اندر جان سی پڑ گئی ہو مگر صرف اسی قدر کہ میں بول سکتا تھا۔

''تم مر چکے ہو سہراب! کیا تمہیں اس حقیقت کا ادراک ہو چکا ہے؟'' ایک نے بڑی گمبھیر سی آواز میں کہا۔

''تم کون ہو؟'' میں نے پوچھا۔ مجھے مسرت ہوئی کہ میں اب بول تو سکتا تھا مگر اپنے جسم کو جنبش دینے سے اب بھی قاصر ہی تھا۔

''سوال نہیں، بس تمہارے سمجھنے کے لیے یہی کافی ہے کہ تمہاری روح کو تمہارے جسم سے پرواز کرتے ہی ہم نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔'' دوسرے جبہ پوش نے کہا۔ میں اس کی بات سن کر ایک ثانیے کے لیے لرز گیا۔ کہیں یہ لوگ ''کالی لہر'' والے شیطانی گروپ سے تو تعلق نہیں رکھتے؟ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں تازہ ہوا کہ میرا دل و دماغ اللہ اور رسول ﷺ کی یاد سے لبریز تھا۔

ایسا ممکن ہی نہ تھا۔

''بکواس کر رہے ہو تم۔'' میں نے بھی دیدہ دلیری سے کہہ ڈالا۔

''رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔'' پہلے والے کریہہ صورت جبہ پوش نے پُرغیظ لہجے میں کہا۔ ''تمہارے لیے اب بہتر یہی ہے کہ ہمارے کہے کو بجالاؤ کیونکہ تمہاری روح اب ہمارے قبضے میں ہے۔''

یکلخت میرے اندر مسرت اور سکون کی لہریں ابھریں۔ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ یہ لوگ رانگا بابا اور میڈم بچھی کے آدمی تھے اور میرے ساتھ ایک جھوٹا موت کا ڈراما رچا کر کسی قسم کی شعبدہ گری میں معروف تھے۔

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرے دل و دماغ میں ایمان تازہ ہی نہیں، راسخ بھی تھا۔ اسی سبب میں نے ہمت اور ذہنی طاقت پکڑی تھی۔ یہ یقین بھی کہ میں مرا نہیں تھا، نہ ہی میری روح کسی شیطانی ٹولے (کالی لہر) کے قبضے میں تھی۔ یہ ایک خاص ''ٹرک'' اور مخصوص ''ماحول'' بنا کر مجھے ٹرانس میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

اگر یہ لوگ میرے ساتھ شعبدہ گری کر سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں......؟

پل کے پل میرے اندر یہ خیال ابھرا اور اگلے ہی لمحے میں نے خوفزدہ اور وحشت زدہ ہونے کی ایکٹنگ شروع کر دی۔

''کک......کیا واقعی میرے ساتھ ایسا سب کچھ ہو رہا ہے؟''

ان دونوں منحوس صورت جبہ پوشوں کی آنکھوں میں چمک ابھری پھر پہلے والے نے کہا۔

''کیا اب بھی تجھے یقین نہیں آتا ہماری بات پر؟ تو پوری طرح ہمارے کہنے پر ہے۔ ہمارے حکم کے زیرِ اثر ہے۔ اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔''

''مجھے تم لوگوں کا کون سا حکم ماننا ہوگا؟'' میں نے لہجے میں خوف سموتے ہوئے پوچھا۔ اگرچہ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ میں نے خود کو ان کے ایما پر چھوڑ دیا تھا لیکن حکمت عملی یہی تھی۔ ابھی مجھے بہت کچھ جاننا تھا۔ انہیں دھوکے میں رکھ کر مفر کی راہ نکالنا تھی لیکن کیا یہ سب ممکن تھا؟ کیا یہ لوگ جو اس قدر خطرناک اور شعبدے بازی جیسے جادو ٹونے کے ماہر تھے، کیا خبر سفلی علوم میں بھی دسترس رکھتے ہوں۔ یہ مجھ سے اتنے ہی بے وقوف بن جائیں گے؟ لیکن مجھے یہ سب کرنا تھا۔ مجبوراً ہی سہی۔

یوں ان کے اندر گھس کر ہی مجھے ان کے بارے میں، ان کے شیطانی عزائم اور ان کی جڑوں اور ''پھیلاؤ'' کا پتا چلانا تھا اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں ان کے ٹرانس میں رہوں۔ جو یہ کہیں، سردست ان کے کہنے پر عمل کروں، بجز اس کے یہ مجھ سے کوئی خلافِ فطرت اور خلافِ قانون کوئی کام لینے کی کوشش نہ کریں۔

ایک جبہ پوش نے مجھے اٹھ کر بیٹھ جانے کو کہا جبکہ میں تو ابھی صرف بولنے کے قابل ہی ہوا تھا کہ مجھ پر اسی بوتل سے دوبارہ ''چھڑکاؤ'' کیا گیا۔ وہی تیز سی عجیب ناگوار بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور میں ہلنے جلنے کے قابل ہوا مگر صرف اس قدر کہ جس طرح ایک ستے سے چڑیا گھر میں پنجرے میں بند شیر کو خوراک دی جاتی ہے کہ وہ پنجرہ نہ توڑ ڈالے۔

نقاہت اب بھی اپنی جگہ تھی تاہم میں کچھ ہلنے جلنے کے قابل ہوا تھا۔ ممکن تھا کہ کچھ اور وقت کے بعد میری جسمانی طاقت بحال ہو جاتی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور معصوم بن کر بولا۔ ''میں اب بھی بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔'' مقصد صرف پتا لگانا تھا کہ یہ مجھے کب میری اپنی جسمانی طاقت میں لاتے ہیں۔

''مت بھولو کہ تم صرف ایک روح ہو، جسم نہیں۔'' دوسرے جبہ پوش نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''روح کی اتنی ہی طاقت ہوتی ہے۔''

مجھے اس کے الفاظ بہت مکروہ لگے تھے۔ میں جان چکا تھا کہ میں مرا نہیں ہوں، زندہ ہوں۔ مجھ سے ڈراما کیا جا رہا تھا اور میں نے بھی عافیت اسی میں سمجھی کہ ان کے اس ڈرامے کا کردار بہ خوبی نبھاتا رہوں تاوقتیکہ میں ان کی گردنیں دبوچ لوں۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا اس بات پر ایمان راسخ تھا کہ جان، زندگی اور روح لینا دینا اور قبض کرنے کا اختیار اور طاقت صرف اور صرف میرے اللہ کریم کے سوا کسی کے پاس نہیں ہو سکتی۔

''اچھا۔'' میں نے مری مری آواز میں کہا۔ اندھیرا ہنوز میرے چہار اطراف طاری تھا۔ ہلکی روشنی کہیں سے آ رہی تھی مگر اس کا منبع اوجھل تھا۔ ان میں سے ایک چند قدم آگے چل رہا تھا اور اس کے پیچھے میں دوسرے جبہ پوش کے ساتھ تھا جس نے میرا ایک بازو پکڑ رکھا تھا۔

بھلا روح کو بازو سے پکڑنے کی کیا ضرورت؟ مگر میں ان کے جھانسے میں آ رہا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ تاریکی میں سب کچھ دیکھ رہے تھے اور انہیں راستے کا تعین بھی تھا جبکہ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا ماسوائے ان دونوں کے

اور وہ بھی مدھم سی روشنی میں کبھی ہیولوں کی صورت اور کبھی ان کا خاکہ کچھ حد اور کچھ لمحوں کے لیے واضح ہو جاتا۔

دروازہ کھلنے کی آواز ابھری۔ یہ فریضہ آگے والے جبہ پوش نے انجام دیا تھا۔ اس کے بعد روشنی بڑھی ... خدوخال واضح ہونے لگے۔ میرے بھی اور ان دونوں کے بھی۔

میں بغور اکناف کا جائزہ لیتا رہا۔ کچھ بھی نہ تھا سوائے دھند کے۔ روشنی تو کسی حد تک تھی مگر گندمی ہوئی سی، غبار آلود۔ ہم چلتے رہے۔ کچھ ثانیے بعد در و دیوار واضح ہوئے۔ پرانی سی وضع کی مگر درست حالت میں دیواریں تھیں۔ دائیں بائیں مختصر راہداریوں میں چند چھوٹے بڑے کمروں کے دروازے بھی نظر آنے لگے۔

منظر اب بالکل واضح ہو چکا تھا۔ مجھے بھی تسلی ہوئی۔ ہمت سوا ہونے لگی تو یہ خواہش مزید تازہ ہونے لگی۔ اب میں ان کے کچے چٹھے کا اچھی طرح پتا لگا سکوں گا۔

ہم ایک ہال میں آ گئے۔ یہاں فرنیچر کے نام پر صرف چند کرسیاں، دو ایک کاؤچ، ایک بڑے سائز کا صوفہ بچھا ہوا تھا۔ فرش چمک رہا تھا۔ قالین کیا، دری بھی نہیں بچھی ہوئی تھی۔ وسط میں آئے تو سامنے مجھے ایک چبوترا سا دکھائی دیا۔ اس کے پس منظر میں تاریکی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ اس کے بطن میں کچھ تھا جو تھوڑی دیر بعد نمودار ہونے والا ہو۔

ایسے اسرار بھرے ماحول اور فضا میں میری ”کامن سینس“ اور ”سیلف آبزرویشن“ بہت تیزی سے کام کرنے لگی تھیں۔ شاید اس لیے بھی کہ میں ان ”کالی لہر“ والوں سے اب تک تھوڑی بہت سہی، آگاہی حاصل کر چکا تھا۔

مجھے چبوترے کے سامنے ایک عجیب سی بغیر پشت گاہ والی شے پر بٹھا دیا گیا۔ دفعتاً ہی وہ نشست فضا میں اٹھی۔ میں لرز سا گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں واقعی روح ہوں اور فضا میں متحرک ہو گیا ہوں۔ میں چند فٹ اونچائی پر رک گیا۔ میں نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر اور نیچے دیکھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ چبوترا بھی میری نہ نظر آنے والی عجیب سی مختصر نشست کے ساتھ ساتھ اٹھتا چلا گیا تھا۔ ہم دونوں فضا میں بھی متوازی تھے۔ یعنی آمنے سامنے۔

وہ دونوں جبہ پوش غائب ہو چکے تھے۔ اب میں اس نیم اندھیرے ہال کی اسرار بھری فضا میں چند فٹ بلندی پر سکونت پذیر تھا۔ اچانک سامنے چبوترے کی جانب ہلکی سرسراہٹ کی آواز ابھری۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، وہاں سے کچھ نمودار ہو سکتا تھا اور اب وہی ہو رہا تھا۔ میں پہلے غور سے اور اب آنکھیں سکیڑے یک ٹک سامنے تکتا چلا گیا۔

تب ہی عقدہ کھلا کہ وہ ایک اونچی پشت گاہ والی اور شاہانہ سی کرسی تھی۔ اس پر کوئی براجمان تھا۔ بالکل ساکت اور خاموش، سیاہ لبادے میں ملبوس۔ چہرے پر بھی اسی لبادے کا گھونگھٹ نکلا ہوا تھا۔ بس اسی قدر ہی کہ چہرے پر تاریک سایہ رہے۔ روشنی پھر مدھم ہو چلی تھی۔ میں گھونگھٹ کے اندر چہرے کے نقوش دیکھنے کی سعی کرتا رہا مگر بے سود۔

نشست گول چبوترے کے وسط میں گویا ٹک کر ٹھہر گئی۔ اب بھی وہ خاموشی اور دوری تھی۔ ہمارے درمیان کئی فٹ کا فاصلہ اب بھی تھا۔ ذرا ہی دیر بعد مجھے ہلکا سا جھٹکا لگا۔ میں چونکا۔ میری نشست اس کے قریب ہونے لگی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا پھر محض وہ تین چار فٹ کے فاصلے پر جا کر ٹھہر گئی۔

یکایک گھونگھٹ کے اندر کا چہرہ کسی بلب کی طرح روشن ہو گیا اور میرے جیسا مضبوط اعصاب کا مالک شخص بھی ایک لحظے کے لیے دہل گیا۔

اف .... ! وہ بڑی ہی مکروہ اور کریہہ المنظر شے تھی۔ اس قدر بھیانک اور بدوضع کہ اسے دیکھ کر لگا کہ کسی فرضی خوفناک کہانی کی کوئی چڑیل یا ڈائن ہے۔ حالانکہ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ سب شعبدہ گری کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن شاید ماحول، غیر یقینی پراسرار حالات اور مبہم سے قیافے کی ملی جلی دلی و ذہنی کیفیات کا ہی شاخسانہ تھا کہ میں خود کو رفتہ رفتہ ایک عجیب سے جانے انجانے خوف میں جکڑتا محسوس کر رہا تھا کیونکہ میں بہرحال ایسے لوگوں کی قید میں بے بس تھا جن کے بارے میں خود بھی ابھی تک میں پوری طرح نہ جان سکا تھا۔

دل کے کسی کونے میں ایک فطری خوف کی لہر بھی سنسناتی ہوئی ابھری کہ کیا خبر یہ لوگ واقعی جادو ٹونے اور سفلی عمل کرنے والے ہی ہوں اور میں انہیں شعبدہ گر سمجھے ہوئے تھا۔ یہ ایک لرزا دینے والا خیال تھا اور تشویش آمیز خدشہ بھی۔

ابھرواں استخوانی سا چہرہ، رنگت سیاہ، جبڑے ابھرے ہوئے، ایک گال قدرے ابھرا ہوا اور دوسرا دھنسا ہوا۔ اس میں سوراخ تھا۔ وہاں ایک تاریک خلا جس کے اندر سے چمکتے ہوئے لیس دار مادے میں کوئی دھاگے دار سا کیڑا کلبلاتا نظر آیا جیسے باہر ٹپک پڑنے کی کوشش میں ہو۔ اوپر کا ہونٹ غائب، وہاں سے دانتوں کی پیلی زرد سی قطار، ان کے درمیان میں اس قدر فاصلہ تھا کہ اندر تک اس کی زبان کسی سوکھی شاخ کی طرح رکھی دکھائی دی۔ نچلا ہونٹ جیسے سوج گیا ہوا اور اپنے ہی وزن سے نہایت بدہیئت انداز

میں ٹھوڑی کی طرف جھول رہا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ایک آنکھ کا ڈیلا تو مجھے بغیر حلقے کے جیسے ایک طرف پتھر کے ڈھیلے کی طرح رکھا نظر آیا جبکہ دوسرا ڈیلا آہستہ آہستہ حرکت میں تھا۔

یوں بادی النظر میں یہ مکروہ بدہیئت چہرہ کسی سو سالہ بیمار سی، لاغر بڑھیا کا ہی معلوم ہوا۔ وہ ہولے ہولے ہل بھی رہا تھا۔ اس کا بدن اگرچہ سیاہ لبادے میں ہی ڈھکا ہوا تھا مگر وہ کرسی میں بیٹھنے کے باوصف جھکا جھکا سا تھا۔ دونوں ہاتھ لبادے کی کھلی آستینوں میں ڈھکے ہوئے تو تھے مگر اندر سے نصف حد تک انگلیوں کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

میں چونک گیا۔ وہ انگلیاں بھی ایسی ہی تھیں جیسے کسی ڈھانچے کی ہوں۔ سوکھی، کالی اور جلے ہوئے گوشت کی [illegible] کھال جیسی۔ خدا جانے کیا شے تھی یہ اور کون تھی؟

دفعتاً یہ سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ "میڈم پچھی!" یہ نام یکلخت ہی میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ تو کیا میں اس کے ٹھکانے "کالی کوٹھی" میں تھا؟

میں چپ رہا۔ سمیرا احمد بری طرح سائیں سائیں کر رہا تھا۔ جس قدر میں پہلے مطمئن تھا، اب اسی قدر گھبرایا ہوا اور متوحش سا ہو گیا۔

"سہراب!" دفعتاً ایک کھوکھلی مگر قدرے مرتعش سی آواز ابھری۔ یہ آواز اسی کریہہ صورت شخصیت کی تھی جو اس سے بالکل بھی ہم آہنگ محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ آواز کے آہنگ سے ظاہر ہوا کہ وہ کوئی عورت ہی تھی، خاصی عمر رسیدہ عورت۔

مجھے اس نے پکارا تھا اور میری نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اس کے آگے بولنے کا منتظر رہا۔

"تم وہ اکیلے انسان ہو جس نے ہم سے براہ راست ٹکرانے کی جرأت کی تھی۔ مجھے یہ بتاؤ اس کا تمہیں کیا فائدہ ہوا؟ بجز اس کے کہ تم ہمارے ہی ہاتھوں مارے گئے۔"

اس کی بات نے مجھے پھر اندر سے لرزا کر رکھ دیا۔ تو گویا یہ خبیث شخصیت بھی مجھے مرا ہوا کہہ رہی تھی۔ تو کیا یہ واقعی میری روح سے مخاطب تھی؟ میں سرتاپا لرز گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے وہی پالیسی اپناتے ہوئے کہا۔

"تو کیا میں واقعی مر چکا ہوں؟"

"ہاہا... ہاہا..." میڈم پچھی نے شیطانی قہقہہ بلند کیا۔ "کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں آتا اپنی موت کا اور اپنی اس غلام روح کا جو اب ہمارے قبضے میں ہے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔" میں نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کو جاری رکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"تمہاری بھول ہے۔ تم مر چکے ہو۔ تمہاری روح اب ہمارے حکم کی تابع ہو چکی ہے۔ وہ اب ہماری غلام ہے۔"

"لل... لیکن مم... میں اپنے جسم میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں دوبارہ سے زندہ ہونا چاہتا ہوں۔"

"بھول جاؤ اپنے اس جسم کو۔ دیکھو کتنے بڑے پھنے خاں بنتے تھے تم۔" میڈم پچھی پرغرور لہجے میں بولی۔ "ہمارے ایک اہم آدمی رانگا بابا کو تم بڑی دیدہ دلیری سے اس کے ٹھکانے سے اپنے یہاں لے گئے لیکن تم اور تمہارے ساتھی اس کا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔ بالآخر مارے گئے۔"

"میں اس کی معافی مانگتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"معافی تلافی کا وقت گزر چکا۔ اب صرف ہمارا حکم ہوگا۔"

"کیا حکم ہوگا؟" میں نے پوچھ لیا ورنہ تو میرا بس چلتا تو میں اسی وقت اس مردود ڈائن کا گلا دبوچ لیتا مگر میں تو کچھ زیادہ حرکت کرنے تک سے قاصر تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے جسم کی طاقت سلب کر لی گئی ہو۔ ایسی بے بسی اور بے چارگی کی قابل رحم کیفیت اور حالت سے میں زندگی میں پہلی بار گزر رہا تھا۔

"وہ ہم بعد میں بتائیں گے۔ پہلے کچھ دن اسی حالت میں ہماری طاقت کے مزید نظارے دیکھو گے۔" میڈم [illegible] لہجے میں بولی۔ "ہم جانتے ہیں کہ تمہیں ابھی تک اپنے مرنے اور روح کی حالت میں ہونے کا بالکل بھی یقین نہیں ہے اس لیے پہلے تمہیں اس کا یقین دلوائیں گے۔ اس کے بعد ہمارا اصل کام شروع ہوگا۔" کہتے ہوئے اس نے ایک تالی بجائی۔ آہستہ آہستہ ایک نشست حرکت میں آئی اور پس منظر کے تاریک بطن میں [illegible] کے ساتھ ہی میری [illegible] نشست بھی نیچے آ گئی۔

میرے ارد گرد تاریکی بتدریج گہری ہونے لگی۔ اسی وقت مجھ پر وہی چکر کا وار کیا گیا اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

دوبارہ ہوش آنے پر میں نے حسب سابق تاریکی میں چند چمکتے ہوئے چہرے دیکھے اور بری طرح ہل کر رہ گیا۔ یہ دو چہرے تھے۔ میرے آشنا، میرے پیارے چہرے۔

ایک فوزیہ اور دوسرا راحیلہ کا چہرہ تھا۔ وہ دونوں اداس، غمگین اور ہراساں ہرنیوں کے مانند نظر آ رہی تھیں۔ میں نے بےاختیار انہیں پکارا۔

"فوزیہ... راحیلہ...!"

مگر یہ کیا؟ میرے ہونٹ وا ہوئے اور کسی قدر متحرک

بھی لیکن آواز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ میں ہنوز خود کو اسی خواب والی کیفیت میں محسوس کرنے لگا جس میں مناظر تو سب نظر آتے ہیں مگر اپنا وجود دیکھنے سے انسان قاصر ہوتا ہے۔
اف... نہ جانے یہ کیسا اسرار تھا، کیا بھید تھا؟ شعبدہ گری بھی تھی تو یہ کیسی کہ اپنا آپ ہی مجھے لاچار اور قابل رحم لگ رہا تھا۔

اچانک ایک آواز ابھری۔ ڈری سہمی اور ہراساں سی آواز۔

''راحیلہ بہن...! یہ ہم کہاں آگئے ہیں؟ کون ہمیں یہاں لایا ہے؟''

یہ سن کر میں دہل گیا۔ فوزیہ نے راحیلہ کو مخاطب کر کے ایسا کہا تھا۔ تو کیا یہ دونوں بھی ان خبیث شیطانوں کے چنگل میں آ پھنسی تھیں یا انہیں اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا؟

''حوصلہ رکھو، فوزیہ! اللہ بڑا ہے۔ وہی ہمیں اس مصیبت سے نکالے گا۔'' راحیلہ اسے حوصلہ دے رہی تھی۔

میرے اندر ایک ابال اٹھا اور میں حلق پھاڑ کر چیخا۔

''فوزیہ! راحیلہ...! خدا کے لیے میری بات سنو۔ ادھر دیکھو میری طرف... میں یہاں ہوں۔''

مگر بے سود۔ ان دونوں نے تو جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ ان کے کانوں تک پہنچنے سے میری [illegible]۔

''ہاہا... ہاہا... بھلا روحوں کی بھی کوئی آواز [illegible] ہے۔'' اچانک وہی مکروہ لہجے والی زنانہ لرزتی کانپتی آواز ابھری۔ میں چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ میڈم پھپھی کی آواز تھی۔

میرا خیال تھا کہ اب فوزیہ اور راحیلہ میری نہیں تو اس کی آواز پر ضرور چونکیں گی اور اس پر متوجہ ہوں گی لیکن یہ دیکھ کر مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ فوزیہ اور راحیلہ تو یوں بے خبر تھیں جیسے اپنے سوا کسی اور کی آواز ان کی سماعتوں میں پڑتی ہی نہ ہو۔ کیا میڈم پھپھی کی بات سچ تھی؟ میں واقعی ایک روح بن چکا تھا؟ تب ہی اچانک میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔

اگر میں روح تھا اور فوزیہ یا راحیلہ کے کانوں میں میری آواز نہیں پڑ رہی تھی لیکن میڈم پھپھی تو زندہ حالت میں تھی۔ اس کی آواز پر تو فوزیہ اور راحیلہ کو چونک جانا چاہیے تھا۔ یہ میری عقل سلیم تھی جو میری خود اعتمادی میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔ اب میرا اس بات پر یقین مزید پختہ ہو چلا تھا کہ یہ سب شعبدہ بازی اور بازیگری کے سوا کچھ نہ تھا۔ تاہم فوزیہ اور راحیلہ کو بھی ان کی گرفت میں دیکھ کر میں تفکر آمیز پریشانی کا شکار ضرور ہو چکا تھا۔ اب ماسوائے اس سب وقت کے انتظار اور خود کو تن بہ تقدیر کرنے کے، میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔

''اے ہماری غلام روح! اب تم ان دونوں کا انجام دیکھو۔'' معاً ہی میڈم پھپھی کی آواز دوبارہ ابھری۔ میرا دل کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ میڈم پھپھی کی آواز خاموش ہوتے ہی میں نے فوزیہ اور راحیلہ کے سامنے چند ہی فٹ کے فاصلے پر ایک اور مردود شخصیت کو نمودار ہوتے دیکھا تو میری آنکھیں پھیل گئیں۔

وہ رانگا بابا تھا۔ اس مردود کو دیکھ کر میرا دل سینے میں زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ میں جیسے سانس روکے یہ منظر دیکھنے لگا۔

رانگا بابا مجھ سے یا میری ہیئت کذائی سے بے خبر تو نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم اس وقت وہ صرف ان دونوں کی طرف متوجہ تھا اور خاصا آگ بگولا اور طیش میں نظر آ رہا تھا۔

''تت... تم لوگ کون ہو؟ ہمارے ساتھ تمہاری کیا دشمنی ہے؟'' فوزیہ نے خوفزدہ ہو کر اس سے کہا۔ رانگا بابا کوئی جواب دیے بغیر بدستور ان کی جانب شعلہ بار نظروں سے گھورتا رہا۔

''میرا کیا قصور ہے؟ میں تو تم لوگوں کا حکم بجا لا رہی تھی؟'' راحیلہ نے ذرا حوصلے سے کام لیتے ہوئے اس سے کہا۔ راحیلہ کی بات سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ کیا وہ [illegible] بھی [illegible] تھی یا پھر میری طرح کوئی داؤ کھیلنے کی کوشش میں تھی؟

''تمہاری ہی وجہ سے ہمارا سارا کھیل بگڑا تھا۔'' بالآخر رانگا بابا نے اس کی جانب غضب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم سے جس راز داری کا تقاضا کیا گیا تھا، وہ تم نہیں کر سکیں۔ تم اپنی جذباتی کمزوری کے آگے مجبور ہو گئیں اور سہراب نے ہمارے ٹھکانے پر ہلا بول دیا۔''

''یہ غلط ہے۔'' راحیلہ نے کہنا چاہا مگر فوزیہ میرے تذکرے پر یکدم تڑپ کر رانگا بابا سے بولی۔

''سہراب کہاں ہے؟''

''اسے بھول جاؤ لڑکی!'' رانگا سفاکی سے بولا۔ ''وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اسے اس کے کیے کی سزا دی جا چکی ہے۔''

''ک... کیا؟'' فوزیہ نے میرے مرنے کی خبر سن کر اپنا سینہ تھام لیا اور گر پڑی۔ میں بے چین ہو گیا۔

''فوزیہ... خود کو سنبھالو۔ یہ کمینہ، خبیث جھوٹ بول رہا ہے۔'' میں زور سے چلا کر بولا لیکن ان پر کوئی اثر نہ

ہوا۔ جیسے ان تک میری آواز پہنچی ہی نہ ہو۔ فوزیہ تو صدمے سے بے ہوش ہوگئی۔ راحیلہ اور رانگا ہوش میں تھے۔

رانگا نے بھی میری آواز نہیں سنی تھی۔ نہ جانے یہ کیا ماجرا تھا؟

فوزیہ اس بدبخت رانگا کی زبانی میری موت کا سن کر صدمے تلے بے ہوش ہوچکی تھی اور راحیلہ اسے سنبھالا دینے کی کوشش کرتے ہوئے بار بار شعلہ بار نگاہوں سے رانگا کی طرف گھور رہی تھی۔

جیسا کہ مذکور ہوچکا، راحیلہ، فوزیہ کے مقابلے میں مضبوط دل گردے کی مالک تھی۔ اگرچہ اس خبر پر وہ بھی چونکی تھی مگر اسے رانگا کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس کے چہرے کے کچھ ایسے ہی تاثرات تھے۔

رانگا شیطانی قہقہے لگا رہا تھا۔ راحیلہ اس سے فوزیہ کی جان بخشی لینے کی التجا کر رہی تھی۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ راحیلہ کے لاشعور میں کہیں اگر فوزیہ کے لیے رقابت کا جذبہ اپنی جگہ تھا لیکن اس کا جذبۂ اخلاص بھی کم نہ تھا۔ اسے فوزیہ کے لیے فکرمند اور متوحش دیکھ کر راحیلہ کی طرف سے میرے دل میں جو بھی غصہ اور ناراضی تھی، وہ دھل گئی۔

”رانگا..... ! یاد رکھو، اگر فوزیہ کو کچھ ہوا تو سہراب اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔ تم میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ راحیلہ نے اسے گھورتے ہوئے شعلہ بار لہجے میں کہا تو وہ پھر بدمست قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”وہ پہلے میرا کیا بگاڑ پایا تھا؟ اب تو وہ خود ہمارے ہاتھوں اپنے بھیانک انجام کو پہنچ چکا۔“

”بکواس کرتے ہو تم۔ مجھے تمہاری بات پر بالکل بھروسا نہیں۔“ راحیلہ کے یقین پر لمحے بھر کو میں خود بھی حیران رہ گیا۔

”وہ زندہ ہے اور کم از کم تم جیسے شیطانوں کے ہاتھوں اس کی موت نہیں لکھی ہوئی ہوگی۔ اس کا مجھے پورا یقین ہے۔“ راحیلہ نے اسی مضبوطی سے کہا۔ آج تو جیسے میں راحیلہ کا ایک الگ ہی روپ دیکھ رہا تھا۔ اس کے لہجے کی گھن گرج، یقین، عزم، وہ سب کچھ جو اسے ایک بہادر اور جری عورت کے روپ میں آج ظاہر کررہا تھا۔

بے شک انسان اپنی کمزوری کے سبب کبھی کچھ لمحاتی کمزوریوں سے بھی گزرتا ہے اور ان خبیثوں نے راحیلہ کی اسی لمحاتی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے میرے اور فوزیہ کے خلاف بھی کردیا ہوگا۔ خلاف تو بس اسی قدر ہی کیا تھا کہ راحیلہ ان کی شعبدہ بازی کو جادو ٹونا یا سفلی علم سمجھ بیٹھی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ ہمیں نقصان پہنچائے بغیر وہ اپنا مقصد حاصل کرلے گی مگر اسے اپنے کیے پر پشیمانی ہوئی تھی۔

”حیرت ہے۔ تم تو خود اس کی اور سہراب کی دشمن ہوچکی تھیں۔ اب تمہارا دل ان کے لیے دھڑک رہا ہے؟“ رانگا نے زہریلے طنز سے کہا۔

”وہ میری ایک بھیانک غلطی تھی۔ میری ایک کمزوری سے تم لوگوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔“ راحیلہ وضاحت کرنے لگی۔ اس دوران فوزیہ کو تھوڑا تھوڑا ہوش آنے لگا تھا۔ راحیلہ اسے بھی مسلسل سنبھالا دے رہی تھی۔

”لیکن پھر بھی میں نے فوزیہ اور سہراب کے خلاف ایسا کوئی قدم اٹھانے کا سوچا بھی نہ تھا جو انہیں جسمانی یا جانی نقصان پہنچانے کا سبب بنتا۔“ راحیلہ کی توجیح میرے قیاس کے عین مطابق تھی۔

رانگا بولا ”اب سب کچھ بھول جاؤ اور..... تم دونوں کے پاس ہماری غلامی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔“

پھر اس سے پہلے کہ راحیلہ کچھ بولتی، اسی وقت وہ منظر غائب ہوگیا۔ میری تشویش آمیز بے چینیاں عروج پر پہنچ گئیں۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میری نظروں کے آگے جیسے ایک بار پھر مکمل تاریکی کا دبیز پردہ آگرا تھا۔

اسی دوران میں، میں نے اپنے ہاتھوں پیروں کو حرکت دینا چاہی اور وہ ہلتے بھی محسوس ہوئے تھے لیکن مقدور بھر۔ ان میں وہ توانائی اور قوت نہ تھی، جو ہونی چاہیے تھی۔ نہ جانے ان بدبختوں نے میرے ساتھ کیا، کیا تھا؟ مجھ پر ایسا کیا چھڑکا تھا کہ میری جسمانی طاقت بالکل مفلوج ہوکر رہ گئی تھی۔ اس پر مستزاد میں کوئی منظر واضح نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ تھوڑا بہت واضح ہوتا بھی مگر صرف دھند میں یا پھر پردۂ ظلمت میں تھوڑی دیر کے لیے ابھرنے والی روشنی جو دھند کی لپیٹ میں ہی ہوتی۔

کیا اس طرح یہ خبیث لوگ مجھ پر بدستور یہی تاثر جمانا چاہتے ہیں کہ میں واقعی ایک مرا ہوا انسان تھا اور اب جو کچھ بھی تھا وہ میں ایک روح کی شکل میں دیکھ رہا تھا؟

میں نے ان پر لعنت بھیجی اور اللہ کی ذات اور اس کی طرف سے مدد پر میرا ایمان مضبوط اور راسخ ہی رہا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے فوزیہ وغیرہ والے منظر بھی اسی طرح کے مجھے دکھائی دیے تھے۔ میرا دھیان اب اپنی فکر و توجہ سے ہٹ کر فوزیہ اور راحیلہ کی طرف چلا گیا۔ یہ بات باعثِ تشویش ہی تھی کہ بدقسمتی سے یہ دونوں بھی اس شیطانی ٹولے کی گرفت میں آچکی تھیں اور اب نہ جانے ان کا کیا حشر

ہونے والا تھا۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میرے تن بدن میں پہلے جیسی قوت بحال ہو اور میں ان خبیثوں کا ادھر ہی تیاپانچا کرکے رکھ دوں مگر یہ سب کیسے ممکن ہوتا؟ میں تو خود کسی کی مدد کا منتظر تھا۔ ان حالات میں اب سوائے اللہ کے اور کون میری مدد کر سکتا تھا۔

مجھے صبر اور حوصلے سے یہ سب کچھ سہنا تھا۔ کوئی ایسا موقع اور وقت میرے ہاتھ لگ جاتا جس سے میں دوبارہ اپنی اصل حالت میں آجاتا مگر کب؟

اچانک مجھ پر غنودگی چھانے لگی پھر مجھے شاید نیند آگئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو اسی بھیانک تاریکی کو اپنے گرد وپیش پا کر مجھ پر ذہنی اذیتیں طاری ہونے لگیں۔ سب سے زیادہ اذیت مجھے اس بات کی ہو رہی تھی کہ میں اپنا آپ نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ یعنی وہی ایک منحوس خواب والی کیفیت مجھ پر طاری رکھی گئی تھی۔

اف، میں اب بھی اسی حالت میں تھا۔ یعنی کمزور اور بے بس۔ میں نے ہمت کی۔ اٹھ کر بیٹھنے اور چلنے کی کوشش بھی کی۔ مجھ پر اب تک ایک روح ہی جیسا تاثر برقرار رکھا گیا تھا۔ یہ سب کچھ تو میں کر پا رہا تھا مگر ایک حد تک۔

بالآخر میں نے اپنے جسم کی اسی قلیل سی طاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی مگر ایک حد تک۔ میں نے اسی پر بس نہیں کیا اور جیسے بھی ہاتھوں پیروں کی مدد سے خواہ ”کرالنگ“ کے انداز میں چل سکتا تھا، چلنے لگا۔ میری کوئی سمت نہ تھی، کوئی تعین نہ تھا۔ بس، آگے اور ادھر اُدھر حرکت کرتا رہا۔ تھوڑا اور حرکت کی تو جیسے کسی ان دیکھی دیوار سے ٹکرا کر رک گیا۔

مایوسی اور بے بسی کے انتہائی احساس میں یہ مسرت میرے لیے برقرار رہی تھی کہ میں بہرحال جسمانی طور پر ایک انسان ہی کی حالت میں تھا۔ روح بہرحال نہ تھا۔ ورنہ کسی ٹھوس آڑ سے ٹکرانے کا اور کیا مطلب ہو سکتا تھا؟

”ہاہا.... ہاہا....“ دفعتاً ایک بھیانک قہقہہ گونجا۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ یہ شیطانی قہقہہ میرا شناسا سا تھا۔ اچانک میرے دائیں جانب تاریکی کے پردے سے رانگا نمودار ہوا۔ اس کے بھینسے جیسے توانا اور سیاہ رو وجود پر صرف ایک لنگی بندھی ہوئی تھی۔ اسٹائل دھوتی باندھنے کا ہی تھا۔ مجھے اس کا وجود بہت ہی مکروہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنی لال انگارہ آنکھوں سے میری طرف ہی گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے میرے لیے نفرت وعداوت کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ ان میں ایک استہزا بھی تھا اور میری بے بسی کا حظ بھی۔

”کیوں مسٹر تیس مار خان! کس بل نکلے یا نہیں؟“ رانگا نے اسی لہجے میں مجھ سے کہا۔ ”پر تم تو بڑے دھڑلے اور طوفانی جی داری کے ساتھ مجھے اٹھالے گئے تھے اور اپنے ٹھکانے میں لے جا کر بند کر دیا تھا۔ پھر کیا ہوا، وہ سب تمہارے سامنے آچکا۔“ وہ بڑے پُرغرور انداز میں لاف گزاف میں مصروف رہا۔

”چچ .... چچ .... چچ .... تمہاری کس قدر قابلِ رحم حالت ہے۔“ وہ میرا مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا۔ ”ہم سے ٹکرانے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے مگر تمہارا انجام ہم نے ذرا مختلف انداز میں کیا ہے۔ تم اسی کے مستحق تھے۔ تمہاری بہادری اور جی داری نے ہمیں جس طرح متاثر کیا تھا، اس کے جواب میں تمہیں ایسے انجام سے دوچار کرنا ہماری مجبوری بھی بن گیا تھا۔“

”رانگا....! دونوں لڑکیوں کو چھوڑ دو۔“ میں نے اس کی لاف گزاف سے مرعوب ہوئے بغیر انتہائی سنجیدگی اور طوفان بھرے لہجے میں کہا۔

”اوہ.... اب بھی وہی غرور سوار ہے تمہارے سر پر؟“ رانگا ایک دم بولا۔ ”مت بھولو کہ تم مر چکے ہو۔ اس وقت صرف تمہاری روح مجھ سے مخاطب ہے۔“

”میں تمہاری بات پر لعنت بھیجتا ہوں اور اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہوں کہ روح کو قبض کرنا اور اپنے اختیار میں رکھنا صرف اس قادرِ مطلق ذات کی طاقت میں ہے جو تم جیسے شیطانوں کو بھی بھیانک انجام سے دوچار کرنے کی سکت رکھتا ہے۔“

”اوہو، بڑا یقین ہے تمہارا کہ تم ابھی مرے نہیں ہو۔“ رانگا بولا۔

”رانگا.... ! میں پھر کہہ رہا ہوں، ان دونوں لڑکیوں کو جس طرح اٹھا کر لائے ہو اسی طرح ان کے گھر انہیں واپس چھوڑ دو۔“ میں نے پھر غضب ناک لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یہ دونوں چھوکریاں تو ہمارے کام کی ہیں۔ فکر نہ کرو۔ انہیں ہم کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“

”تو تم انہیں یہاں قیدی بنائے رکھنا چاہتے ہو؟“ میں نے اسے خونی نظروں سے گھور کر کہا۔

”اپنی بکواس بند کرو اور اپنی قبر میں جانے کی تیاری کرو۔“ اس نے ایک دم ہولناک لہجے میں کہا۔ اس کے بعد ایک جھماکا ہوا۔ پھر وہی چھڑکاؤ مجھ پر کیا گیا تھا۔ میں ایک

بار پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔
دوبارہ آنکھ کھلی تو میں بری طرح دہل گیا۔ میرے نتھنوں سے مٹی، گرد اور دوسری انتہائی ناگوار اور ناقابلِ برداشت سڑاند نما بدبو ٹکرائی تھی۔ ایسی بدبو جو صرف زمین کے اندر موجود خرافات مُردہ کی ہو سکتی تھی۔ مجھے صرف اندازہ تھا کہ میں قبر میں تھا کیونکہ اس خبیث رانگا نے مجھ سے ''اپنی قبر'' میں جانے کا کہا تھا۔
میں ہلنے جلنے لگا۔ ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دی تو یہی عقدہ کھلا کہ میں قبر تلے تھا کیونکہ میرے ہاتھ کچی دیواروں اور چھت سے لگے تھے۔ تب میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی بھی کوشش کی تو دہل گیا۔ قبر کی چھت سے ٹکرا کر میں دوبارہ لیٹ گیا۔ میرے جسم میں اتنی طاقت ہی کب رہی تھی۔ یہ بھی انتہائی کوشش سے اس قدر ہی ہل جل پایا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے ہاتھ پاؤں چلائے تو مجھ پر پوری حقیقت عیاں ہو گئی کہ میں واقعی کسی پرانی قبر میں ہی تھا کیونکہ اس کی کھردری اور کچی زمین پر اندھوں کی طرح ہاتھ مارنے سے کچھ ہڈیاں ٹکرائی تھیں جو یقیناً کسی مُردے کی ہو سکتی تھیں۔ ایسا مُردہ جو اب گل سڑ کر اپنے استخوانی وجود کے بھی اختتامی دور سے گزر رہا تھا۔ میں پورے جی جان سے لرز اٹھا۔
قبر میں زندہ لیٹنے کا تصور کیسا ہو سکتا ہے، بلاشبہ یہ مردہ ہی جانتا ہوگا لیکن میں تو زندہ تھا اور ایک زندہ، سانس لیتے ہوئے انسان کے لیے تو یہ اور بھی زیادہ روح فرسا منظر تھا۔
حیرت کی بات تو یہ تھی کہ میں اندر سانس لے رہا تھا۔ تھوڑی بہت گھٹن کا احساس اپنی جگہ مگر میں زندہ تھا، چھو سکتا تھا۔ میں نے مٹی کھودنے کی بھی کوشش کی مگر میرا جسم تو ناتواں تھا۔ ایک ذرا سی حرکت ہی کر پا رہا تھا۔ طاقت تو میرے جسم کی سب نچوڑ دی گئی تھی۔ صرف ہلکا سا ادھر اُدھر ہلنے جلنے کے سوا اور کوئی جنبش نہ تھی۔
مجھ پر اس قدر سکتے کی سی کیفیات طاری ہوئیں کہ میں کئی لحظوں کے لیے بلکہ شاید کئی منٹوں کے لیے ایسے ہی ایک مُردے کی طرح لیٹا رہا۔ یوں جیسے اپنے نامۂ اعمال کا منتظر ہوں۔ میں اس قدر یاسیت زدہ ہونے لگا تھا کہ مجھے نہیں معلوم کب تک اور کتنی دیر تک میں ایسے ہی پڑا رہا۔ شاید گھنٹوں بیت گئے تھے مجھے اسی طرح پڑے پڑے۔ ناگوار اور انتہائی سڑی ہوئی بدبو سے میرا دماغ الگ پھٹا جا رہا تھا۔
میرے اردگرد منحوس تاریکیاں تھیں۔ یہ جگہ قبر ہی کی طرح محدود اور تنگ تھی۔ کافی دیر بعد کہ اچانک ایک عجیب سی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ ابتدا میں، میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ آواز آجاتی لیکن پھر بتدریج مسلسل آنے لگی۔ اب مجھے چونکنا پڑا۔
مجھے لگا کوئی شے میرے پیروں پر چل رہی ہے۔ میں نے اسے ہلایا۔ وہ شے جیسے اچھل کر میرے پیٹ اور پھر سینے پر آ گئی... پھر گردن پر۔ میں لرز گیا۔ میں تڑپا اور وہ میرے چہرے پر آئی۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر چیخ ماری۔ وہ اچھل کر کہیں غائب ہو گئی۔
وہ شاید کوئی چوہا وغیرہ تھا۔ میرے ہلنے جلنے اور تڑپنے سے وہ بھاگ گیا۔ میں زور زور سے سانسیں لینے لگا۔ کیا میں واقعی قبر میں تھا؟ ورنہ یہ چوہا کیوں آتا؟
معاً ہی میرے ذہن میں یہ ہولناک اور دہلا دینے والا خیال ابھرا کہ کہیں کالی نہر والے واقعی مجھے اس قدر بے بسی کے عالم میں ہلاک کر ڈالنے کا ارادہ تو نہیں کر چکے تھے کہ میں قبر ہی میں رہتے ہوئے جان سے چلا جاؤں۔ ہاں، کچھ ایسا ہی نظر بھی آ رہا تھا۔ ان خبیثوں نے مجھے کسی طرح مفلوج سا کر کے واقعی کسی پرانی قبر میں پھینک دیا تھا اور پھر چند لمحے مزید بیت چکنے کے بعد ہی مجھے گھٹن اور آکسیجن کی کمی کا بھی احساس ہونے لگا۔ زندہ قبر میں مر جانے کا تصور کس قدر اذیت ناک اور جانکاہ ہوتا ہے، مجھے آج معلوم ہو رہا تھا۔ ان لوگوں نے یقیناً میرے لیے ایسی ہی بھیانک موت کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔ نہ لاش ٹھکانے لگانے کی ضرورت پڑتی اور دشمن سے بھی چھٹکارا مل جاتا۔ ان کے سینوں میں میرے لیے بھڑکتی ہوئی انتقامی آگ بھی سرد ہو جاتی۔ میرے لیے یہی سزا تجویز کر کے رانگا اور کریہہ چہرے والی منحنی چڑیل نما عورت میڈم پچھی نے اب سکون کا سانس لیا ہوگا۔
یہ ہولناک خیال آتے ہی میرے اندر بقا کی آرزو زور پکڑنے لگی۔ میں نے سوچا کہ یہ میرے لیے آزادی حاصل کرنے کا ایک سنہری موقع بھی تو ہو سکتا ہے۔ میرے اندر بچی کھچی جتنی بھی طاقت تھی، اسے بروئے کار لا کر میں قبر کی مٹی کھود سکتا تھا لیکن یہ محض میرا خیال لغو ہی ثابت ہوا۔
اول تو میری حالت کسی قریب زندہ مریض کی سی کر دی گئی تھی، دوسرے میں حرکت اسی قدر ہی کر پا رہا تھا کہ مقدور بھر ہاتھ پاؤں ہلا جلا سکوں۔ قبر کی چھت کی مٹی اور وہ بھی اندر سے کھودنے اور کھرچنے کی بھلا مجھ میں سکت کہاں تھی۔
رفتہ رفتہ اب گھٹن اور آکسیجن کی کمی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اس قدر کہ میری سانسیں بھی آکسیجن لینے کے لیے زور زور سے چلنے لگی تھیں۔ میں نے دل مسوس کر سوچا کہ کیا

میری موت اسی طرح لکھی گئی ہے؟ میں جو ایک جنگجو فطرت کا انسان تھا، کیا ان بے ایمان اور جادو ٹونے والے سفلی شیطانوں کے ہاتھوں میرے جیسے انسان کا انجام ہونا تھا۔ یہ جو کالی لہر والے خود کو ارضی خدا سمجھے ہوئے تھے، کیا ان کے مقابلے میں، میں بے بس ہو چکا تھا؟

تب ہی میں نے اپنے اللہ کو پکارا۔ وہی پاک ذات اور قادرِ مطلق ہستی مجھے نجات دلا سکتی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر اسی کیفیت میں رہا تھا کہ دوبارہ مجھے ایسی ہی آواز سنائی دی۔ اس بار یہ آواز میرے سرہانے والی جگہ کی طرف سے آرہی تھی۔

"کھر..... کھر..... کھر..... کھر....." یہ آواز ایسی ہی تھی جیسے کوئی باہر سے میری قبر کی مٹی کھود یا سرکا رہا ہو۔ نظر تو مجھے کچھ نہیں آرہا تھا۔ بس آواز کی سمت کا اندازہ کرتے ہوئے میں آنکھیں پھاڑے اسی سمت دیکھنے لگا۔ تب ہی ذرا دیر بعد میرے چہرے پر بھی مٹی گرنے لگی۔ کھر، کھر کی یہ منحوس آواز تیز ہونے لگی۔ یوں جیسے کوئی مشین چل رہی ہو۔ مٹی گرنے کے سبب میں نے لیٹے لیٹے ہی اپنا چہرہ ایک طرف کرلیا تاکہ مٹی آنکھوں منہ اور ناک میں نہ گھس پائے۔

مٹی بدستور گرتی رہی یہاں تک کہ مجھے قبر کے سرہانے اوپر کی جانب ایک سوراخ سا بنتا نظر آنے لگا۔ میں اپنی گردن ایک طرف کیے اسی طرف تکتا رہا۔ میرا دل سینے میں جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ خوشی اور مسرت کا احساس جاگا۔ سوراخ کی سمت سے تازہ ہوا اندر آنے لگی تھی۔ تاہم ڈر بھی تھا کہ آخر یہ نیا ماجرا کیا ہے؟ کیا میری نجات کا ذریعہ تھا یا پھر کوئی نئی مصیبت؟

اوپر سرہانے کی جانب سے قبر کی چھت کا سوراخ کچھ واضح ہوا تو مجھے تاریک آسمان کی مقدور بھر سہی، جھلک نظر آگئی۔ وہاں تارے ٹمٹما رہے تھے۔

یکایک مسرت اور امید کا جھونکا جیسے ایک دم یاسیت کے صحرا میں در آیا۔ شاید کوئی قبر کھود کر مجھے اس عذاب سے باہر نکالنے کی تگ و دو میں تھا۔ کوئی نجات دہندہ، کوئی غیبی مدد۔ قبر کے سوراخ سے ٹھنڈی سی ہوا بھی اندر آنے لگی تھی۔

"یہ اتنی دیر کیوں کر رہا ہے؟ مجھے جلدی سے اس منحوس قبر کے اندر سے نکالتا کیوں نہیں؟" میں خود کلامیہ بڑبڑایا۔ "اور..... اور اس نے یہ اتنا چھوٹا سوراخ کیوں کیا ہے؟ میں تو اس سے باہر نہیں نکل سکتا..... شاید ابھی کھود رہا ہو۔"

میں جیسے باؤلا ہونے لگا اور خود سے باتیں کرتا رہا۔ اچانک اسی چھوٹے سے کھلے سوراخ سے ایک قدرے لمبوترے اور خیالی رنگت کے چہرے نے اندر جھانکا۔ اس کی آنکھیں نہایت بدوضع اور چنی چنی سی تھیں۔ اس نے اپنے لمبوترے تھوتھنے سے لمبی زبان بھی باہر کو لٹکائی تھی۔ اس بدہیئت اور کریہہ حیوان کو دیکھ کر میری آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ وہ قبر کھود کر مُردے کھانے والا بجو تھا۔

میں حلق کے بل زور سے چیخا۔ یکدم وہ ڈر کر پیچھے ہو گیا۔ اب سوراخ کے خلا سے مجھے باہر کا مقدور بھر تاریک آسمان نظر آنے لگا۔ میرا دل سینے کے پنجرے میں اس قدر زور زور سے دھڑ دھڑانے لگا جیسے ابھی توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ دوبارہ اسی سوراخ سے بجو کا بدہیئت تھوتھنا نظر آیا۔ اس بار اس نے اتنی ہمت دکھائی تھی کہ اپنا پورا منحوس تھوتھنا ہی اندر تک نیچے میرے چہرے کے بالکل قریب اتار لیا تھا اور یہی نہیں، اس نے اپنی لپلپاتی اور لجلجی سی زبان بھی میرے چہرے پر گھما دی۔

انتہائی کریہہ اور ناقابلِ برداشت حیوانی بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور میرا جی الٹنے لگا۔

وہ ایک بڑے سائز کا بجو ہی تھا۔ ذرا تصور کریں، اس کا بدہیئت تھوتھنا میرے چہرے کے بالکل قریب تھا۔ اس قدر کہ مجھے اس کے کریہہ تھوتھنے سے حیوانی بھپکارے صاف چہرے پر محسوس ہو رہے تھے۔ تب ہی اس نے تھوتھنا کھول کر عجیب آواز نکالی۔ ساتھ ہی میرے حلق سے بھی ڈراؤنی چیخ نکل گئی۔ وہ اس بار بھاگا تو نہیں مگر تھوڑا پیچھے ضرور ہو گیا۔ وہ یقیناً حیرت زدہ ہوگا کہ آج تک تو کسی مُردے نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ یہ کیا ماجرا تھا جو مجھے اپنا گوشت نوچنے سے روکے ہوئے تھا۔

مجھے سخت بے بسی کا احساس ہوا کہ میں اسے مار بھگانے سے بھی قاصر تھا مگر بقا کا جذبہ مجھے بدستور مہمیز کیے ہوئے تھا۔ اس موذی سے مقابلہ کرنا ضروری تھا ورنہ یہ مجھے کھا سکتا تھا۔ بڑی کوشش اور رہی سہی مقدور بھر جسمانی قوت کو مجتمع کرتے ہوئے میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور انہیں قریب سینے پر رکھ دیا۔ ٹھنڈ کا احساس بھی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔

بجو کا تھوتھنا تھوڑا صبر کرنے کے بعد پھر اندر کو لپکا تو میں نے اس کی گردن دبوچنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے مگر میری حرکت اتنی سست الاثر تھی کہ وہ دوبارہ پیچھے ہٹ گیا اور میرے ہاتھوں کی گرفت میں نہ آسکا مگر سوراخ سے غائب نہیں ہوا۔

میرے اندر کا جنگ باز شاید دم توڑ چکا تھا ورنہ تو

کہاں میں دشمن کو موقع دیے بغیر اس قدر طاقت اور بجلی کی سی پھرتی سے دبوچ لیا کرتا تھا کہ وہ سوچتا ہی رہ جاتا مگر اب جیسے میں واقعی میں ایک لاش ہی تھا۔ میں نے ''کالی لہر'' کے اس شیطانی ٹولے کو شاید ''ہلکا'' لے لیا تھا۔ انہیں تر نوالہ سمجھ کر اسی طرح ہی ان پر اچانک ہلا بولا تھا جس طرح میرا خاصہ ہوا کرتا تھا مگر یہ تر نوالہ ثابت نہیں ہوئے تھے۔ برعکس اس کے، انہوں نے مجھے بڑے آرام سے نہ صرف قابو میں کر لیا تھا اور میری یہ قابلِ رحم حالت بنا ڈالی تھی۔ فوزیہ اور راحیلہ بھی ان کی گرفت میں آ چکی تھیں۔ یہ میری شکستگی کا ایک ایسا نمونہ تھا جس سے میں آج تک نہیں گزرا تھا۔ کتنے ہی خطرناک اور طاقتور دشمنوں کو میں اب تک چنے چبوا چکا تھا اور آج اس شیطانی ٹولے کے چنگل میں پھنس کر اس قدر بے بس اور کمزور ہو چکا تھا کہ ایک مُردار خور بجو کا مقابلہ کرنے سے بھی قاصر تھا۔

اس موذی کے بڑے سے تھوتھنے کے بار بار سوراخ سے اندر باہر ہونے کے سبب اب قبر کی سرہانے والی چھت کا بھی سوراخ قدرے کشادہ ہونے لگا تھا۔

تب ہی اس بدبخت نے شاید بھوک سے مغلوب ہو کر یا میری سست روی اور ناطاقتی کا اندازہ کرتے ہوئے دوبارہ اپنا تھوتھنا اندر گھسیڑا اور نہ صرف یہ بلکہ اس نے اسے کھولا بھی۔ اس کے مکروہ دہانے سے دانتوں کی جھمک مجھے صاف نظر آئی تھی۔ اس نے میرے کندھے پر کاٹ لیا اور شاید کچھ گوشت بھی ادھیڑ ڈالا۔ شدتِ تکلیف سے میرے حلق سے چیخ برآمد ہوئی۔ میری چیخوں میں بھی کوئی سکت اور بلندی نہ رہی تھی۔ یہ ایسی ہی تھیں جیسے میں ایک ذرا کراہا تھا۔ جہاں سے اس مردود حیوان نے میرا گوشت نوچا تھا، وہاں مجھے درد اور جلن کا احساس ہوا۔

منحوس بجو اب بھی سوراخ سے ہٹا نہیں تھا اور اندر ہی جھکا ہوا تھا مگر تھوڑا پیچھے ہٹ کر میری نوچی ہوئی بوٹی چبا رہا تھا۔ اس قدر بے بسی اور لاش ہی جیسی بے طاقتی کے بھیانک عمل میں گزر رہا تھا کہ تنگ آ کر سوچنے لگا اس سے تو اچھا ہے مجھے واقعی موت آ جاتی لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے سوچا، میرے جسم میں طاقت نہ رہی تھی تو کیا تھا۔ میرے حوصلوں کے بادبان تو جنگ باز تھے۔ میری ہمت تو زندہ تھی۔ کیا میں اسی قدر کم ہمت تھا کہ ایک بے ایمان شیطانی اور سفلی عمل کرنے والے ٹولے سے مار کھا جاؤں گا؟ ہرگز نہیں۔

یہ سوچ کر میری ہمت سوا ہوئی۔ میں نے اللہ کو مدد کے لیے پکارا۔ مایوسیوں اور ناامیدی کے اندھیاروں میں وہی ایک واحد پاک اور طاقت والی ذات تھی جو مجھے اس قبر نما میں گرنے سے بچا سکتی تھی۔

اللہ کو یاد کر کے میرے اندر طاقت کا جوش سا ابھرا۔ میں نے بجو کو دیکھا۔ وہ موذی اب دوبارہ میرا گوشت نوچنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

اب تک چھوتا، درد اور تکلیف کے احساس نے مجھے کم از کم یہ تو باور کرا ہی دیا تھا کہ میں ''کالی لہر'' والوں کی شعبدہ بازی کے ہی زیر اثر تھا۔ ان کا روح والا چکر محض ایک ڈراما تھا۔

اسی وقت بجو نے دوبارہ اپنا کریہہ تھوتھنا اندر گھسایا اور چاہتا تھا کہ میری بوٹی نوچ لے کہ میں نے بھی اس بار دوسرا داؤ آزمایا۔ کیونکہ اپنی جسمانی ناطاقتی کا مجھے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا لہٰذا جیسے ہی اس نے اپنا تھوتھنا میرے چہرے کے قریب کیا، میں نے منہ کھول کر اپنے دانت اس کے لمبوترے تھوتھنے پر گاڑنے چاہے مگر مجھے یہ دیکھ کر اپنی حالت اور ہیئت کذائی پر جیسے رونا ہی آ گیا۔ میں تو دانت کاٹنے سے بھی قاصر تھا۔ حتیٰ کہ ایک ذرا سی پھرتی تک دکھانے سے معذور رہا۔ تب تک وہ موذی میرے دائیں گال پر کاٹ چکا تھا۔

میرے حلق سے کانپتی ہوئی کراہ آمیز چیخ ابھری۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ اس منحوس بجو کی ''چپ چپ...... کچر کچر'' کرتی آواز میری سماعتوں میں گونجتی رہی۔ وہ بڑے مزے سے گویا ''مرحلہ وار'' میری ضیافت اڑانے میں معروف تھا۔

ادھر میرا خوف و دہشت کے مارے بُرا حال تھا۔ ڈر اور خوف تو میری فطرت کا کبھی حصہ ہی نہ رہے تھے لیکن یہ حالات بڑے ہولناک تھے۔ بڑے سے بڑا مضبوط اعصاب والا شخص بھی ان بھیانک حالات میں اپنا حوصلہ ہار سکتا تھا۔ تاہم میرے اندر ایک انجانی قوت بھی مسلسل متحرک تھی جو مجھے بقا کی جانب بلا رہی تھی۔

میں نے پھر ہمت و حوصلے سے کام لیا۔ آکسیجن اور ہوا کا مسئلہ تو کسی قدر حل ہو چکا تھا۔ اب اس مردار خور بجو سے جان چھڑانا باقی تھا۔

میں نے ادھر اُدھر ہاتھ چلائے۔ خواہ ان میں سست روی سہی، تب ہی ایک ہڈی میرے ہاتھ آن لگی لیکن جب میں نے اس پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرنا چاہی تو بے اختیار اپنی بے بسی اور کم مائیگی پر مجھے آپ ہی رونا آ گیا۔ میں اس سے بھی قاصر تھا۔

اب کیا ہو سکتا تھا؟ شاید یہ انتہائی مایوسی کا عالم ہی تھا

کہ میں خود ہی اپنی بے بسی پر ہنس پڑا۔
مجھ پر جیسے پاگل پن کا دورہ پڑنے لگا۔ ساتھ ہی ہنستا بھی چلا گیا۔ شاید میرا نروس بریک ڈاؤن ہونے والا تھا کہ اچانک میں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔

☆☆☆

تیسری یا پھر شاید چوتھی بار جیسے ہی مجھے دوبارہ نوچنے کے لیے اس مردار خور نے جس قدر تیزی سے اپنا بھیانک تھوتھنا اندر ڈالا تھا اسی تیزی سے وہ مجھے چھوئے بغیر ہی پلٹ گیا تھا۔ یوں جیسے باہر سے اسے کسی نے کھینچ لیا ہو۔
ابھی میں اس معجزے پر حیران ہی ہو رہا تھا کہ مجھے قبر کے باہر ایک سے زائد جانوروں کی خونخوار آوازیں آنے لگیں اور ساتھ ہی اس مردار خور بجو کے چلّانے کی بھی۔
میرا دل یک بیک اس حقیقت کا ادراک کر کے خوشی کے مارے دھڑک اٹھا کہ اس پر کسی آوارہ جانور کے ٹولے نے اچانک حملہ کر دیا ہوگا۔ وہ کوئی آوارہ کتے بھی ہو سکتے تھے یا پھر گیدڑ۔ ذرا ہی دیر بعد بجو کے چلّانے کی اذیت ناک آواز ڈوب گئی۔ اس کی جگہ اب خوراک چبانے کی آواز... ابھر رہی تھی۔
بے بسی، نا امیدی اور حسرت و یاسیت کے ان عبرت ناک لمحات میں میرے لیے یہ مسرت کا مقام تھا۔ ابھی میں اس مسرت کو سنبھال بھی نہ پایا تھا کہ ایک اور دہلا دینے والا عقدہ کھلا کہ آوارہ اور خونخوار جانوروں کے ٹولے نے صرف بجو پر ہی بس نہیں کیا تھا، اسے کھا چکنے کے بعد اب وہ اس قبر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جس کے اندر میں لاش کی طرح بے طاقت لیٹا ہوا تھا۔
بجو کے کھودے ہوئے سوراخ سے مجھے ان خونخوار جانوروں کے جھانکتے ہوئے خون آلود تھوتھنے بڑے بھیانک معلوم ہونے لگے۔ وہ باری باری ایک دوسرے کو دھکیل کر اندر پڑے ایک اور شکار کو تاکنے کی جستجو میں تھے اور پھر میری صورت میں ایک تازہ شکار کو دیکھ کر او پر موجود ان سب آوارہ جانوروں نے قبر کھودنے کی اپنی سی کوششیں تیز کر دیں۔
میں ہنستا چلا گیا۔ اب میرا انجام یقینی تھا۔ پہلے سے بھی زیادہ بھیانک انجام۔

☆☆☆

''کالی لہر'' والے شیطانی ٹولے کی گرفت سے لے کر زندہ قبر میں دفن ہونے تک کی ہولناکیاں مرحلہ وار جاری تھیں۔ پہلے معمولی سے چوہے نے مجھے تنگ کیا پھر مُردے کھانے والے بجو کی آفت آئی۔ اس سے چھٹکارا پایا تو یہ سوچ کر امید بندھی تھی کہ کالی لہر والے مجھے زندہ قبر میں دفن کر کے سمجھ چکے ہوں گے کہ یہیں ختم ہو جاؤں گا۔ نہ انہیں میری لاش ٹھکانے لگانے کا مسئلہ ہوگا، نہ میرا کوئی سراغ ملے گا۔
اگرچہ مجھ سے یہی کہا گیا تھا کہ وہ میری روح کو غلام بنانا چاہتے تھے مگر شاید مجھ پر یقینی موت کی دہشت بٹھانے کے لیے ایسا کہا گیا ہو ورنہ وہ خوب جانتے تھے کہ میں آزاد ہونے کے بعد ان کے لیے کیسی کیسی مصیبتیں کھڑی کر سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہیں مجھ سے نہیں بلکہ فوزیہ اور راحیلہ کو ہی قیدی بنانے سے سروکار ہو۔
بجو سے چھٹکارا پا کر میں نے اطمینان کی سانس لی تھی کہ ایک تو ہوا اور آکسیجن کی آمد و رفت کا سلسلہ بحال ہوا تھا۔ اب میں اپنی سی کوشش کے بعد قبر سے باہر آنے کی جستجو کرتا مگر اب جو تیسری مصیبت ان خونخوار اور بھوکے آوارہ جانوروں کی آن پڑی تھی، اس نے مجھے زندگی سے ہی مایوس کر دیا تھا۔
مجھ پر دیوانگی اور پاگل پن کا دورہ پڑا تھا حالانکہ میں مضبوط اعصاب کا مالک تھا لیکن یہ صورتِ حال میرے نیے بڑی اعصاب شکن تھی۔ بھلا ایک قبر میں لیٹا ہوا مفلوج سا آدمی کر بھی کیا سکتا تھا؟
قبر کی چھت پر ان خونخوار اور بھوکے آوارہ جانوروں کا اب آپس میں لڑنے کا شور ختم ہو چکا تھا اور وہ مٹی کھودنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ انہوں نے شاید اپنی اجتماعی ''کوشش'' کے فائدے کو سمجھ لیا تھا کہ قبر سے مل کر ہی تازہ شکار مل سکتا ہے جو ان سب کے لیے کافی ہوگا۔ وہ اسی لیے اپنی لڑائی بھول کر اب قبر کشائی میں مصروف تھے۔
میں اندر لیٹا خدا کو یاد کرتا رہا۔ مردہ آنکھوں سے قبر کی سرہانے والی چھت پر بنے سوراخ کو بڑا ہوتا دیکھتا رہا۔ کھرچی اور کھدی ہوئی مٹی میرے چہرے پر گر رہی تھی اور میں نے ذرا سرک کر منہ بچا رکھا تھا۔ مقدور بھر کوشش سے میں نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے تھے کہ مایوسی گناہ ہے۔ مرنے سے پہلے بقا کی کوشش تو کرنا ہی تھی۔
سوراخ کشادہ ہو گیا بلکہ یوں لگا جیسے قبر ہی چھننے لگی ہو۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میرے نامۂ اعمال میں یہی لکھا تھا۔ خون آلود تھوتھنوں میں اب مٹی بھی لگی نظر آنے لگی۔ دو مہیب تھوتھنے اندر داخل ہوئے۔ ان سے غراہٹیں ابھرنے لگیں اور وہ اپنی چنی چنی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگے۔ ان کے تھوتھنوں سے حیوانی بھپکارے میرے چہرے پر پڑے

اور میرا جی اٹھنے کو آیا۔

یہ کوئی آوارہ گیدڑ تھے۔ بھوک اور بے بس پڑے شکار کی مسرت نے انہیں خونخوار بنا ڈالا تھا۔ میں اپنی سی کوشش سے تھوڑا پیچھے سرک گیا مگر کب تک..... قبر کی سرہانے والی چھت کمزور ہو کر گرنے لگی تھی۔ تقدیر حرکت میں آ چکی تھی۔ اس کا ادراک تو مجھے بعد میں ہوا کہ جسے ہم مصیبت سمجھے ہوئے ہوتے ہیں، وہ درحقیقت راہِ نجات کا ذریعہ بنتی ہے۔

کیونکہ اس وقت چھت گری تو دفعتاً ہی عجیب سی آواز باہر ابھری۔ میں ابھی اندازہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ یہ کیسی آواز تھی جیسے معاً ہی ''زنا..... زش'' سونٹے مارنے اور ساتھ ہی گیدڑوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔

''بھاگو..... بدبختو! مردے کو بھی نہیں چھوڑتے۔ دفع ہو جاؤ۔'' باہر کوسنے دیتی آواز نے جیسے یک دم میرے اندر چھائی تمام مایوسیوں کی تاریکیاں جھٹک دیں۔

''مردودو! میرے خصم کی قبر میں اب رکھا ہی کیا ہوگا۔ ری..... چنبیلی! اس مردود ے..... موٹے بھگیاڑ کو رکھ کے سونٹا دے۔ یہ بار بار قبر کی طرف آ رہا ہے۔''

ایک بوڑھی ضعیف آواز کوسنے دیتی میری تھکی ہوئی سماعتوں سے ٹکرائی۔ میرا دل ان کوسنوں پر مسرت سے بری طرح دھڑک کے جا رہا تھا۔ یہ کوئی ماں بیٹی تھیں شاید جو حسنِ اتفاق سے رات کے اس پہر ادھر نہ جانے کیا کرنے نکل آئی تھیں اور میری نجات کا ذریعہ بن رہی تھیں لیکن نہیں..... یہی تو تقدیر ہے۔ کس ذریعے سے مدد کرتی ہے، کچھ پتا نہیں چلتا۔

''اماں! یہ موٹا لوفر کچھ ڈھیٹ قسم کا گیدڑ لگتا ہے۔ دیکھ کیسے گھور رہا ہے۔ یہ مجھ پر حملہ نہ کر دے۔'' لڑکی کی آواز ابھری۔ اندازہ ہوا کہ یہ ایک نوعمر لڑکی تھی اور اس متوقع بوڑھی خاتون کی بیٹی ہی ہوگی۔

''آ..... مردودو! تجھے دیکھتی ہوں۔'' بڑھیا دلیر تھی۔ وہ شاید کوئی مضبوط سونٹا لے کر اس ''لوفر گیدڑ'' کی طرف دوڑی تھی پھر سونٹا پھینکنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی گیدڑ کے چلا کر بھاگنے کی۔

ان کڑے اور کٹھن حالات میں بھی مجھے ہنسی آ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں میری نجات دہندہ بنی ہوئی تھیں۔ نہ جانے انہیں یہ معلوم بھی تھا یا نہیں کہ اس قبر میں ایک زندہ آدمی بے یار و مددگار بھی پڑا ہے۔

جیسا کہ بڑھیا کی ابتدائی بڑبڑاہٹ سے مجھے پتا چلا تھا کہ یہ قبر اس کے ''خصم'' کی تھی۔ ایک بات البتہ مجھے ضرور عجیب سی لگی تھی۔ ان ماں بیٹی کے لب و لہجے کچھ عجیب سے تھے۔ وہ جملے اور الفاظ کھینچ کھینچ کر ادا کر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے میں کسی غیر مانوس سرزمین میں پہنچا دیا گیا ہوں مگر کہاں؟ اس کا بھلا قبر میں لیٹے ''زندہ مردے'' کو کیا پتا ہوتا۔ تاہم یہی کیا کم تھا کہ میں ان کی زبان سمجھ رہا تھا۔ خواہ ٹوٹی پھوٹی سہی۔

گیدڑ شاید بھاگ چکے تھے۔ اب میں یہی دعائیں مانگنے لگا کہ یہ دونوں ماں بیٹی اس قبر کی طرف بھی متوجہ ہوں تاکہ مجھے باہر نکال سکیں۔ خود میں نے آواز لگائی۔ بہت کمزور اور نقاہت بھری ہلکی آواز میرے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ وہ نہیں سن سکی تھیں۔

''اماں! بابو کی قبر ٹھیک کرنا پڑے گی۔ ان گیدڑوں نے ساری کھود ڈالی ہے۔'' لڑکی نے کہا اور میرے اندر مسرت کا جگنو سا چمکا۔ ''بابو'' شاید اس نے اپنے برسوں پہلے مرے باپ کو ہی کہا تھا۔

''چل آ، پھر..... میری مدد کر۔ اوپر مٹی ڈال دیتے ہیں۔ ہائے رے رحیمو.....! تیرا یہ انجام بھی دیکھنا تھا۔'' بڑھیا کی تاسف آمیز سی حسرت بھری آواز ابھری۔ میں سرک کر پھٹی ہوئی قبر کے اور قریب ہو گیا۔

تھوڑے سے نظر آنے والے تاروں بھرے آسمان کے محدود منظر میں جھریوں بھرے چہرے کو جھکتے دیکھا اور میری کمزور سی چیخ نکل گئی۔ بڑھیا کا آدھا چہرہ خارش زدہ نظر آیا تھا۔

''یا اللہ! یہ کیا کوئی نئی مصیبت تھی؟'' بے اختیار میں بڑبڑایا۔ تب ہی بڑھیا نے ایک اچھے بھلے زندہ انسان کو دیکھا تو ایک دلدوز سی چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔

''کیا ہوا اماں؟'' نوعمر لڑکی نے چلا کر پوچھا۔

''چچ..... چنبیلی..... وہ..... وہ..... اندر..... زندہ لاش پڑی ہے۔ بالکل تازہ.....'' بڑھیا کی خوف سے لرزتی آواز آئی۔

''اماں! کہیں بابو تو زندہ نہیں ہو گیا؟'' لڑکی نے ماں کی بات کو شاید مذاق میں لیا تھا۔

''مجھے نکالو، میں..... میں لاش نہیں ہوں۔'' میرے اندر جتنی طاقت تھی، اسے بروئے کار لاتے ہوئے میں نے چلا کر کہنے کی کوشش کی مگر انہیں ابھی تک میری بازگشت سنائی نہیں دی تھی۔

''میں دیکھتی ہوں۔'' لڑکی بولی پھر ایک سانولا اور تیکھے نقوش والا پرکشش چہرہ پھٹی ہوئی قبر پر ابھرا۔ میں نے

سر ہلایا اور مدد کے لیے پکارا۔

چنبیلی نام کی وہ لڑکی بھی ڈر کر پیچھے ہوگئی۔ ذرا دیر بعد ڈرتے ڈرتے دونوں ماں بیٹیوں کے چہروں نے اندر جھانکا۔ میں نے زور زور سے سر ہلانے کی کوشش کی مگر تھوڑا ہی حرکت کر پایا۔ ان دونوں کے لیے یہی کافی تھا۔

''اماں! لگتا ہے کسی نے اسے زندہ بابو کی قبر میں دفن کر دیا ہے۔'' چنبیلی ماں سے بولی۔

''ہاں، ہاں۔ ایسا ہی ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے کہنا چاہا۔ نہ جانے انہوں نے سنا بھی کہ نہیں۔

''یہ کچھ بول بھی رہا ہے۔'' بڑھیا بولی پھر ان دونوں نے ڈرتے ڈرتے ہی سہی، مجھے قبر سے باہر نکال لیا۔ باہر آتے ہی مجھے پھر ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا۔ ان دونوں نے بھی گرم چادریں ڈال رکھی تھیں۔ نہ جانے میں کہاں اور کون سی سرزمین پر تھا؟

''تو کون ہے؟'' بڑھیا نے پوچھا۔ میں لمبے لمبے سانس لے کر اپنا نظامِ تنفس درست کرنے لگا پھر انہیں پکارا۔ شکر تھا کہ دونوں ماں بیٹیاں میرے بہت قریب جھک کر میری بات سننے کی کوشش کرنے لگیں۔ تب میں نے مختصر ترین جملوں میں ان سے کہا کہ میرے کسی دشمن نے مجھے ناکارہ کر کے اس طرح زندہ دفن کر دیا ہے۔ خدا کے لیے میری مدد کرو......وغیرہ۔

بالآخر دونوں نے میری مدد کی ٹھان لی اور مجھے سہارا دیا۔ بڑھیا کے آدھے چہرے پر شاید کوڑھ گرا تھا لیکن اس وقت وہ مجھے بہت ہی اچھا، پیارا اور مہربان لگا۔ میں ان دونوں مہربان ماں بیٹیوں کے سہارے بہ مشکل کھڑا تو ہو گیا مگر میرے قدم میرا ساتھ نہ دیتے ہوئے لڑکھڑانے لگے۔

''اسے کہیں سیندور میں تھوتھا تو ملا کر نہیں چٹا دیا ہے؟'' بڑھیا بڑبڑائی۔ وہ مجھے دیہات کی ایک گھاگ اور تجربہ کار عورت محسوس ہوئی۔

''ہاں، ماں! اس بے چارے پر تو پورا فالج گرا ہے۔ ہائے، کتنا خوب صورت اور تگڑا نوجوان ہے اور ظالموں نے یہ حالت کر دی اس کی۔'' لڑکی چنبیلی بولی۔

انہیں مجھ سے ہمدردی ہونے لگی تھی اور وہ میری مدد کی ٹھان چکی تھیں۔ بے اختیار میرے دل سے اللہ کا شکر ادا کرنے کی صدا ابھری۔ بہرکیف، دونوں نے مجھے سہارا دے رکھا تھا اور آہستہ آہستہ مجھے چلانے کی کوشش بھی کرتی رہیں۔ میں ... گرد و پیش کا جائزہ بھی لینے لگا۔ میں نے دیکھا ... چٹکی ... چاندنی میں ٹھٹھرتی ہوئی رات اپنے پڑے سے جوبن پر تھی۔

یہ کوئی قبرستان ہی تھا۔ ٹنڈ منڈ درختوں اور ان کے بے سایا تلے کچی پکی قبریں تھیں۔ کہیں کہیں بیری اور پھپل کے درخت بھی تھے۔ وہ مجھے لیے قبرستان کے شاید آخری سرے پر لے آئیں۔ یہاں پھلائی اور کاہو کے گھنے جھنڈ کے وسط میں پرانے برگد تلے ایک مڑھی (کٹیا) بنی ہوئی تھی۔ کچھ کشادہ تھی یا پھر بعد میں اسے بوقتِ ضرورت بڑھا لیا گیا تھا۔

مجھے اس کے اندر لے جایا گیا اور ایک کونے میں بچھے فرشی بستر پر ڈال دیا گیا۔ مڑھی کی فضا مجھے گرم اور پُرسکون لگی۔ مجھے بڑا آرام ملا لیکن میں ابھی تک گزرے ہوئے بھیانک لمحات کے زیرِ اثر تھا۔ ذرا سنبھالا ملا تو میں نے مڑھی کا جائزہ لیا جو خاصی کشادہ تھی۔ اس میں ایک اور گوشہ بھی تھا۔ بڑھیا مجھے لٹا کر وہاں چلی گئی جبکہ چنبیلی کونے کی طرف بڑھی اور وہاں سے کچھ کھانے پینے کا سامان اٹھا لائی۔

اس نے مٹی کا پیالہ میرے منہ سے لگایا۔ اس میں پانی تھا۔ پیاس سے پہلے ہی میرا حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ غٹ غٹ پیتا رہا۔ جب تک پانی پیتا رہا، چنبیلی مجھے دلچسپ نگاہوں سے تکتی رہی۔ اس کی ''دلچسپی'' میں کہیں مجھے ''پسندیدگی'' کی بھی رمق محسوس ہوئی تھی۔ اس کے نرم لبوں پہ ہلکی مسکان بھی تھی۔

''شش... شکریہ'' میں نے بہ مشکل کہا۔ اس کے لبوں کی میٹھی میٹھی سی مسکان اور گہری ہوئی۔ وہ واقعی ایک خوب صورت دوشیزہ تھی۔ اس کے بال لمبے اور گھنے تھے جو اس نے کچھ گوندھ کر پیچھے پشت پر ڈال رکھے تھے، شاید کسی پراندے میں۔ چہرہ گول سا تھا، جلد بہت ملائم اور چمک دار تھی، آنکھیں کشادہ اور ناک قدرے اٹھی ہوئی، اس کی پلکیں مجھے غیر معمولی طور پر لانبی محسوس ہوئیں۔ بلاشبہ وہ ''سلونے'' حسن کا ایک شاہکار تھی۔ قد بھی مناسب تھا۔ جسم متناسب اور در شباب پر دستک دیتا ہوا۔

اتنے میں اس کی ماں آگئی۔ اس کے بغل میں بوسیدہ سے کپڑے کی کوئی چھوٹی سی بقچی دبی ہوئی تھی۔ وہ اس نے میرے قریب بستر کے فرش پر رکھ دی اور بڑے غور سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں بھی مدد طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے میری نبض دیکھی۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے وہ کوئی حکیمہ ہو پھر اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا اور اس کے بعد کان۔ میں الجھی ہوئی نظروں سے اسے یہ سب کرتا دیکھتا رہا۔

اسی طرح ایک ہاتھ کی ہتھیلی بھی اس نے میرے جسم پر جگہ جگہ رکھ کر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے ٹھونک بجا کر دیکھتی رہی۔ میں نے اس کے جھریوں بھرے ایک ہاتھ میں بھی کوڑھ کی جھلک دیکھی۔

''ہمم ۔۔۔ یہ ضرور انہی مردود کالے بھڑوں کے ٹولے کے ہتھے چڑھا ہوگا۔'' وہ بڑبڑائی۔ نہ جانے اس نے کن مردودوں کو ''کالے بھڑ'' کہا تھا۔

میں نے حلق کے زور پر بات کرنے کی کوشش کی۔ ہونٹ تو متحرک ہوئے تھے مگر آواز بہت کمزور اور پھنسی پھنسی سی تھی۔

گزرتے وقت کے ساتھ مجھے ایسا ضرور لگا تھا کہ میری طاقت چیونٹی برابر سہی، کچھ بحال ہوئی ہے۔ اس پر مجھے خوشی بھی تھی اور یہ بھی ادراک ہوا کہ کیا خبر میری یہ حالت کسی دوا یا محلول کے زیر اثر عارضی ہوتی کیونکہ مجھے زندہ قبر میں دفنا دیا گیا تھا اور ''کالی بھڑ'' والوں کی تسلی کے لیے یہی کافی تھا کہ میں تنگ و تاریک قبر میں کتنا جی پاؤں گا۔

اب یہ انہیں کیا معلوم تھا کہ میں بچ گیا تھا۔ مارنے والے سے بچانے والا کتنا طاقتور تھا پھر بھی اس ہمدرد بڑھیا نے اپنی بچی سے اندر سے کچھ پڑیاں، دوائیاں نکالیں اور چینی کی دو پیالے پانی کے بھر کر لانے کا کہا۔ اس میں وہ سفوف اور کچھ ملایا اور مجھے تھوڑے تھوڑے وقفے سے پلاتی رہی۔

چند گھنٹے بیتے بلکہ صبح ہوگئی اور مجھے لگا جیسے میں واقعی دوبارہ زندہ ہونے لگا ہوں۔ مجھے اپنے تنِ ناتواں میں کچھ طاقت جاگتی محسوس ہونے لگی۔ وہ بھی اس قدر کہ میں کچھ آواز نکال سکوں اور اپنے جسم کو مقدور بھر سہی جنبش دے سکوں۔

کچھ دن چڑھ آیا تھا۔ مڑھی کے اندر باہر نکلی خوشگوار دھوپ کی روشنی اندر پڑ رہی تھی۔ سردی کا احساس کم تھا۔ دو کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ مڑھی میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ میں ہنوز اسی فرشی بستر پر دراز تھا جو گرم تھا۔ میں نے دھیرے سے اٹھ بیٹھنے کی کوشش کی تو نقاہت اور مفلوج ہونے کا احساس ہوا مگر میں یہ ماننے کو تیار ہی کب تھا کہ میں اس قدر ناطاقت اور ناتواں بھی ہوسکتا ہوں۔ لہٰذا شاید یہ میری خود اعتمادی اور قوتِ ارادی ہی تھی کہ میں تھوڑا وقت لگا کر ہی سہی، اٹھ بیٹھا تھا۔ ابھی تو پیروں پر نہیں کھڑا ہوا تھا، بیٹھنے سے ہی مجھے چکر آنے لگے۔

''نن...... نہیں...... میں اس قدر ناتواں اور ڈھے جانے والا انسان نہیں ہوں۔'' میں زیرِلب بڑبڑایا۔ خود کو تسلی دی۔ دل و دماغ سے چھٹ جانے والے مایوسیوں کے سیاہ بادل دوبارہ بدلیاں جمانے لگے تو میں نے انہیں جھٹکنے کی کوشش شروع کردی۔

تب ہی میں نے چند لمحے ٹھہر کر اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ کامیاب بھی ہوا مگر کمزوری اب بھی تھی۔ تھوڑا بہت چلا۔ مڑھی کی سرکنڈوں اور پھونس کی دیوار کا سہارا لیے دروازے پر لکڑی کی چوکھٹ کا سہارا لیے کھڑا ہوگیا۔ ہر طرف چمکیلی سی خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میرے سامنے اردگرد کا منظر واضح تھا۔ غور سے دیکھا تو کچھ الجھن کا شکار ہوا۔

وجہ یہی تھی کہ کچھ غیر مانوس اور اجنبی سے مناظر محسوس ہوئے۔ علاقہ قبرستان کے آخری سرے کا ہی تھا۔ دوسرے سرے پر مجھے پہاڑیاں نظر آئیں۔ ان پر سبزہ بکھرا ہوا تھا اور کہیں کہیں برف بھی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں شمالی علاقے کے کسی شہر میں تھا۔ مری یا کالام وغیرہ میں...... پھر خود ہی ہنس دیا۔ بھلا یہاں کہاں نکل آیا میں۔ مجھے کچھ سبزہ اور شادابی بھی نظر آئی۔ یہ علاقہ میرے اندازے کے مطابق قدرے بلندی پر ہی واقع ہوسکتا تھا۔ تاحال مجھے کوئی ذی نفس نظر نہیں آیا۔ وہ دونوں ماں بیٹیاں بھی نہ جانے کدھر غائب تھیں۔

یکایک مجھے فوزیہ اور راحیلہ کی فکر ستانے لگی جس نے مجھے بے چین اور متوحش سا کردیا۔ وجہ یہی تھی کہ وہ دونوں ہنوز اس شیطانی جوڑے میڈم پنچھی اور رانا کے قبضے میں تھیں۔ مجھے تو ان خبیثوں نے اپنی طرف سے مار ہی ڈالا تھا۔ اب نہ جانے وہ ان دونوں کے ساتھ کیا حشر کرنے والے تھے۔

ایکا ایکی دل و دماغ میں ایک جوش، ایک طوفان سا جاگا کہ اسی وقت ان کے ٹھکانے پر جیسے اڑ کر جا پہنچوں اور سب کا تیا پانچا کر ڈالوں لیکن پھر جب اپنی سابقہ کیفیات اور انجام کا تصور ذہن میں آتا تو لرز جاتا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ میں اپنے دشمن سے کچھ خوفزدہ بھی ہوا تھا۔ کیا میں ان خبیث شیطانوں کا کچھ بگاڑ بھی پاؤں گا؟ جبکہ میں خود بڑی مشکلوں سے ان کے خوفناک چنگل سے بچ گیا تھا۔ سچی بات یہی تھی کہ مجھے ایک عام آدمی کی طرح اس خطرناک گروہ سے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے یہ ڈر بار بار میرے اندر مارے خوف کے سر اٹھاتا کہ کہیں میں دوبارہ اس شیطانی ٹولے کی خوفناک گرفت میں نہ جا پھنسوں۔ مجھے افسوس بھی ہوا یہ سوچتے ہوئے۔ کیا میں اسی قدر خوفزدہ ہوگیا تھا لیکن حقیقت یہی تھی کہ جس طرح میرا ان لوگوں نے حشر کیا تھا، وہ اچھے بھلے آدمی کے بھی ہوش و حواس مختل کرنے کے

لیے کافی تھا۔

میں نے تو اب تک جن دشمنوں سے مقابلہ کیا تھا، وہ میری ہی طرح کے عام لوگ تھے۔ خواہ طاقت اور افرادی قوت اور اثر رسوخ میں مجھ سے اعلیٰ بھی تھے مگر پھر بھی میں نے انہیں ناکوں چنے چبوائے تھے مگر ''کالی لہر'' والوں کا معاملہ مجھے کچھ اور ہی لگتا تھا کیونکہ مجھے ان کی طاقت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ یوں مجھے بہرحال ان سے اب دوبارہ ٹکراؤ بہت سوچ سمجھ کر پوری ممکنہ تیاری سے کرنا تھا۔

یہاں مجھے اس بات کا بھی ادراک تھا کہ اس میں بھی انہی ''کالی لہر'' والوں کا ایک زعم تھا یا طاقت کا نشہ، مجھے ایسی حالت میں کر کے زندہ دفنانے کے بعد مطمئن ہو گئے تھے کہ اب میں نہیں بچ سکتا تھا۔ یوں دوبارہ وہاں کا رخ کرتا اور وہ مجھے دیکھ لیتے تو کب مجھے زندہ چھوڑتے۔ لہٰذا مجھے اب کی بار جوش سے نہیں بلکہ پوری طرح ہوش و حواس سے کام لے کر ''کالی لہر'' والوں کا نہ صرف مقابلہ کرنا تھا بلکہ ان کی شیطانی گرفت سے فوزیہ اور رباحیلہ کو بھی آزاد کروانا تھا۔

مجھ سے زیادہ دیر کھڑے نہیں رہا گیا اور اچانک یوں لگا جیسے اتنی دیر بھی لکڑی کی چوکھٹ کا سہارا لیے کھڑے رہنے کے سبب میری ٹانگیں جواب دینے لگی ہوں۔ میں اسی سہارے وہیں چوکھٹ پر ہی بیٹھ گیا۔ اپنی یہ حالت دیکھ کر میرے اندر چھناکا سا ہوا۔ بے بسی اور مایوسی پھر شدت کے ساتھ حملہ آور ہونے لگی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اچانک ایک شناسا سا آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی اور میں نے خیالات کے بھنور سے چونک کر اپنا سر اٹھا کر دیکھا۔

چند قدموں کے فاصلے پر چنبیلی کھڑی تھی۔ اس کے سر پر سرکنڈوں کا بنا ٹوکرا تھا۔ اس میں کچھ سبزی، پھل اور پھول تھے۔ پہلی بار میں نے اس سرو قد سانولی سجل سی نوعمر حسینہ کو غور سے دیکھا۔ وہ دیہات کے مخصوص روایتی لباس میں تو تھی مگر یہ ایسا ہی لباس نظر آتا تھا جیسے کوئی سرحد پار کا دیہات ہو۔ لباس سرخ اور نیلے رنگ کی آمیزش والا تھا۔ ان پر کہیں کہیں ستارے اور شیشے تاروں کی طرح ٹنکے ہوئے تھے۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور میں بھی جواب میں پھیکے پن سے مسکرا دیا۔ ابھی بہت سے سوالات میرے ذہن میں تھے اور مجھے ان کے جوابات کا بے چینی سے انتظار تھا۔

''اندر اکیلا دل گھبرا رہا تھا اسی لیے ذرا دیر کے لیے باہر آیا تو زیادہ دیر کھڑا نہ ہو پایا...... اور...... ادھر ہی گر...... پڑا......''

میری آواز ایسی ہی تھی جیسے کنوئیں سے آ رہی ہو۔ پتا نہیں لڑکی نے سنی بھی تھی یا نہیں۔ اتنے میں ہی میرا دم پھول گیا تھا۔ جو تھوڑی بہت طاقت محسوس ہوئی تھی، وہ بھی اتنی سی ''مشقت'' پر جاتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اب تو بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا کہ وہیں بیٹھنے کے انداز میں چوکھٹ کا سہارا لیتے لیتے ڈھے گیا۔

چنبیلی نے یکدم سامان پھینکا اور میری جانب لپکی اور مجھے سہارا دیا۔ وہ مجھے بہ مشکل گھسیٹتے ہوئے ہی سہی، اندر آگئی اور اسی فرشی گرم بستر پر ڈال دیا۔ باہر گئی اور اپنا سامان بھی اٹھا لائی۔

ایک نشست نما شے سی دیوار کے ساتھ رکھی تھی۔ وہ اس پر تھکی تھکی سی جا بیٹھی۔

''تمہاری حالت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی۔ اماں تمہاری دوائی لینے صبح پاس کے ڈھک گئی ہوئی ہے۔''

''ڈھک؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہنسی۔

''قریب آبادی میں گئی ہوئی ہیں۔''

اس نے میرے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کیا۔ کوئی میٹھی چینی سی تھی۔ تھوڑا مکھن تھا، چائے تھی۔ اس چلی مانس نے روٹی بنا کر دی۔ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں فرشی بستر پر ہی سرکنڈوں اور پھونس کی دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھ کر کھانے لگا۔ سہارا اسی نے دیا تھا۔ نوالے توڑ کر کھلا بھی وہی رہی تھی۔ اپنی اس ہیئت کذائی پر خود مجھے اپنے آپ پر رونا آ رہا تھا۔ چنبیلی میری طرف سوچتی نگاہوں سے تکتی بھی رہی پھر بولی۔

''تم یہاں کے تو نہیں لگتے...... ویسے تمہارے ساتھ کن لوگوں نے ایسا ظلم کیا تھا؟'' اس کے سوال پر میں نے ایک گہری سانس لی اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''میرے دشمن ہی تھے وہ...... ویسے یہ کون سا علاقہ ہے؟ میں کہاں ہوں اس وقت......؟'' وہ میری قدرے بوکھلائی ہوئی کیفیت پر ہنس پڑی۔ دراصل میں اس کے سوال پر چونکا تھا۔

''یہ سرحدی علاقہ ہے۔ گاؤں کا نام ریڑی ہے۔ تمہیں اور کچھ چاہیے؟''

''نہیں، میں تم دونوں کا بہت مشکور ہوں۔ میری زندگی بچا کر تم نے اور تمہاری ماں نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے ورنہ نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔''

''یہ سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، ورنہ ہم دونوں

ماں بیٹیاں رات گئے کب قبرستان کا رخ کرتی ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب میں کہا۔ میں نے دیکھا کچھ بتاتے بتاتے اس کا چہرہ ایک دم اداس سا ہوگیا۔ میں بھی خاموشی اور مستفسرانہ نظروں سے اس کے آگے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔

''اماں کو کوڑھ ہے۔ ڈھک ... میرا مطلب ہے آبادی والوں نے اماں اور مجھے گاؤں سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔'' وہ چپ ہوگئی۔

''اوہ ..... بہت افسوس ہوا مجھے یہ سن کر۔'' میں نے متاسفانہ لہجے میں بدستور اس کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو ظلم ہے۔ بجائے ایسے بیمار انسان کی مدد کرنی چاہیے، نہ کہ اسے بے دخل کردیا جائے مگر تمہاری اماں تو خود بھی علاج معالجہ کرلیتی ہیں۔ کل رات میری کیسی حالت تھی۔ آج دیکھو میں کچھ ہلنے جلنے کی حد تک ہی سہی، کچھ بہتری کی طرف تو جا ہی رہا ہوں۔ وہ اپنا علاج خود بھی تو کرسکتی ہیں؟''

''وہ تو کر ہی رہی ہیں۔ اسی لیے تو کوڑھ زیادہ نہیں پھیلا۔'' وہ بولی۔ ''بلکہ اماں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مجھ پر بھی کوڑھ نے دس فیصدی حملہ کیا تھا مگر میں بھی اماں ہی کی دوائی سے بھلی چنگی ہوگئی۔''

''اچھا!'' مجھے یہ سن کر ایک تکلیف ہوئی اور حیرت بھی کہ اس جیسی نوعمر حسینہ پر بھی موذی مرض نے حملہ کیا تھا۔

''تمہاری اماں گاؤں والوں کا علاج بھی کرتی ہوں گی پھر انہوں نے ایسا ظلم کیوں کیا؟''

''میرے نانا جان حکیم تھے۔ ہمارا آبادی میں بڑا سا گھر تھا۔ اسی میں نانا مطب کرتے تھے۔ ان کا انتقال ہوگیا۔ اماں نے نانا جان کے نسخے ہی سنبھالے ہوئے تھے مگر نانا جان کی اور بات تھی۔ لوگ ان کے علاج پر بھروسا کرتے تھے۔ حالانکہ اماں جان بھی لوگوں کا اچھا علاج کرتی تھیں مگر..... خیر، چھوڑو۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم کون ہو، تمہارا نام کیا ہے، کیا کرتے ہو، بیوی بچے بھی ہوں گے تمہارے؟''

اس نے اپنی روداد چھوڑ کر مجھ میں دلچسپی لینا چاہی تو میں ہونے سے سر جھٹک کر مسکرادیا۔ اب میں اسے کیا بتاتا اپنے بارے میں۔ تاہم مختصر ہی کچھ جھوٹ سچ کا سہارا لیتے ہوئے بولا۔

''میرا نام سہراب ہے۔ میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔ سیالکوٹ میں رہتا تھا۔ چھوٹا موٹا کاروبار کرتا تھا۔ ایک بہن ہے اور کچھ عزیز..... بس یہی کچھ۔''

''اور تمہاری دشمنی کی وجہ؟''

''بس، کاروباری سمجھ لو۔'' میں نے دانستہ ''کالی لہر'' والوں کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا البتہ ایک بات جو مجھے کھٹک رہی تھی، میں نے وہ اس سے پوچھ لی۔

''لیکن تمہاری مہربان اماں نے کل رات میری حالت دیکھتے ہوئے کچھ اندازہ لگاتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ''کالے بھڑوں'' والوں کی حرکت ہوسکتی ہے۔ یہ کون ہیں؟''

میری بات پر چنبیلی کی شوخی دوبارہ لوٹ آئی۔ ہنس کر بولی۔ ''کالے بھڑ'' درحقیقت اماں ان برے اور گندے لوگوں کو کہتی ہیں جو اپنے فائدے کی خاطر شریف لوگوں کا جینا حرام کردیتے ہیں۔ فسادی اور فتنہ پیدا کرنے والے.....''

''اوہ، اچھا۔'' میں بھی سر جھٹک کر مسکرادیا۔ ''تم دونوں یہاں کب سے مقیم ہو؟ تم ماں بیٹی کو یہاں جنگل میں اکیلے رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟ تم کسی اور آبادی یا شہر کی طرف کیوں نہیں نکل جاتیں؟''

''لگتا ہے ڈر، کیوں نہیں لگتا۔'' وہ پھر اداس سی ہونے لگی۔ ''کچھ دن ہوگئے ہیں ہمیں یہاں رہتے ہوئے مگر ہم یہاں اکیلے، خاص کر میں بیزار سی رہتی ہوں۔ نہ کسی سے ملنا جلنا نہ بات چیت۔ کوئی یہاں سے گزرتا ہوا آبادی کا شخص مل بھی جاتا ہے تو ہمیں دیکھ کر فوراً راستہ بدل لیتا ہے۔ ہم نے یہاں سے کہیں اور جانے کا بھی سوچا بلکہ میں ہی اماں کا ہر وقت سر کھاتی ہوں۔ وہ بھی میری وجہ سے ہی فکرمند رہتی ہیں مگر وہ چاہتی ہیں کہ پہلے یہاں رہ کر اپنا علاج کرلوں۔ اس کے بعد کسی اور آبادی کا رخ کریں گے۔ کہیں وہاں بھی ہمارے ساتھ یہ حشر نہ ہو۔''

''لیکن اب تمہاری اماں کیسے آبادی کی طرف گئی ہیں؟ کیا وہاں لوگ انہیں دیکھ کر، میرا مطلب ہے .....''

''اماں بھیس بدل کر جاتی ہیں۔'' وہ میری بات کاٹ کر پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔

''اوہ..... اچھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن بہرحال یہ بڑے دکھ کی بات ہے۔ لوگ کس قدر بے حس ہوتے ہیں۔ حالانکہ تم اور تمہاری ماں تو میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئی ہو۔ میری جان بچائی اور اب تم دونوں کس محبت اور ہمدردی سے میرے علاج کے جتن بھی کررہی ہیں۔ میں تم دونوں کا تہ دل سے مشکور ہوں۔''

''اصل خرابی کی جڑ چھوٹی نمبرداری ہیں۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''ورنہ گاؤں کے سب لوگ برے کہاں تھے۔ وہ تو نانا جان کی وجہ سے ہماری بہت عزت

کرتے تھے لیکن.....''

''چھوٹی نمبردارنی؟'' میں درمیان میں قدرے حیران ہو کر بولا۔ ''نمبردار تو سنا ہے مگر یہ بھلا کیا شے ہے؟ چھوٹی نمبردارنی!''

''اس کا نام شمیلہ خانم ہے۔ وہ نمبردار چودھری فتح خاں کی چہیتی بہو ہے مگر بیوہ......'' چنبیلی بتانے لگی۔ ''اس کا لاڈلا بیٹا یعنی فتح خاں کا پوتا، صمد یار ایک اول درجے کا اوباش اور گندا انسان ہے۔ ایک ہی اولاد ہے نا۔ لاڈ پیار نے اسے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ چودھری فتح خاں بھی ایک سخت مزاج آدمی ہے۔ اس کی بہو شمیلہ خانم بھی اسی کے مزاج کی بڑی غصیلی اور مغرور عورت ہے۔ عجیب بات ہے، زماں خاں اپنے باپ یعنی چودھری فتح خاں جو شمیلہ خانم کا شوہر تھا، وہ اپنے باپ کے الٹ ایک بہت ہی نیک نفس، شریف اور سادہ لوح آدمی تھا۔ بے چارے کا انتقال ہو گیا۔''

وہ اتنا بتا کر ذرا رکی پھر چہرے پر تلخی سموتے ہوئے بولی۔ ''صمد یار انتہائی اوباش لڑکا ہے۔ اسی کی وجہ سے ہم آج اس حال کو پہنچے ہیں بلکہ اس رذیل نے ہمارا یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا ہے اور......''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ بوڑھی خاتون اندر داخل ہوئی۔ اس نے موٹی سی کھدر کی سستی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ چہرہ اس نے اسی چادر کے اندر چھپا رکھا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا۔ اس کے آدھے چہرے پر کوڑھ گرا ہوا تھا اور اسی طرف کے بدن کے اندر سے (بقول اس کی بیٹی چنبیلی کے) بائیں ہاتھ تک بھی مرض چپکا ہوا تھا۔ اس نے وہ ہاتھ بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ ایسے میں واقعی وہ نہیں پہچانی جاتی تھی۔ بہرکیف، میں نے اس کا بھی مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور بے حد ممنون بھی ہوا۔

''ابھی کہاں...... بیٹا! تم مکمل صحت یاب نہیں ہوئے۔ میں تمہاری جڑی بوٹی اور جس محلول میں بنتی ہے، وہ لینے کے لیے پہلے پچھلا ہی اور کاہو کے جنگل گئی تھی۔'' وہ بتانے لگی۔ ''اس کے بعد نیچے ریزی (گاؤں) کے ڈھک (بازار) میں بھیس بدل کر جانا پڑا۔ ورنہ پہچان لی جاتی تو لوگ وہاں سے مجھے ڈنڈے مار کر نکال دیتے۔''

میں نے اس کا ایک بار پھر تہہ دل سے ممنون ہونا چاہا مگر وہ ہاتھوں میں پکڑے ایک کپڑے کے تھیلے کو چنبیلی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''لے چنبیلی! اسے نکال اور چھٹو وٹہ (سل وٹہ، ہاون دستہ) میں اچھی طرح پیس لے اور باقی ہم وزن ملاوٹ میں خود کر لوں گی۔ ذرا چائے ناشتا کر لوں۔''

''جی اچھا، اماں!'' کہتی ہوئی چنبیلی نے وہ تھیلا ماں سے لے لیا۔ وہ منہ ہاتھ دھونے قریب بنے کمرے کی طرف بڑھ گئی جو ایک آڑ کے عقب میں تھا۔

بے چاری میری وجہ سے کتنا رسک لے کر آبادی کی طرف گئی تھی۔ وہ بھی ناشتا کیے بغیر۔ اب لوٹی تھی۔ اس ضعیف خاتون کے اس ایثار سے میں ازحد متاثر ہوا۔ یہ حقیقت ہی تھی کہ میں ابھی پوری طرح بھلا چنگا نہیں ہوا تھا۔ اب بھی بس اسی قدر میری جسمانی طاقت بحال ہوئی تھی کہ میں تھوڑا بہت حرکت کرنے اور کچھ کھانے پینے کے قابل ہوا تھا۔ یوں نقاہت اپنی جگہ تھی۔ میں اس عذاب سے جلد از جلد چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ نہ جانے اس میں کتنے دن لگتے لیکن مجھے شب گزشتہ سے اب تک ایک خوشگوار تجربہ ضرور ہوا تھا کہ میں مزید چند گھنٹے گزرنے کے بعد کچھ بہتر ہوا تھا۔ اسی سے میں نے یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی کہ اب جو بقول ''اماں'' کے (اب میں اس مہربان اور پرشفیق خاتون کو ''بڑھیا کے بجائے ''اماں'' ہی کہوں گا)، تنی اور میری اصل دوا لائی تھی وہ مجھے بالکل پہلے جیسا بھلا چنگا کر دے گی، مگر کب تک؟

وجہ اس کی یہ تھی کہ مجھے فوزیہ اور راحیلہ کی بھی فکر ایک پل کے لیے چین سے نہیں بیٹھنے دے رہی تھی۔ نہ جانے وہ دونوں بے چاریاں ان شیطانی لوگوں کی گرفت میں کس حال میں ہوں گی۔ مجھے اپنے بہی خواہوں اور ہمدرد دوستوں استاد جوجی اور جگنو وغیرہ کا بھی خیال آیا جو میرے اس اچانک اور پُراسرار غیاب پر کس قدر پریشان اور متفکر ہو رہے ہوں گے۔

چنبیلی وہیں کونے میں بیٹھ کر چھٹو وٹہ چلانے لگی اور گاہے بگاہے میری جانب دیکھتے ہوئے مسکراتی بھی جاتی۔ اس نے اماں کا ناشتا قریب ہی کونے والی رسوئی میں بنا کر رکھا ہوا تھا، وہ لا کر اماں میرے پاس بیٹھ کر کھانے لگی۔

میں نے دیکھا اس کا جھریوں بھرا چہرہ خاصا متفکر بھی تھا۔ چنبیلی بھی اپنی ماں کی طرف کن انکھیوں سے تکے جا رہی تھی۔ شاید وہ بھی ماں کی پریشانی کو محسوس کیے ہوئے تھی۔ بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''اماں! کیا بات ہے؟ جب سے تو ڈھک سے لوٹی ہے، ایک دم پریشان سی دکھائی دے رہی ہے۔ کیا وہاں کسی نے تجھے پہچان لیا تھا؟''

میں خاموشی سے دونوں ماں بیٹیوں کی طرف تکتا

رہا۔ میں نے دیکھا، اماں نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر چائے کے مگ سے ایک گھونٹ بھر کر بولی۔

''چنبیلی! تو اب باہر بالکل بھی نہ نکلنا۔''

''نکلتی ہی کہاں ہوں اماں! تو نے تو مجھے یہاں قید کر رکھا ہے۔ جاتی بھی نہیں یہاں سے تو۔'' چنبیلی نے منہ بسور کر بیزاری سے کہا۔

''کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے نا؟'' میں نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے اماں سے کہا۔

''کچھ نہیں بیٹا! ہماری اپنی بات ہے۔ تو پریشان نہ ہو۔'' اماں نے آنا کانی کرنا چاہی تو چنبیلی نے ہولے سے ماں سے کہا۔

''میں اسے سب بتا چکی ہوں۔ بھلا اس میں چھپانے والی کون سی بات ہے۔''

''ہیں!'' اماں کے منہ سے بے اختیار نکلا پھر ایک نظر مجھ پر ڈال کر اپنی بیٹی سے بولی۔

''اس غریب کو کیوں پریشان کرتی ہے۔ یہ دو ایک روز میں بھلا چنگا ہو کر چلا جائے گا۔ اسے ان معاملات سے کیا لینا دینا ہے۔''

''اب میرا تمہارے سب معاملات سے لینا دینا ہے، اماں!'' میں نے یکدم سنجیدہ لہجے میں بوڑھی خاتون سے کہا۔ میرے اٹل اور جمے ہوئے لہجے پر دونوں ماں بیٹیاں ایک ٹک میری طرف دیکھنے لگیں اور میں اسی جوش سے آگے بولا۔

''اگر میرا تم سے لینا دینا نہ ہوتا تو تم دونوں کیوں مجھے اس تاریک قبر سے نکالتیں اور میری جان بچاتیں؟ کیا تم دونوں نے مجھے اتنا کم ظرف اور احسان فراموش سمجھ لیا ہے کہ میں تم لوگوں کی پریشانیوں اور مصیبتوں میں ساجھا نہیں ہوسکتا؟ ہرگز نہیں۔ بتاؤ اماں! تمہیں یہ اچانک کیا پریشانی لاحق ہوگئی ہے؟ کیا میری وجہ سے کچھ ہوا ہے؟''

''نہیں..... نہیں۔ تمہارے بارے میں تو ابھی کسی کو پتا بھی نہیں ہے۔ نہ ہی ہم کسی کو بتانا چاہتے ہیں۔'' اماں نے فوراً کہا پھر ایک نظر دوبارہ اپنی بیٹی پر ڈالتے ہوئے بولی۔

''کیا بتائیں بیٹا! اب اگر چنبیلی نے تمہیں سب بتا ہی ڈالا ہے تو سن لو۔ میں جب نیچے (ترائی میں) ریڑی کی طرف گئی تو وہاں میں نے اسی اوباش چھوکرے کو اپنے چند بدمعاشوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پایا۔ وہ مردود ہمارے بارے میں بلکہ چنبیلی بیٹی کے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے۔ میں پہچان لیے جانے کے ڈر سے اور زیادہ تو کچھ نہ سن سکی لیکن وہ کمینہ صمد یار..... خدا اس کا بیڑہ غرق کرے، چنبیلی کو......'' فرطِ غم و بے کسی تلے بے چاری اماں رو پڑی۔ میرا دل پسیج گیا۔ چنبیلی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور رسوئی کی طرف چلی گئی۔ میں حیران سا ہوگیا۔ وہ واپس لوٹی تو اس کا سلونا حسین چہرہ مارے طیش کے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے قوس کی شکل کی تیز دھار درانتی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور بپھرے ہوئے لہجے میں ماں سے بولی۔

''اگر اس مردود نے میرے قریب آنے کی بھی کوشش کی تو میں اسے چیر کر رکھ دوں گی یا اپنے سینے میں یہ ہنسیا اتار لوں گی۔''

میں نے ایک ٹک جمی ہوئی نظروں سے اس نوعمر دوشیزہ کو دیکھا جو بظاہر ایک سیدھی سادی اور دیہاتی ماحول کی پروردہ نظر آتی تھی مگر اس وقت جیسے شعلہ فشاں بنی ہوئی تھی۔ شاید ہر لڑکی خواہ وہ کسی بھی ماحول میں پلی ہوئی ہو، جب بات جان سے زیادہ عزت پر آجاتی ہے تو وہ ''چنبیلی'' ہی بن جایا کرتی ہے۔

اماں ایک دم اٹھی اور خوفزدہ سے انداز میں اس نے بچی کے ہاتھ سے وہ درانتی چھین لی۔

''پاگل ہوگئی ہے تو؟ چل جا کر کام کر اپنا اور دوبارہ ہنسیا کو ہاتھ بھی مت لگانا۔ اللہ ایسا دن نہ دکھائے۔'' پھر وہ درانتی واپس رکھنے کے لیے رسوئی کی طرف چلی گئی جبکہ چنبیلی روتی ہوئی مڑھی کے دوسرے گوشے کی جانب بھاگ گئی۔

میں اپنی جگہ بیٹھا بڑے اداس دل کے ساتھ سوچتا رہ گیا کہ ان دونوں بے چاری ماں بیٹیوں کے ساتھ گاؤں والوں نے بڑا ظلم کیا تھا۔ اتنا بھی خیال نہیں کیا کہ اس کے باپ یعنی چنبیلی کے نانا نے گاؤں والوں کی بہت خدمت کی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد اس ضعیف خاتون کی دادرسی کے بجائے اسے کوڑھی کہہ کر ایک جوان بیٹی سمیت گاؤں سے بے دخل کر دیا تھا اور دونوں ماں بیٹیاں یہاں ویران جنگل میں صرف اللہ کے آسرے پر آن پڑی تھیں۔

یہ بے حسی تھی، ظلم تھا۔ اپنے محسن کے اس مختصر گھرانے کے ساتھ تو انہیں چاہیے تھا کہ سر پر بٹھاتے اور کچھ نہیں تو یہ ظلم تو روا نہ رکھتے۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلسوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

دھوکا

قرۃ العین سکندر

لالچ کی بنیاد پر کوئی بھی تعلق زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا... جبکہ وہ تو لالچ کے ہاتھوں قاتل بننے کے لیے بھی تیار تھا... بس تھوڑی سی غفلت اور حد سے بڑھا ہوا اعتماد اسے لے ڈوبا... کیونکہ دھوکا تو ہر حال میں اپنا رنگ دکھاتا ہے۔

دوستی کے نام پر دشمنی کرنے والے ایک

زہریلے تعلق کا انجام

کار فراٹے بھرتی ہوئی سڑک کے راستے مضافات سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ کار اس وقت رچرڈ چلا رہا تھا جبکہ اس کے ساتھ والی نشست پر مونیکا بیٹھی ہوئی تھی۔ عقبی نشست پر اس کی بیٹی لیزا سوار تھی جو کار میں چلتی ہوئی تیز موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے بجائے چہرے پر بیزاری لیے ہوئے تھی۔

''پلیز! اس بے ہنگم میوزک کو بند کردیں۔'' لیزا نے قدرے بدتمیزی سے کہا جس پر رچرڈ اور مونیکا، دونوں نے ہی چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مونیکا کے اشارے پر رچرڈ نے کندھے اچکا کر میوزک بند کردیا۔

"کہو تو تمہاری پسند کا ٹریک لگا دیتا ہوں۔" رچرڈ نے مسکرا کر خندہ پیشانی سے کہا مگر لیزا نے جواب تک دینا مناسب نہ سمجھا اور شیشے سے پار باہر دیکھنے لگی۔

لیزا کے اس رویے کے سبب مونیکا خود کو مجرم سمجھنے لگی۔ اس کے چہرے پر خجالت پھیل گئی تبھی رچرڈ نے ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ نرمی سے مونیکا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یہ منظر لیزا کی تیز نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکا۔

اشتعال کی ایک تیز لہر لیزا کے چہرے پر پھیل گئی۔

مونیکا نے جب گھبرا کر پلٹ کر دیکھا تو اسے اپنی بیٹی لیزا کے چہرے پر برہمی کے واضح تاثرات دکھائی دیے جبکہ وہ ایک آزاد معاشرے میں زندگی بسر کر رہے تھے جہاں کوئی کسی پر جبر نہیں کرتا۔ ہر طرح کی بندش سے آزادی ہوتی ہے۔ کوئی کسی کی زندگی میں بے جا مداخلت نہیں کرتا۔

مگر اس سب کے باوجود مونیکا کئی دن سے محسوس کر رہی تھی کہ لیزا کو رچرڈ کا مونیکا کے لیے جھکاؤ پسند نہیں آیا تھا۔ مونیکا سمجھتی تھی کہ یہ اس لیے بھی ہوسکتا تھا کہ لیزا اپنے والد کی جگہ کسی اور کو دینے کے لیے کسی طور پر آمادہ نہ تھی۔

جب لیزا چھوٹی تھی تب اس کا باپ ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ اس کی ماں مونیکا نے اسے تنہا اتنے سال تک پالا پوسا۔ مونیکا کو اچھی طرح سے یاد تھا کہ جب سب رشتے داروں نے لاتعلقی اختیار کر لی ہوئی کوئی بھی معاشی اور سماجی طور پر مدد کے لیے آمادہ نہ تھا، تب رچرڈ جو اس کے شوہر کا دوست تھا، اس نے مونیکا کو ایک جگہ فوری طور پر جاب بھی دلائی تھی۔ یہی نہیں، ہر ویک اینڈ پر رچرڈ آ جایا کرتا تھا۔ اس کی آمد سے لیزا کے دل میں اپنے باپ کے لیے جو خلا سا آ گیا تھا وہ پُر ہونے لگا تھا۔ اس سے قبل لیزا کو رچرڈ کی ذات سے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا بلکہ مونیکا کا فطری طور پر رجحان رچرڈ کی طرف اسی وجہ سے ہوا تھا کہ وہ لیزا کا، اس کی ضروریات کا بہتر طور بہت خیال رکھتا تھا لیکن جب سے مونیکا نے اشارتاً اسے رچرڈ کے پروپوزل کے متعلق بتایا تھا، لیزا اکھڑی اکھڑی رہنے لگی تھی۔

رچرڈ کی نگاہوں میں مونیکا کے لیے واضح پیغام دبا ہوا تھا۔ جب جب رچرڈ کی نگاہیں مونیکا پر اٹھتی تھیں، مونیکا کو اپنا آپ بہت پُرکشش اور خاص محسوس ہونے لگتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد اس نے اپنے آپ کو لیزا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ بلکہ کچھ سال قبل اس نے لیزا کے ہر خواب کی تکمیل کے لیے دو دو شفٹوں میں کام بھی کیا تھا۔ اس نے اتنے سال اپنے آپ پر بالکل توجہ نہیں دی تھی مگر اب اسے رچرڈ کی طرف سے ملنے والی گرمجوشی کے بعد اپنی زندگی کے لیے کوئی بڑا قدم اٹھانا ہی تھا۔

وہ ابھی پینتیس سال کی تھی اور اس کی بیٹی لیزا سولہویں سال میں قدم رکھ چکی تھی۔

رچرڈ اور مونیکا نے مل کر یہ پروگرام بنایا تھا کہ ساحلی علاقے میں پُرفضا مقام پر چھٹیاں گزاری جائیں اور کسی اچھے موقع پر لیزا کو اپنی آئندہ کی زندگی کے لائحہ عمل کے بارے میں بتائیں مگر ابھی روانگی کے وقت سے ہی لیزا اکھڑی اکھڑی سی دکھائی دے رہی تھی۔

بندرگاہ پر پہنچ کر رچرڈ نے ایک ریسٹورنٹ کے قریب لے جا کر اپنی کار پارک کی تھی۔

"سب سے پہلے کمرا بک کر لیتے ہیں، اس کے بعد ہم کھانا کھاتے ہیں۔ مجھے تو سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔" رچرڈ نے مسکرا کر کہا۔ شاید وہ اس طرح ماحول کا تناؤ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بالکل...... اور مینیو میری لیزا کی پسند کا ہوگا۔" مونیکا کی بات پر بھی لیزا نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا اور چپ چاپ ان کے ساتھ ہی ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئی۔

"میں اس کے رویے کے لیے معافی چاہتی ہوں۔ نہ جانے لیزا کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو تم سے بہت گھل مل گئی تھی۔ اس کا غصہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" مونیکا نے خجالت سے کہا۔

"تم پریشان نہ ہو۔ یہ فطری ردعمل ہے۔ وہ باپ کی جگہ مجھے نہیں دینا چاہتی۔ تم جانتی ہو وہ باپ سے کس قدر اٹیچ تھی۔ اسے کچھ وقت دو۔ گھل مل جائے گی۔ اب اس وجہ سے ہم اپنی زندگی تو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔" رچرڈ نے یہ کہہ کر مونیکا کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر گویا اسے اپنی دانست میں تسلی دی۔

وہ سب اس شاندار ریسٹورنٹ میں ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ لیزا اطراف کا جائزہ لینے میں مگن تھی۔ لیزا سے نظر چرا کر رچرڈ گاہے بگاہے مونیکا کے چہرے پر گہری نظر ڈال لیتا تھا۔ مونیکا کے چہرے پر خوشی چھا گئی مگر پھر وہ اچانک لیزا کے متوجہ ہونے پر محتاط ہو کر بیٹھ گئی۔

ویٹر نے جیسے ہی کھانا سرو کیا، سب خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ کل ہم فشنگ کے لیے چلتے

ہیں اور کشتی کی سیر بھی ہو جائے گی۔ موسم خاصا خوشگوار ہے۔" رچرڈ نے مسکرا کر خوش دلی سے براہِ راست لیزا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"اوکے۔" لیزا نے کندھے اچکا کر اقرار کر کے گویا احسانِ عظیم کیا تھا۔

اس کے اقرار پر مونیکا نے اطمینان بھری گہری سانس لی۔ کھانے کے بعد رچرڈ، لیزا کا موڈ اچھا کرنے کے لیے اسے واک پر لے گیا۔ یہ مشورہ بھی مونیکا نے دیا تھا کہ رچرڈ تنہائی میں لیزا سے بات کرے۔ یہ ان کی آنے والی زندگی کے لیے بہت ضروری تھا کہ لیزا، رچرڈ کو بطور باپ قبول کر لے۔

موسم خوشگوار تھا اور خلافِ معمول لیزا کا موڈ بھی اچھا تھا۔ وہ رچرڈ کے ہمراہ چل رہی تھی۔

"لیزا ڈیئر! مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ میں نے اور مونیکا نے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ باس کی جانب سے لکھی گئی وصیت کے مطابق تم جیسے ہی سولہویں برس میں قدم رکھو گی، سب جائداد تمہارے نام منتقل ہو جائے گی اور تم جانتی ہو کہ اس کے ساتھ ہی شادی کی شرط بھی رکھی گئی ہے۔ تم تیار ہو نا؟ دیکھو، کوئی گڑبڑ نہ کرنا...... تم واپسی پر اپنی مام کو گلے سے لگا کر ان سے ایکسکیوز کرو گی اور کہو گی کہ تمہیں یہ نیا رشتہ قبول ہے...... تم تو جانتی ہو کہ وہ بس ایک دن کی مہمان ہے...... کل ہم دونوں اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں گے......" رچرڈ نے بے تکلفی سے لیزا کی کلائی تھام لی۔

لیزا کی آنکھوں میں غیر معمولی روشنی تھی۔ واپسی کے سفر میں لیزا خاموش رہی۔ اس نے ریسٹورنٹ میں داخل ہونے سے پہلے رچرڈ کے ہاتھوں میں ڈالا ہاتھ نکال دیا تھا۔ وہ سیدھی مونیکا کے کمرے میں گئی۔ لیزا جانتی تھی کہ دروازے کے قریب کھڑا رچرڈ اس کی بات سن رہا ہو گا۔

"مام! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ شادی کر سکتی ہیں۔" لیزا کی آواز میں محبت گھلی تھی۔

"او مائی لٹل چائلڈ......!" مونیکا نے اسے خود سے لپٹا کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

باہر کھڑے رچرڈ کے چہرے پر بھی اطمینان بخش مسکراہٹ چھا گئی۔

☆☆☆

رچرڈ اس وقت ریسٹورنٹ میں اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ وہ کل ہی لیزا کے ساتھ مل کر مونیکا سے

چھٹکارا حاصل کر لے گا اور جلد ہی لیزا سے شادی کر کے اسے بھی راستے سے ہٹا دے گا۔ لیزا نا سمجھ تھی، کم عمر تھی۔

اسے بہت پہلے اندازہ ہو گیا تھا کہ لیزا اس پر بہت بھروسا کرنے لگی ہے۔ اس نے انداز بدل ڈالا تھا اور لیزا کو بھی اعتماد میں لے لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مونیکا ایک سمجھ دار عورت ہے جو کبھی بھی لیزا کے ساتھ اس کی شادی نہیں ہونے دے گی۔ بالفرض شادی ہو بھی جاتی ہے تو پھر بھی وہ اس کی جائداد کے چکر میں لیزا سے نجات حاصل نہیں کر سکے گا۔

مگر اسے بہت حیرت ہوئی جب لیزا اس کی محبت میں اتنی پاگل ہو گئی کہ اپنی ہی ماں کو راستے سے ہٹانے کے لیے رضامند ہو گئی۔ اگرچہ اس کے لیے رچرڈ کو فقط اتنا ہی کرنا پڑا تھا کہ اس کی مام کے ساتھ التفات کا اظہار کرتا رہا تھا۔

اب لیزا کے دل میں مونیکا کو لے کر اتنا غصہ تھا کہ وہ اپنی زندگی کو حسین بنانے کے لیے اپنی مام سے نفرت کرنے لگی تھی۔

رچرڈ نے صبح جھیل کی سیر کا منصوبہ بنایا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس جھیل کے جنوبی اطراف میں جہاں دلدلی علاقہ ہے، وہاں لے جا کر لیزا اور رچرڈ، مونیکا کو دھکا دے دیں گے۔

یہ بے داغ منصوبہ تھا، بعد میں اسے حادثے کا رنگ دیا جا سکتا تھا۔

رچرڈ خود کو دولت میں کھیلتا ہوا دیکھتے ہوئے خوبصورت خوابوں میں کھو گیا پھر گہری نیند نے اسے آلیا۔

صبح تینوں کا ہی موڈ بے حد خوشگوار تھا۔ ناشتے کے بعد وہ سب جھیل کی سیر کے لیے روانہ ہو گئے۔

مونیکا بہت خوش تھی کہ اب لیزا نے رچرڈ کو بطور باپ قبول کر لیا ہے اور رچرڈ دولت کے سپنے دیکھ رہا تھا۔ لیزا چپو چلاتی ہوئی گانا گنگنا رہی تھی۔ جب بھی اس کا موڈ خوشگوار ہوتا یا وہ بہت زیادہ پُرجوش ہوا کرتی تھی، وہ یونہی گانے گاتی تھی۔

کشتی میں اس وقت تین نفوس بیٹھے ہوئے تھے۔ کبھی رچرڈ چپو چلاتا اور کبھی لیزا۔

مونیکا ہوا سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ تبھی رچرڈ نے لیزا کو اشارہ کیا۔ رچرڈ کے چہرے پر اچانک تناؤ سا آ گیا تھا۔

رچرڈ کا اشارہ پاتے ہی لیزا نے کشتی کا رخ جنوبی طرف کر دیا۔ مونیکا اپنی سوچوں میں گم تھی اور ہولے ہولے مسکرا رہی تھی۔

اچانک ہی اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور اس نے رچرڈ کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

''رچرڈ! تمہیں یاد ہے کہ تم نے باکس کے کتنے ڈالرز دینے ہیں؟ وہ بزنس پارٹنر تم ہی ہو نا جس کی وجہ سے باکس کو کئی دن سے پریشانی تھی۔ تم نے محض ڈالرز کی ادائیگی کے خوف سے میرے شوہر کو راستے سے ہٹا دیا۔ اب اور کس کس کو راستے سے ہٹاؤ گے۔ مجھے مارو گے...... اس کے بعد میری بچی کو مارو گے؟ مجھے کبھی علم نہ ہوتا اگر میں نے تمہارے گھر میں اس دن باکس کا وہ خط نہ پڑھ لیا ہوتا جو تمہارے نام تھا کہ وہ جلد قانونی طور پر تم سے وہ رقم نکلوا لے گا۔ مجھے اس وقت انسپکٹر نے بتایا تھا کہ ایک شخص نے کسی اجنبی کو باکس کی کار کے ساتھ آفس کے باہر چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔''

رچرڈ کا چہرہ فق ہونے لگا۔ اس نے چونک کر بدحواسی سے لیزا کو دیکھا۔

''لیزا! تمہاری ماں پاگل ہو چکی ہے۔ یہ ہم دونوں کی شادی رکوانے کے لیے من گھڑت جھوٹ سنا رہی ہے۔ مجھے تم سے بہت پیار ہے لیزا!'' وہ دیکھ رہا تھا کہ لیزا کے چہرے پر پُراسراری مسکراہٹ چھا گئی تھی۔

''اچھا، واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو۔ تو یہ لو...... میرے لیے اس موت کو قبول کرو۔'' لیزا اور مونیکا نے پورا زور لگا کر رچرڈ کو دھکا دے دیا۔

رچرڈ کی چیخ نکل گئی۔ وہ اس ساری صورتحال کے لیے ذہنی طور پر ہرگز تیار نہیں تھا۔ اس کا وجود دلدل میں تیزی سے دھنسنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی ثبت ہو چکی تھی۔

''مام! میں نے اسے بالکل شک نہیں ہونے دیا تھا کہ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔'' لیزا، مونیکا کے گلے سے لگ کر پُرجوش انداز میں بولی۔

مونیکا لیزا کے سر پر ہاتھ رکھے تھپتھپا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر وہ لیزا کو لفظوں میں سمجھاتی کہ رچرڈ کی نگاہ صرف اس کی دولت پر ہے تو وہ کبھی بھی یقین نہ کرتی۔ اس لیے اسے از خود وہ من گھڑت خط لکھنا پڑا تھا جسے دیکھ کر ہی لیزا کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ آخر وہ اپنے باپ سے جنون کی حد تک پیار کرتی تھی۔ اسے رچرڈ کی محبت سے زیادہ ماں کے لمس کی طلب تھی۔

xxx

بحیرۂ کاسپین اور بحیرۂ اسود کے درمیان داغستان کا علاقہ واقع ہے جسے آج کل چیچنیا کہتے ہیں۔ یہاں شمال مغرب سے جنوب مشرق تک پھیلے ہوئے پہاڑوں کے فلک بوس سلسلوں کا نام قفقاز ہے۔ اسی قفقاز کو کیشیا بھی کہتے ہیں۔ ترک اسے کوکاز (Cavkaz) کہتے ہیں اور اردو میں کوہ قاف کہا جاتا ہے۔
مغرب میں اس سے ملحق جارجیا ہے۔ کہتے ہیں کہ روس کا مردِ آہن اسٹالن اور اس کا رفیقِ کار بیریا جارجین تھے۔

اتھارہویں صدی کا آخری عشرہ کئی بڑی شخصیات کے حوالے سے بہت یادگار رہا ہے۔ اسی عشرے کے پیدا ہونے والوں نے روس کے ایک خاص طبقے کے خلاف آواز بلند کی اور داغستان اقر قفقاز کے مسلمانوں میں اسلامی روح پیدا کی۔ بے وسیلہ اور بے یار و مددگار یہ لوگ تقریباً تیس پینتیس سال تک روس کا مقابلہ کرتے رہے۔ وہ اپنی کوششوں میں کتنے کامیاب ہوئے، یہ ایک علیحدہ سوال ہے اور اس کا جواب ہنوز ہمیں نہیں ملا لیکن جب ہم چیچنیا میں مسلمانوں کو روس سے برسرِ پیکار دیکھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے خاکستر کی یہی وہ چنگاری ہے جو 1859ء میں دب گئی تھی۔ سرپھرے اور سروں کو ہتھیلیوں پر لیے پھرنے والوں کی داستان۔ اللہ والے جو اللہ کے نام پر مرمٹے۔

مجاہدین کے حوالے سے امام شامل کی کاوشیں۔ گوریلا جنگ کے ماہر اور پہلے مسلمان گوریلا جنرل کی داستان

چیچنیا کا عقاب

ضیاء تسنیم بلگرامی
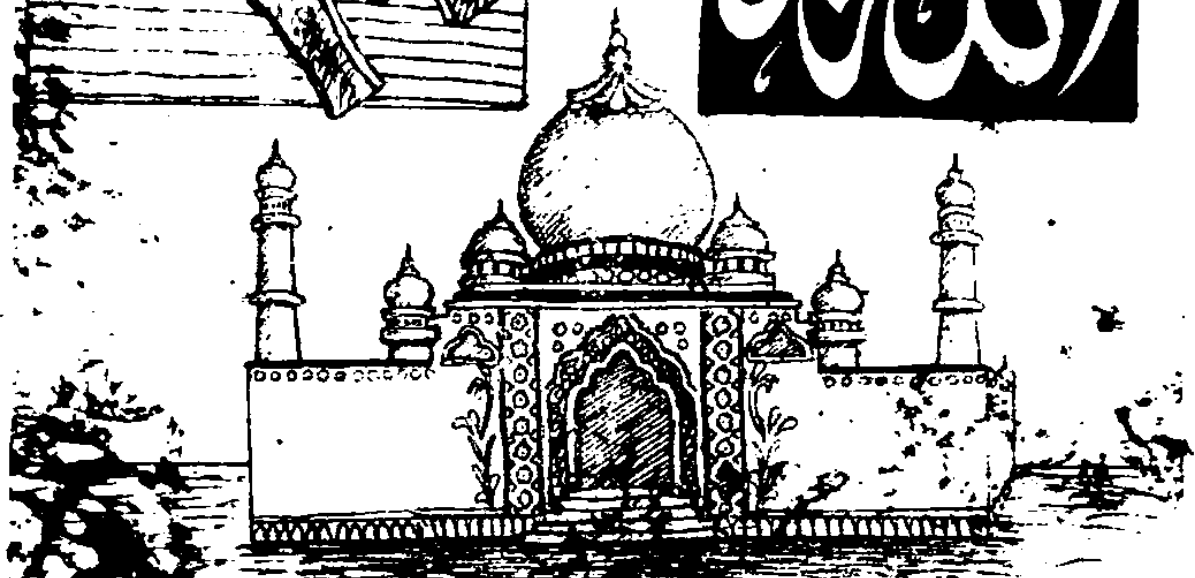
اور مغرب میں چلے جایئے تو ترکی سلطنت کی حدود شروع ہو جاتی ہے۔
قفقاز کے ان کوہستانی سلسلوں میں آباد قبائل مسلمان ہو چکے تھے۔ تیمور بھی ان علاقوں سے گزر چکا تھا۔ تیمور سے پہلے منگول بھی یہاں سے گزرے۔
گو کہ اسلام نے انہیں اپنی برکتوں سے نوازا تھا مگر اپنے دشوار گزار محل وقوع کی وجہ سے یہ لوگ مسلمانوں سے اپنا رشتہ مسلسل اور مستقل طور پر برقرار رکھنے میں ناکام رہے۔ ان کے مشرق میں بحیرۂ کاسپین کے اس پار ایک ریگستانی سلسلہ تھا اور اس سے ملحق خوارزم، بخارا اور سمرقند وغیرہ تھے جو اسلام اور اسلامی درس گاہوں کے مرکز بنے ہوئے تھے۔
قفقاز کے پہاڑی سلسلوں میں جو قبائل آباد تھے، مسلمان ہونے کے باوجود ان کے خصائل عربوں کی زمانۂ جاہلیت اور پٹھانوں کی خو بُو سے مختلف نہیں تھے۔ انتقام ان کے خون میں شامل تھا اور اس خونی دیوتا پر معلوم نہیں کتنے خاندانوں کو بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ اس جذبۂ انتقام کو قومی روایت کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ گویا ان کی نظروں میں اسلام کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہ تھا چنانچہ ایک روسی شاعر نے ان کی تعریف کرتے ہوئے اپنے اشعار میں کہا ہے۔
"اے پہاڑوں کے رہنے والے قبیلو!
آزادی تمہارا خدا ہے اور جدوجہد تمہارا قانونِ حیات
تم دوستی کے معاملے میں شدید ہو اور بدلہ لینے میں شدید تر
تمہارے نزدیک نیکی کا بدلہ نیکی اور بدی کا بدلہ بدی
اور تمہاری نفرت بھی تمہاری محبت کی طرح غیر محدود ہے"
ان اشعار میں دیکھیں اور غور کریں تو یہی محسوس ہوگا کہ ہم عربوں کی قبائلی عصبیت اور ان کی اچھائیوں اور برائیوں کو بیان کر رہے ہیں۔ اسی طرح پٹھانوں کی قبائلی عصبیت، بہادری، انتقام پسندی اور اپنے ہر معاملے میں انتہا پسندی واضح نظر آتی ہے۔
کہتے ہیں کہ یہاں کادار نامی گاؤں کے ایک دہقان نے اپنے پڑوسی کی مرغی چرا لی۔ پڑوسی مرغی کو تلاش کرتا رہا اور آخر کسی طرح مرغی کے مالک کو پتا چل گیا کہ اس کی مرغی پڑوسی دہقان کے پیٹ میں پہنچ چکی ہے۔ اسے غصہ آیا اور اس نے انتقاماً اس کی بھیڑ اٹھالی اور پورے گھر نے مزے لے لے کر بھیڑ کو ہضم کرلیا۔ دہقان بھیڑ تلاش کرتا رہا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی بھیڑ پڑوسی خاندان کے پیٹ میں پہنچ چکی ہے تو یہ بھی موقع کی تلاش میں رہا اور بھیڑ چور کی دو بھیڑیں چرالیں اور مزے لے لے کر دونوں کو چٹ کر گیا۔
اب دونوں پڑوسی ایک دوسرے کے لیے جانوروں کی چوری کے معاملے میں اجنبی نہیں رہے تھے اور دونوں کا جذبۂ انتقام شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ دو بھیڑوں کی چوری کا واقعہ گویا اپنی برتری کا اعلان تھا۔ دوسری طرف اس کا یہ انتقام لیا گیا کہ دو بھیڑوں کے بدلے پڑوسی کی ایک گائے چرالی گئی اور یہ بھی کنبے کے پیٹ میں چلی گئی۔
جوابی کارروائی میں گائے چرانے والوں کا گھوڑا چوری کرلیا گیا اور اسے کسی دوسرے علاقے میں فروخت کردیا گیا۔
اب چرانے کے لیے کوئی بڑی چیز نہیں رہ گئی تھی۔ جس کا گھوڑا چوری ہوا تھا، وہ آستینیں چڑھا کر اپنے دشمن کے گھر پہنچا۔ اسے آواز دی۔ وہ جیسے ہی باہر نکلا، اس کا سر قلم کردیا۔ قاتل فرار ہوگیا۔ مقتول کے گھر والے کچھ عرصے قاتل کو تلاش کرتے رہے۔ مقتول کا پورا خاندان جذبۂ انتقام میں جل بھن رہا تھا اور اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس معاملے کو زیادہ دن تک التوا میں رکھا گیا تو خاندان والوں کا جذبۂ انتقام سرد پڑ جائے گا۔ قاتل کا گھرانا ان کا مذاق اڑائے گا اور دوسرے پڑوسی انہیں کمزور اور کمتر سمجھنے لگیں گے۔
مقتول کا خاندان کئی دن تک غور کرتا رہا کہ مفرور قاتل سے کس طرح بدلہ لیا جائے۔ قاتل کا چھوٹا بھائی موجود تھا اور وہ مقتول کے خاندان والوں کی بے بسی پر مسکراتا رہتا تھا۔ آخر انتقاماً اس مسکرانے والے کو قتل کردیا گیا۔
اب جذبۂ انتقام نے وسعت اختیار کرلی تھی اور دونوں طرف کے لوگ آزادی سے ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ دونوں پڑوسیوں نے ایک دوسرے سے دوری اختیار کی اور اپنی اس معرکہ آرائی میں اپنے دوست قبیلوں کو بھی شامل کرلیا اور یہ سلسلہ تین سو سال تک جاری رہا۔
ایک مرغی کی چوری نے کتنے ہی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور کتنے ہی خاندان برباد ہوگئے۔

اسی علاقے کے آندی نامی گاؤں میں چرواہے نشانے بازی کی مشق کر رہے تھے۔ بندوقیں ان کے ہاتھوں میں تھیں اور ان کا نشانہ ایک درخت کے تنے پر ایک گول دائرہ تھا۔

اتفاق کی بات کہ درخت کے پاس سے کوئی شخص گزرا اور چرواہے کی گولی درخت کے دائرے کے بجائے اس شخص کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ وہ تڑپ تڑپ کر وہیں مر گیا اور چرواہوں نے راہِ فرار اختیار کی لیکن یہ خبر چھپی نہ رہی اور مقتول کے گھر والے روتے دھوتے وہاں پہنچ گئے۔

جو لوگ اس کے عینی شاہد تھے، انہوں نے قاتل چرواہے کی نشاندہی کر دی اور یہ لوگ چرواہے کے گھر پہنچ گئے اور مطالبہ کیا کہ قاتل کو ان کے حوالے کیا جائے۔

اس چرواہے کا قبیلہ ہزاروں مویشیوں کا مالک تھا۔ اس نے قاتل کے بجائے مویشیوں کی پیشکش کی اور کہا۔ ”یہ قتلِ عمد نہیں تھا بلکہ غلطی سے ہوگیا۔ یہ بالکل اتفاقی امر تھا کہ مقتول سامنے سے گزرا اور گولی اصل نشانے کے بجائے اس کے سینے میں اتر گئی۔“

مقتول کے گھر والوں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”جسے تم لوگ غلطی کہہ رہے ہو، اس غلطی میں ایک قیمتی جان ضائع ہوئی ہے۔ یہ بہت بڑا نقصان ہے۔“

چرواہے کے کسی بزرگ نے کہا۔ ”ہم آپ کے اس نقصان کے بدلے میں آپ کو کئی جانور دے سکتے ہیں۔ آپ انہیں قبول کریں اور اس جھگڑے کو ختم کریں۔“

مقتول کے ورثاء کی طرف سے قاتل کے بزرگ کی پیشکش کو ٹھکرا دیا گیا۔ ”جانور کسی انسان کی جان کا بدل نہیں ہو سکتے۔ ہم انسان کے بدلے انسان کو قتل کریں گے اس لیے قاتل ہمارے حوالے کیا جائے۔“

قاتل کے بزرگوں نے صاف انکار کر دیا۔ ”اگر تم لوگ دیت میں جانور قبول کرلو تو بہتر ہے ورنہ گناہ گار چرواہا کسی طرح بھی تمہارے حوالے نہیں کیا جائے گا۔“

مقتول کے بزرگوں نے کہا۔ ”جب ہمیں تمہاری دیت کی پیشکش قبول نہیں ہے تو تم قصاص میں قاتل کو ہمارے حوالے کردو۔“

بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رہا اور یہ معاملہ کسی طرح بھی طے نہ پایا۔ قاتل کے نمائندے کہتے تھے کہ یہ قتل عمد نہیں تھا۔ ایک امر حادثاتی تھا اس لیے دیت قبول کرلو اور مقتول کے ورثاء بضد تھے کہ قتل، قتل ہوتا ہے اور وہ قتلِ عمد اور قتلِ خطا کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے۔

جب کسی طرح بات نہیں بنی تو مقتول کے پسماندگان غصے میں اٹھ کر چلے گئے اور کئی دن بعد قاتل کے خاندان کے ایک اہم شخص کو قصاص میں قتل کر کے اپنا جذبۂ انتقام ٹھنڈا کیا۔ اب یہ لوگ نئے قاتل کے گھر پہنچے اور قاتل کا مطالبہ کیا۔

اِدھر سے بھی دیت میں چند جانور پیش کر دیے گئے اور کہا گیا۔ ”یہ رسم اور یہ پیشکش تم لوگوں کی ہے حالانکہ ہم نے اس شخص کو قصاص میں قتل کیا تھا مگر پھر بھی ہم دیت میں جانور دے رہے ہیں۔“

دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔ ”یہ قتلِ عمد تھا اور ہم دیت نہیں لینا چاہتے، قصاص چاہتے ہیں۔ قاتل کو ہمارے حوالے کردو۔“

اس جھگڑے نے طول کھینچا اور دونوں طرف سے جنگ وجدل کا آغاز ہوا۔ کچھ اِدھر کے مارے گئے، کچھ دوسری طرف کے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ کہاں کی دیت اور کیسا قصاص۔ دونوں طرف سے قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہاں نہ کوئی قانون تھا، نہ کوئی قاعدہ اور نہ کوئی اصول اور نہ کوئی حکومت۔ پہلے معرکہ آرائی مردوں میں ہوتی رہی پھر عورتیں بھی اس میں شامل ہوگئیں اور بچے بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ یہ سلسلہ دو سو سال تک جاری رہا اور جب کسی طرح یہ سلسلہ موقوف نہ ہوا تو معلوم ہوا کہ دونوں طرف کے صرف چار نفر زندہ باقی بچے ہیں۔

زیادہ پرانی بات نہیں۔ اسی علاقے میں 1826ء کی بات ہے کہ کسی سے کسی کا قتل ہوگیا اور قصاص میں قاتل کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اب بظاہر جھگڑا ختم ہو چکا تھا لیکن انتقام پسندی کی عادت باز نہ آئی اور معاملے کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیا اور کہا گیا کہ اس قتل کا بھی انتقام لیا جائے گا اور پھر تیسرا قتل بھی ہوگیا، پھر تیسرے کے بعد چوتھا قتل ہوا اور اس طرح متواتر چودہ قتل ہوگئے۔

ان حالات پر درد مند مسلمانوں کی نظریں اٹھیں۔ وہ قبائلی عصبیت کے شکار لوگوں کو سمجھاتے رہتے تھے کہ یہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ جہالت ہے اور جہالت کو اب ختم ہو جانا چاہیے۔

ان میں اور ہوش مند مسلمانوں میں بحث کا آغاز ہوا۔ علماء بھی اس طرف متوجہ ہوئے اور انہیں بھی ہوش آیا کہ ان کی جاہلانہ رسمیں ان کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاک کروادیں گی۔ دشمن ان کی تاک میں ہیں اور ان کے آپس کے جھگڑوں کو خوشی اور دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ روسی بادشاہ نکولائی ان پر حریصانہ نظریں ڈالے ہوئے تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ خطہ بھی اس کی حکومت میں شامل ہو جائے لیکن اسے وقت کا انتظار تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب یہ آپس میں لڑتے لڑتے نڈھال ہو جائیں گے تو ان پر بہ آسانی غلبہ حاصل کرلیا جائے گا۔

یہاں بھی سلسلۂ تصوف قائم ہو چکا تھا اور بہاء الدین نقشبند کا سلسلہ رائج تھا۔ لوگ روحانی سکون کی تلاش میں اس سلسلے کے بزرگوں کے پاس جاتے اور ان سے روحانی تسکین حاصل کرتے۔

سلسلۂ تصوف کے بزرگ حضرات بھی قبائلی، معاشرتی رسم ورواج اور عادات کی خرابیوں کو تشویش کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ان کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ یہ بزرگ روسی حکومت کی حریصانہ نظریں بھی محسوس کررہے تھے مگر اس حریص روس کے خلاف اپنے بچاؤ کے لیے کوئی منصوبہ بندی اس وقت تک نہیں کرسکتے تھے جب تک مسلمانوں کی اصلاح نہ کی جائے اور ان میں اتفاق واتحاد نہ پیدا ہو جائے۔

مختلف علاقوں کے مختلف بزرگوں میں بیک وقت یہ سوچ پیدا ہوئی اور انہوں نے اس پر کام کرنا شروع کردیا۔

یہاں غمری نامی ایک قصبے میں قاضی ملاّ 1793ء میں پیدا ہوئے تھے اور کونائی نامی قصبے کے مدرسے میں عربی سیکھی پھر اراکنی چلے گئے اور سعید آفندی سے دینی تعلیم حاصل کی۔ یہ وہ پہلے شخص تھے جن کے دردمند دل میں مسلمانوں کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔

ابھی قاضی ملاّ کے وطن غمری میں ان سے چھ سال چھوٹے علی نامی ایک صاحبزادے تھے۔ یہ پیدا ہونے کے چھ سال بعد تک بہت زیادہ بیمار رہتے تھے اور گھر کے لوگ ان کی بیماری، آزاری سے پریشان رہتے تھے۔ جب کم سن علی کی بیماریوں سے گھر کے لوگ تنگ آگئے تو بزرگوں نے بیٹھ کر غور وخوض شروع کیا کہ بیماریوں پر کس طرح قابو پایا جائے اور ان سے کس طرح نجات حاصل کی جائے پھر متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ بچے کا نام بدل دیا جائے کیونکہ شاید یہ نام راس نہیں آرہا ہے۔ بچے کا نام علی سے بدل کر شامل رکھ دیا گیا اور شاید اس نئے نام نے خوشگوار اثرات دکھائے۔ بیماریاں پیچھا چھوڑ گئیں اور شامل صحت مند ہوتے چلے گئے اور اس حد تک صحت مند وتوانا ہوئے کہ قاضی ملاّ ان کے دوڑنے بھاگنے اور محنت مشقت کے اتنے قائل ہوئے کہ اپنی کم گوئی کے باوجود شامل کی جسمانی خوبیوں کا اعتراف کرتے۔

شامل کا سن پیدائش وہی ہے جو برصغیر کے مردِ حریت ٹیپو شہید کا سن شہادت ہے یعنی 1799ء۔

شامل بیس سال کی عمر میں پورے داغستان میں لاجواب تھے۔ کہتے ہیں کہ ستائیس فٹ چوڑی خندق چھلانگ لگا کر عبور کرجاتے تھے۔ انہیں کھلے سینے اور ننگے پاؤں ہر موسم میں گھومتے دیکھا گیا۔ یہ بھی قاضی ملاّ کے ساتھی تھے اور مسلمانوں کی اصلاح کے خواہشمند۔

داغستان میں یاراغل نامی شہر اس اعتبار سے زیادہ مشہور تھا کہ یہاں اہلِ تصوف پائے جاتے تھے اور صوفیائے کرام تصوف کی اعلیٰ منازل طے کرنے کے لیے یاراغل پہنچتے تھے۔

اس دور کے مشہور صوفی حاجی اسمٰعیل نے اپنے مریدِ خاص ملاّ محمد کو حکم دیا کہ وہ یاراغل جائیں اور دعوت واشاعت کا سلسلہ شروع کردیں۔ چنانچہ ملاّ محمد یاراغل کی مسجد میں داخل ہوئے اور عام تبلیغ کا کام شروع کردیا۔

یہاں جمال الدین نامی ایک اور بزرگ بھی موجود تھے۔ یہ طریقۂ طریقت کے علاوہ تزکیۂ نفس میں بھی اپنے مریدوں کی راہنمائی کرتے تھے۔

قاضی ملاّ نے بھی اپنے ساتھی شامل کے ساتھ یاراغل کا سفر اختیار کیا۔ اب قاضی ملاّ، ملاّ محمد، شامل اور جمال الدین ایک جگہ اکٹھا ہو چکے تھے۔

ملاّ محمد یہاں کے مرشد تھے اور اپنے اس مرشدی کے مقام سے سلسلۂ رشد وہدایت قائم کررکھا تھا۔ یہ کام یاراغل کی مسجد میں انجام دیا جارہا تھا لیکن یہاں کوئی بھی بڑا قدم جمال الدین کی اجازت کے بغیر نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔

قاضی ملاّ جہاد کی فوری ضرورت محسوس کررہے تھے اور صوفی ملاّ محمد کو اکساتے رہتے تھے۔

شامل نے تقریباً ہم سن اور ہم وطن ملاّ قاضی کو اپنا استاد تسلیم کرلیا تھا اور یہ بھی اصلاح اور جہاد کی طرف مائل تھے۔

ملا محمد جہاد کے معاملے میں کسی قدر انتظار کے قائل تھے۔ کہتے تھے کہ جہاد کے لیے نہ تو ماحول سازگار ہے اور نہ وقت مناسب ہے اور اس کے لیے یاراغل کے جمال الدین کی حمایت و تائید بہت ضروری ہے۔

شامل نے جمال الدین کی ہم نشینی اختیار کی اور اپنے ساتھیوں کو یقین دلایا کہ وہ جمال الدین کو جہاد پر آمادہ کر لیں گے لیکن جب بھی اس موضوع پر بات ہوئی، انہوں نے شامل کو سمجھایا۔ ''میں تیرے جذبۂ جہاد کی تعریف کروں گا مگر صاحبزادے! پہلے مسلمانوں کی اصلاح کی جائے۔ ان میں اتحاد و اتفاق قائم کیا جائے۔ یہ بھی کوئی جہاد سے کم کام نہیں ہے۔ جب یہ سچے مسلمان ہو جائیں گے تو یہ سچے مجاہد بھی بن سکیں گے۔''

لیکن جمال الدین کی نظریں روس کی استعماریت پر تھیں جس نے اٹھارھویں صدی کے آخری عشرے سے داغستان میں اپنے قدم جمانے شروع کر دیے تھے۔ یہاں کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں نے روس کی بالادستی قبول کرنا شروع کر دی تھی۔ اس طرح شمال مشرقی داغستان ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مختولی کے خان نے بھی روسی شہنشاہیت کو قبول کر لیا۔ دربند پر بھی روس کا قبضہ ہو گیا۔ 1803ء میں داغستان کے سب سے اہم علاقے آویریا کو روسی سرحد میں شامل کیا گیا۔ 1806ء میں باکو اور کوبہ پر روس کا تسلط ہو گیا۔ 1813ء میں ایران نے روس سے عہد نامہ گلستان کے نام سے جو معاہدہ کیا اس میں ایران نے دربند، کورین، طالش، شکین، شیروان اور قراباغ کے علاقوں پر بھی روس کی بالادستی تسلیم کر لی۔

1820ء میں قاضی قومخ کے خان نے ہمت سے کام لیا اور اپنے علاقوں میں آزادی کا علم بلند کیا مگر اس کے علاقوں پر زبردستی قبضہ کر لیا گیا۔ 1824ء میں کوزوبو کے علاقے کے رہنے والوں نے اعلان کیا کہ وہ روس کے وفادار رہیں گے۔ اسی علاقے میں شامل کا وطن غمری بھی واقع تھا۔

قاضی ملا نے ان حالات میں یہ فیصلہ کیا کہ پہلے اسلامی کردار پیدا کیا جائے۔ روسی حکومت بہت طاقتور تھی اور متفرق اور منتشر بے عمل اور نام نہاد مسلمان کسی طرح روس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنے کام کا آغاز شراب نوشی کے خلاف جہاد سے کیا کیونکہ شراب ہی ام الخبائث تھی۔

قاضی ملا کی تحریک کا نام مریدیت تھا اور مریدیت میں داخل ہونے والوں کو شراب نوشی کے خلاف جدوجہد کرنا پڑی۔ ہر اعتبار سے یاراغل کو بڑی اہمیت تھی۔ جب شراب نوشی کے خلاف آواز بلند ہوئی تو ان بزرگوں کی شخصیت نے بڑا اثر دکھایا اور لوگ شراب سے تائب ہونے لگے۔ یہاں تک کہ جب قاضی ملا یاراغل سے کامیاب و کامران اپنے وطن غمری میں پہنچے تو لوگوں نے ان کا بہت شاندار استقبال کیا۔ فرطِ عقیدت سے ان کے جبّے کو بوسے دیے اور کئی لوگوں نے جذباتی ہو کر خود اپنے آپ کو مارا پیٹا۔

روسی حکومت ان حالات پر کڑی نظریں رکھے ہوئے تھی۔ جب تک یہ اصلاحی عمل جاری رہا، روس خاموش رہا لیکن قاضی ملا کو جلدی تھی اور انہوں نے کھلے عام تبلیغ شروع کر دی۔ قاضی ملا بہت بلند پایہ خطیب تھے۔ چار سو احادیث کے حافظ تھے۔ یہ ان احادیث کو دورانِ تقریر موقع موقع سے استعمال کرتے رہتے تھے۔

شراب نوشی کے بعد مروجہ غلط رسم و رواج کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ان کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علاقہ تارکو کے شامخال نے قاضی ملا کو اپنے دارالحکومت میں بلایا اور خواہش ظاہر کی کہ مسجد میں تبلیغ کریں اور ساتھ ہی اریلی نامی مقام کا منصبِ قضاۃ ان کو بخش دیا۔ حالانکہ ان دنوں تارکوز اور روس نکولائی کا وفادار اور باج گزار تھا اور اسے روسی فوج میں میجر جنرل کا عہدہ بھی حاصل تھا۔

قاضی قومخ کے ارسلان خان نے قاضی ملا کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا اور ان کی شہرت پورے داغستان میں پھیلتی چلی گئی اور ان کے پیروکاروں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ابھی تک تو یہ شریعت کے نفاذ پر ہی زیادہ زور دے رہے تھے اور مقامی رسوم اور بدعات کو ختم کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ ان کے ساتھی شامل نہایت جوش و خروش سے ان کا ساتھ دے رہے تھے۔

یاراغل کے جمال الدین نے نوجوان شامل میں کردار کی بلندیاں دیکھیں تو اپنی بیٹی زیدت سے ان کی شادی کر دی۔

اتنے قریبی رشتے کے بعد شامل نے جمال الدین سے درخواست کی کہ انہیں جہاد کی اجازت دی جائے اور وہ خود بھی تبلیغِ جہاد میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔

اس بار پھر جمال الدین نے انکار کر دیا کہ وہ خود بھی فی الحال جہاد میں حصہ نہیں لیں گے اور دوسروں کو بھی روکیں گے۔

شامل نے ادھر سے مایوس ہونے کے بعد قاضی ملّا سے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں حکم دیتا ہے کہ منکروں اور کافروں سے جہاد کرو مگر جمال الدین اس کی اجازت نہیں دیتے۔ بتائیے میں کیا کروں؟''

دوسری طرف سے جواب ملا۔ ''ہمیں انسانوں کے بجائے اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرنی چاہیے۔''

اجازت کا ملنا تھا کہ جہاد اور شریعت کے نفاذ کی تحریک شروع ہوگئی۔ یہ کام انہوں نے اپنے وطن سے شروع کیا۔

روسی حکومت نے داغستان کی سرحدوں پر جنگجو قبائل کاسک کو زرخیز زمینیں دیں۔ انہیں یہاں آباد کیا اور ان کے ذمے اس علاقے کی دفاعی ذمے داری رکھ دی گئی۔

ان کے مقابلے میں مسلمانوں کے پاس گھوڑے تھے، تلواریں تھیں، خنجر تھے، بندوقیں اور رائفلیں بھی تھیں مگر نہایت محدود تعداد میں۔ خنجر کو یہ لوگ کنجل کہتے تھے اور یہ ان کا پسندیدہ ہتھیار تھا۔

مسجدیں آباد ہونے لگیں۔ دوسروں کی بہ نسبت شامل نے بہت زیادہ جوش و خروش سے اپنے منصوبے پر کام شروع کر دیا اور مسلمانوں پر مسلمانوں کا قتل حرام قرار دیا۔ اگر کہیں اتفاق سے کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تو شامل کوشش کرتے کہ مقتول زیادہ فراخ دلی دکھائے اور قاتل سے خون بہانہ لے اور اپنا قتل معاف کر دے۔

اگر کوئی خون بہا لینے پر تیار نہ ہوتا تو اسے دیت پر آمادہ کیا جاتا اور اس جھگڑے کو کچھ اس طرح ختم کیا جاتا کہ جذبۂ انتقام سرد پڑ جاتا۔ یہ خبریں روسی حکومت تک پہنچ رہی تھیں اور زار اس علاقے کی طرف سے فکر مند ہو گیا۔ فوجی کارروائیوں کے لیے بہانے تلاش کیے جانے لگے۔

شامل کی یہی جدوجہد اور یہی کوششیں تھیں کہ لوگوں نے انہیں امام شامل کہنا شروع کر دیا۔ جب تک قاضی ملّا کی ذات ان میں موجود رہی، امام شامل، قاضی ملّا کے تابع رہے۔ ملا محمد بھی لوگوں کو جہاد پر اکسانے لگے۔ ان کا نعرہ تھا کہ غیور سے نجات حاصل کرو۔ یہاں لفظ غیور ان معنی میں استعمال نہیں کیا گیا جن معنی میں اردو میں مستعمل ہے۔ ان کی غیور سے مراد غیر قوم سے تھی اور اس لفظ غیور کو کچھ اس طرح استعمال کیا گیا کہ مسلمانوں کے نزدیک یہ لفظ گالی کے مترادف قرار پایا۔

تحریکِ جہاد کی ابتدا قاضی ملّا سے ہوئی تھی اور یہ آواز پہلی بار 1829ء میں سنی گئی۔ غمری میں ایک عام اجلاس منعقد ہوا۔ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نے اس میں شرکت کی۔ داغستان کے مختلف علاقوں سے علماء اس اجلاس میں شامل ہوئے۔ سب نے قاضی ملّا کو امام بنا دیا اور یہاں سے جہاد کا اعلان کر دیا گیا۔

آور نامی صوبہ قریب تھا اور یہ نہایت اہم تھا۔ یہاں کا خان نابالغ تھا۔ حکومت اس کی ماں پاخو بیگ نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھی تھی۔ ذہانت اور شجاعت میں اس عورت کا کوئی جواب نہ تھا۔

قاضی ملّا نے تین ہزار مجاہدین کے ساتھ کوچ کیا۔ آندی پہنچے تو اتنے ہی افراد مزید شامل ہو گئے اور آگے بڑھے تو مخالفت شروع ہوگئی۔ زیادہ شدت کی مخالفت نے مسلح مزاحمت کی شکل اختیار کر لی اور دشمن حملہ آور ہوا۔ قاضی ملّا نے جواں مردی سے مقابلہ کیا اور دشمن کے ستائیس افراد ہلاک کر دیے۔ خاصی تعداد میں زخمی بھی ہوئے اور سات آدمی قید کر لیے گئے۔

کمال کی بات یہ تھی کہ قاضی ملّا پیدل سفر کر رہے تھے۔ راستے میں کئی جگہ وہ رکے اور ایسا لگا جیسے وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عقیدت مندوں نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ کو کچھ سنائی دے رہا ہے؟''

کچھ توقف کے بعد جواب دیا۔ ''میں زنجیروں کی آواز سن رہا ہوں اور ایسا لگتا ہے کہ روسی سپاہی زنجیروں میں بندھے ہوئے میرے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں۔''

گویا یہ بشارت تھی جس سے مجاہدین کے حوصلے بڑھ رہے تھے اور ان کا جوش اور ولولہ مجاہدین میں منتقل ہو رہا تھا۔

دوبارہ سفر شروع کیا تو ایک جگہ پتھر پر بیٹھ گئے اور اعلان کیا۔ ''ہم قفقاز سے غیور قوم کو نکال باہر کریں گے اور اللہ نے چاہا تو ماسکو پر بھی اپنا قبضہ ہو جائے گا اور پھر وہاں سے استنبول پہنچیں گے۔ اگر ترکی کا سلطان شریعت کا عامل ہوا اور نیک نکلا تو اسے حکمران رہنے دیں گے اور اگر وہ اس کے برعکس نکلا تو ہم اسے معزول کر دیں گے، زنجیروں سے جکڑ دیں گے اور اس کی سلطنت مومنین کے حوالے کر دی جائے گی۔''

لوگوں کے لیے یہ بشارتیں تھیں۔ انہوں نے دوبارہ سفر شروع کیا۔ آندی کے قریب پہنچے تو مسلمانوں نے باہر نکل کر ان کی راہ میں اپنی چادریں بچھا دیں۔ آور میں بھی ایسا ہی ہوا۔ لوگ دیدہ و دل فرشِ راہ کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ خونزاخ کے سامنے پہنچ گئے۔ اس قصبے میں سات سو گھر تھے۔ یہاں سے ایک شخص بھی ان کے استقبال

کے لیے باہر نہ آیا۔ یہ لوگ پاخو بنگی کے وفادار تھے اور یہاں پاخو بنگی نے زبردست مورچابندی کررکھی تھی۔

یہ روائی کا دسواں دن تھا۔ 14 فروری 1830ء کو قاضی ملّا نے اپنے مریدوں کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ ایک کی قیادت قاضی ملّا کررہے تھے اور دوسرے کی قیادت امام شامل کررہے تھے۔

خونزاخ کے لوگوں نے ہتھیار اٹھا رکھے تھے۔ بندوقیں اور رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ انہوں نے اعلانِ جنگ کیے بغیر ہی فائرنگ شروع کردی اور دوسری طرف سے قاضی ملّا نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور زور زور سے قرآنی آیات کی تلاوت ہونے لگی۔ بظاہر یہ آوازیں حلق سے نکل رہی تھیں مگر ان میں روحانی قوت شامل تھی۔ خونزاخ والوں پر لرزہ طاری ہوگیا۔ فائرنگ کا سلسلہ بند ہوا اور مسلمانوں کی طرف سے حملے کا آغاز ہوا۔

وہیں پاخو بنگی بھی موجود تھی۔ اپنے آدمیوں کی بدحواسی پر اسے بے حد غصہ آیا۔ وہ اپنی تلوار سونت کر مبہوت اور خوفزدہ لوگوں کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس وقت اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ اس نے لوگوں کو غیرت دلائی۔ ''اگر تم خوفزدہ ہو تو اپنے ہتھیار ہم عورتوں کو دے دو اور ہمارے چوغوں کے پیچھے پناہ گزیں ہوجاؤ کیونکہ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ ہتھیار اٹھاسکو۔''

مردوں کو غیرت نے جان دینے اور جان لینے پر آمادہ کردیا۔ خطرناک جنگ شروع ہوگئی۔ مردوں میں ایک عورت کی موجودگی نے کچھ زیادہ ہی جوش پیدا کردیا تھا۔ پاخو بنگی کے دفاعی انتظامات بھی بھرپور تھے اور فوج بھی بہت تجربے کار تھے۔ عورت نے جنگ کا پانسا پلٹ دیا۔ دو سو مسلمان شہید ہوگئے، بے شمار زخمی ہوئے اور ساٹھ مسلمان قید کرلیے گئے۔

امام شامل زخمی ہوئے اور ایک مرید نے انہیں بچالیا۔

اس معرکے میں قاضی ملّا کے ایک مرید حاجی مراد نے بڑا نام پیدا کیا اور یہ اسی مردِ مجاہد کا کارنامہ تھا کہ اس نے مجاہدوں کے جنگی پرچم اور جنگی ہتھیاروں کو بچالیا تھا۔

قاضی ملّا کو اس شکست نے بے حد غمزدہ کردیا تھا اور یہ غمری واپس چلے گئے۔

قاضی ملّا اسے اپنی شکست سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ سمجھ رہے تھے۔ وہ اب بھی خونزاخ کی تسخیر سے مایوس نہیں ہوئے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ پاخو بنگی کو شکست دینے کے بعد آور پر حملہ کیا جائے۔ اس فتح سے ان کو روسیوں کا ایک قلعہ میسر آجاتا۔

روسی بھی غافل نہیں تھے۔ زار نے روسی کمانڈر بیرن روزن کو ان کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ ابھی وہ راستے میں تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ قاضی ملّا، پاخو بنگی سے شکست کھا کر غمری واپس جاچکے ہیں۔ یہ روسی جرنیل ایک دوسری سمت کو غراخ چلا گیا اور آس پاس کے تمام علاقوں پر قابض ہوگیا۔ یہاں قریب ہی غمری تھا۔ غمری کے لوگوں نے امام شامل اور قاضی ملّا کا ساتھ دیا۔ بہت جلد ایک بڑی تعداد ان کے پرچم تلے جمع ہوگئی۔

اب ان کا رخ گاٹھ قلعے کی طرف تھا۔ اس کی حفاظت میجر جنرل پرنس بیکووچ کے ذمے کی گئی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ قاضی ملّا کو پیچھے دھکیل دے مگر ناکام رہا۔ قاضی ملّا یہاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اتلی بویون کی طرف روانہ ہوگئے۔

یہاں کمانڈر بیرن توبے ان کے انتظار میں تھا۔ قاضی ملّا نے اسے بھی شکست دی اور روسی قلعے بورنایا کی طرف روانہ ہوگئے۔

یہاں توپیں مسلمانوں کا انتظار کررہی تھیں۔ روسی توپیں حرکت میں آئیں۔ اگر یہاں بھی روسیوں کو شکست ہوجاتی تو ان کا تارکوف پر قبضہ ہوجاتا۔ یہاں اچانک روسی کمک پہنچ گئی۔ مقابلہ سخت ہوا اور قاضی ملّا کو ایک بار پھر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

قاضی ملّا نے فرار ہوکر خومشقند میں پناہ لی۔ جس دن یہاں پناہ لی، یہ مئی 1831ء کا آخری دن تھا۔

اب بھی قاضی ملّا کی نظریں قلعہ ویز اپنایا پر تھیں۔ یہاں روسی کمانڈر بیرن روزن ان کا منتظر تھا۔ قاضی ملّا نے اس قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ ایک دوسرا جنرل ایموہیل قلعے کی طرف بڑھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ بیرن روزن اس قلعے کو نہیں بچاسکے گا۔ یہ دوسرا جنرل قاضی ملّا کے عقب میں آکر انہیں اپنے محاصرے میں لے لینا چاہتا تھا۔

قاضی ملّا نے قریبی جنگل میں پناہ لی۔ اس جنگل میں بھی سخت معرکہ ہوا۔ روسیوں کو شکست ہوئی۔ ایک توپ قاضی ملّا کے قبضے میں آگئی اور جنرل ایموہیل زخمی ہوگیا اور اس نے اپنی کمان جنرل ولیم نوف کے سپرد کردی۔

قاضی ملّا ایک بار پھر خومشقند چلے گئے۔ یہاں کے علاقوں کے لوگوں کا ایک وفد ان سے ملنے آیا۔ اس نے انہیں دعوت دی کہ دربند پہنچ کر روسیوں کے خلاف جہاد کریں۔

دربند کا محاصرہ ہوا اور قاضی ملا نے آٹھ دن تک قلعے کا محاصرہ کیے رکھا مگر یہاں انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ دربند کا محاصرہ اٹھا لیا گیا اور ایک دوسرے شہر کزلیر پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ یہاں سے ان کو دو سو قیدی اور تقریباً چار لاکھ روبل مالِ غنیمت میں ملے۔

یکم دسمبر 1831ء کو جنرل کا خالوف کو حکم دیا گیا کہ وہ قاضی ملا کی پناہ گاہ خومشقند پر قبضہ کر لے۔ اس نے ایک دوسرے کرنل کو اس مہم پر روانہ کر دیا۔ اس کرنل نے حملہ کیا مگر یہاں اتنی سخت مزاحمت ہوئی کہ اس معرکے میں چار سو روسی مارے گئے۔ مارے جانے والوں میں یہ کرنل بھی شامل تھا اور آٹھ دوسرے افسر بھی۔

یہ مقابلہ روسی افواج کو بہت مہنگا پڑا۔ مجاہدوں کے پاس جو توپ تھی اس کی حصولیابی کی کوشش میں اسی روسی سپاہیوں نے اپنی جانیں گنوائیں۔

اب قاضی ملا کے سامنے تختینیا کا علاقہ تھا۔ اگر تختینیا سے قفقاز تک قاضی ملا کا قبضہ ہو جاتا اور داغستان بھی ان کے قبضے میں ہوتا تو ایک متحدہ مسلم قوت وجود میں آ جاتی۔ تختینیا میں انہوں نے نزران کا محاصرہ کر لیا۔ کئی جگہ کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں لیکن خاص نزران میں کوششوں کے باوجود کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

تختینیا میں غیر مسلم قبائل بھی موجود تھے۔ ان میں تبلیغ کے لیے علما بھیجے گئے اور کافی کافروں کو مسلمان کر لیا گیا۔

اس علاقے کے جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، ان لوگوں میں جذبۂ ایمانی کچھ زیادہ ہی پایا جاتا تھا۔ حالانکہ یہاں نومسلموں کا کسی سے کوئی تصادم نہیں تھا مگر مقامی عیسائیوں اور پادریوں کو نئے مسلمانوں سے شکایت پیدا ہوگئی۔ شکایت یہ تھی کہ وہ مسلمان کیوں ہو گئے۔ ان مسلمانوں نے مقامی عیسائیوں اور پادریوں کی مداخلت کو اپنی آزادی پر حملہ قرار دیا۔ نئے مسلمانوں میں جوشِ ایمانی کی فراوانی تھی اور مقامی عیسائیوں اور پادریوں میں غم و غصہ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں میں تصادم ہو گیا اور کئی عیسائی اور پادری قتل کر دیے گئے۔ روسی پولیس آفیسر نے مداخلت کی تو وہ بھی مارا گیا۔ بظاہر یہ کوئی بڑا واقعہ نہیں تھا لیکن روسی حکومت اس واقعے کو کسی اور ہی پس منظر میں دیکھ رہی تھی۔ اس کو تختینیا سے یہ خبریں پہنچ رہی تھیں کہ قاضی ملا اور امام شامل اس علاقے میں تبلیغِ اسلام میں کوشاں ہیں اور لوگ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں جس سے حکومت کے علاوہ عیسائیت کو بھی خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔

روسی حکومت کو یہ اطلاعات بھی ملی تھیں کہ قاضی ملا اور امام شامل حصولِ تعلیم کے سلسلے میں اس علاقے میں کافی وقت گزار چکے ہیں اس لیے وہ یہاں کے راستوں اور گلی کوچوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔

ان حالات میں اگر اسلامی تبلیغ و اشاعت کی کوششیں جاری رہیں اور مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہوتا رہا تو روسی حکومت کے لیے مشکلات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس علاقے کا ماہر روسی کمانڈر بیرن روزن تھا اور جنرل ولیم نوف چیف آف دی اسٹاف تھا۔ جنرل بیرن روزن کو حکم دیا گیا کہ وہ قفقاز جائے اور نومسلم قبیلے گالگیز کی زیادتیوں کا خاتمہ کرے۔

بیرن روزن نے مذکورہ قبیلے کو حکم دیا کہ عیسائیوں، پادریوں اور پولیس افسروں کے قاتلوں کو حکومت کے حوالے کر دیں ورنہ قاتلوں کو بزورِ قوت حاصل کر لیا جائے گا۔

گالگیز والوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا اور بیرن روزن نے فیصلہ کیا کہ وہ گالگیز والوں کے خلاف فوجی کارروائی کرے گا۔

اطلاعات کے مطابق چودہ میل دور یہ جگہ دشوار گزار راستوں سے ملی ہوئی تھی اور یہاں فوجی ساز و سامان کے ساتھ پہنچنا دشوار ہی نہیں، ناممکن تھا لیکن کارروائی بھی بہت ضروری تھی اس لیے اس نے تین ہزار سپاہیوں، چار پہاڑی توپوں اور پانچ سو ملیشیا پر مشتمل جوانوں کا ایک دستہ تیار کیا۔

سڑکوں کی عدم موجودگی میں یہاں فوج اپنے ساتھ خیمے وغیرہ نہیں لے جا سکتی تھی اس لیے حکم دیا گیا کہ چند افسروں کے خیموں کے سوا سارا سامان رہنے دیا جائے اور ہر شخص اپنے ہتھیاروں اور بسکٹوں کا تھیلا اپنے ساتھ رکھے۔ تھیلوں کے یہ بسکٹ چھ دن کی غذا کے لیے کافی تھے۔

ایک دن ایک رات سفر کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ کمانڈر انچیف، چیف آف دی اسٹاف اور چانسلری کے خیمے ساتھ رکھے جائیں اور ان کے سوا دیگر فوجی افسروں کے خیمے راستے میں ہی چھوڑ دیے جائیں اور یہ سفر پھر شروع کر دیا گیا۔

چوتھے دن یہ معلوم ہوا کہ آگے جانے کا راستہ اتنا تنگ ہے کہ اب فوجیوں کو ایک قطار میں چلنا پڑے گا۔ توپوں کے

لیے خچر حاصل کیے گئے تھے اور جب یہ قافلہ اس صورت روانہ ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ مختصر فوجی قافلہ پانچ میل کی لمبائی میں پھیلا ہوا تھا لیکن روسیوں کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں ابھی تک کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا لیکن پانچویں دن کسی نامعلوم سمت سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور اس آواز نے روسیوں کو محتاط کر دیا۔

روسیوں نے اپنی راہ میں حائل فصلوں کا صفایا کر دیا۔ پُرامن گاؤں بھی برباد کر دیے گئے۔ مسلمانوں نے اِکا دُکا پیچھے رہ جانے والے سپاہیوں کا صفایا کر دیا اور پہاڑی سے روسی فوجیوں پر بھاری پتھر بھی لڑھکاتے رہے۔ بیرن روزن کو یہ معلوم ہوا تھا کہ آگے قصبہ توری ہے اور اس قصبے کے مسلمان بہت پُرجوش اور جنگجو ہیں۔ یہ لوگ قصبہ توری کو تباہ و برباد کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

ابھی قصبہ توری کچھ دور تھا کہ روسی فوج کو بلندی پر ایک برج دکھائی دیا۔ اس برج سے وقفے وقفے سے گولیاں چل رہی تھیں اور روسی سپاہی مارے جا رہے تھے۔ روسیوں نے بھی گولیاں چلانا شروع کر دیں اور تین دن تک یہ مقابلہ جاری رہا۔ روسیوں کی پیش قدمی رک گئی۔

روسیوں کو یقین تھا کہ اس برج میں زیادہ اسلحہ نہیں ہوگا۔ جب ختم ہو جائے گا تو روسی فوج آگے بڑھنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ تین دن کی مزاحمت کے بعد روسیوں کے لیے صبر کرنا مشکل ہو گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ چٹان میں سوراخ کر کے بارودی سرنگ بچھائی جائے اور برج کو اڑا دیا جائے۔

منصوبے پر عمل ہوا اور اس ترکیب سے روسی فوج اس برج میں داخل ہوئی تو ان کی ملاقات دو مسلمانوں سے ہوئی۔

بیرن روزن نے ان دونوں سے پوچھا۔ ”بقیہ فوجی کہاں بھاگ گئے اور کس راستے سے بھاگے؟“

دونوں مجاہدوں نے جواب دیا۔ ”اس برج میں صرف ہم دو تھے۔ ہم دونوں کے سوا تیسرا کوئی نہیں تھا۔ تو معلوم نہیں کس فوج کا ذکر کر رہا ہے؟“

لیکن بیرن روزن کو کسی طرح یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ صرف دو مسلمانوں نے اس کو تین دن تک روکے رکھا تھا اور بیرن روزن ہی کو نہیں، کسی کو بھی اس عجیب و غریب مزاحمت پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن یہ واقعہ تھا۔

توری پر روسی فوج کا قبضہ ہو گیا اور گالگیر قبیلے کی مہم کا خاتمہ ہو گیا۔

جنرل ویلیم نوف کو یہ حکم مل چکا تھا کہ اس علاقے کے مجاہدوں کا مکمل طور پر خاتمہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ نو ہزار جوانوں اور اٹھائیس توپوں کے ساتھ چیچنیا کے زیریں علاقوں کی طرف بڑھا۔ راستے میں جنگلات حائل تھے لیکن اس جنگل میں ایک راستہ ضرور ہونا چاہیے تھا کیونکہ فوجی ریکارڈ میں یہ موجود تھا کہ بارہ سال پہلے 1820ء میں روسی جنرل یرملوف نے اس جنگل کے درمیان سے ایک سڑک نکالی تھی اور اس سڑک کے دونوں طرف کا راستہ صاف کیا گیا تھا لیکن بعد میں جب اس راہ سے کوئی کام نہیں لیا گیا تو دوبارہ جنگل اگ آیا۔ جنرل یرملوف کی بنائی ہوئی سڑک غائب ہو گئی اور سڑک کے آس پاس کے صاف کیے ہوئے حصے دوبارہ اُگنے اور بڑھنے والے درختوں میں چھپ گئے۔

روسیوں کی فوج میں مقامی سپاہی بھی تھے۔ یہ تاتاری نسل سے تعلق رکھتے تھے اس لیے انہیں آگے رکھا جاتا اور ان سے بڑے بڑے کام لیے جاتے۔

سفر مسلسل جاری رکھنا اس لیے دشوار تھا کہ قاضی ملا اور امام شامل کے مجاہد ان علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ ان کا راستہ روک رہے تھے۔ کہیں کہیں سے فائرنگ بھی ہو رہی تھی اور روسی فوجی مارے جا رہے تھے لیکن مجبوری یہ تھی کہ یہ حملہ آور مجاہد کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ اندازے سے بس یہی ممکن تھا کہ جہاں کہیں سے دھواں اٹھتا نظر آئے تو سمجھ لیں کہ یہ دھواں کسی آبادی سے اٹھ رہا ہے اور روسی اس دھوئیں کی طرف گولیاں چلانا شروع کر دیں اور کچھ دیر بعد مقامی تاتاری سپاہیوں کو اس طرف بھیج دیا جائے کہ وہ ہلاک ہونے والوں کو تلاش کریں اور ان کی لاشیں اٹھا لائیں۔

کئی بار ان کوششوں میں ناکامی ہوئی کیونکہ تاتاری سپاہی جستجوئے بسیار کے باوجود خالی ہاتھ واپس آئے۔

روسی فوجیوں کا یہ سفر جاری رہا۔ جنگلی راستوں کی تلاش جاری رہی، درخت کٹتے رہے پھر ندیاں بھی حائل ہو گئیں۔ اب روسی سپاہیوں کو اور زیادہ دشواریاں پیش آنے لگیں۔ آگے جا کر ان پر باقاعدہ حملے بھی ہونے لگے۔ یہ حملہ آور کسی طرف سے اچانک نمودار ہوتے اور مدافعت کا موقع دیے بغیر جانی نقصان پہنچا کر غائب ہو جاتے۔

روسی جنرل بے حد پریشان تھا کہ یہ کیسے جنگی ماہر ہیں جو کسی طرح ان کے قابو میں نہیں آ رہے۔ یہ کیسا طریقۂ جنگ تھا جو

روسیوں کے لیے نا قابلِ فہم بنا ہوا تھا۔ وہ یہ سوچ رہے ہوتے کہ حملہ آور ان کو نقصان پہنچا کر بائیں طرف کے جنگلات میں فرار ہوئے ہیں تو اسی طرف سے واپس آکر دوبارہ حملہ آور ہوں گے مگر دوسری بار یہ حملہ آور اچانک سامنے سے نمودار ہوتے اور مارتے، کاٹتے ان کے عقب میں غائب ہوجاتے۔

آگے بڑھنے والی فوج کے لیے یہ ناممکن ہوجاتا کہ وہ اپنے دشمن کی تلاش میں مزید آگے جائیں۔ جیسے ہی وہ رکتے، ان پر بائیں طرف سے حملہ ہوجاتا۔ یہ انتہائی دشوار طریقۂ جنگ تھا جس سے مسلسل روسیوں کو نقصان پہنچ رہا تھا اور مسلمان بالکل محفوظ تھے پھر بھی جن حصوں کو یہ روسی پیچھے چھوڑ آئے تھے، وہاں انہیں نہ تو جنگی مورچے ملے تھے اور نہ مسلمانوں کی آبادیاں۔ ان کا عقب بڑی حد تک محفوظ تھا۔

انہوں نے کچھ تامل کے بعد آگے بڑھنا شروع کردیا پھر ان پر اچانک زیادہ حملے ہونے لگے جس سے انہیں معلوم ہوا کہ ہو نہ ہو کہیں قریب ہی مسلمانوں کی بستیاں ضرور موجود ہیں۔

اس شبہے کو ایک تاتاری سپاہی نے یقین میں بدل دیا۔ اس نے بتایا کہ اس جنگل کو عبور کرنے کے بعد وہ مسلمانوں کی ایک ایسی بستی میں داخل ہوجائیں گے جہاں مسلمانوں کے تقریباً آٹھ سو گھر آباد ہیں اور یہ سارے ہی لوگ اعلیٰ پائے کے جنگجو ہیں اور اگر ان کی عورتوں، بچوں کو دیکھ کر یہ شبہ کیا جائے کہ وہ روسی سپاہیوں کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں تو یہ روسیوں کی غلط فہمی ہوگی کیونکہ یہاں کے بچے اور عورتیں بھی بلا کے جنگجو ہیں۔

روسی جنرل کو اس کا تجربہ بھی ہوگیا۔ کئی جگہ روسی فوج کو نقصان اٹھانے کے بعد تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ ان کو نقصان پہنچانے والے عورتیں اور بچے تھے۔

تاتاریوں نے روسی جنرل کو بتایا کہ یہاں قاضی ملّا اور امام شامل نے مسلمانوں میں ایسی روح پھونک دی ہے کہ وہ کسی طرح ہتھیار نہیں ڈالیں گے اور جنگ جاری رکھیں گے۔ مسلمانوں کے بچے اور عورتیں بھی مجاہدوں کے شریکِ کار ہیں اور انہوں نے اپنی تعداد کی کمی کی وجہ سے ایک ایسا طریقۂ جنگ دریافت کیا ہے کہ انہیں دشمن کی بڑی سے بڑی فوج بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی اور یہ اچانک حملے کرکر کے دشمن کی طاقت کو کم کرتے رہیں گے۔

ان حالات میں روسی جنرل کو انتہائی غور و فکر اور تدبر سے کام لینا پڑا۔

جنرل نے جنگل کی صفائی کرکے فوج کے لیے ایک مستقر قائم کیا۔ یہاں فوج کا توپ خانہ بھی پہنچا دیا گیا اور دوسرا فوجی ساز و سامان بھی۔ گھوڑے اور مویشی بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان مویشیوں کے لیے گھاس درکار ہوتی تو سپاہی گھاس کاٹنے کے لیے اِدھر اُدھر چلے جاتے کیونکہ مویشیوں اور گھوڑوں کو یہاں چرنے کے لیے چھوڑ دینا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ان پر مسلمانوں کا قبضہ ہوجاتا اور وہ انہیں لے کر غائب ہوجاتے۔

سپاہیوں کو گھاس کاٹنے کے دوران یہ مصیبت پیش آتی کہ ان پر مجاہدین اچانک حملہ آور ہوجاتے اور ان کا صفایا کرکے غائب ہوجاتے۔

کچھ دنوں بعد ان گھاس کاٹنے والوں کی حفاظت کے لیے بھی فوجی دستے چھپائے جانے لگے تاکہ انہیں حملہ آور مجاہدوں سے بچایا جاسکے۔

یہ طریقہ کچھ کچھ کارگر اور مفید ثابت ہوا اور جب بھی گھاس کاٹنے والے سپاہیوں پر اچانک حملہ ہوا تو جنگل میں چھپا ہوا توپ خانہ بھی حرکت میں آگیا اور مجاہدوں پر آگ برسائی جانے لگی۔

لیکن اس خطرناک صورتِ حال میں بھی مسلمان اپنی جدوجہد سے باز نہیں آئے اور ایسے ہی ایک حملے میں ان کے سپاہی زخمی ہوکر جنگل میں روپوش ہوگئے۔

مقامی تاتاری سپاہیوں کو ان کے پیچھے روانہ کیا گیا اور ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ گرفتار ہونے والے مسلمانوں سے ان کا پتا پوچھیں اور انہیں یقین دلائیں کہ اگر وہ جنگ سے باز آجائیں تو انہیں معاف کردیا جائے گا۔

(جاری ہے)

ماخذات

سرگزشتِ مجاہدین، مولانا غلام رسول مہر۔ امام شامل، کیپٹن محمد حامد۔ تاریخ بخارا، بخارا کے امیر کی سرگزشت۔ تاتاریوں کی یلغار، ہیرالڈ لیمب۔ عثمان بطور (قازقوں کی داستان)، گوڈفرے لیاس

''تو تم یہاں مجھے ڈرانے آئے ہو؟'' وہ مجھے یک ٹک گھور رہا تھا۔

''مگر افسوس مسٹر کیسپر! تمہاری یہ کوشش کامیاب نہیں ہوگی کیونکہ تم تو خود مجھ سے ڈرے ہوئے ہو۔ کیوں...... ایسا ہی ہے نا؟'' یہ سوال کرتے ہوئے جب اس کے چہرے پر وہی عجیب اور مکروہ سی مسکراہٹ آئی تو مجھے دل ہی دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ وہ غلط نہیں تھا۔

''تم ایک گنوار ہو۔ تم میں کوئی اسٹائل نہیں۔ اب برائے مہربانی یہاں سے چلتے بنو۔ مجھے اپنے ڈرامے کی ریہرسل کرنا ہے۔'' ہاتھ لہرا کر کہتے ہوئے اس نے مجھے اپنی پیٹھ دکھائی تو

خود پرست

عائشہ نصیر

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ساری عقل سمٹ کر تمام جرائم پیشہ افراد کے دماغوں میں سما گئی ہے... کیونکہ ان کی منصوبہ بندی اور جرائم کی نوعیت ان کی تیز دماغی کو ظاہر کرتی ہے... لیکن وقت نے ہمیشہ ثابت کیا ہے کہ بظاہر عقلمند افراد کا یہ گروہ صرف عقلمند ہونے کا تماشا کرتا ہے... اور ہمیشہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی سقم ان کے منصوبے کو بے نقاب کر ڈالتا ہے... اور بالکل ایسا ہی اس قاتل کے ساتھ بھی ہوا جو خود کو بہت دانا سمجھتا تھا۔

خود پرستی کے فریب میں مبتلا ایک قاتل کی

چالاکی کا قصہ

مجھے وہاں سے دفع ہونا ہی سب سے بہتر آئیڈیا لگا۔
کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ یہ سب ایک فون کال سے شروع ہوا۔ ڈیومیک ایلیسٹر میرا ایک پرانا جاننے والا، مجھ سے اپنی لاپتا بیٹی کے بارے میں بات کرنے کے لیے مجھے اپنے فلیٹ میں آنے کو کہہ رہا تھا۔
''میں چاہتا ہوں کہ تم لوسی کو تلاش کرو کیسپر!'' اس نے لاؤنج میں بیٹھتے ہی کہا۔ ''وہ مرچکی ہے اور مجھے اس کی آخری رسومات کے لیے اس کی ڈیڈ باڈی چاہیے۔ کیا تم میری مدد کرسکتے ہو؟'' اس کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی اوور پلے ریکارڈ۔ وہ بہت ساکت تھا۔ اس کی نظریں میرے کندھے سے پرے اس اکھڑے ہوئے وال پیپر پر تھیں۔
''تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو کہ وہ مرچکی ہے؟'' مجھے حیرت ہونے لگی۔
''کیونکہ مجھے یقین ہے۔ میں بیس سالوں تک ڈیٹکٹیو رہا ہوں کیسپر ...... اور میرا تجربہ یہی کہتا ہے۔ لوسی کو یا تو کسی نے مارا ہے یا پھر وہ کسی حادثے کے بعد کسی کھائی میں پڑی ہے، ڈھونڈے جانے کے انتظار میں۔'' اس کا چہرہ ایک نامکمل پینٹنگ جیسا تھا۔ چہرے پر کوئی حرکت نہیں تھی، کوئی احساس نہیں تھا سوائے اس کی آنکھوں کے جب انہوں نے وال پیپر سے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔
''میں ہی کیوں ڈیو؟'' میں نے کہا۔ ''فورس میں اب بھی تمہارے کچھ دوست ہیں اور ان کے پاس ایک پرائیویٹ ڈیٹکٹیو کے مقابلے میں کافی وسائل ہیں۔''
''سچ ہے، لیکن پولیس ایک فریم ورک کے اندر کام کرتی ہے اور مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو ضرورت پڑنے پر ہر گہرائی میں اترنے پر تیار ہو۔''
میں نے جواب نہیں دیا مگر میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔
''اور اس کی دوسری وجہ بھی ہے۔'' اس نے کہا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔
''میں نے تمہاری بیٹی کے بارے میں سنا۔ مجھے افسوس ہے۔'' اس نے توقف کیا۔ ''لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس وجہ سے بھی شاید تم اس کیس کو الگ نظر سے دیکھو گے۔'' اس کا لہجہ جواب نرم ہو چلا تھا، اس میں ہمدردی کی آمیزش بھی شامل ہوگئی اور میں نہ چاہتے ہوئے بے چینی محسوس کرنے لگا۔
میں نے ڈیو کو آخری بار آٹھ سال پہلے دیکھا تھا۔ تب وقت ہم پر مہربان تھا۔ ہم تب بھی پولیس والے تھے اور ہم دونوں کی بیٹیاں تب ہمارے ساتھ تھیں مگر اب سب کچھ بدل گیا تھا۔ وقت بھی اور ڈیو بھی۔ اس کی سیاہ آنکھیں پیلی اور تھکی تھکی تھیں۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ تھری پیس سوٹ کی جگہ ٹریک سوٹ، بوسیدہ اور داغوں سے اَٹے جمپر نے لے لی تھی۔
میں نے اپنے دل میں یکا یک اس شخص کے لیے ہمدردی کا ایک سمندر امڈتا محسوس کیا۔
''تو تمہارا کیا خیال ہے، کیسپر؟''
''میرے خیال میں، ڈیو ...... پتا نہیں ...... میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ اگر میں نے یہ کام لیا اور اس کا کوئی حتمی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو میں تمہیں مایوس کردوں گا۔'' میں نے ہچکچاتے ہوئے اپنا ڈر اس کے سامنے رکھا۔
''میں نے اس پر پہلے ہی سوچا ہے اور میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔'' اس نے کہا۔
''کیا اس کیس میں کوئی مشتبہ ہے؟'' میں نے کچھ دیر سوچ کر اس سے پوچھا۔
''انہوں نے ایک لڑکے کو پوچھ گچھ کے لیے حراست میں لیا تھا۔ لوسی اس کے ساتھ فلیٹ شیئر کررہی تھی۔ ڈیرن ھوڈی نام کا یہ لڑکا مجھے کافی عجیب لگا۔ باقی کی تفصیلات یہاں ہیں۔'' اپنی کرسی کے پہلو سے ڈیو نے جامنی رنگ کا ایک فولڈر اٹھایا اور اسے کافی ٹیبل پر میرے سامنے کھسکا دیا۔
میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اندر شاید کوئی درجنوں فوٹو کاپی شدہ صفحات اور تصاویر تھیں جن میں ایک مخلوط نسل کی خوبصورت لڑکی موجود تھی۔ سیاہ گھنگرالے بال اور ڈیو کی طرح گہری اداس آنکھیں۔
''تمہارے پاس اب کیس کی پوری فائل موجود ہے۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے مجھے کئی لوگوں کے احسان اٹھانے پڑے ہیں۔'' ڈیو کو خفیہ معلومات کو ٹیپ کرنے اور اسے منتقل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا جاسکتا تھا لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ اس کے لیے اب قواعد کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔
''ٹھیک ہے۔'' میں نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں کہ میں کیا کرسکتا ہوں۔''
ہم نے فیس پر بحث کرنے میں ایک منٹ گزارا اور پھر ہاتھ ملائے۔ اس کی گرفت مضبوط تھی لیکن ہاتھ پتھر کی طرح خشک اور ٹھنڈے تھے۔
''میں تمہیں مطلع کرتا رہوں گا۔'' میں نے کہا۔
اس نے سر ہلایا لیکن وہ میری جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں پھر سے وال پیپر پر جم گئیں۔ میں وہاں

سے نکل آیا۔

☆☆☆

میں نے وہ شام تفتیشی فائل کو پڑھتے ہوئے گزاری۔ پولیس نے بہت اچھا کام کیا تھا مگر پھر بھی لوسی کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ حیرت کی بات تھی۔ انیس سالہ لوسی میک ایلیسٹر ڈراما ڈگری کے آخری سال میں ایک ہونہار اور پُراعتماد طالبہ تھی۔ سی سی ٹی وی میں وہ رات دس بجے بس اسٹاپ پر انتظار کرتے ہوئے نظر آئی تھی۔ آٹھ مئی کو جب وہ اگلے دن کلاس میں نہیں آئی تو اس کے دوستوں نے پولیس سے رابطہ کیا اور اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرلی گئی۔

ڈیرن ہموڈی، اس کا فلیٹ میٹ، ممکنہ مشتبہ افراد کی لسٹ میں پہلے نمبر پر تھا۔ پتا چلا کہ ڈیرن ایک سال پہلے اپنے والد پر حملہ کرنے کے الزام میں گرفتار ہو چکا تھا۔ پریشان کن طور پر اس کے پاس لوسی کے غائب ہونے والی رات اپنی عدم موجودگی کا ثبوت تھا۔ اس کے باوجود وہ شروع کرنے کے لیے ایک اچھے شخص کی طرح لگ رہا تھا۔ میں نے اس کے ایڈریس کا نوٹ بنایا۔

میں گلاس میں اپنے لیے تھوڑا سا مشروب انڈیلنے کے بعد واپس صوفے پر آکر بیٹھا تو میری لینڈ لیڈی کا ست پوئنٹر کراس میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ اس کا سر سہلاتے اور مشروب کے گھونٹ لیتے ہوئے میں ایک بار پھر ڈیو کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں نے کبھی بھی اس کے ساتھ براہِ راست کام نہیں کیا تھا۔ وہ ایک سینئر ڈیٹکٹیو تھا۔ میری یادداشت میں اس کی اچھی یاد تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس نے چالیس کا ہونے سے پہلے ہی فورس کیوں چھوڑی۔ اگر وہ کچھ سال اور رکتا تو ایک اچھی پنشن پر ہوتا مگر شاید وہ تھک گیا تھا۔ میرا استعفا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میری چودہ سالہ بیٹی نے ٹرین کے آگے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی تھی اور پھر میرے اندر وہ بات نہیں رہی مگر پچھلے کچھ سالوں سے میں نے اپنی زندگی کے اس حصے کو ایک فاصلے پر رکھا ہوا ہے۔ میں خود کو یاد نہیں دلاتا جب تک کہ کوئی اور مجھے یاد نہ دلائے۔

☆☆☆

وہ موسم گرما کی ایک روشن صبح تھی۔ میں اس جدید نظر آنے والے بلیوڈ اسٹون کے فلیٹ کے مخالف سمت کھڑا تھا جو وہ لوسی کے گمشدہ ہونے سے پہلے تک، لوسی کے ساتھ شیئر کیا کرتا تھا۔

ڈیرن آٹھ بجے نمودار ہوا۔ وہ مین ڈینم اور زرد ٹینکی ٹاپ میں ملبوس تھا۔ اس کی ناک، ہونٹ اور کان چھدے ہوئے تھے اور اس کے ناخن سرخ رنگ کے تھے۔ وہ عرب تھا شاید۔ میرا مشاہدہ اس معاملے میں زیادہ اچھا نہیں ہے۔ اس کی دائیں آنکھ کے نیچے زخم کا نشان تھا۔

میرے جوتوں کی آواز نے اسے تیزی سے مڑنے پر مجبور کردیا۔

''ہیلو، ڈیرن!'' میں نے کہا۔

''کیا میں آپ کو جانتا ہوں؟'' وہ اجنبی نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

''ابھی تک نہیں۔'' میں نے اپنا بزنس کارڈ باہر نکالا۔ ''لوسی کے والد نے مجھے ہائر کیا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کیا ہم بات کرسکتے ہیں؟''

''اس کے پاپا؟'' اس کی آنکھوں میں خوف امڈ آیا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا۔''

''دیکھو، میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ میں صرف اسے ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔''

اس نے جھجکتے ہوئے میرا کارڈ لے لیا۔ میں اس کے ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے ناخن بہت خوبصورت طریقے سے پینٹ کیے گئے تھے۔ میں تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔

''اس میں لکھا ہے کہ تم پرائیویٹ ڈیٹکٹیو ہو۔ لوتھر کی طرح؟''

''نہیں، لوتھر پولیس کے لیے کام کرتا ہے۔ میں اپنے کلائنٹس کے لیے اور لوتھر مجھ جیسا سخت نہیں ہے۔'' میں نہیں چاہتا تھا وہ مجھ سے کوئی بات چھپانے کا سوچے بھی۔ ''دس منٹ، ڈیرن! تم کیا کہتے ہو؟''

''ٹھیک ہے، لیکن ہم کسی پبلک پلیس پر بات کریں گے۔ میں تمہیں اپنے فلیٹ میں نہیں لے جاسکتا۔ تم کوئی قاتل بھی ہوسکتے ہو۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے سر ہلایا۔

''وہاں بچوں کا پارک ہے۔'' اس نے مجھے مطلع کیا۔

''وہیں چلتے ہیں۔''

ہم نے ایک کھیل کے میدان کی طرف ٹہلنا شروع کیا۔

''تو تمہاری آنکھ کے نیچے یہ زخم کیسے آیا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

ڈیرن نے کندھے اچکائے۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

ہمارے بائیں طرف ایک بینچ پر ایک بوڑھا شرابی لیٹا تھا اور اپنے وائٹ ڈائمنڈ کے ٹن کو گھورتے ہوئے غصے

سے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور کچھ نہ سمجھ میں آنے والا ریمارک پاس کیا۔

''ڈیو سمجھتا ہے کہ لوسی مر گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔''

''کیا اس بارے میں کچھ اور بتانا چاہو گے؟'' ہمارے پیچھے اس بوڑھے شرابی نے گانا شروع کردیا تھا۔ ہم نے اسے نظرانداز کیا۔

''لوسی مجھے وہ سب کچھ بتاتی تھی جو اس کی زندگی میں چل رہا تھا۔ وہ ایسے غائب ہونے والی لڑکی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ کچھ تو ہوا ہے اور میں شرطیہ کہتا ہوں کہ اس کا باپ خود کو مجرم محسوس کررہا ہے۔''

''مجرم؟'' میں چونکا۔

''وہ جانتا ہے کہ لوسی کے غائب ہونے کی وہ خود ایک وجہ ہوسکتا ہے۔'' وہ بولا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ وہ اس میں ملوث ہے؟''

''ایسا نہیں جیسا تم سوچ رہے ہو۔ وہ لوسی سے پیار کرتا تھا لیکن جب سے اس کی ماں کی موت ہوئی، وہ اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لیے وہ میرے ساتھ چلی گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس کی صلاحیتوں کو دبا رہا تھا۔ لوسی ایک حیرت انگیز اداکارہ تھی۔ اس نے ابھی نیویارک میں اسٹڈی کے لیے اسکالرشپ جیتا تھا۔ اس سے وہ ایک اسٹار بن جاتی۔''

''کیا تم اس کے لاپتا ہونے کی کوئی اور وجہ سوچ سکتے ہو...... اس کے مرنے کے علاوہ؟''

''نہیں۔''

ہم جھولوں کے پاس رک گئے۔ ڈیرن ایک پر بیٹھ گیا اور آگے پیچھے جھولنے لگا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔

''لوسی کا باپ تمہارے بارے میں کیا سوچتا ہے؟''

ڈیرن پہلی بار ہنسا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟ اس کی بیٹی ایک مسلم لڑکے کے ساتھ رہ رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے گرفتار کیا گیا۔ اس کے پولیس کے دوستوں نے مجھ سے گھنٹوں پوچھ گچھ کی۔ آخر کار انہیں معلوم ہوا کہ میں لوسی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا۔ جس رات وہ لاپتا ہوئی، میں ایک کمرے میں پرفارم کر رہا تھا۔ پرسیلا، کوئین آف دا ڈیزرٹ۔ کیا تم نے یہ دیکھا ہے؟''

میں نے سوچا۔ ''نہیں، کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

اس نے آسٹریلوی لہجے میں چند سطریں سنائیں۔

اس کا انداز کائلی مینوگ جیسا تھا جس نے اس بوڑھے شرابی کو اس طرف دیکھنے پر مجبور کردیا۔

''یہ اچھا تھا۔'' مجھے تعریف کرنا پڑی۔

''چیئرز۔'' ڈیرن مسکرایا۔

میں نے اس کے چہرے کے زخم کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور کیا یہ ڈیو کی وجہ سے لگا ہے؟''

اس کی مسکراہٹ مدھم ہوگئی۔ ''ہاں۔ جب پولیس نے مجھے جانے دیا، وہ اسٹیشن کے باہر تھا۔ اس نے کہا کہ اس کے پاس اپنے کچھ سوالات ہیں۔ میں نے اسے بھی وہی بتایا جو میں نے ڈیٹکٹو کو بتایا تھا۔ تب اس نے میرے چہرے پر گھونسا رسید کردیا۔''

میں نے سر ہلایا۔

''سنو۔'' اس نے کہا۔ ''میں بھی لوسی کو ویسے ہی ڈھونڈنا چاہتا ہوں جیسے وہ۔ وہ میری سب سے اچھی دوست تھی۔ جب میرے ڈیڈ والا واقعہ ہوا تب وہ میرے لیے کھڑی رہی تھی۔''

''وہ کیا واقعہ تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں پچھلے سال اپنے والدین کے پاس آیا تھا۔ والد نے مجھ پر حملہ کیا۔ میں بس اپنا بچاؤ کررہا تھا اور اس نے مجھ پر حملہ کرنے کا الزام لگادیا۔'' اس نے توقف کیا اور ناک رگڑی۔ ''لوسی کے بغیر میں اس جھمیلے سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اس نے میری بہت مدد کی تھی۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے کچھ بھی کروں گا۔ سمجھے؟''

اگلے چند منٹوں میں اس نے مجھے چند دوستوں کے نام بتائے جن سے میں بات کرسکتا تھا۔ سبھی یونیورسٹی کے ڈراما ڈیپارٹمنٹ سے تھے۔

''کیمپس میں آؤ۔'' اس نے کہا۔ ''ہم اپنے سمر شو کی ریہرسل کررہے ہیں۔ آذ سمر نائٹ ڈریم۔ تمام منافع لوسی کے لیے رکھی چیریٹی میں جائے گا۔ یہ جیرمی کا خیال تھا۔''

''جیرمی؟''

''جیرمی سنگلٹن! ہمارے ٹیچر۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں آؤں گا۔''

ہم کھڑے ہوکر اسی طرف آنے لگے جہاں سے آئے تھے۔ پارک بینچ پر پینے والا ''ولی میک برائڈ'' گا رہا تھا۔

جب ہم گزر رہے تھے تو اس نے ڈیرن کی طرف جھک کر کچھ کہا اور پھر قہقہہ لگایا۔ میں رک گیا۔

''نہیں۔'' ڈیرن نے کہا۔ ''یہ ہر وقت ہوتا ہے۔''

میں نے اس آدمی کی طرف دیکھا۔ میری سخت

گھورنے والی نظروں سے گھبرا کر اس نے گانا بند کر دیا۔
''کیا بولے ابھی تم۔ دوبارہ کہو۔'' میں نے کہا۔
اس نے ہنسنے کی کوشش کی تھی مگر صرف کھانس کر رہ گیا۔
چند منٹ بعد ہم ڈیرن کی دہلیز پر تھے۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔
''مجھے خوشی ہے کہ تم لوسی کو تلاش کر رہے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔''
اس کے بعد میں نے فورس میں اپنے واحد رابطے کی طرف توجہ کی۔ یہ میری سابقہ گرل فرینڈ تھی۔ ڈیان میکاٹیر، وہ اب میریلیبون تک میں ڈی سی آئی ہے۔ اس نے اپنے کام کے قریب اسکینڈ نیوین ہپسٹر کیفے میں میٹنگ کا مشورہ دیا۔
''ڈیو میک ہلیسٹر میرا کلائنٹ ہے۔ میں اس کی بیٹی کی گمشدگی کو دیکھ رہا ہوں۔''
ڈیان نے سر ہلایا۔ اس کی نظریں کافی کے... مگ کے پیچھے مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ ''مجھے ڈیو یاد ہے۔ اس نے فورس اسی وقت چھوڑی تھی جس وقت تم نے چھوڑی۔ تو اسے یقین ہے کہ وہ مر چکی ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں...... اور میرا کام لاش تلاش کرنا ہے۔''
وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ ''یہ دلچسپ ہے۔'' اس نے آخرکار کہا۔
''دلچسپ، کیسے؟'' میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
''سی آئی ڈی ڈیو کے اس یقین سے اتفاق نہیں کرتی کہ لوسی مر گئی ہے۔''
''مطلب؟''
''تم ڈیو کے فورس سے الگ ہونے کے بارے میں کتنا جانتے ہو؟''
''کچھ نہیں۔'' میں نے ہاتھ پھیلائے۔
''ٹھیک ہے، اسے اس طرح سے دیکھو۔ اس آدمی کے ساتھ غصے کے مسائل ہیں۔ بیوی کی موت کے بعد یہ زیادہ ابھر کر سامنے آیا۔ وہ اکثر کام کے دوران بھی ٹمپر لوز کر لیتا ہے۔ مشتبہ افراد سے بدتمیزی کرنا، کولیگز سے جھگڑے۔ اس کے خلاف اوپر کافی شکایات درج ہوئی تھیں اس لیے اس نے تادیبی کارروائی کا نشانہ بننے سے پہلے اپنا نوٹس دے دیا۔''
''اس سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی وضاحت ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور تب سے وہ کیا کرتا رہا؟''
''بنیادی طور پر سیکیورٹی کی نوکریاں...... لیکن اندازہ لگاؤ کیا؟ اس کے غصے نے اس کا یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ ضرورت سے زیادہ طاقت کے استعمال کے لیے کم از کم دو برطرفیوں کے بارے میں پتا چلا ہے۔ اس پر فردِ جرم عائد نہ کرنے کی واحد وجہ یہ ہے کہ اس کے فورس میں اب بھی کئی دوست ہیں۔''
''تو، اس کا کیا مطلب ہے؟''
''اس کا مطلب ہے کہ ڈیو بھی قابلِ بھروسا نہیں اور ایک نظریہ یہ ہے کہ لوسی شاید بھاگ گئی ہو۔'' ڈیان نے کہا۔ ''کون جانے اس غصیلے انسان کا اپنی بیٹی کے ساتھ رویہ کیسا ہو۔'' وہ کافی کے سپ لینے لگی۔
''یہ قابلِ فہم لگتا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔
''اس کے علاوہ یہ لڑکی ایک اداکار ہے۔ وہ ڈراما کرنے کے ماہر ہیں، رائٹ؟'' یہ ڈیان کا پوائنٹ تھا۔ میں نے ڈیرن کے ساتھ اپنی صبح کی بات چیت کے بارے میں سوچا۔
''ایک اور امکان بھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں لگتا ہے کہ ڈیو اپنی بیٹی کو خود غائب کر سکتا ہے؟''
''جیسا کہ اس کو مار ڈالنا؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں۔''
''اور پھر تمہیں اس کی تلاش پر لگا دیا تاکہ ہمیں اس سے دور رکھ سکے؟''
میں نے کندھے اچکائے۔ ''یہ سوال مجھ سے مت پوچھو۔ وہ میرا کلائنٹ ہے۔'' میں اپنی کافی پینے لگا۔
''پولیس کے نقطہ نظر سے لوسی کے پاس بھاگنے کے لیے بھی کچھ وجہ ہونی چاہیے اور لوسی کی موت کا بھی فی الحال کوئی ثبوت نہیں ہے۔ وہ اس وقت صرف ایک گمشدہ لڑکی ہے اور بس۔'' اس نے بیگ اٹھایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
''ڈیو کا انداز مختلف ہے۔''
''مگر اس سے صورتِ حال پر کوئی فرق نہیں پڑے گا جب تک کہ لوسی کی لاش نہیں مل جاتی۔ مجھے بتانا اگر تمہیں اس معاملے میں کسی مدد کی ضرورت ہو۔'' اس نے میز کے اوپر سے ہی تھوڑا جھک کر اپنے گال میرے گالوں سے مس کیے اور وہاں سے نکل گئی۔
تو اب مجھے کیا معلوم تھا؟ زیادہ نہیں لیکن اس کھیل میں یہ معمول ہے۔ تجربے نے مجھے بتایا کہ اگر میں کچھ اور تحقیقات کروں تو شاید کوئی کام کی بات پتا چل جائے۔

☆☆☆

لوسی کی یونیورسٹی میری اگلی منزل تھی۔ کیمپس شمال مغربی لندن کے ایک مضافاتی سلیب کے اندر واقع تھا

جہاں آج تک مجھے جانے کی کوئی وجہ نہیں ملی تھی۔ اس راستے پر چلتے ہوئے میں بلاکس اور راہداریوں سے ہوتا بالآخر ان عمارتوں تک پہنچ ہی گیا جن کے عقب میں ڈراما ڈیپارٹمنٹ تھا۔ یہ ایک بڑے لیکچر ہال، سیمینار رومز اور ایک پرفارمنس تھیٹر پر مشتمل تھا۔ میں تھیٹر کی طرف بڑھا اور میں نے دروازے سے جھانکا جو آڈیٹوریم میں جاتا تھا۔ اسٹیج پر اداکاروں کا ایک گروپ موجود تھا۔ وہ تلواریں سنبھال رہے تھے۔ لائنیں پڑھ رہے تھے، تھیٹر کے کام کر رہے تھے۔ ان میں ڈیرن بھی تھا جو ٹائٹس اور بنیان میں ملبوس تھا۔ انہیں پریشان کرنے کے بجائے میں نے گھومنے کا فیصلہ کیا۔ دروازے کے دائیں طرف مجھے ایک وال ڈسپلے ملا۔ اس کے اندر ڈیپارٹمنٹ کے طلبا اور اساتذہ کی تصاویر آویزاں تھیں۔ لوسی کے چہرے کو ڈھونڈنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ اس کی دودھیا جلد اور گہری آنکھیں میرے لیے مانوس ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے ایک وینڈنگ مشین سے کوک خریدا اور اداکاروں کو دیکھنے کے لیے واپس آ گیا۔ وہ اب ایک میوزیکل نمبر کی ریہرسل کر رہے تھے۔

ان میں مرکز میں جو آدمی تھا، وہ باقیوں سے تھوڑا بڑا لگ رہا تھا۔ اس کے گھنے، شہد رنگ کے بال، ہموار سفید جلد اور آسمانی نیلی آنکھیں تھیں۔ فوٹو ڈسپلے پر واپس آ کر میں نے دیکھا کہ وہ جیریمی سنگلٹن تھا۔ ڈراما ٹیچر جس کا ڈیرن نے ذکر کیا تھا۔ دس منٹ بعد ریہرسل ختم ہوتی دکھائی دے رہی تھی اور سنگلٹن پردے کے پیچھے چلا گیا۔

میں نے دروازے کو دھکیلا۔ ڈیرن نے اوپر دیکھا۔

''دو دن میں دو بار۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے بتایا کہ وہ مڈسمر کی ریہرسل کر رہے تھے۔

''ہمارا سمر شو۔ یہ تین دن بعد ہونے جا رہا ہے۔ اب جب کہ لوسی چلی گئی ہے، ہمیں اس کا حصہ دوبارہ بنانا پڑا۔ جیریمی اسے شاندار طریقے سے ہینڈل کر رہا ہے۔''

اس کے چند دوست مجھے دیکھ رہے تھے۔ لڑکیاں، لڑکے، سبھی مجھ میں دلچسپی لے رہے تھے۔

''تم تعارف چاہتے ہو؟'' ڈیرن نے کہا۔

''تم نے میرا دماغ پڑھ لیا۔'' میں مسکرایا۔

اگلے آدھے گھنٹے کے دوران میں نے لوسی کے کئی دوستوں کے ساتھ خوشگوار اور بے نتیجہ گفتگو کی۔ سب نے ایک ہی بات کہی کہ وہ ''حیرت انگیز'' اور ''ناقابلِ یقین حد تک باصلاحیت'' تھی۔ اس نے کسی ذاتی مسائل کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کوئی بوائے فرینڈ، گرل فرینڈز نہیں تھے۔ وہ مدد کے لیے کچھ بھی کریں گے۔

پانچ کے قریب، ڈیرن نے پوچھا کہ کیا میں اس کے اور اس کے دوستوں کے ساتھ ایک قریبی ریسٹورنٹ آنا پسند کروں گا۔ میں ہاں کہنا چاہتا تھا لیکن پھر میں نے سوچا میں اس دوران ان کے ٹیچر سے بات کر سکتا ہوں لہٰذا میں نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ پتا چلا یہ ایک معقول اقدام تھا۔ ڈیرن اور دیگر کے جانے کے چند منٹ بعد جیریمی سنگلٹن فوئر میں نمودار ہوا۔ سیلزمین کی سی مسکراہٹ اور سنجیدہ ہلکی آواز کے ساتھ اس نے پوچھا کہ کیا وہ میری مدد کر سکتا ہے۔

''میں ایک پرائیویٹ ڈیٹیکٹو ہوں اور لوسی میک ایلیسٹر کی تلاش میں ہوں۔'' میں نے اسے اپنا کارڈ دیا۔

اس نے اسے لیا، پڑھا، اوپر دیکھا، مسکرایا اور مجھے اپنا ہاتھ پیش کیا۔ ''مسٹر کیسپر! تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' اس نے کہا۔ اس کی ہتھیلی ٹھنڈی اور ملائم تھی لیکن گرفت مضبوط تھی۔

''لوسی کو کھونا تباہ کن رہا۔'' اس نے کہا۔

''میں تصور کر سکتا ہوں۔'' میں بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ ''تم اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے ماضی کا صیغہ استعمال کر رہے ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے ہر کوئی یہ مان چکا ہے کہ وہ مر چکی ہے۔''

''اگر وہ زندہ ہوتی تو اب تک اس کی کہیں سے تو کوئی اطلاع آتی۔'' اس نے اپنی دانست میں منطقی بات کی تھی۔

میں نے کہا، ''کیا تم مجھے اس کے بارے میں کچھ اور بتانا پسند کرو گے؟''

وہ دوبارہ مسکرایا اور پھر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر گویا ہوا۔ ''ضرور... چلو میرے دفتر میں چلتے ہیں۔''

تھیٹر کے آڈیٹوریم میں ہم اسٹیج پر چڑھے، بورڈز کو عبور کیا اور پردے کے پیچھے آ گئے۔ میں نے اپنے آپ کو ایک نیچی چھت اور مدھم روشنی والے تنگ سے ہال وے میں پایا۔

''اندر آؤ۔'' سنگلٹن فائر ایگزٹ سے متصل دروازے پر رکا۔

یہ آرام دہ نہیں تھا۔ ایسا آفس میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ درحقیقت اسے آفس کہنا ہی غلط تھا۔ یہ کسی تارک الدنیا شخص کا کوئی خفیہ گوشۂ تنہائی لگ رہا تھا۔

مرکزی دیوار پر ایک وسیع چاندی کے فریم والا آئینہ تھا۔ اس کے نیچے ڈریسنگ ٹیبل اور کرسی تھی۔ باقی تین دیواریں سنگلٹن کی مختلف تصاویر سے فرش تا چھت تک ڈھکی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک نظر چند ایک کو دیکھا۔ ایک

میں وہ رقص کر رہا تھا۔ سوان لیک اسٹائل۔ ایک اور میں وہ مکمل طور پر سیاہ لباس میں تھا۔ بال اس کے سر کے گرد بہت چھوٹے کٹے ہوئے تھے۔ اس کی ہتھیلی پر ایک کھوپڑی تھی۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ میرے پاس ہی کھڑا بغور میرے تاثرات جانچ رہا ہے۔

''یہ میں ہیملیٹ کا کردار نبھا رہا تھا۔'' اس نے تصویر پر میری نظریں جمی دیکھ کر بتایا۔ ''اسے ہینگ اسٹوک کے اینول تھیٹر میں لیا گیا تھا۔ میں تیئس سال کا تھا۔ پروڈکشن کو لندن آنا تھا لیکن وہاں کچھ مسائل ہو گئے تھے۔ ورنہ مجھے ہالی ووڈ میں بریک مل جاتا۔''

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ چاہتا ہے کہ میں کچھ سوالات پوچھوں تاکہ وہ اور شیخی بگھار سکے لیکن میں چپ رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔

''بیٹھ جاؤ پلیز!''

میں نے کونے میں رکھی ایک فولڈ کرسی لی۔ ایک وسیع آئینے کی موجودگی میں بات کرنا میری عادت نہیں ہے، جب میرا عکس میری ہر حرکت کی نقل کر رہا ہو۔ اس کے برعکس سنکلئر کافی آرام سے تھا۔

اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کرسی لی۔ شیشے میں میری طرف دیکھا اور ایک عجیب سی مسکراہٹ دی۔

''تو مسٹر کیمپر! میں آپ کو لوسی کے بارے میں کیا بتاؤں؟''

میں نے اپنا نوٹ پیڈ نکالا۔ ''چلو شروع کرتے ہیں۔ کوئی وجہ جس سے وہ غائب ہو سکتی ہے؟''

''مجھے واقعی کوئی اندازہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے پولیس کو بتایا، وہ ایک اچھی طالبہ تھی۔ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ ایک معما ہے۔''

میں نے پیڈ پر کچھ نہیں لکھا، کچھ بھی نہیں۔ یہ بس میں نے آئینے میں اس کے چہرے کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے نکالا تھا۔

''تم اسے اچھی طرح جانتے ہو؟''

''کہہ سکتے ہیں۔''

''مطلب؟''

''میں زیادہ تر اساتذہ سے اس لحاظ سے مختلف ہوں کہ میں اپنے طلبا کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ تدبر سے بولا۔

''وضاحت کرو؟'' میں نے کہا۔

''میں صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ یہ ایک ہنر ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''آئی سی۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''کیا تمہاری اس مہارت سے لوسی کو کسی ذاتی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا؟''

''کبھی نہیں۔ وہ میری قدر کرتی تھی اور اپنے مستقبل کے لیے پرعزم تھی۔ وہ خوش تھی۔''

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز میں آئی مبہم سی تبدیلی پر مجھے چونک کر سر اٹھانا پڑا اور دیکھا کہ اس کی آنکھیں نم اور سرخ ہو چکی تھیں۔

مجھے یہ سمجھنے میں ایک سیکنڈ لگا کہ یہ کیا ہے؟ وہ شخص رو رہا تھا۔ میں کچھ دیر اسے یونہی دیکھتا رہا...... اندازہ لگاتا رہا ...... کیا یہ آنسو حقیقی تھے؟ لیکن نہیں، واقعی نہیں۔ یہ ایک کارکردگی تھی۔ میری کمر اکڑ گئی۔

''میں معافی چاہتا ہوں۔'' اس نے دونوں گالوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''لوسی کے بارے میں بات کرنا مشکل ہے۔ ایک استاد کے طور پر ایک طالب علم کو کھونا ایک خوفناک دھچکا ہے۔''

''میں سمجھ سکتا ہوں۔'' اس کی کارکردگی نے مجھ سے آئینے کی الجھن بھی بھلا دی تھی۔

اس نے سر ہلایا۔ ''اسی لیے میں نے اپنی پریشانی کو کسی تعمیری چیز پر مرکوز کرنے کی کوشش کی ہے۔ لوسی کے لیے۔'' وہ ڈریسنگ ٹیبل کی دراز تک پہنچا اور ایک فلائر اٹھایا پھر مڑ کر مجھے دے دیا۔ یہ آڈ سمر نائٹ ڈریم کے لیے تھا۔ ڈیپارٹمنٹ کا سمر شو جمعے کو شروع ہونا تھا۔ عنوان کے نیچے کاسٹ کی فہرست تھی۔ سنکلئر کا نام دو بار سامنے آیا، بطور لیڈ ایکٹر سب سے اوپر اور ڈائریکٹر نیچے۔ بولڈ میں فلائر کے دامن میں الفاظ تھے۔

''ہمارے لوسی میک [illegible] کے لیے ایک ہونہار گمشدہ طالبہ کی بہتری کے لیے آگے بڑھیں۔''

میں نے اوپر دیکھا تو سنکلئر کی آنکھیں [illegible] ہو چکی تھیں۔ وہ مجھے آئینے سے دیکھ رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ بھی واپس آ گئی تھی۔

''یہ اپنے پاس رکھو۔'' اس نے کہا۔ ''شاید تمہارے آنے کا موڈ بن جائے۔''

''کیا اساتذہ کے لیے طلبا کے ڈراموں میں اداکاری کرنا معیاری عمل ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میرے تھیٹر میں یہ ضروری ہے۔ یہاں ہم استاد اور طالب علم کی تقسیم کو نہیں پہچانتے۔ ہم سب ایک ہیں۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔

''تم کون سا کردار ادا کر رہے ہو؟''

”تھیسیس، ڈیوک آف ایتھنز۔“ اس نے ایک وقفہ دیا جیسے میرے تالیاں بجانے کا انتظار کر رہا ہو۔ ”یہ میرے پسندیدہ کرداروں میں سے ایک ہے۔ میں نے اسے اب تک سات بار ادا کیا ہے۔ تمہارے دائیں طرف دیوار پر لگی تصویر، گیارہ سال پہلے کی ہے۔“

میں نے اس کی انگلی کا پیچھا کیا۔ ایک چھوٹی سی تصویر میں سنگلٹن گول اسٹیج پر اکیلا کھڑا تھا اور کسی طرح کے گلیڈی ایٹر آرمر میں ملبوس تھا۔ اس کی پیشانی پر ہارن ماسک لگا ہوا تھا۔

”تو تم ہمیشہ سے اداکار رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ اپنے بارے میں بات کرنے کی دعوت نے اسے بے حد خوش کیا۔

”ہمیشہ۔ آپ کے پیچھے پانچ سالہ جیرمی سنگلٹن کی پہلی پرفارمنس میں ایک تصویر ہے جو بوڈیکا کی ایک پلے ہاؤس پروڈکشن ہے۔ میری ماں، خدا اس کی روح کو سکون دے، نے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور مجھے اپنی اصلاح کے لیے صحیح قسم کی رہنمائی دی۔ جلد ہی یہ واضح ہو گیا تھا کہ ڈرامے کو بھی میری اتنی ہی ضرورت تھی جتنی مجھے ڈرامے کی تھی۔ میں جس خوفناک ریاستی اسکول میں گیا تھا، اس کے باوجود میں ایکٹنگ کالج میں جگہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔“ وہ بیس منٹ تک اسی طرح لگاتار بولتا رہا۔ بیچ میں صرف سانس لینے کے لیے رکتا تاکہ یہ یقینی بنا سکے کہ میں سن رہا ہوں۔

وہاں بیٹھے رہنا ایک عجیب تجربہ تھا۔ دھیان دینا، مناسب طریقے سے سر ہلانا، سنگلٹن کی تال کو برقرار رکھنے کے لیے آنکھوں کی حکمتِ عملی کو برقرار رکھنا لیکن میرے دماغ میں سوچوں کا ایک طوفان تھا اور ان میں سے کوئی بھی سوچ کوئی بھی تاثر اچھے تو بالکل نہیں تھے۔ اس شخص میں کچھ تو تھا جو غلط تھا۔ مجھے یہ پسند نہیں آیا اور نہ ہی میں نے اس پر یقین کیا تھا۔ آنسو، جھوٹا خلوص، اسے اس سب دکھاوے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ڈراما ٹیچر ایک بہت برا ایکٹر تھا۔

بالآخر مجھے اسے ٹوکنا پڑا۔ ”یہ قابلِ تعریف ہے کہ تم کیا کر رہے ہو جیرمی، لوسی کی چیریٹی کے لیے؟ اس سے اس کے والد کو کچھ سکون مل سکتا ہے۔“

وہ رکا اور ہلکے سے مسکرایا۔ اس عجیب سی مسکراہٹ نے مجھے بتایا کہ وہ تعریف سے خوش ہوا ہے۔ ”میں کم از کم یہ تو کر ہی سکتا ہوں۔“

”مجھے یقین ہے کہ ڈیو خوش ہوگا۔“

”مجھے بتاؤ مسٹر کیسپر! کیا تمہیں لگتا ہے کہ لوسی اپنے قاتل کو جانتی ہوگی؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے الٹا اسی سے پوچھ لیا۔

اس نے کندھے اچکائے۔ ”مجھے نہیں معلوم لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو بھی ذمے دار ہے، اسے بہت ہوشیار ہونا چاہیے۔ یوں دنیا کی نظروں سے خود کو چھپانے کے لیے بہت مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”تم اپنی جگہ ٹھیک ہو سکتے ہو۔“ میں نے کہا اور اس کی طرف آگے کو جھک گیا۔ ”یہ بات میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں جیرمی! لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ لوسی مر چکی ہے۔“

سنگلٹن کی آنکھیں تنگ ہو گئیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”تمہیں یہ یقین کیوں ہے؟“

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”کوئی لاش نہیں ہے۔“

”اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔“ وہ بولا۔

”ہاں نہیں ہوتا لیکن میں جانتا ہوں کہ لوسی کے پاس غائب ہونے کی اچھی وجہ تھی۔ اس کا اور اس کے والد کا جھگڑا چل رہا تھا۔ شاید وہ کسی اور جگہ سے نئی شروعات کرنا چاہتی تھی۔ ایک نئی زندگی۔ یہ ممکن ہے، ہے نا؟“

اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ ”شاید۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر یہ حادثہ ہوتا تو وہ مل جاتی اور اگر یہ قتل ہوتا تو تب بھی لاش ملنی چاہیے تھی۔ یہ صرف بزدل جنسی بدکار ہی ہوتے ہیں جو لاشیں چھپاتے ہیں اور یہ کوئی ہوشیاری کی بات نہیں ہے۔ تم کیا کہتے ہو؟“

وہ کسی سوچ میں پڑ گیا تھا، گم صم سا۔ اس نے پھر سے میرے سوال پر صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”میرا اندازہ ہے لوسی اب بھی کہیں زندہ ہے۔ اپنی اداکاری کی مہارت کو استعمال کرتے ہوئے ریڈار کے نیچے ایک نئی زندگی کو تراش رہی ہے۔ اگر ایسا ہے تو ایسی صورتِ حال میں ہوشیار لوسی ہوئی۔“

”بالکل۔“ اس نے کہا۔ ”کیا یہ معجزہ نہیں ہوگا اگر وہ زندہ ہوئی؟“

تھیٹر فوئر میں سنگلٹن نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”مجھے کسی بھی وقت کال کر سکتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے بات کر کے اچھا لگا۔“

میں نے اسے بتایا کہ میں کروں گا۔ وہاں سے نکلتے ہی میں قریبی پب میں گھسا اور ایک کے بعد دوسرے مشروب کا آرڈر دیتے ہوئے میں نے مڈسمر نائٹ ڈریم کے فلائر کی طرف دیکھا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن انہیں یونیورسٹی سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک لاش ملی۔ تین نوجوان بھائی، فٹ بال کی پریکٹس سے گھر جا رہے تھے اور ایک غیر استعمال شدہ کیمرے کی دکان سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ تالا ٹوٹا ہوا ہے۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔ ایک تو نے چھوٹے بھائی کو اندر جانے کی ہمت کرنے پر اکسایا۔

اس بیچارے نے جو منظر دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آنے والے سالوں تک وہ اسے پریشان کرتا رہے گا۔

میں وہیں تھا۔ میں نے اپنے موبائل سے ڈیان کو کال ملائی۔

''ڈیان! ایک لاش ملی ہے۔''

999 کا ایک آپریٹر جو میری پہچان کا تھا، نے مجھے ٹیکسٹ کیا تھا کہ کیمروں کی پرانی دکان سے ایک لاش ملی ہے۔ میں فوراً چلا آیا۔

پولیس کی گاڑیاں اس دکان کے سامنے کھڑی تھیں اور اندر فرانزک کے لوگ اپنا کام کر رہے تھے۔

''یہ لوسی ہے، ڈیان!'' میں نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا؟'' وہ چونک کر سوال کرنے لگی۔

''میں جانتا ہوں کہ یہ کس نے کیا ہے۔'' میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

''کون؟'' لمحاتی پُرسوچ خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔

''سنگلٹن...! وہ ڈراما ٹیچر۔'' میں نے لب بھینچتے ہوئے بتایا۔

''اس کا انٹرویو ہوا تھا کاس! کچھ خاص نہیں ملا۔ کیا تمہیں یقین ہے؟''

اب میں اس سے کیا کہتا کہ میرے پاس میری چھٹی حس کے علاوہ کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔

''ہاں، ڈیان! مجھے یقین ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے نہیں لگتا کہ وہ مری ہے اور یہ کہ صرف بزدل لوگ لاشیں چھپاتے ہیں۔ میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تو اس نے جا کر اس کی لاش یوں پھینک دی۔ صرف مجھے غلط ثابت کرنے کے لیے۔''

''یہ معاملہ کافی الجھا ہوا ہے کاس! ٹھیک ہے۔ تم مجھے ایک دن دو۔ میں پھر سے اس سنگلٹن کو ٹٹولتی ہوں۔ دیکھو کیا سامنے آتا ہے۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

اس شام ڈیو نے یہ سلیسٹر کو وہ خبر دی جو میں پہلے سے جانتا تھا۔ اس دکان سے ایک عورت کی تعفن زدہ لاش دریافت ہوئی تھی۔ دانتوں کے ریکارڈ نے تصدیق کی کہ یہ لوسی تھی۔ موت کی وجہ پوسٹ مارٹم تک غیر واضح رہی لیکن سینے کے زخموں اور کلائی کے گرد لپٹے آہنی تاروں کے نشانات نے قتل کی طرف اشارہ کیا۔

ڈیو نے مجھے یہ سب فون پر بتایا۔ اس کی آواز سخت تھی۔ کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔

جب اس نے بات ختم کی تو میں نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے۔''

وہ خاموش رہا۔

''ڈیو!'' میں نے اسے پکارا۔

''کیا یہ ایک اتفاق ہے، کیسپر؟ جب تم نے یہ کیس ہاتھ میں لیا اس کے کچھ دنوں بعد انہوں نے لوسی کی لاش دریافت کرلی؟'' اس کی سرسراتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''شاید۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ تم نے قاتل سے بات کی ہوگی؟ تمہاری کسی بات نے اسے متحرک کیا ہو؟''

''اب یہ پولیس کا معاملہ ہے، ڈیو! انہیں سنبھالنے دو۔ کم از کم تمہارے پاس اب اس کی ڈیڈ باڈی تو ہے۔ اس کے کفن دفن کا بندوبست کرو۔ تم یہی چاہتے تھے۔''

''کسی نے اسے مار ڈالا۔'' اس نے کہا۔ یہ ایک اطلاع تھی، سوال نہیں تھا۔

لائن کٹ گئی۔

کال کے بعد میں ڈوگلز کی طرف چلا گیا اور مسلسل پیتے ہوئے جیرمی سنگلٹن کی عجیب مسکراہٹ اور انیس سالہ لڑکیوں کے بارے میں سوچنے کی کوشش کر رہا تھا جو قتل کر دی گئی تھیں کہ ڈیان کی کال ایک خوشگوار ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔

''تم اتنے ہوش میں ہو کہ بات کرسکو؟''

''ہاں بالکل۔'' میں نے کہا اور اسے سننے کے لیے پب سے باہر نکل آیا۔

''میں نے سنگلٹن کی مزید چھان بین کی کاس! جیسا کہ میں نے سوچا تھا، وہ صاف ستھرا ہے۔ کوئی گرفتاری نہیں۔ وہ یونیورسٹی کے قریب ایک بیڈروم کے فلیٹ میں اکیلا رہتا ہے۔ اپنے بل وقت پر ادا کرتا ہے۔ شاید اپنے پڑوسی کے پودوں کو پانی دیتا ہے جب وہ گھر سے دور ہوتے ہیں۔''

''اچھا... بس اتنا ہی؟''

''ہاں۔'' وہ بولی۔ ''لیکن جب میں نے قدرے گہرائی میں جا کر کھنگالا تو پتا چلا کہ جیرمی کا اداکاری کا کافی شاندار کیریئر تھا لیکن یہ اچانک ختم ہوگیا۔''

"کیوں؟" میں نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

"تفصیلات ناقص ہیں۔ وہ اسٹیٹس کے دورے پر تھا، ڈرامے کی ہیڈ لائنز میں تھا لیکن آخری منٹ میں وہ پلے سے آؤٹ کر دیا گیا اور اس کی جگہ ایک انڈر اسٹڈی کو دے دی گئی۔"

"کس کے لیے آؤٹ کیا گیا؟"

"کوئی اندازہ نہیں لیکن اگلے سال وہ انگلینڈ واپس آیا اور اس نے طے کیا کہ اب اداکاری نہیں کرے گا بلکہ ٹیچنگ کرے گا۔"

میں نے بادلوں سے صاف موسم گرما کے نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ "اس کا کیا مطلب ہوا، ڈیان؟"

"صبر کرو۔" اس نے کہا۔ "دیکھو، میں نے وہ ڈراما بھی دیکھا جس سے سنگلٹن نکالا گیا تھا۔"

"پھر......؟"

"اس کی جگہ لینے کے لیے لایا گیا، انڈر اسٹڈی شو کے آغاز کی رات پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔ شوز کینسل کرنے پڑے اور ٹور کمپنی تباہ ہو گئی۔"

موبائل پر میری گرفت سخت ہو گئی۔ "اس طالب علم کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے؟ وہ مردہ پایا گیا تھا۔ تار سے بندھا ہوا، سینے پر زخم اور پھر اسے ایک متروک عمارت میں پھینک دیا گیا۔ سنا سنا سا لگتا ہے نا؟ پولیس کو کوئی مشتبہ نہیں ملا نہ کوئی سراغ۔ یہ کیس کبھی حل نہیں ہو پایا۔"

"سنگلٹن ......! اوہ میرے خدا...... اس نے پہلے بھی یہ کیا ہے۔" میں نے سر کو تھام لیا۔ "کیا یہ دونوں ایک جیسے قتل اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں؟"

"بغیر ثبوت کے نہیں۔ اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ہمیں ٹھوس شواہد کی ضرورت ہوگی۔ تم سمجھ سکتے ہو، اسے بھنک بھی ملی کہ ہم اس کے پیچھے ہیں تو وہ ہوشیار ہو جائے گا۔" وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ "کاس! سنو۔ یہ معاملہ پولیس کو سنبھالنے دو۔"

"پولیس اس میں گڑبڑ کر دے گی ڈیان! تم جانتی ہو۔ سنگلٹن ایک اور قتل سے بچ جائے گا۔"

میں نے اس کی آہ سنی۔

"اور شاید کوئی پھنس جائے۔" وہ بولی تھی۔

"کیا مطلب؟" میں چونکا۔

"تم ڈیرن ہمودی نامی بچے کو جانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، وہ لوسی کے ساتھ رہتا تھا۔ کیوں؟"

"اسے پوچھ گچھ کے لیے لایا گیا تھا، جب وہ پہلی بار لاپتا ہوئی تھی اور اب جب انہیں لوسی کی لاش ملی، وہ اسے پھر سے گھسیٹ لائے ہیں۔"

"اوہ نو...... ڈیرن بے قصور ہے ڈیان!" میں کراہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں لیکن ڈیومیک ایلیسٹر کی طرف سے اسی پر الزام لگایا گیا تھا اور وہ پولیس کے لیے اس وقت سب سے اہم مشتبہ ہے۔"

"سنگلٹن......!" میں نے دانت پیسے۔

"کاس! تم ٹھیک تو ہو؟" وہ پریشان ہو گئی۔

"نہیں۔ ڈیرن اب کہاں ہے؟"

"حراست میں۔ سوکس کا ؤنٹی تک۔" اس نے قدرے توقف سے کہا۔ "کاس! تم کیا کرنے جا رہے ہو؟"

"کچھ نہیں......" میں نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

اگلے دن میں جیری سنگلٹن کو ڈھونڈنے کے لیے نارتھ ویسٹ چلا آیا۔ میں اسے اکیلے پکڑنا چاہتا تھا اس لیے میں پانچ بجنے کے بعد ہی کیمپس آیا تھا۔

میں نے ڈیرن کے کچھ دوستوں کو ایک کیفے ٹیریا کے باہر پہچان لیا۔ ڈیرن کی گرفتاری کے بعد ان کے تاثرات سخت تھے۔ وہ میرے بارے میں بھی غیر یقینی کیفیت سے دوچار تھے کہ میں کون ہوں۔ میں نے ہیلو کہا لیکن مجھے جواب نہیں ملا۔ میں آگے بڑھ آیا۔ ویسے بھی میرے معاملات ان کے ساتھ نہیں تھے۔

مڈسمر نائٹ ڈریم کے پوسٹرز ہر طرف آویزاں تھے۔ سنگلٹن آڈیٹوریم کے سرے پر تھا۔ وہ اسٹیج پر بیٹھا کسی قسم کے فلٹر ڈیوائس کو لائٹ پر لگا رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اس نے اوپر دیکھا اور مسکرایا۔

آج اس نے ڈھیلی سی جینز اور ایک سرخ چیک والی لمبر جیک شرٹ پہنی ہوئی تھی جس کے اوپر کے کھلے دو بٹنوں سے اس کے سینے کے گھنگرالے بال جھانک رہے تھے۔

وہ آہستہ سے کھڑا ہوا اور اوپر آیا۔ "تمہیں دوبارہ دیکھ کر کافی اچھا لگ رہا ہے۔" اس نے کہا۔ "تم نے شاید وہ خبر سنی ہوگی جس سے ہم خوفزدہ تھے۔ تمہاری یہ امید جھوٹی نکلی کہ لوسی بھاگ گئی ہے۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "بہت برا ہوا۔ میں یہاں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"اچھا، چلو میرے دفتر چلتے ہیں۔" وہ پلٹنے لگا۔

"دراصل میں یہاں ٹھیک ہوں جیری!" میں نے

فوراً اسے روکا۔

وہ مسکرایا۔ ''اوکے۔'' وہ اسٹیج پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنی ہتھیلیاں ان پر رکھے مجھے دیکھنے لگا۔

میں چند فٹ دور کھڑا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے بولنے کے انتظار میں تھا مگر میں بس خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔

''تم نے سنا، پولیس نے ڈیرن کو گرفتار کرلیا ہے؟'' شاید وہ میری نظروں سے بے چینی محسوس کرنے لگا تھا یا پھر میری خاموشی سے۔ اسی لیے خود ہی پوچھنے لگا۔

میں نے سر ہلایا۔

''کیا تم مجھ سے اس کے بارے میں سوال پوچھنا چاہتے ہو؟''

''نہیں۔'' میں سپاٹ لہجے میں بولا۔

''تو پھر میں کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

میں نے چند لمحے توقف کیا۔ ''میں تم میں دلچسپی رکھتا ہوں جیرمی!'' میں نے اس کی پیشانی کی ایک رگ پھڑکتے دیکھی۔

''واقعی؟'' اس نے پلکیں جھپکائیں۔

''ہاں، واقعی۔'' میں نے کہا۔ ''چلو گڑبڑ نہیں کرتے۔ ڈیرن کا اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ تم نے لوسی کو مارا ہے۔ میں جانتا ہوں۔''

اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نمودار ہوئے جس سے ایک پل میں پتا چل گیا کہ وہ اب تک چہرے پر ایک ماسک چڑھائے ہوئے تھا۔

''کیا تمہارے پاس اس الزام کا کوئی ثبوت ہے؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''نہیں..... اگر ہوتا تو تم اس وقت لاک اپ میں ہوتے۔''

''آئی سی۔'' اس نے ایک آسودہ سی سانس خارج کی۔

ہمارے درمیان خاموشی چھاگئی۔ میں اس سے آئی کانٹیکٹ رکھنے کی پوری کوشش کررہا تھا لیکن اس کی نگاہیں ناقابلِ تسخیر تھیں۔ وہ نیلے رنگ کے شفاف شیشے..... جس سے میں اس کے دماغ کے اندھیرے میں تقریباً دیکھ سکتا تھا۔ میرا ایک حصہ بھاگنا چاہتا تھا، دوسرا حصہ اس سے سات شیڈز نکالنا چاہتا تھا۔

''اس نے کیا کیا تھا؟'' بالآخر میں نے لب کھولے۔ ''تم نے اسے کیوں مارا؟''

وہ اپنی انگلیوں کی پوروں کو دیکھ رہا تھا۔ ''تمہیں لگتا ہے کہ تم مجھے جانتے ہو، ہے نا؟'' اس کی آواز پُرسکون اور ہموار تھی۔

''میں تمہارے اس انڈر اسٹڈی فرینڈ کے بارے میں بھی جانتا ہوں جو غائب ہوگیا تھا اور پھر اس کی لاش ملی۔'' میں بس کسی طرح اس کا یہ سکون برباد کرنا چاہتا تھا۔

''تو تم تفتیش کررہے ہو؟''

''اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ واحد شخص نہیں تھا جسے تم جانتے ہو اور جو مُردہ ملا ہو۔''

اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور ایک گہری سانس پھیپھڑوں میں بھر کر ایک آہ کی صورت باہر نکالی۔

''تم جانتے ہو۔'' وہ بند آنکھوں سے بول رہا تھا۔ ''میں تمہیں بہت پسند کرنے لگا تھا۔ تم ان احمق پولیس والوں سے زیادہ دلچسپ لگ رہے تھے لیکن اس ملاقات نے سب کچھ خراب کردیا۔'' پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔ یہ بس ایک کہانی ہے..... یقین کرو۔ ایک بیس سالہ نوجوان کا تصور کرو جس کے پاس اداکاری کا ایک نادر تحفہ ہے۔ یہ تحفہ اسے دنیا بھر میں لے جاتا ہے۔ سب سے مشہور تھیٹر میں کچھ بہترین اداکاروں اور ہدایت کاروں کے ساتھ۔ وہ اسٹارڈم کے لیے تیار ہے کہ ایک خودغرض، لالچی ہدایت کار اسے ریہرسل کے دوران چیلنج کرنے کا فیصلہ کرتا ہے..... یہ کہتے ہوئے کہ اس کی اداکاری میں فطری سادگی اور سچائی نہیں بلکہ بناوٹ ہے۔ وہ اوور ایکٹنگ کرتا ہے..... اوور ایکٹنگ..... کیا تم یقین کروگے؟ اور جب یہ نوجوان اسے منہ توڑ جواب دیتا ہے تو اگلے ہی دن وہ کاسٹ میں اپنی جگہ ایک انڈر اسٹڈی کو پاتا ہے تو پھر تم اس نوجوان سے کیا توقع کروگے جب اسے اتنی بیدردی سے آکسایا جائے گا؟''

''تو تم نے اس اسٹوڈنٹ کو مار ڈالا؟ ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تو پرانا بدلہ ہوگیا..... لوسی کو تم نے کیوں مارا؟''

''آہ، لوسی! وہ بھی اس نوجوان کی طرح تھی۔ پُرکشش، پُراعتماد۔'' وہ مسکرایا۔

''تو؟''

''تو اس باصلاحیت نوجوان نے جواب کچھ سال بڑا اور سمجھ دار ہے، اسے بھی کہانی سنائی۔ اس امید کے ساتھ کہ وہ ہمدردی کا اظہار کرے گی۔ اس کے بجائے وہ اسکالرشپ پر نیویارک میں ڈراما پڑھنے کا ارادہ ظاہر کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ اس کی معلمی میں خود کو محدود محسوس کرتی ہے کیونکہ وہ ایک بُرا اداکار ہے۔'' اس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ''آخر ہر انسان کی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔''

''تو تم نے اسے باندھا اور پھر چاقو سے اس پر وار

کیے؟'' میرا خون کھول رہا تھا۔
اس نے کندھے اچکائے۔ ''جیسا کہ میں نے کہا، یہ ایک کہانی ہے، خالص قیاس۔ تاہم اگر ایسا ہوا ہے تو مجھے یقین ہے کہ لوسی اس کی مستحق رہی ہوگی۔''
''گاڈ.....!'' میرا بس نہیں چل رہا تھا میں مار مار کر اس کی شکل بگاڑ دوں۔
''جانتے ہو مجھے تم سے بات کر کے بہتر محسوس ہوتا ہے۔'' اس نے اپنا سر پینتالیس ڈگری زاویے پر جھکا لیا۔ ''شاید تم میرے جیسے ہو ورنہ یہاں ایسے بہت کم ہیں جن سے بات کر کے مجھے اچھا لگے۔''
''میں تم جیسا نہیں ہوں۔'' میں غرایا۔ ''تمہیں تو جیل میں ہونا چاہیے۔''
جواب دینے کے بجائے وہ یوں مسکرانے لگا جیسے اسے کوئی لطیفہ یاد آ گیا ہو۔
''جو کچھ تم نے میرے سامنے کہا، وہی کہانی اب پولیس کو بھی سناؤ..... کم آن۔'' میں نے کہا۔
''میں یہیں ٹھیک ہوں، شکریہ۔'' اس نے ہاتھ اٹھایا۔
''وہ تمہیں لینے آئیں گے۔ ایک بار جب میں پولیس کو بتا دوں کہ تم نے کیا اعتراف کیا ہے۔''
''یہ.....؟'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''میں نے کچھ بھی نہیں مانا اور جیسا کہ تم نے کہا، میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ میں تو ایک ہیرو ہوں۔ لوسی کے والد نے مجھے اس کے فیونرل میں اسپیچ کے لیے بھی بلایا ہے۔''
''ڈیو تمہارے رابطے میں ہے؟'' میں خود کو بیمار محسوس کرنے لگا۔
''میں آج اس کے چھوٹے سے فلیٹ پر اسے دیکھنے گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ انہیں لوسی کی لاش ملی ہے۔ میں نے اس کے لیے جو کچھ کیا اس کے لیے وہ میرا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے ہمارے سرپلے کے لیے ٹکٹ بھی دیا لیکن مجھے شک ہے کہ وہ آئے گا۔ اتنے گہرے صدمے میں جو ہے۔''
مجھے ڈر لگنے لگا کہ اگر تھوڑی دیر اور میں یہاں رکا تو کہیں چیزیں توڑنا شروع نہ کر دوں۔ ''ڈیو تمہیں چیر دے گا جب اسے پتا چل جائے گا کہ تم نے کیا کیا ہے۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔
''لیکن وہ ایسا نہیں کرے گا۔'' اس کی کمینی مسکراہٹ میں یقین تھا۔
''میں اسے بتاؤں گا۔''

''مجھے اس پر شک ہے۔''
''اگر تم نے پولیس کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف نہیں کیا تو میرے پاس کوئی چارہ نہیں ہوگا۔'' میں اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔
''مجھے ایسا نہیں لگتا مسٹر کیسپر!'' وہ سیدھا ہو کر سنجیدگی سے کہنے لگا۔
''کیوں؟''
''کیونکہ تم اخلاقی ضابطوں کے ساتھ چلنے والے آدمی ہو۔ میں نے یہ پہلی بار ہی محسوس کر لیا تھا جب ہم ملے تھے۔ تم اپنی خامیوں میں تقریباً شیکسپیئر ہو۔ اگر تم نے ڈیو میک ایلیسٹر کو بتایا کہ تمہیں شبہ ہے کہ میں نے اس کی عزیز از جان بیٹی کو قتل کیا ہے اور اسے میرے پیچھے آنے دو گے تو تم بھی ایک قاتل بن جاؤ گے۔ مجھ جیسے۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی بات ختم کی۔ اس کے بعد میرے کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ اپنے ہاتھ اپنی پشت پر سختی سے باندھے میں نے سنگلٹن کی ساری بکواس سنی جب اس نے مجھے گنوار کہا اور مجھ سے اپنی پیٹھ موڑی، تب میں بھی اس پر لعنت بھیجتا وہاں سے نکل آیا تھا۔

☆☆☆

اس رات میں نے سوئس کاٹیج تک کو فون کیا جہاں ڈیرن زیرِ حراست تھا۔ ایک بیزار سی آواز والی ڈیسک سارجنٹ نے مجھے بتایا کہ اس سے ملنے کوئی نہیں آیا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیسا ہے؟ وہ تھوڑی ہچکچائی پھر کہا۔
''وہ ٹھیک ہے، مجھے لگتا ہے۔''
اگلے ایک گھنٹے تک میں بے مقصد ہیمپسٹڈ ہیتھ کے پارکوں میں گھومتا رہا اور غروب ہوتے سورج کو گھورتا رہا اور آخر کار اپنے ڈیڈ کے پرانے کاٹیج میں چلا آیا۔
اس وقت بھی میں پی رہا تھا جب دس بجے کے قریب میرا فون وائبریٹ ہوا۔ ڈیو کال کر رہا تھا۔
''مجھے تم سے ملنا ہے..... ابھی۔'' اس نے میری آواز سنتے ہی کہا۔
آدھے گھنٹے بعد میں اس کے فلیٹ میں تھا۔ پردے کھنچے ہوئے تھے، روشنیاں مدھم تھیں۔ وہ میرے سامنے اپنی کرسی پر بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ ہمارے درمیان اس کی کافی ٹیبل پر بکھرے چائے کے کپ، گندی پلیٹیں، کٹلری اور مڈسمر نائٹ ڈریم سنگلٹن کا ٹکٹ بھی تھا۔
''ڈیو! تمہارے ذہن میں کیا ہے؟'' میں نے ٹکٹ سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے آپس میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کی ناک کے گرد کی جلد پھٹے ہوئے چیتھڑے کی طرح تھی۔

''وہ لڑکا، ڈیرن!'' اس نے کہا۔ ''وہ حراست میں ہے۔ میں نے پولیس سے کہا تھا۔ تم سن چکے ہو گے؟''

میں نے سر ہلایا۔

''یہ وہ نہیں ہے...... ہے نا؟ اس نے لوسی کو کبھی تکلیف نہیں دی۔''

میں ایک بار پھر صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

اس نے دانت پیس کر مٹھیاں بھینچیں۔ ''میں چاہتا ہوں...... مجھے سزا دینے کے لیے کسی کی ضرورت ہے۔ یہ احساس مجھے کھا رہا ہے کیسپر! جس نے لوسی کے ساتھ یہ سب کیا، وہ باہر ہے...... آزاد گھوم رہا ہے۔''

''وہ پکڑا جائے گا ڈیو! پولیس کو جو کرنا ہے وہ کرنے دو۔ میرا یقین کرو۔''

''یہ میری غلطی ہے۔'' اس کی آواز کانپنے لگی۔ ''اس کی ماں کے مرنے کے بعد لوسی میری دنیا بن گئی۔ میں نے سوچا تھا اس کی حفاظت کرے گی لیکن میری سخت مزاجی نے اسے بھگا دیا۔ میں ذمے دار ہوں۔''

''نہیں ڈیو! تم نہیں ہو۔'' میں تاسف سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ وہ آگے کو جھکا۔ ''کون ہے وہ؟ تم جانتے ہو میری بیٹی کو کس نے قتل کیا؟ بولو۔'' وہ سوال کر رہا تھا۔

میرے دل نے کہا کہ میں اسے بتا دوں۔ یہاں ہم دو باپ تھے جنہوں نے اپنی بیٹیاں کھو دی تھیں۔ میں اسے ایک موقع دے سکتا تھا۔ بدلے کا موقع...... لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔

''مجھے بتاؤ۔'' اس نے کہا۔ اس کی گردن کی رگیں ابھر آئی تھیں۔

''نہیں ڈیو!'' میں نے پیچھے ہٹنا چاہا۔ ''میں نہیں بتا سکتا۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' ایک زوردار آواز کے ساتھ کافی ٹیبل کو الٹتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کپ اور کراکری فرش پر بکھر گئے۔

''تم مجھے اس کا نام بتاؤ۔ بدلے میں جو چاہیے، وہ لے لو۔'' اس کے ہاتھ میرے کندھوں پر آ ٹکے تھے اور اس کی انگلیاں اتنی سختی سے میرے شانوں میں گھبی تھیں کہ گوشت میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''ہٹ جاؤ ڈیو!'' میں نے اسے پوری طاقت کے ساتھ پیچھے دھکیلا۔

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھوکر کھا کر رہ گیا لیکن پھر زیادہ غضبناک ہوتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور میری سمت لپکتے ہوئے اس نے میری گردن دبوچ لی۔

''کمینے!'' وہ غرا رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی جان کا خوف محسوس ہوا۔ میں نے اس کی کلائیاں پکڑیں اور اس کی گرفت کو توڑنے کی کوشش کی۔ جب وہ چیخا تو میں نے اس کے پیٹ میں ایک زوردار گھونسا مارا۔

وہ کافی ٹیبل سے ٹکرایا اور فرش پر گر پڑا۔ کھانستا ہوا، تھوکتا ہوا، روتا ہوا۔

''گاڈ!'' میں نے کھڑے ہو کر گردن سہلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''ڈیو! تم مجھے مار دیتے۔'' مجھے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔

میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کیا کروں۔ اسے گلے لگاؤں ...... اسے روکوں؟

''باہر نکلو۔'' اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔ ''نکل جاؤ میرے گھر سے۔''

میں نے ایسا ہی کیا۔ کئی بار میں نے ایسے کام کیے ہیں جس پر بعد میں پچھتایا ہوں کہ کاش نہ کیے ہوتے۔

ڈیرن کو اس رات بغیر کسی چارج کے رہا کر دیا گیا تھا۔ اس نے مجھے بلایا اور ہم دوبارہ اس کھیل کے میدان کے قریب ملے۔

''تم زرد لگ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دو وردی والوں نے اسے اٹھایا تھا اور مسلسل چار گھنٹے تک اس سے لوسی کے بارے میں سوال کرتے رہے۔

میری اس بات پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آواز کانپنے لگی۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' مجھے افسوس ہونے لگا۔ ''یہ سب جلد ہی ختم ہو جائے گا۔''

اس نے مجھے انہی نظروں سے دیکھا جیسے ڈیو نے دیکھا تھا۔ ''تمہیں معلوم ہے لوسی کو کس نے مارا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کون؟''

''تم نہ ہی جانو تو بہتر ہے۔'' میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے لیکن وعدہ کرو تم اسے پکڑو گے۔''
''میں اسے سزا دلا کر رہوں گا۔'' طیش کے باعث مجھے اپنے کان سرخ ہوتے محسوس ہوئے۔
''کیا میں کچھ کر سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔
''شاید۔ میں پہلے اس پر سوچوں گا لیکن فی الحال میں چاہتا ہوں کہ تم معمول کے مطابق چلو اور اپنے مڈسمر پلے کی تیاری کرو۔ کل اس کی اوپننگ ہے نا؟''
''ڈراما!'' اس نے آہ بھری۔ ''میرے خدا! مجھے نہیں معلوم کہ میں کر بھی پاؤں گا یا نہیں۔''
میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''لوسی ہوتی تو اس صورت حال میں کیا کہتی؟''
''وہ کچھ اسٹوپڈ سا......'' وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ''دا شو مسٹ گو آن۔''
''بالکل۔ تم فی الحال اس پر توجہ دو۔'' میں نے کہا۔ ''ہم پھر ملیں گے۔''

☆☆☆

اگلی صبح تک میرے پاس کوئی پلان نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر پولیس سنگلٹن تک پہنچنے میں ناکام رہی، جو کہ ہوئی بھی تو پھر میں ایک بار پھر سنگلٹن کو پکڑوں گا۔ اسے اکساؤں گا۔ کچھ ایسا کروں گا جس سے وہ کوئی غلطی کر بیٹھے۔ وہ بے حد چالاک تھا اور ساتھ ہی خود پرست بھی۔ اس کا خود پر یہ اندھا اعتماد ہی اس کے گلے کا پھندا بن سکتا ہے۔
لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے بجائے ڈیو میک الیسٹر نے میری جھولی میں ایک آئیڈیا ڈالا جس پر میں بیک آؤٹ نہیں کر سکتا تھا۔
میرے بیڈ کے پاس میرا فون وائبریٹ کر رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسکرین کی طرف دیکھا۔ یہ ڈیو کا ایک ٹیکسٹ میسیج تھا۔ پہلے چند الفاظ کے بعد میرا دل زور سے دھڑکا۔
''کیسپر! کسی کی نظروں میں آئے بغیر ابھی مجھ سے ملنے چلے آؤ اور دستانے پہن کر آنا۔ تمہیں پتا چل جائے گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔''
یہ میسیج دیکھتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا اور پھر مجھے وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔
ڈیو کے فلیٹ کا دروازہ کھلا تھا۔ لیٹیکس کے دستانے والے ہاتھ سے میں نے اسے دھکیلا اور اندر داخل ہوا اور جب میں لاؤنج میں آیا تو...... مجھے تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بس یہ کہنا کافی ہے کہ وہاں خون کا ایک چھوٹا سا تالاب سا بن گیا تھا اور ڈیو...... اس سرخ رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا۔ زندگی کی چمک سے عاری آنکھیں کسی غیر مرئی نکتے پر تھیں۔
میرے حلق میں کانٹے اُگ آئے۔ وہاں سے کسی گھبرائے ہوئے اونٹ کی طرح بھاگ اٹھنے کی خواہش پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے میں نے اپنا دماغ حاضر رکھنے کی کوشش کی۔
چاقو اس کے ہاتھ میں تھا جس کا بلیڈ خون میں ڈھکا ہوا تھا۔ میں احتیاط سے اس خون سے بچتا بچاتا اس کے بے جان جسم کے نزدیک آیا۔ اس کے جسم پر لگے چاقو کے یہ زخم مخصوص انداز کے تھے۔ وہ زخم جو کسی جنونی حملہ آور سے مڈبھیڑ کے نتیجے میں لگے ہوں اور تمام تر مزاحمت کے بعد بھی جان کی بازی ہار دی گئی ہو۔ یہ خودکشی بالکل نہیں لگ رہی تھی اور ڈیو جیسا ڈیلٹیو اسے خودکشی دکھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔
میری نظر اس کے ہاتھوں پر گئی۔ اس نے بھی دستانے پہن رکھے تھے۔ اسمارٹ ...... میں نے جلدی سے اس جگہ کے اردگرد نظر دوڑاتے ہوئے اپنی توجہ مرکوز رکھنے کی کوشش کی اور یہ چیک کرنے لگا کہ آیا مجھ سے کوئی چیز چھوٹ نہ گئی ہو۔ کچن ٹیبل پر مجھے ہاتھ سے لکھا ہوا نوٹ ملا۔
''کیسپر!
اب میرے لیے یہاں کچھ بھی نہیں بچا۔ میرے دستانے اتار دو اور چاقو نے جاؤ۔ تم جانتے ہو اس کا استعمال کیسے کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے قاتل کو ہاتھ سے جانے نہیں دو گے۔''
میں نے بالکل ویسے ہی کیا جیسا ڈیو نے کہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی انگلیوں کو کھول کر اس کے دستانے اتار لیے اور پھر انہیں چاقو اور نوٹ سمیت پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر اپنے ساتھ لیے وہاں سے نکل آیا۔
مشروب پینے کے بعد میں نے یونیورسٹی فون کیا اور سنگلٹن سے بات کرنے کے لیے کہا۔
کچھ دیر بعد مجھے اس کی سانسیں سنائی دیں۔ ایک ذرا توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''ہاں...... اب کیا ہے؟''
''مجھے تم سے ملنا ہے جیریمی!''
''کیوں؟''
''بہتر ہے اگر ہم آمنے سامنے بات کریں۔'' مجھے اندازہ نہیں تھا مگر شاید میری آواز بھاری ہو رہی تھی۔
''کیا تم پی رہے ہو؟ ہاں...... میں تمہاری آواز سے بتا سکتا ہوں۔'' اس نے خود ہی سوال کر کے بیسے خود ہی کو جواب دیا۔

''تو کیا کہتے ہو؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔
''نہیں شکریہ۔'' وہ قطعیت سے بولا۔
''اگر تم نہیں مانو گے تو میں تمہیں ملنے وہاں آجاؤں گا۔''
میری اس دھمکی پر وہ چند لمحے خاموش رہا۔
''دیکھو، میں بہت مصروف ہوں۔ تمہیں اندازہ بھی ہے آج رات ہمارے سمر پلے کا آغاز ہو رہا ہے؟''
''اس میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔''
''ٹھیک ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں آؤ اور شراب کی بُو آرہی ہو۔''
''اوکے، تو پھر کہاں آؤ گے؟''
''یونیورسٹی سے ایک میل کے فاصلے پر ایک انڈسٹریل سائٹ ہے، کار پارکنگ کے ساتھ۔ چلو، وہاں ملتے ہیں، ایک بجے۔''
میں نے پتا لے لیا۔
پارکنگ ویران تھی۔ سوائے کباڑ! پرانی گاڑیوں کے، جس پر پارکنگ ٹکٹ چسپاں تھے۔ یہ ایک اچھی جگہ تھی۔ الگ تھلگ۔
میں ایک خاک آلود رینالٹ کے پاس کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ میرے شانے کسی انجانے بوجھ سے شل ہو رہے تھے اور میرے ہاتھ میری پیٹھ کے پیچھے کانپ رہے تھے۔ میری جیکٹ کی جیب میں ڈیو کا خونی چاقو تھا۔
سنگلٹن ٹھیک ایک بجے نمودار ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی فیشن شوٹ سے نکلا ہو۔ بال پیچھے سیٹ کیے، آنکھیں ٹھہرے نیلے پانیوں کی طرح۔ اس نے خاکستری چائنوز، لینن کی قمیص، بھورے رنگ کے جوتے اور ایک زبردست مسکراہٹ چہرے پر سجا رکھی تھی۔
''آل رائٹ...'' اس نے مجھ سے چند فٹ دور رکتے ہوئے کہا۔ ''میں آگیا۔ اب بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟''
''میں تمہیں ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔'' میں اس کی آنکھوں میں گھور رہا تھا۔ ''میں پولیس کو بتاؤں گا کہ تم نے کس طرح تعاون کیا ہے لیکن تمہیں ہر بات کا اعتراف کرنا پڑے گا۔''
''میں ایسا کیوں کروں گا؟'' وہ یوں ہنسنے لگا جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔
''کیونکہ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو میں تمہیں ختم کرنا اپنی زندگی کا مقصد بنا لوں گا۔'' میں نے بہت ٹھنڈے لہجے میں یہ بات کی تھی۔
''میں سمجھتا ہوں کہ تم اس قسم کے آدمی نہیں ہو۔'' وہ مسکرایا۔ ''اور نہ ہی میں نے کوئی غلط کام کیا ہے۔ میں انگلینڈ کا ایک باعزت شہری ہوں۔ تم جاؤ، اپنی پوری کوشش کرو مجھے پھنسانے کی۔ شاید میں تم پر ہتک عزت کا دعویٰ کردوں۔ آخر تمہیں ایک معزز شہری کو ہراساں کرنے کی کچھ تو سزا ملنا ہی چاہیے۔''
میرا پورا جسم اب بے قابو ہو کر لرز رہا تھا جس سے توجہ مرکوز کرنا مشکل ہو گیا تھا۔
''جیریمی! لوگ مر چکے ہیں۔ تم اپنا یہ ڈراما مزید جاری نہیں رکھ سکتے۔''
''اوہ، بے شک میں رکھ سکتا ہوں۔ تم مجھے دماغ سے زیر نہیں کر سکتے۔ میری مانو تو اسے کسی تعمیری کام میں صرف کرو۔'' وہ میرا تمسخر اڑا رہا تھا۔
میرے ہاتھ میری پیٹھ کے پیچھے سے نکلے اور میرا دایاں ہاتھ میری جیکٹ کی جیب تک پہنچا۔
سنگلٹن کی آنکھیں پھیل گئیں لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹا۔
''تمہارے پاس وہاں کیا ہے؟ مجھے تکلیف دینے والی کوئی چیز؟''
الکوحل میرے اندرونی ہیجان کے ساتھ مل کر میرے اعصاب توڑنے کے درپے تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ واپس اپنی پشت پر باندھے۔ زمین کی طرف دیکھا اور قہقہہ لگایا۔
وہ ہنسنے لگا۔ ''سچ کہتا ہوں مسٹر کیسپر! میں نے سوچا تھا کہ تمہارا انداز الگ ہے۔ لیکن تم بھی بالکل اکثریت کی طرح ہو۔ کھوکھلے اور ناقص۔''
''یہ... یہ بات ابھی ختم نہیں ہوئی جیریمی!'' میں نے کہا۔
''مجھے لگتا ہے، ہوگئی ہے۔'' وہ پیچھے ہٹا۔ ''میں اب واپس جانا چاہوں گا اور آج رات کے پلے کی تیاری کروں گا۔ مجھے باہر بلانے کے لیے تمہارا شکریہ۔ یہ ملاقات خوشگوار رہی۔'' وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مڑ کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
میں نے وہیں کھڑے کھڑے ڈیرن کو فون ملایا۔ وہ یونیورسٹی کے تھیٹر میں تھا۔ میں پس منظر میں شور، آوازیں سن سکتا تھا۔
مختصر الفاظ میں، میں نے اسے بتایا کہ کس طرح سنگلٹن نے لوسی اور کم از کم ایک دوسرے شخص کو قتل کیا ہے اور اب مجھے آج رات اسے زیر کرنے میں اس کی مدد کی ضرورت ہے۔
''تمہیں یقین ہے کہ یہ جیریمی تھا؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔
''ایک سو ایک فیصد۔''

وہ آہ بھر کر رہ گیا۔ ''لوسی ہمیشہ کہتی تھی کہ اس شخص میں کچھ کمی ہے۔''

''ہاں۔'' میں بڑبڑایا۔ ''ایک روح کی۔''

''تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

☆☆☆

میں ڈسمر نائٹ ڈریم کے آغاز سے پندرہ منٹ پہلے وہاں پہنچا۔ ٹرن آؤٹ متاثر کن تھا۔ تھیٹر فوئر میں، میں نے اپنے آپ کو آرٹ کی قسموں اور درمیانی عمر کے جوڑوں کے درمیان پایا۔ یہ سب ڈراما ڈیپارٹمنٹ کے سپورٹ اور اس کی بُری طرح سے محروم طالب علم، لوسی میک ایلیسٹر کی چیریٹی کے لیے رقم جمع کرنے میں مدد کرنے وہاں موجود تھے۔ سنگلٹن بھیڑ کے درمیان تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا۔

وہ واضح طور پر پہلے سے ہی اپنے کردار میں تھا۔ گھٹنوں تک اونچے جوتے، نیوی سلیکس اور ایک سفید رنگ کی سفید قمیص جو اس کے پتلے کولہوں کے گرد گھوم رہی تھی۔ اس کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگی لوسی کی ایک تصویر تھی جس کے نیچے ''میموری'' لکھا تھا۔

''کمینے!'' میرے اندر طیش کی ایک لہر اٹھی۔

ٹکٹ خرید کر میں آڈیٹوریم میں آیا۔ ڈیرن پردے کے سامنے کھڑا تھا۔ لمبی سی دُم کے ساتھ بھورے رنگ کے تیندوے کے لباس میں۔ چہرے پر گلابی اور جامنی رنگ کا پینٹ تھا۔ ہماری آنکھیں ملیں اور میں چل پڑا۔

''تمہیں یقین ہے کہ تم یہ کر سکتے ہو؟'' میں نے دھیرے سے کہا جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچا۔

''میں کر سکتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''لوسی کے لیے۔''

''ٹھیک ہے۔ پہلے مجھے سنگلٹن کے دفتر میں جانا ہے لیکن میں نظر میں نہیں آنا چاہتا۔''

''اس وقت بیک اسٹیج پر بہت لوگ ہیں۔'' اس نے کہا۔

''جب ڈراما شروع ہوگا، اس وقت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ پیچھے سے ایک فائر ایگزٹ ہے۔ تمہیں وہ میرے لیے کھلا رکھنا ہوگا، ٹھیک ہے؟''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ جیسے ہی ایکٹ ون شروع ہو، تم تھیٹر کے پیچھے آجانا۔ میں ایکٹ ٹو تک نہیں ہوں اس لیے میں تمہیں اندر آنے دے سکتا ہوں۔ جیریمی کی فکر نہ کرنا۔ وہ سارا وقت اسٹیج پر رہتا ہے۔ اسے خبر بھی نہیں ہوگی۔''

''اچھا۔'' میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ڈیو کے چاقو کے ساتھ ساتھ میرے پاس لوگیا کا برز فون تھا۔ میں نے وہ ڈیرن کو دیا۔ ''یاد ہے کیا کرنا ہے؟''

اس نے سر ہلایا، اسٹیج پر چڑھا اور پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

میں مڑا اور تیزی سے چلتے ہوئے آڈیٹوریم کے دروازے کے قریب ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اپنا کوٹ اتار کر میں اپنی تھکی ہوئی آنکھیں رگڑنے لگا اور جب میں نے انہیں کھولا تو مجھے ایک جھٹکا لگا۔ سنگلٹن نہ جانے کب وہاں ٹپک پڑا تھا۔ میں نے کوئی آہٹ بھی نہیں سنی تھی۔ وہ میرے بائیں طرف تھا۔

''تمہیں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔'' اس نے کہا۔ ''ایک بار پھر......''

میں نے اس کی آنکھوں، سفید دانتوں اور صاف ستھرے ہاتھوں کا جائزہ لیا اور چہرے پر وہی مخصوص عجیب سی مسکراہٹ جسے میں غائب کرنا چاہتا تھا۔

''اتنے سٹپٹائے ہوئے کیوں ہو؟ یوں لگ رہا ہے جیسے تم نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔''

''بھوت نہیں، قاتل۔'' میں نے تصحیح کی۔

اس نے ہاتھ یوں لہرایا جیسے کہہ رہا ہو، بولتے رہو۔

اسی وقت ایک نوجوان نمودار ہوا۔ ''پانچ منٹ، جیریمی!''

سنگلٹن نے سر ہلایا لیکن اس کی نظریں مجھ پر جمی رہیں۔ ''مجھے جا کر ڈرامے کی تیاری کرنی چاہیے، مسٹر کیسپر! شو کا مزہ لو۔ مجھے تمہارے آنے سے خوشی ہوئی۔''

''بہت جلد افسوس بھی ہوگا۔'' میں بڑبڑایا تھا۔ اس نے سنا نہیں۔

کچھ ہی دیر بعد بقیہ نشستیں سنبھال لی گئیں۔ لائٹس بند ہو گئیں اور ڈراما شروع ہو گیا۔

سنگلٹن پہلے نمبر پر آیا۔ برف کے گھنے بادل اور ڈھول کی آواز سے ابھرا اس نے ایک مونولوگ پڑھنا شروع کیا۔ اس کا تلفظ بس ٹھیک تھا اور اس کی ہر ایک حرکت نپی تلی تھی۔

میں نے خاموشی سے اپنا کوٹ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ تھیٹر ہال کے باہر رات کی ٹھنڈی ہوا نے میرا استقبال کیا۔ میں چلتا ہوا تھیٹر کے عقب کی..... دائیں طرف مڑ گیا۔

وہاں فائر ایگزٹ کھلا تھا اور ڈیرن میرے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں اطمینان جھلکا اور وہ واپس پلٹ گیا۔

جلدی سے اس مدھم روشنی والے ہال وے میں

داخل ہوتے ہوئے میں نے احتیاطاً اردگرد دیکھا اور پھر سنگلٹن کے آفس میں داخل ہوگیا۔

دو منٹ بعد ہی میں واپس آگیا تھا۔ مین انٹرنس سے ہوتے ہوئے میں نے اپنا ٹکٹ دروازے کے پاس کھڑی اس لڑکی کو دیا۔ جس وقت وہ مجھے میری سیٹ تک جانے کی راہنمائی کر رہی تھی اسی وقت ڈیرن کا ایکٹ شروع ہوا۔ وہ اسٹیج پر آیا اور قاری لہجے میں کچھ سطریں پڑھیں۔ ایکروبیٹکس کرتے ہوئے آڈینس سے خوب داد کمائی۔

لیکن اس پلے کے مرکزی کردار نے باقی سب کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔ میں اداکاری کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ شیکسپیئر کے بارے میں بھی کم...... لیکن میرے نزدیک وہ سطحی تھا۔ گہرائی کا فقدان تھا۔ مجھے اب احساس ہوا کہ اسٹینس میں جس ڈائریکٹر نے اس کی جگہ کسی اور کو دی تھی، کس وجہ سے دی تھی۔ وہ واقعی ایک بہت برا ایکٹر تھا۔

جیسے ہی انٹرول ہوا، میں نے ڈیو کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

پولیس اس کے فلیٹ میں داخل ہوئی ہوگی اور ایک بھیانک دریافت کرے گی۔ ایک گمنام 999 فون کال نے انہیں اس ایڈریس پر کسی گڑبڑ سے آگاہ کیا ہوگا اور لہراتے بالوں اور نیلی آنکھوں والے ایک چھوٹے آدمی کو دیکھا ہوگا جو ہاتھ میں خون آلود چاقو لیے جائے وقوعہ سے فرار ہو رہا تھا۔

تمام 999 کالز ریکارڈ کی جاتی تھیں اور آواز کی شناخت کا مطلب تھا کہ مجھے کسی ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو شناخت سے بچ سکے۔ خوش قسمتی سے ڈیرن ایک ایسا ایکٹر تھا جسے ہر قسم کے لہجوں میں مہارت حاصل تھی۔ میں نے اسے وہ برنر فون اسی مقصد کے لیے دیا تھا۔ یہ مشکل حل ہوگئی تھی۔

وہاں سے پولیس کو مڈسمر نائٹ ڈریم کا ٹکٹ تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہ لگتا جسے سنگلٹن نے ڈیو کے نیچے چھوڑا تھا۔ یہ انہیں بہ آسانی یہاں تھیٹر تک لے آئے گا جہاں انہیں اس کے دفتر میں ایک خونی چاقو ملتا...... ڈریسنگ ٹیبل میں محفوظ طریقے سے رکھا گیا۔ جہاں میں نے اسے رکھا تھا اور جب پولیس کو یہ پتا چلتا کہ وہ دوپہر کے کھانے میں ایک گھنٹا تھا جب وہ باہر نکلا۔

اگر وہ یہ دعویٰ کرتا بھی کہ وہ فار پارک میں ایک پرائیویٹ انفلیئر سے ملاقات کر رہا تھا جس کا نام کیسپر تھا

لیکن حیرت انگیز طور پر میری یادداشت اور ٹائم ٹیبل میں ایسی کوئی ملاقات درج نہ ہوئی۔

اس وقت جب میں ذہن میں یہ سارا جوڑ توڑ کر رہا تھا، مجھے اپنے فون پر ڈیان کی طرف سے ایک پیغام موصول ہوا۔

”ڈیو مر چکا ہے، سنگلٹن پر شبہ ہے۔ پولیس اسے پکڑنے جا رہی ہے۔ تم صحیح تھے۔“

میں مسکرایا اور سیٹ سے ٹیک لگالی۔ یہ خبر سنتے ہی یکلخت مجھ پر تھکن طاری ہوئی۔ مجھے احساس ہوا کہ اس تھکاوٹ کے پیچھے غصہ تھا، دکھ تھا، تاسف تھا۔ ڈیو کو مرنا نہیں چاہیے تھا۔ ہماری بیٹیوں کو مرنا نہیں چاہیے تھا۔ یہ ایک ناقابلِ معافی دنیا ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔

چند منٹ بعد میں نے پہلے سائرن کی آواز سنی تو میں نے خود کو سمجھایا کہ وہ کسی بھی کال آؤٹ کے لیے ہو سکتے تھے لیکن میرے دل کی بڑھی ہوئی دھڑکن میرے اس اندازے کی نفی کر رہی تھی۔

اور میرے دل کی پکار غلط نہیں تھی۔ اس وقت جب سنگلٹن تلوار لے کر گھوم رہا تھا، کچھ پولیس والے ہال کے دروازے پر نمودار ہوئے۔

سر اس طرف کو مڑ گئے۔

”شش......“ سرگوشیاں گونجی تھیں۔

پھر کچھ اور کوپس افراتفری کے عالم میں اندر گھس آئے۔ ایک سنگلٹن کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھی سے کچھ کہہ رہا تھا جس نے سر ہلایا اور اپنے ریڈیو میں بات کرنے لگا۔

سنگلٹن کی آنکھوں میں خفیف سی چمک ابھری تھی۔

اس نے ڈائیلاگ کو ادھورا چھوڑ دیا۔

ویسے تو یہ ڈرامائی تاثر کے لیے بھی ہو سکتا تھا لیکن ایسا تھا نہیں۔

وہ پولیس کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر نیچے جا گری تھی۔

لوگوں کے اس ہجوم میں اس کی بے تابانہ نظریں کچھ تلاش رہی تھیں اور پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں نے مسکرا کر اسے ہاتھ ہلایا۔

مگر وہ اب مسکرا نہیں رہا تھا۔

بالآخر میں اس کی مسکراہٹ غائب کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

×××

شکستہ سائے

فرح بخاری

دنیا میں اگر دھوکے اور فریب کا کوئی وجود ہوتا تو اس کا نام اذیت ہوتا... اور اذیت بھی ایسی جو زندگی بھی چھین لے اور موت کے بعد بھی چین نہ ملنے پائے... شکستگی کے اس مقام پر وہ تنہا سفر کرکے نہیں آئی تھی بلکہ اس کے ساتھ اس کا دلفریب ساتھی قدم سے قدم ملا کر محوِ سفر تھا لیکن بدقسمتی سے وہ اس حقیقت سے آگاہ نہ تھی کہ اس کی دلفریبی تو مکمل ایک فریب تھی... کیسی عجیب بات ہے کہ سماج کی یہ دیواریں کبھی دھوکا دینے والوں کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں البتہ خلوص سے اپنانے والوں کی راہ میں یہ رکاوٹیں فلک بوس دیواریں بن جاتی ہیں یہ اور بات کہ جب کوئی دلفریبی سے فریب دیتا ہے تو اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کس ان دیکھے جال میں لپٹتا جارہا ہے... بالآخر کسی کو بکھیرنے والا خود بھی ایک دھندلی شام... سائے کے ڈھلتے ڈھلتے شکستگی کا شکار ہوکر بکھر گیا کیونکہ کانچ جیسے خوابوں کو ریت کے مانند بکھیر دینا اسے بہت مہنگا پڑ گیا تھا۔

اپنی حیثیت بھول کر محلوں کے خواب دیکھنے والی

ایک دوشیزہ کی شکستہ زیست کا قصّہ
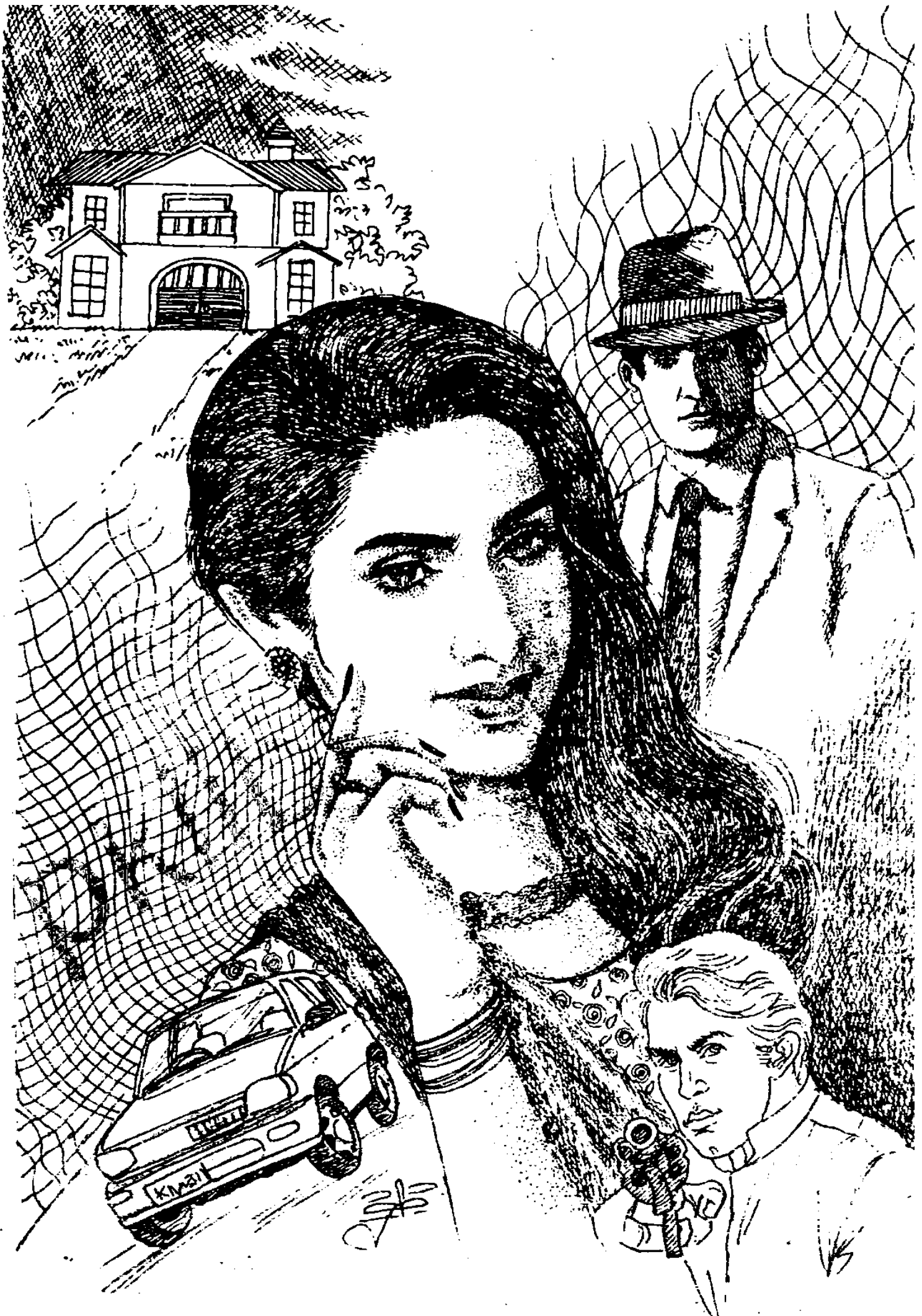
درختوں کے گھنے کالے سائے اس سے درختوں سمیت کسی عفریت جیسے دونوں بانہیں پھیلائے نیچے آتے... اور نیچے آتے اس کی کار کو پورا اپنے اندر سمو لینا چاہتے تھے۔ سندیپ کی خشک زبان پر کچھ جاپی انجانی دعائیں آکر دم توڑ رہی تھیں۔ گھومتا چکراتا سر یہ سوچ کر مزید خالی ہونے لگا کہ بجائے سایوں کے پورا درخت کیوں نیچے کو الٹ رہا ہے... اکادکا گاڑی بس کبھی کبھار تیز رفتاری سے ساتھ قریب سے گزر جاتی اور وہ اس تنہا اکیلے سفر کا بھاری بھرکم بوجھ اٹھائے آگے ہی آگے بڑھنے پر مجبور تھا حالانکہ گھر سے نکلتے وقت وہ خاصا پُرجوش اور جذباتی تھا لیکن آغازِ سفر میں ہی کچھ عجیب سے خیالات یوں وارد ہونا شروع ہوئے کہ سندیپ کو اپنے اکیلے نکل پڑنے پر پچھتاوا سا ہونے لگا۔ پچھلے دنوں جو کچھ اس پر بیتی تھی اس نے گھر میں کسی کو بھی اس سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ کردیتا تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ممی اس کو اکیلا جانے دیتیں اور ان دنوں جبکہ وہ سنجیدگی سے کسی سائکاٹرسٹ سے کنسلٹ کرنے کی سوچ رہا تھا، اسے دارجلنگ کے انجان رستوں پر سفر کرنا پڑ گیا تھا اور یہ بھی کچھ اتفاق کی بات تھی کہ پہلی بار وہ اکیلے سفر کررہا تھا۔ پتا جی کاروباری آدمی تھے اور چند برس ہوئے یعنی جب سے اس نے تعلیم مکمل کی تھی، وہ اسے اپنے ساتھ لگائے ہوئے تھے تاکہ وہ بزنس کی سوجھ بوجھ حاصل کرلے۔ ان دنوں انہیں چائے کا نیا برانڈ متعارف کرانے کا شوق چرایا تھا۔ قریب دو ماہ پہلے وہ خود دارجلنگ جاکر ایک ڈیلر سے معاملات نمٹا آئے تھے۔ سندیپ ان دنوں اپنے انجینئرنگ کے ایک ٹیسٹ کی تیاری میں مصروف تھا اس لیے ساتھ نہ جاسکا اور اب جبکہ پتا جی کی اگلی پارٹی سے تمام ڈیل فون پر ڈن ہوچکی تھی تو وہاں جاکر باقاعدہ یہ ڈیل سائن کرنا تھی لیکن دل کی تکلیف نے انہیں بیڈ ریسٹ پر مجبور کردیا تھا جس بنا پر انہیں سندیپ کو اکیلے دارجلنگ بھیجنا پڑا۔

دھرد دارجلنگ، سندیپ کے لیے ایک نئی دنیا تھی جسے وہ پہلی بار تسخیر کرنے جارہا تھا۔ البتہ جوں جوں سفر آگے کو سرک رہا تھا، اسے اپنا اکیلا پن کچھ زیادہ شدت سے کھلنے لگا تھا۔ اس کے پتا چاہتے تھے کہ وہ ڈرائیور منوہر کو اپنے ساتھ لے جائے لیکن اس کے لیے سندیپ خود ہی راضی نہ ہوا تھا۔

کولکتہ سے کئی گری سے باگ ڈوگرا ائرپورٹ وہ بائی ائر آیا تھا اور یہاں پتا جی کے ایک دیرینہ دوست اچاریہ انکل سے کار لے کر اس نے دوارس پہنچنا تھا۔ دوارس، دارجلنگ سٹی سے پہلے آجاتا تھا۔ چائے کے خوبصورت باغات پر مشتمل یہ ایک پُرسکون پہاڑی علاقہ تھا۔ ائرپورٹ سے نکل کر اچاریہ انکل کے گھر پہنچا تو کھانا کھا کر کچھ دیر ریسٹ کرنے کے لیے لیٹا۔ ارادہ تو آدھے گھنٹے میں آگے نکلنے کا تھا لیکن سفر کی تھکاوٹ کا کچھ اثر تھا کہ اسے لیٹتے ہی نیند آگئی۔ میزبانوں میں سے بھی کسی نے جگایا نہیں کہ مروت ان کے آڑے آگئی لیکن نقصان اس کا یہ ہوا کہ جب اس کی آنکھ کھلی تو سہ پہر مکمل ڈھل چکی تھی۔ شام کا اندھیرا کچھ ہی دیر میں کالی چادر تاننے والا تھا۔ سندیپ نے لمحہ کی تاخیر کیے بغیر اپنا سامان اٹھایا اور پارکنگ میں نکل آیا۔ اچاریہ انکل خود تو یہاں نہیں تھے، ان کا ملازم روکتا رہ گیا لیکن سندیپ نے ایک نہیں سنی اور کار میں بیٹھ گیا۔ سفر شروع ہوا تو کچھ ہی دیر بعد وہ پریشان ہوگیا۔ رات بھی کالی اندھیری ہوچکی تھی اور یہ اس کا چکراتا سر... پھر یہ لمبے پڑتے سائے... اور اوپر کو اٹھتے درخت... اس نے سر جھٹک کر دھیان بدلنے کو میوزک لگا دیا۔

دھیان بہت حد تک تبدیل ہوگیا تھا۔ سنگر کی آواز کی بدولت اب وہ خود کو اکیلا محسوس نہ کررہا تھا اور اس وقت میوزک کے بولوں پر دھیرے دھیرے مسکرا بھی رہا تھا۔ جب ٹیپ کی آواز اٹکنے لگی... چونکہ اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ سنبھالنے میں مصروف تھے۔ تبھی بس ایک نظر پلیئر پر ڈالی اور سنتا ہی رہا۔

تو جانے... اور... اف... سندیپ نے اسٹیئرنگ چھوڑ کر ہاتھ کانوں پر رکھے۔ پلیئر میں سے ایک دردناک نسوانی چیخ نکلی جس سے سندیپ کو کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ گاڑی کو بے اختیاری بریک لگاتے اس نے کانپتے ہاتھ سے پلیئر آف کیا۔

اوہ... ایک بار پھر... پھر وہی نسوانی چیخ... اس کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ اندھیری رات کا فسوں طاری ہونے پر کچھ اور بھی حاوی ہوا۔ جلدی سے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا لیکن اچانک ہی نہایت تیزی سے وائپر چلنے لگے۔ سندیپ نے وائپر آف کرنے کی کوشش کی تو وہ پہلے ہی آف تھے۔ سندیپ نے حیرت سے سامنے کے شیشے کو دیکھا جس پر پوری رفتار سے وائپر چلتے جارہے تھے اور جنہیں بند کرنے کے لیے سندیپ کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ اس نے تنگ آکر وائپر آن کیے تو وہ برق رفتاری سے چلنے لگے۔ یوں جیسے چلتے چلتے ٹوٹ کر ہی دم لیں گے۔ سندیپ نے پھر آف کا بٹن دبایا تو وہ پہلے جیسی رفتار میں واپس آگئے۔ سندیپ نے اس مسئلے کو نظرانداز کرتے ہوئے

سفر کا آغاز کیا۔ اب وہ متواتر چلتے وائپرز کو برداشت کرتے ہوئے کار آگے بڑھا رہا تھا۔ سفر بھی خطرناک تھا۔ سڑک تنگ تھی اور ہر تھوڑی دیر بعد ایک اندھا موڑ...... دل کی کیفیت ایک دم بوجھل، بھاری اور مرنے کی حد تک گھبراہٹ زدہ تھی۔ میلوں کا یہ سفر جیسے آج صدیوں کی مسافت بن گیا تھا۔ سر تھا کہ درد سے پھٹا جا رہا تھا، اوپر سے متواتر چلتے وائپرز اور وہ نسوانی چیخ جو کانوں سے نکلنے کو تیار ہی نہ تھی۔ وہ نیم جان سا اپنی کار کو کسی بیل گاڑی جیسے آگے کھینچ رہا تھا۔

اور یہ سب کچھ کوئی پہلی بار تو نہ تھا۔ سندیپ کو آج اپنی بے پروائی پر جی بھر کر پچھتاوا محسوس ہو رہا تھا۔ گزرے دس ماہ کے دوران اس کے ساتھ کتنا کچھ پیش آچکا تھا۔ کبھی یہ نسوانی چیخ سوتے میں اسے جگا دیتی تو کبھی لوگوں کے درمیان بیٹھے وہ بے ساختہ دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیتا۔ تب اسے حیرت ہوتی کہ آس پاس بیٹھے افراد کو ایسی کوئی آواز سنائی نہ دی تھی...... پھر راتوں کو اس کا سونا کہیں اور...... اور جاگنا...... سندیپ نے بے اختیار ایک جھرجھری لی۔ وہ رات کو بڑے عام انداز میں اپنے بیڈ پر سوتا لیکن جب آنکھ کھلتی تو وہ کبھی بالکنی میں سویا ملتا، کبھی چھت کے شیڈ پر عین چھت کے کنارے پر۔ قدرت نے ہمیشہ اسے گرنے سے بچا لیا ورنہ وہ یہ سوچ کر گھنٹوں ساکت رہتا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے...... اور اگر کسی دن وہ کنارے سے ذرا سا بھی ادھر ہوا تو...... اور پھر وہ سنجیدگی سے اس بات پر غور کرنے لگا کہ اسے کسی نفسیاتی معالج سے مل لینا چاہیے۔ اسے لگا وہی راتوں کو نیند میں چلتا رہتا ہے اور نیند کی دوا کھا لینے سے اس مسئلے کا حل نکل سکتا ہے لیکن وہ نہیں جانتا تھا ایسے حادثے زندگی میں یونہی نہیں ہوا کرتے۔ کچھ ادھورے کام زندہ لوگوں کے لیے تو بے معنی ہوتے ہیں پر مرے ہوؤں کی روح کو تاابد بے چین و بے قرار رکھتے ہیں۔

☆☆☆

تین گھنٹوں کا سفر جیسے تیسے متواتر طے کر کے وہ رات ساڑھے گیارہ بجے دوارس ٹی پہنچا تو منیجر سوہن داس نے کال پر ہی راستہ کچھ ایسے سہولت سے سمجھا دیا کہ سندیپ سیدھے ان کے آؤٹ ہاؤس کے گیٹ پر آگیا۔ سوہن داس کا گھر آؤٹ ہاؤس سے تھوڑا پیچھے ڈھلان چڑھ کر تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ سندیپ اس کی ذاتی انیکسی میں ٹھہرے لیکن پاپا سے کہہ کر اس نے خود ہی آؤٹ ہاؤس میں بندوبست کرنے کو کہا۔ دارجلنگ کے تین دن وہ خوب مزے سے بے فکر ہو کر گھومتے پھرتے گزارنا چاہتا تھا۔ سوہن داس کے بھرے پُرے گھر میں باقی افراد خانہ بھی موجود ہوتے اور یہ جھنجٹ اس کی نازک طبیعت پر گراں گزرتا۔ پاپا اس کی نیچر جانتے تھے تبھی سوہن داس کو بھی سمجھا دیا۔ البتہ کھانے پینے کے لیے سندیپ نے شیف کی بات کی تو یہاں سوہن داس نے اس سے منوا ہی لیا کہ کھانا وہ اپنے ہاں سے تیار کر کے بھیجا کرے گا اور اس بارے میں مزید کوئی بات نہیں ہوگی۔ سندیپ نے بھی زیادہ بحث نہیں کی۔ آخر تین دن کی ہی تو بات تھی۔ کار کو پارکنگ میں روک کر وہ چوکیدار کی راہنمائی میں اپنے کمرے تک پہنچا۔ سوہن داس اسی وقت ملنے آگیا۔ کھانا بھی وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ سندیپ نے فریش ہو کر کھانا کھایا۔ کچھ دیر سوہن داس کے ساتھ ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور اس کے چلے جانے کے بعد وہ بھی کھڑکیاں دروازے بند کر کے سو گیا۔

☆☆☆

آ آ آہ...... الویرا ٹھٹک کر رکی۔ کسی کے کراہنے کی آواز آئی تھی۔ کسی انسان کے کراہنے کی آواز۔ وہ خوفزدہ ہو کر رکی۔ دل کہیں ڈوب سا گیا۔ پلٹ کر پہلے تو اوپر پروفیسر صاحب کے بنگلے کو دیکھا پھر سامنے نیچے دکھائی دیتی سڑک کو۔ وہ اس وقت دونوں کے عین درمیان میں تھی۔ مردانہ آواز کے کہیں بہت قریب ہونے کے احساس نے بُری طرح سہما دیا تھا۔ قدم تو اپنی جگہ سے مانو ہلنے کو ہی انکاری ہو گئے۔ وہ دل ہی دل میں سرلی کاکا کو کوسنے لگی۔ وہ آج پھر پاپا کے کسی کام سے فیلڈ کی طرف نکل گیا تھا۔ ایسے میں اسے پھر پیدل گھر جانا پڑا تھا۔ اب بھلے یہاں کے اونچے نیچے راستے خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھے لیکن نہ صرف وہ چلنے سے کتراتی تھی بلکہ یہاں کی ویرانی اور اونچے نیچے تنہا راستے اسے خوفزدہ بھی خوب کرتے تھے۔ پروفیسر آنند کا بنگلا ان کے گھر سے چار پانچ کوس دور تھا۔ پروفیسر آنند اسے زولوجی پڑھاتے تھے اور شرط ان کی ایک ہی تھی کہ سوائے پہلے وقت کے وہ سارا دن فارغ نہیں ہوتے۔ ناچار الویرا کو کھینچ تان کر صبح جلدی اٹھنا پڑتا اور سات بجے سے نو بجے تک پڑھنے کے بعد وہ گھر واپس آجاتی۔ بیتا اور نشا آج کچھ دیر پہلے پڑھ کر نکل گئی تھیں ورنہ وہ انہی کی کار میں آجاتی اور اب یہ انسانی کراہ...... اس کی کھوجتی آنکھوں میں ایک خوف تھا۔ بالآخر اس نے ہمت پیدا کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا اور ڈھلان اترنے لگی لیکن ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھ پائی تھی کہ گھنی گھاس سے گزرتے وہ ایک بھاری چیز تھی جو اس کے پیروں سے ٹکرائی تھی۔ الویرا پھر بدک کر دو قدم

پیچھے ہوئی اور نیچے دیکھا تو ایک جدید طرز کی بالکل نئی دوربین پیروں میں پڑی دکھائی دی۔ وہ یقیناً اسی بھاری دوربین سے ٹکرائی تھی۔ عین انہی لمحوں میں کراہنے کی آواز دوبارہ سنائی دی بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ صاف اور قریب۔ اس نے پھر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔

''کک... کون ہے؟'' الویرا کے حلق سے آواز بڑی دقت کے ساتھ نکلی۔

''ہے... ہے... ہیلپ۔'' ایک سمت سے دھیمی سی آواز ابھری۔ الویرا نے اپنے حلق میں کچھ اٹکتا سا محسوس کیا۔ اس کے قدم کانپ رہے تھے، سوچیں عجیب مخمصے کا شکار تھیں۔ وہ اپنے آپ کو اس وقت بڑی مشکل میں گھرا محسوس کر رہی تھی کہ ہیلپ مانگنے والے کی مدد کے لیے آگے بڑھے یا نہ بڑھے۔ وہ کانپتے قدموں سے تقریباً لڑکھڑاتے ہوئے ڈھلان اتری تو ارادہ سیدھے اپنے گھر کو نکل جانے کا تھا لیکن اترتے ہی سرسبز جھاڑیوں کے دوسری طرف وہ ایک نوجوان تھا جو بالکل اس کے پیروں میں اوندھا پڑا کراہ رہا تھا۔ الویرا کا دل بے طرح دھڑکے جا رہا تھا۔ نظریں نوجوان پر تھیں جس نے اپنے ٹخنے کو تھام رکھا تھا۔ الویرا بغور اس لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔ نیلی شرٹ اور بلیک جینز والے لڑکے کے ہاتھ... اوہ...

وہ فوراً ہی بنا کچھ سوچے اکڑوں بیٹھ گئی۔ لڑکے کا پورا ہاتھ خون سے بھرا ہوا تھا۔ اب اس لڑکے کا چہرہ بھی نظروں کے سامنے تھا۔ ہلکی بڑھی شیو اور کھلی رنگت والا وہ لڑکا کافی خوش شکل تھا۔

''ایکسکیوز می... ہیلو...!'' وہ اس کے آگے ہاتھ لہراتے ہوئے متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن لڑکے کی پلکیں بند تھیں۔ نسوانی آواز سن کر البتہ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش ضرور کی تھی۔

''کیا ہوا آپ کو اور جانا کہاں ہے؟'' الویرا نے مزید پوچھا۔ خوف کی جگہ اب پریشانی نے لے لی تھی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ کوئی سیاح تھا جو گھومتے پھرتے کسی مشکل میں پھنس گیا تھا۔

''میرا پاؤں...'' اس نے نیچے کی جانب اشارہ کیا اور یہ تو الویرا دیکھ ہی چکی تھی کہ لڑکے کا پیر زخمی ہے۔ اس نے جلدی سے اپنے کندھے سے لٹکے ہینڈ بیگ کو سامنے کیا اور اس میں سے چند ٹشو پیپرز تو نکلے پر باندھنے کے لیے کچھ میسر نہیں آیا۔ جلدی سے ٹشو پیپرز سے اس کا زخم دبایا۔ لڑکا اب اٹھ بیٹھا تھا۔

''زخم کیسے آیا؟'' الویرا نے ذرا کی ذرا نظریں اوپر اٹھائیں۔

''ایک لمبا سا نکیلا پتھر پنڈلی میں آ لگا اور بری طرح کٹ لگ گیا۔''

''اوہو...'' الویرا نے ٹشو سے خون دبا کر اپنے گلے کا پیلا ریشمی رومال نکال کر ٹشو پیپر والی جگہ پر پٹی باندھ دی۔

''ارے، یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' وہ اس کا رومال خراب ہوتے دیکھ کر چلایا لیکن الویرا نے ہاتھ نہیں روکے اور پٹی سختی سے باندھ دی۔

''کوئی بات نہیں۔ یہ زیادہ ضروری ہے۔ ویسے اب کیا آپ چلنے کی کوشش کر سکتے ہیں؟'' الویرا نے کام نمٹا کر نظریں اٹھائیں تو سندیپ کچھ چونک کر حال میں لوٹا۔

''جی... کچھ کہا آپ نے؟''

''آں... وہ... آپ چل کر دیکھ سکتے ہیں؟'' الویرا کچھ جھجک کر اپنی بات دہراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سندیپ اس کے کام کے دوران بغور اسے دیکھے جا رہا تھا۔

''جی، میں کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے ہتھیلی گھاس پر جما کر اٹھنے کی کوشش کی تو الویرا نے فوراً اپنا ہاتھ مدد کے لیے آگے بڑھایا جسے سندیپ نے تھام لیا اور زخمی پیر پر دباؤ نہ دیتے ہوئے مکمل اٹھ کھڑا ہوا پھر دھیرے دھیرے زخمی پیر کو زمین پر رکھا اور قدم آگے بڑھایا۔ یہ دیکھ کر البتہ... تسلی محسوس ہوئی کہ زخم گہرا تھا پر ہڈی محفوظ تھی۔ وہ باوجود زخم کے آرام سے چل پا رہا تھا۔

''آپ کا بہت شکریہ۔ اب میں ٹھیک سے چل پا رہا ہوں۔'' وہ کہہ کر آگے چل پڑا۔

''ایک منٹ...'' الویرا کو اچانک کچھ خیال آیا۔ وہ تیز قدموں سے اوپر چڑھی اور دوربین ہاتھ میں لیے سندیپ کے سامنے آئی۔

''یہ آپ کی ہے؟''

''اوہ، ہاں... اور...'' اس نے خیال آنے پر اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ اپنا موبائل، بٹوا اور چند ایک ضروری چیزوں کی موجودگی کی تسلی کی، دوربین گلے میں لٹکائی اور آگے بڑھنے لگا۔ الویرا ابھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

''آپ تکلیف نہ کریں۔ میں چلا جاؤں گا۔'' وہ ایک لحظے کو رکا جس پر الویرا مسکرائی۔

''فی الحال مجھے بھی اسی راستے پر چلنا ہے، تو کوئی بات نہیں۔ ایک ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔''

''اوہ... صحیح... آیئے پھر۔'' اس نے ہاتھ کے

اشارے سے آگے بلایا اور دونوں ساتھ ساتھ نیچے اترنے لگے۔

''آپ بھی اکیلی ہیں اور قریب کہیں رہتی ہیں؟''

''جی نہیں۔ گھر تو نیچے آبادی میں ہے۔ یہاں میں ٹیوشن لینے آتی ہوں۔ اوپر جو چند بنگلے بنے ہوئے ہیں، انہی میں سے ایک ہمارے پروفیسر صاحب کا ہے۔'' وہ بتانے لگی۔

''اچھا، تو روزانہ اتنی دور سے پیدل آتی ہیں؟'' سندیپ نے حیرت سے دور آبادی کی طرف دیکھا۔ فاصلہ اچھا خاصا تھا۔

''نہیں، میں اپنی کار پر آتی ہوں لیکن ڈرائیور شاید پاپا کے کسی کام سے چلا گیا ہے۔ وہ نہیں آیا تو میں پیدل نکل آئی۔''

''یہاں کے ماحول میں ویسے پیدل چلنا بھی کسی نعمت یا جرنی سے کم نہیں۔ اِٹس سو بیوٹی فل۔'' وہ مسکراتے ہوئے اس سرسبز ماحول کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ یہاں نہیں رہتے نا۔'' الویرا نے بیزار کن سی صورت بنائی تو سندیپ حیران ہو کر رکا۔

''کیا مطلب! یہ بیوٹی فل نہیں ہے؟''

''اوہ ..... وہ بات نہیں۔'' الویرا ہنس پڑی۔ ''میری مراد پیدل چلنے سے ہے۔ سیر و تفریح کے لیے چند دن آنا اور بات ہے پھر گھومنا پھرنا، چلنا پھرنا سب اچھے لگتے ہیں لیکن مجھے پیدل چلنے سے سخت کوفت ہوتی ہے۔ جس دن ڈرائیور نہ آئے، میرا موڈ بالکل آف ہو جاتا ہے۔''

''یعنی اس وقت آپ کا موڈ آف ہے؟'' وہ اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ الویرا ابھی ہنس پڑی۔

''نہیں۔ آج مجھے یہ لگ رہا ہے کہ ہر کام کسی نہ کسی وجہ سے ہوتا ہے۔ بھگوان کی یہی اچھا تھی کہ میں آپ کے کسی کام آؤں۔''

''بہت مہربانی آپ کی۔ اگر آپ وہاں نہ پہنچتیں تو میرے لیے اٹھنا بہت مشکل ہو رہا تھا پھر مجھے یہ بھی لگ رہا تھا کہ موچ شاید ہڈی کی ہے اس لیے بھی اٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔''

''یہ واقعی بہت اچھا ہوا کہ ہڈی مڑنے سے بچ گئی۔ ویسے ابھی آپ کو زخم کی ڈریسنگ وغیرہ کے لیے کسی کلینک جانا چاہیے اگر......''

''آپ برا نہ مانیں تو آپ کا تعارف حاصل کر سکتا ہوں؟''

''مجھے الویرا کہتے ہیں۔''

''اچھا، گڈ......! اور مجھے سندیپ رائے۔''

''سندیپ! آپ گھومنے آئے ہیں؟''

''نہیں، پتا جی کے ایک کام کے سلسلے میں آنا ہوا۔ آنا تو ایکچوئلی انہوں نے تھا لیکن ان کی طبیعت اچانک کچھ بگڑ گئی تو انہوں نے مجھے بھیج دیا۔''

''اچھا۔'' الویرا کچھ دیر کے لیے رکی۔ ''کیسا کام ہے؟ سوری! اگر آپ نہ بتانا چاہیں تو ''

''اوہ، ایسی کوئی بات نہیں۔ چائے کا ایک نیو برانڈ لانچ کر رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں ...'' اس نے کندھے اچکائے۔

''واؤ، گریٹ!'' وہ ہنس دی۔ ''کامیابی کے لیے پُرامید ہوں۔''

''تھینکس۔''

''تو ..... کتنے دن؟''

''یہی بس تین چار دن۔ آج ویسے یہاں میرا پہلا دن ہے۔''

''اوہ ..... پہلے دن ہی چوٹ لگ گئی۔''

''کوئی بات نہیں پھر دیکھیں تو کتنی آسانی سے چلتا آ رہا ہوں۔''

''اچھی بات ہے نا۔ اب آپ آرام سے گھوم پھر لیں گے۔''

''ویسے یہاں دیکھنے کو کیا کچھ ہے؟'' سندیپ کو خیال آیا کہ وہ تو لوکل تھی۔

''جیسا آپ کا مزاج لگ رہا ہے تو آئی تھنک، یہی نی فارسٹ ہی بہت ہیں گھومنے کو۔''

''میرا مزاج؟'' وہ سوالیہ اسے دیکھنے لگا۔ ''کیسے جانا؟''

''دور ہی سے لگ کر آپ اکیلے اس ویران جگہ پر نکلے ہوئے تھے۔ یہی لگا کہ لوگوں سے گھبراتے ہیں۔''

''جی، ہے تو ایسا ہی۔ لوگ تو اب ہر جگہ ہیں۔ تنہائی اور سکون بہت کم دکھائی دیتا ہے اور یہ جہاں بھی ملے، اس ٹائم کو خوب لطف لے کر گزارنا چاہیے۔''

''بس تو پھر ان خوبصورت فیلڈز کی تصاویر بنائیں۔ یہاں کی سیر کریں اور ہاں، میرا مشورہ ہے کہ .....'' الویرا نے کہتے کہتے رخ بدلا اور ایک سمت انگلی سے اشارہ کیا۔

''وہ پہاڑ کی چوٹی دیکھ رہے ہیں؟ وہاں تک ضرور جائیں۔''

''اچھا، گڈ! کیا ہے وہاں؟'' سندیپ کو دلچسپی محسوس ہوئی۔

''وہی آپ کی من پسند تنہائی، خاموشی، بہت سی خوبصورتی اور ہاں، اضافی چیز وہاں سے نیچے گہری وادیوں کا نظارہ۔''

''واؤ، گریٹ! پھر تو ضرور دیکھیں گے۔'' دونوں مسکراتے اور باتیں کرتے ہوئے آؤٹ ہاؤس کے دروازے پر پہنچے تو سندیپ چونکا۔

''ہم دونوں کا راستہ میرا گھر آنے تک ایک ہی تھا؟

کمال ہے۔“
”آپ یہاں رہتے ہیں؟“ الویرا کے لہجے میں حیرت پنہاں تھی۔
”جی، ابھی پچھلے روز سے ہی اور آگے بھی دو دن۔“ اس نے مفصل بتایا۔”اور آپ ..... آپ نے آگے کہاں تک جانا ہے؟“
”بس یہی ..... آؤٹ ہاؤس کے پچھواڑے اور جاکر پاپا سے شکوہ کرنا ہے کہ مہمان کو اکیلے کیوں بھیج دیا زخمی ہونے کے لیے۔“ وہ اب مسکرا رہی تھی جبکہ سندیپ کا حیرت سے منہ کھلا۔
”مطلب..... آپ سوہن داس جی کی بیٹی.....؟“
”جی، وہی میرے پاپا ہیں۔“
”واؤ، یہ تو بہت ہی عجیب ..... آئی مین بہت ہی خوشی کی خبر ہے۔ آپ سے تو ملنا جلنا رہے گا۔“
”آں.....“ وہ کچھ رکی پھر اِدھر اُدھر محتاط نظر ڈالی۔
”جی ضرور لیکن پاپا سے میرا ذکر نہ کرنا۔“
”اچھا، وہ کیوں؟“
”وہ اصل میں پاپا میری اکیڈمی کے..... ان ٹیکٹ میرے زیادہ پڑھنے کے ہی حق میں نہیں ہیں۔ انہیں پتا چلا کہ راستوں میں ایسے اتفاقات ہوا کرتے ہیں تو یو نو.....“ اس نے جھینپے جھینپے انداز میں ناک سکوڑی تو سندیپ ہنس دیا۔
”راستوں کے ایسے حسین اتفاقات سے پتا جی ناواقف ہی رہیں تو اچھا ہے کیونکہ ان کے علم میں آ گیا تو مزید خوبصورت اتفاقات کی راہیں بھی بند ہو جائیں گی۔“
”میں چلوں؟“ اب کے انداز میں ایک شرمیلا پن تھا۔
”پھر کب ملیں گی الویرا؟“ سندیپ کی ہمت میں بھی اضافہ ہوا تھا۔
”کل صبح۔“ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔
”اتنی دور۔“ سندیپ نے نچلا لب دانت میں دباتے اظہار کے لمحوں کو طویل کیا۔

☆☆☆

”ہے بھگوان! اتنی بارش۔“ سنینا نے پلو سے چہرہ صاف کرنے کی کوشش کی لیکن دوپٹا پہلے ہی پورا بھیگ چکا تھا۔ مارکیٹ سے نکلتے وقت اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ باہر موسم اتنا بگڑ چکا ہے۔ بیسمنٹ میں شاپنگ کرتے باہر کا ماحول کیا خاک کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تو ہاتھ میں پکڑے تھیلے مانو ہوا سے اڑنے ہی لگے۔ تیز طوفانی بارش نے اس کا سواگت کیا اور وہ بُری طرح بوکھلا گئی۔ فٹ پاتھ سے ہی چھاتا خرید کر سر پر تانا۔ تب تک اگرچہ وجود سارا بھیگ چکا تھا لیکن چھاتے کی وجہ سے اب کم از کم دکھائی اور سجھائی تو دینے لگا تھا۔ ٹریفک یوں تو خوب روانی سے آ، جا رہی تھی پر آٹو نہیں دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اوپر سے لگاتار بجتا موبائل۔ وہ بارش میں موبائل باہر نکالنا نہیں چاہتی تھی پر یہ بھی معلوم تھا کہ کون اتنے تواتر سے گھنٹیاں مار سکتا ہے۔
”افو ممی! آٹو تو رو کنے دو۔ میں سوچ رہی تھی آٹو میں بیٹھ کر آپ سے بات کر لوں گی۔“
”ابھی تک آٹو نہیں ملا؟ ارے تو کہاں کھڑی ہو، گھر کیسے پہنچو گی؟“ ممی کی حالت مزید غیر ہونے لگی۔
”کوئی چنتا کی بات نہیں۔ آٹو نہ ملا تو کچھ دیر دوبارہ مارکیٹ کے اندر چلی جاؤں گی۔ تم پلیز فی الحال کالیں ملا ملا کر تنگ مت کرو۔“ اس نے ممی کو سمجھا کر فون کاٹ دیا۔
”مے آئی ہیلپ یو۔“ قریب بالکل اچانک کوئی بولا تو وہ اچھل کر دور ہوئی۔ چھاتا اوپر اٹھا کر دیکھا کالی چھتری سر پر تانے وہ ایک نوجوان تھا جو بالکل بھیگا ہوا نہیں تھا اور یقیناً بیسمنٹ سے ہی نکلا تھا۔
”کیسی ہیلپ؟“ سنینا کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔
”آپ کو شاید آٹو نہیں مل رہا۔ میں آپ کو کہیں ڈراپ کر دوں؟“
”کیوں؟“ سنینا کا لہجہ سخت اور روکھا ہوا۔
”خراب موسم کی وجہ سے..... اور کیا۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ البتہ اب اس کا اعتماد کچھ کمزور پڑ گیا تھا۔ لڑکی کافی بدتمیز دکھائی دیتی تھی وہ آفر کر کے پچھتایا۔
”یہاں بہت سے لوگ ہیں جو اس وقت مدد کی تلاش میں ہیں۔ آپ کسی اور کی ہیلپ کر دیں۔“ وہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔
”کام تو میں کسی نہ کسی کے ضرور آؤں گا لیکن بنا آپ کی صلاح کے۔“ وہ بھی غصہ دکھا کر آگے بڑھ گیا۔ لڑکیاں بھی نہ جانے لفٹ کو سوائے ایک چانس کے کچھ سمجھنے کو تیار نہیں ہوتیں۔ بدتمیز نہ ہوں تو۔ وہ فٹ پاتھ سے اترتے اپنی کار میں جا بیٹھا۔ سامان ساتھ والی سیٹ پر پھینک کر کار اسٹارٹ کی۔ مام نے اچھا موسم دیکھتے ہوئے کال کر کے پاستا کی فرمائش کر دی تھی۔ اب اگرچہ موسم خوبصورت سے قدرے طوفانی اور ہولناک ہو چکا تھا لیکن ماں تو گھر بیٹھی تھیں۔ ان کو ایسی باریکیوں کا اندازہ نہ تھا۔ اس نے بازار کے رش والے ایریا سے نکل کر کار کو ایک فاسٹ فوڈ شاپ کے

سامنے روکا اور پاستا لینے ایک دکان میں گھس گیا۔ رش تو یہاں بھی خوب تھا لیکن اس نے آرڈر دے کر بجائے شاپ میں بیٹھنے کے، باہر کا رخ کیا۔ دکان کے باہر بڑا سا شیڈ بنا ہوا تھا۔ لوگ شیڈ کے نیچے ٹھہر کر موسم کو انجوائے کر رہے تھے۔ اس نے بھی چھاتا بند کر کے بارش کا نظارہ کرنا شروع کیا۔ قریب بیس منٹ بعد اسے اس کا مطلوبہ آرڈر مل گیا۔ پیمنٹ کر کے وہ جونہی پلٹا، دکان کے عین سامنے سے گزرتی آٹو میں سے ایک لڑکی نے روکو روکو کا شور مچانا شروع کر دیا جس پر آٹو والے نے بوکھلا کر آٹو کو روکا اور وہی بدتمیز لڑکی لڑتی جھگڑتی آٹو سے باہر نکل آئی۔ فٹ پاتھ کی طرف بڑھتے بھی وہ پلٹ پلٹ کر آٹو والے کو گالیوں سے نواز رہی تھی۔ چہرہ چونکہ دوسری جانب تھا اور قدم آگے کی طرف تو جونہی فٹ پاتھ کا اونچا کنارہ آیا، لڑکی کا پاؤں کنارے سے ٹکراتے ہوئے اسے اوندھے منہ گرا گیا۔

''مائی گاڈ!'' دو تین لوگ آگے بڑھے۔ لڑکی کراہتی ہوئی فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔ بے چاری کی ٹانگ ٹخنے سے قریب دو تین انچ اوپر والی جگہ سے بری طرح چھل گئی تھی۔ خون بھی رسنے لگا تھا۔ لوگ زبانی ہمدردی تو کر رہے تھے لیکن برستی بارش میں مناسب سدباب کسی کے پاس بھی نہ تھا۔

''یہ تو روڈ کا زخم ہے۔ ان کو تو انجکشن لگنا چاہیے۔'' کسی پڑھے لکھے کے منہ سے مشورے کے انداز میں نکلا تو وہ ایک بار پھر آگے بڑھا۔

''آپ پلیز، میری کار میں بیٹھ جائیں۔ یہاں نہ تو آسانی سے آپ کو دوسرا آٹو ملے گا، نہ ہی کلینک کہیں نزدیک ہے۔ بیٹھ جائیں۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی مدد پیش کر دی جس پر آس پاس کھڑے ہوؤں نے بھرپور انداز میں سنینا کو منانا شروع کیا۔ وہ بھی اس بار کسی قدر رضامند دکھائی دیتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی۔ لڑکے نے اس کے لیے اپنی کار کا دروازہ کھول دیا۔ سنینا لنگڑا کر چلتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور گھوم کر دوسری جانب سے آ کر اس نے بھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔

''پہلے آپ کو قریبی کلینک چلنا چاہیے۔''

''نہیں۔ آپ مجھے میرے گھر چھوڑ دیں۔ میں اپنی ممی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

''ارے بھئی گھر سے دوبارہ نکلنا مشکل ہو جائے گا پھر یہ طوفانی بارش دیکھیں۔ کیا پتا اس میں کمی کے بجائے اضافہ ہونے لگے اور آپ کو یہ انجکشن شاید چوبیس گھنٹوں کے اندر لگوانا ہوگا۔''

''شاید اڑتالیس گھنٹے۔'' سنینا نے اپنا اندازہ ظاہر کیا۔

''جو بھی ہے، جلدی لگوا لینا بہتر ہوگا اور اب آپ مزید بحث نہیں کریں گی۔'' وہ اس بار کچھ خفا دکھائی دیا تو لڑکی اپنی مسکراہٹ نہ روک سکی۔ اس نے دو ٹرن لینے کے بعد ایک چھوٹے کلینک کے سامنے کار روکی اور سنینا لنگڑاتے ہوئے خود ہی اندر چلی گئی۔ وہ بھی کار پارک کر کے اندر آیا۔ ریسیپشن سے اس نے پرچی بنوائی تھی۔ او پی ڈی میں کچھ ہی دیر میں انجکشن لگا دیا گیا اور دونوں باہر آ گئے۔ بارش اب بہت کم ہو چکی تھی۔ سنینا دوبارہ کار میں بیٹھی۔ سنینا سے اس کے گھر کا ایڈریس معلوم کر کے اس نے کار اسٹارٹ کر دی۔

''سوری!'' سنینا دھیرے سے منمنائی تو اس نے ہلکا سا سر گھمایا۔

''ہوں؟'' اسے واقعی سنائی نہ دیا تھا۔

''آئی ایم سوری!'' سنینا بات کے دہرائے جانے پر کچھ خفا سی ہوئی تو وہ مسکرا دیا۔

''سوری کس لیے؟ پہلی مرتبہ میں آپ نے بھروسا نہیں کیا تو یہ نیچرل سی بات ہے۔ مجھے برا نہیں لگا۔'' وہ اپنے وقتی غصے کو ویسے بھی اب بھلا چکا تھا۔

''اچھا، ویسے آپ وہ آٹو والے کو برا بھلا کیوں کہہ رہی تھیں؟'' اسے اچانک کچھ خیال آیا۔

''مجھے مجبوری میں ایسے آٹو پر بیٹھنا پڑا جس میں پہلے ہی ایک سواری موجود تھی لیکن اب وہ مسلسل انجان راستوں پر گھمائے ہی جا رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر گونگوں کی طرح بیٹھا تھا۔ کسی بات کا جواب ہی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے بھی شور مچا دیا۔ دو، دو مردوں کے ساتھ اکیلے بیٹھنا ویسے بھی بڑا ہوا رسکی ہے۔'' اس نے جھرجھری لی تو وہ ایک بار پھر ہنس پڑا۔

''ویسے زخمی پاؤں کے ساتھ ایک مرد کے ساتھ بیٹھنا بھی کم خطرناک نہیں۔'' وہ چونکہ اسے تنگ کر رہا تھا۔ لہجے سے ہی ظاہر تھا تو سنینا بھی ہنس پڑی۔

''بالکل خطرناک نہیں کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ میں چیخ چلا کر کار تو کیا جہاز بھی رکوا سکتی ہوں۔''

''ہاہاہاہا......'' اس بار وہ خوب انجوائے کر کے ہنسا تھا۔ ''جان پیاری ہے تو یہ غلطی ویسے بھی مت کیجیے گا۔''

''یس، آئی نو۔'' وہ بھی ہنس پڑی۔ باتوں باتوں میں سنینا کا گھر آ گیا۔ تنگ سی گلی کا وہ ایک سادہ سا گھر تھا۔ سنینا ایک شاندار کار سے اتر کر اپنا سامان ہاتھ میں لیے لنگڑاتی ہوئی اپنے گھر میں داخل ہوگئی اور اس نے واپسی کی راہ لی۔ یہ خیال واپسی کے راستے میں آیا کہ دونوں نے ہی ایک

دوسرے کا تعارف حاصل نہیں کیا تھا۔
''چلو، شاید پھر کبھی...... کہیں......'' وہ اس سانولی موہنی صورت والی کا تصور کر کے مسکرا دیا۔

☆☆☆

''ہائے!'' الویرا نے دور سے ہاتھ ہلایا تو سندیپ تھک کر ایک اونچے پتھر پر بیٹھ گیا۔ ہائے کا جواب اس نے ہاتھ ہلا کر دے دیا تھا۔
''آپ کی ہائے سننے کے لیے یہ خاکسار پچھلے چالیس منٹ سے واک کر رہا ہے۔''
''اوہو...... ایسی حالت میں؟'' الویرا نے اس کے زخمی پیر کی جانب اشارہ کیا تو سندیپ نے بھی نیچے دیکھا۔
''ارے، ایسا کچھ نہیں۔ زخم واقعی بیرونی نوعیت کا تھا۔ چلنے پھرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔''
''چلیں، شکر ہے۔''
''اور......؟'' سندیپ نے اس کے ہینڈ بیگ کی طرف ابرو سے اشارہ کیا۔ ''پڑھنے......؟''
''جی۔'' اس نے سر اثبات میں ہلایا۔
''ہوں...... جائیے۔'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو الویرا ہنس دی۔
''ساتھ نہیں آئیں گے؟''
''اچھا۔'' وہ بھی مسکرا دیا۔ ''کسی نے کہا جو نہیں۔''
''تو ڈرائیور آج بھی نہیں آیا؟'' سندیپ کو اس کی کل کی بات یاد تھی۔
''جی، وہ تو آیا تھا، میں نے ہی منع کر دیا۔''
''لیکن آپ تو پیدل چلنے سے گھبراتی ہیں نا؟''
''جی گھبراتی ہوں لیکن یہاں ایک سیاح بس تین دن کے لیے آیا ہے جو راہ بھی دیکھ رہا تھا۔'' وہ نیچے دیکھتے مسکرا رہی تھی۔
''اچھا، اور یہ آپ نے کیسے جانا؟'' وہ چلتے چلتے رکا تو الویرا نے ابرو سے اوپر اشارہ کیا۔
''وہ سفید بالکونی۔ وہاں میرا روم ہے۔ اس کی کھڑکی سے آپ کو دیکھا۔''
''واؤ، بیوٹی فل ویو۔'' وہ اس کی سفید بالکونی کو دیکھتا ہوا وہاں سے آگے بڑھ آیا۔
دونوں ہی پہاڑی کا موڑ مڑ کر دوسرے روڈ پر آ گئے تھے۔ الویرا نے بھی تسلی کا سانس لیا کہ پیچھے گھر والوں میں سے کسی کی نظر میں آنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ یہاں کے چھوٹے بڑے فیلڈز کے کنارے کنارے پکی سڑکیں تھیں۔ روڈ سے دیکھنے پر اونچائی تک جاتے چائے کے باغات اور بیچ بیچ میں اونچے لمبے پام کے درخت تھے۔ بہت دور لمبی فینس کے درمیان بانس کی ٹوکریاں سر کے پیچھے باندھے مزدور عورتیں پتیاں اکٹھی کر رہی تھیں۔
''آپ کا دوارس بے حد خوبصورت ہے۔ میرے پاس تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔''
''اتنے خوبصورت دوارس کو بس کل ہی چھوڑ دیں گے؟'' الویرا نے بے ساختہ ہی کہہ دیا تو سندیپ بھی مسکرانے لگا۔
''دل تو نہیں چاہ رہا لیکن مجبوری ہے۔''
''کیسی مجبوری...... میرا مطلب ہے مزید کیوں نہیں رک سکتے؟''
''ایگریمنٹ پر سائن کرنے تھے، سو وہ کام ابھی یہاں سے جا کر مکمل ہو جائے گا۔ اس کے بعد کیا کہوں۔'' سندیپ نے کندھے اچکائے جبکہ الویرا ان لمحوں میں اسے بغور دیکھ رہی تھی۔
''آ...... آپ...... رکنا چاہتے ہیں؟''
''ہوں......؟'' سندیپ نے دور کے نظاروں سے نظر ہٹاتے ہوئے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔
''آف کورس، رکنا چاہتا ہوں۔''
''اور رکنے کی وجہ؟'' الویرا ابھی نظر جھکا کر اب اپنی ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر اس کے جواب کی منتظر تھی۔
''رکنے کی وجہ صرف آپ کو بتاؤں یا سوہن داس جی کو بھی بتا......''
''نن...... نہیں...... نہیں۔'' الویرا نے گھبرا کر ہاتھ لہرایا تو سندیپ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔
''جناب! جب آپ کو وجہ معلوم ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی تھیں...... ہوں؟'' اب اس کا انداز شرارتی تھا۔ الویرا کا چہرہ گلابی پڑ رہا تھا۔
''دوارس دکھاؤ گی؟''
''ہاں...... پاپا سے بات کرتی ہوں۔''
''نہ......!'' سندیپ نے آنچل چھوڑا۔ ''یہاں کی خوبصورتی اور صرف سندیپ، الویرا...... بولو منظور ہے؟''
''اوکے۔'' اس بار وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''منظور ہے۔''
''تو ٹھیک ہے پھر آپ کا یہ مہمان ایک ہفتہ مزید کہیں جانے والا نہیں۔''
''ہوں...... تو پھر مہمان کو چاہیے کہ پورا ایک گھنٹا یہیں گھوم پھر کر اپنی میزبان کا انتظار کرے کیونکہ وہ سامنے

پروفیسر صاحب کا بنگلا آگیا۔'' وہ انگلی سے سامنے اشارہ کرتی اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی جبکہ سندیپ مسکراتے ہوئے وہیں نزدیک ایک پتھر پر ستانے کے لیے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

وہ اس وقت اسٹیشنری کا کچھ سامان لے رہا تھا جب شور شرابے کی آواز پر پلٹ کر دیکھا تو بے اختیار حلق سے ایک آہ نکل گئی۔ وہ اس روز والی آندھی طوفان پھر کسی پتھر سے سر ٹکرا بیٹھی تھی۔ آخر دنیا اس بے چاری کے ساتھ کیوں اتنا برا سلوک کرتی ہے؟ وہ اپنی بے ساختہ ہنسی کو دانتوں میں دبائے اس کی پشت پر آ کھڑا ہوا۔

''مے آئی ہیلپ یو؟''

''ہاں......؟'' وہ چونک کر پلٹی۔ قینچی جیسی زبان کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی ساکن ہو گئیں۔

''آپ......؟'' وہ نہ صرف اسے پہلی نظر میں پہچان گئی بلکہ اپنے اونچے تیز لہجے پر پشیمان بھی خوب ہوئی۔ نہ جانے وہ اس قدر نروس کیوں ہوئی تھی۔

''سادہ سا ایک واٹر سیٹ ہی تو ہے اور قیمت سنیں...... کیا آگ لگی ہے۔'' اس نے نروس ہو کر ہاتھ میں پکڑا گلاس اس کے آگے کیا۔ گلاس واقعی اپنے ڈیزائن میں بہت سمپل سا تھا۔

''تو میڈم! آپ یہاں، ایسی دکان سے برتن خریدتی ہی کیوں ہیں؟ ہول سیل کی مارکیٹ میں اس سے آدھے داموں کہیں خوبصورت اور بڑھیا ڈیزائن دستیاب ہیں۔''

''ہول سیل مارکیٹ، برتنوں کی......؟'' سنینا کی آنکھوں میں حیرت اتری۔ ''وہ کہاں ہے؟ مجھے تو نہیں پتا۔''

اس نے اسے زبانی پتا سمجھایا تو وہ مسکرا دی۔

''دیپو...... اے دیپو......!'' اونچی بے تکلف پکار پر اس نے سر گھمایا۔ سمیر اور بوبی کھڑے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ اس نے بھی جواباً ہاتھ لہرایا پھر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ میرے دوست سمیر اور بوبی! ہم نے آج ایک ایگزیبیشن پر جانا ہے تو......''

''جی، جی جایئے۔'' ''سمیر، بوبی اور دیپو......'' وہ اس کا نام دہرا کر ہنستے ہوئے وہاں سے چل پڑی اور دیپو اس کی پشت کو مسکرا کر کچھ دیر دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر خود بھی دوستوں کی طرف آگیا۔

☆☆☆

دھند کی سفید پتلی چادر کے پیچھے ٹی گارڈن کا گہرا سبزہ اس صبح کچھ ماند پڑتا دکھائی دے رہا تھا۔ سندیپ نے شال اپنے گرد لپیٹ کر کھڑکی کھولی۔ ٹھنڈ کی تیز لہر نے وجود کو کپکپا دیا لیکن وہ اس سردی کو اپنے وجود پر محسوس کر کے مسکرا دیا۔ یہی تو آتے جاتے موسموں کی خوبصورتی ہے۔ ان کا نیا پن بھی ناگوار نہیں گزرتا۔ وہ بالوں میں انگلیاں گھماتے اسی وقت باہر نکل آیا۔ پہلی نظر بے اختیار سفید بالکنی کی طرف اٹھ گئی حالانکہ الویرا وہاں نہیں تھی اور شاید اس کے آنے کا ابھی وقت بھی نہیں ہوا تھا لیکن سندیپ کو آج اس کا شدت سے انتظار تھا۔ اس نے ایک نظر اپنے حلیے کو دیکھا اور اپنی عجلت پر خود ہی ہنس دیا۔ الویرا کو دیکھ لینے کی چاہ میں وہ چینج کرنا بھی بھول گیا تھا۔ سندیپ کا بے تاب دل اس سے ہر قیمت الویرا کی موہنی صورت سے سیر ہونا چاہتا تھا اور پھر تین چار منٹ میں ہی وہ سامنے سے آتی دکھائی دی۔

''الویرا!'' سندیپ بیتابی سے چند قدم خود ہی آگے بڑھ کر اس کے مقابل آیا۔ دیکھنے میں ایسی شدت ایسی بے چینی تھی کہ تاب لانا مشکل تھا۔ الویرا نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ پچھلے روز پروفیسر صاحب کے بنگلے سے واپسی پر بھی وہ دونوں ساتھ تھے۔ واپسی کا راستہ ان کی باتوں کی وجہ سے کچھ اور طویل ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں دونوں کے پاس ایک دوسرے سے شیئر کرنے کے لیے کتنی باتیں تھیں۔ راستہ گھٹتا جاتا تھا اور باتیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں لیکن بہر حال وہ راستہ بھی کٹ گیا اور دونوں اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ بعد کا پورا دن سندیپ کا کہیں اور من نہیں لگا۔ سوہن داس کی سنگت میں دوسری پارٹی کے پاس معاہدے کے سائن کرنے گیا اور وہاں سے بھی جلد واپسی ہو گئی اور واپس آ کر اس نے بہت چاہا کہ کسی طرح ایک بار پھر الویرا سے مل لے لیکن سوہن داس بھی اصولوں کے پکے تھے شاید۔ ایک بار جو اس کے پاپا نے کہہ دیا کہ سندیپ آؤٹ ہاؤس میں اکیلے وقت بتانا چاہتا ہے تو بے مروت ہیں کا...... چھوٹے منہ بھی گھر لے جانے کی بات نہیں کی۔ اب سندیپ اپنے منہ سے کیا کہتا کہ مجھے ایک بار تو اپنے گھر جانے دو۔ آج کے دن کا وہ ایک پل بھی الویرا کے بنا نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ تبھی اس کے انداز اتنے عجلت بھرے تھے۔

''تھوڑی دیر رکو گی الویرا! میں تمہارے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔''

''کہاں؟'' وہ ابھی بھی اسے دیکھ نہیں رہی تھی۔

''جہاں چاہے لے چلو۔ جتنی دور لے چلو۔ آج میں صرف تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔''

''جائیں، آپ چینج کر کے آئیں۔ میں وہاں اگلے موڑ کے بعد باغات کے کنارے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔''

''میں بس ابھی دو منٹ میں آیا۔'' وہ چٹکی بجاتے تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف دوڑ گیا۔

☆☆☆

''تو...... نیند کیوں روٹھ گئی آپ سے، ہوں؟'' وہ نیچے دیکھتے اب اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

''تمہاری سندرتا، تمہارا یہ بولنے کا انداز، تمہاری من موہنی باتیں، سب میرا چین و قرار لوٹ چکی ہیں۔ بتاؤ نا الویرا! کیا کروں؟''

''اتنی بیتابی اچھی نہیں سندیپ بابو!'' وہ بظاہر تو سمجھا رہی تھی لیکن یہ مسکراتی پلکیں کچھ اور ہی کہانی کہہ رہی تھیں۔ سندیپ نے کچھ دیر رک کر اس کی حسین گہری آنکھوں کو دیکھا۔

''میرا ساتھ دو گی الویرا؟''

''جی......؟'' الویرا نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں صرف بے یقینی ہی نہیں، کچھ ایسا تھا کہ سندیپ بری طرح گڑبڑا کر پیچھے ہٹا تھا۔

''میں نے کچھ غلط کہا الویرا! مم...... میرا مطلب ہے، کیا مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے؟'' وہ الویرا کے ردعمل سے حقیقتاً پریشان ہوا تھا۔ ادھر الویرا نے کچھ دیر تک گہری گہری سانسیں لے کر لمحوں میں خود کو نارمل کیا اور بال ماتھے سے ہٹاتے ایک دم مسکرا کر سندیپ کو دیکھا۔

''آں...... نہیں...... وہ اتنی جلدی...... یہ سب میرے لیے کچھ ان ایکسپیکٹڈ تھا تو......'' وہ اب بری طرح جھینپی ہوئی لگ رہی تھی۔

''ہمیں ایک دوسرے سے ملتے آج چوتھا روز ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ پہلے دن، پہلی ملاقات سے ہی ہمارا رشتہ کچھ خاص اور ہٹ کر ہو گیا تھا، تو کیا آج چوتھے روز میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تم سندیپ کے بارے میں کیا سوچتی ہو؟''

''سندیپ کبھی سمجھ ہی نہیں پایا کہ میں اس کے بارے میں کیا سوچتی ہوں۔'' الویرا نے بے ساختہ ایک آہ بھر کر کہا تو سندیپ نے چونک کر سر اٹھایا جبکہ الویرا ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ سندیپ منہ بنا کر ہنس دیا۔

''مذاق کر رہی ہو نا؟''

''تو آپ نے کیا سمجھا؟'' وہ ہنسے ہی گئی۔

''کبھی سمجھ ہی نہیں پایا۔ ہاہاہا۔'' سندیپ اس کے الفاظ کو زور دے کر دہراتے ہنسنے لگا۔ ''انداز تو کچھ یوں تھا جیسے پچھلے جنم سے نکل کر کوئی روح میرے مقابل آ بیٹھی ہو۔''

''میں بھی چیک کر رہی تھی کہ کتنے بہادر ہیں۔''

''اچھا...... اور چیک کرنے کی وجہ؟''

''یہ علاقہ اس حوالے سے ذرا بھاری ہے۔ میں نے سوچا کبھی کوئی بھٹکتی آتما سچ مچ آپ کے سامنے آ گئی تو دل خوب کڑا کرنا پڑے گا۔''

''دیکھو، اب تم واقعی مجھے ڈرا رہی ہو۔'' سندیپ نے تنبیہاً انگلی اٹھائی تو الویرا ہنستے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیوں بھئی، تنگ آ گئیں مجھ سے؟'' سندیپ اس کو اٹھتا دیکھ کر یونہی بیٹھا رہا۔

''بابا نے اگر پروفیسر صاحب کو کال کر دی نا تو آگے سے وہ بتائیں گے کہ بٹیا ایک گھنٹا پہلے رخصت ہو گئی تھی۔''

''ہوں...... تو پھر کیا کہے گی بٹیا؟'' سندیپ بھی کپڑے جھاڑتے اٹھ کر ڈھلان اترنے لگا۔

''بس یہی کہ نشا کے گھر رک گئی تھی۔ کچھ کام تھا۔'' وہ کندھے اچکاتے آگے آگے چلنے لگی لیکن پیچھے آتے سندیپ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر روکا۔

''تو نشا کے گھر تم ڈیڑھ گھنٹا رک جاؤ نا۔''

''جائیں، آپ کا تو کبھی دل نہیں بھرتا۔''

''ہاں نہیں بھرتا۔ بس تم سامنے بیٹھی رہو، میں دیکھتا جاؤں۔''

''آدمی کا دل بھرتے دیر نہیں لگتی۔'' اس نے منہ بسورا۔

''کون ہے وہ آدمی؟ بتاؤ ذرا، میں اس سے نمٹوں۔'' سندیپ نے آستینیں چڑھائیں تو الویرا بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''مطلب، سندیپ کا دل کبھی الویرا سے نہیں اکتائے گا؟'' اب وہ ایک ادا سے پوچھ رہی تھی۔

''ذرا وہم ہے تمہارا۔ لکھ لو الویرا سوہن داس کہ سندیپ رائے کبھی بے وفا نہیں ہو سکتا۔''

''اچھا جناب! لکھ لیا۔'' وہ ہلکا سا جھک کر مسکرا دی۔

دار جلنگ کی ویرانیاں دو دلوں کو قریب لانے میں معاون ثابت ہو رہی تھیں۔ یہاں ہر گزرتا دن ہی نہیں، ہر گزرتا پل ان دونوں کی محبت کو امر کر رہا تھا۔ سندیپ کا رُواں رُواں شاد تھا۔ معلوم نہیں کیوں وہ پچھلے کچھ عرصے سے نفسیاتی معالج سے کنسلٹ کرنے پر غور کرنے لگا تھا جبکہ درد کا درماں تو کوئی ایسا تعلق، کوئی ایسی ہستی ہی ہو سکتی تھی جو دل کو آباد کر دے۔ الویرا اس کی زندگی میں بہار بن کر آئی تھی اور اسے بہار کا یہ قیام تا دیر درکار تھا۔

☆☆☆

وہ دیپاولی کی رات تھی۔ سنینا کا زیادہ وقت رملا کی سنگت میں گزر گیا تھا۔ ماں سے وہ کہہ آئی تھی کہ شام کو واپس لوٹے گی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ رملا کی بستی میں دیپاولی کی رات مکمل اندھیرا کر دیا جاتا ہے تاکہ دیے جلانے کی رسم زیادہ جوش وخروش سے منائی جاسکے۔

''اے رملا بٹیا! باتیں ہی کرتی رہوگی یا کوئی دیپک بھی جلائے گا۔'' دادی دھیرے دھیرے چلتی مندر کے دروازے میں آئی تھیں۔ رملا اور سنینا تھالی میں دیے ہی سجا رہی تھیں۔ دادی کی بات پر باتیں بناتے سنینا کا ہاتھ رکا، لبوں پر مدھر مسکان آئی اور آنکھوں میں بڑے ہی بے ساختہ ایک سنجیدہ صورت۔

''تمہارا نام بھی دیپک ہے نا؟'' وہ نچلا لب دانتوں میں دبا کر شرارت سے ہنس دی۔ بوبی اور سمیر کا دیپو کہہ کر بلانا اکثر اسے پکار سا کانوں میں سنائی دیتا۔

''میں بھی اب چلتی ہوں رملا! دیکھو کیسی کالی اندھیری رات ہوگئی۔'' وہ مندر کے روشن دان سے پار دکھائی دیتے اندھیرے سے خوفزدہ ہوئی۔

''اری پگلی! رات تو وہی روز والی ہے۔ اندھیرا آج معمول سے تھوڑا زیادہ ہے کیونکہ ہماری بستی میں ساری لائٹیں آف کردی جاتی ہیں۔ ابھی گھر گھر میں جب دیپک جلیں گے تو سارے اندھیارے مٹ جائیں گے اور یہ ننھے دیے ستاروں کی طرح چمکیں گے۔''

''ہاں، ہاں۔ دیے تو ساری رات جلیں گے پر میری ماں ابھی آنکھوں میں شرارے جلائے بیٹھی ہوگی۔ مجھے گھر پہنچنا ہے اس لیے تم ان ننھے دیوں کی ویڈیو بنا کر رکھنا۔ میں کل دیکھوں گی۔'' وہ ہاتھوں کو آنچل سے صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دادی نے اس کے ماں باپ کے لیے مٹھائی دی تھی۔ وہ مٹھائی اور اپنا پرس سنبھالتی باہر نکلی تو اندھیرے کی چادر نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔ مندر میں دیے جلانے کی وجہ سے آنکھیں تیز چبھتی روشنی کی عادی ہوگئی تھیں۔ تبھی باہر کے اندھیرے میں اسے مکمل اندھے پن کا احساس ہوا۔ عادی ہونے میں کچھ وقت لگا اور پھر وہ دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھاتی بستی کے بڑے چوراہے پر پہنچی۔ عام حالات میں اکثر وہیں سے آٹو دستیاب ہوجاتا لیکن آج یہاں بھی اندھیرا چھایا تھا۔ اکا دکا دکانوں میں لائٹ جل رہی تھی۔ زیادہ تر دکاندار دیے جلائے بیٹھے تھے۔ رملا نے سچ کہا تھا، ان کی بستی کی باقاعدہ یہ رسم تھی۔ تبھی ہر کوئی عمل پیرا دکھائی دیتا تھا۔ وہ چوراہے سے آگے بڑھتے اپنے گھر کی سڑک کو چل دی۔ یہ ذیلی راستہ بڑے روڈ کو جاتا تھا۔ یہاں تو پہلے بھی اندھیرا ہی رہتا کیونکہ اس روڈ سے بڑے بڑے گھر شروع ہوجاتے۔ گھروں کے بڑے بڑے لان بھی اندھیرے میں ڈوبے تھے اور باہر درختوں کی قطاریں تھیں۔ سنینا اب سے پہلے بھی اتنی شام کو یہاں سے نہ گزری تھی۔ ہمیشہ ہی رملا کے ہاں سے جلدی نکلتے چوک سے آٹو لے کر سیدھے گھر پہنچ جاتی۔ اس روڈ سے نہ جانے کتنی مدت بعد گزر ہو رہا تھا، وہ بھی ایسی اندھیری رات میں۔ سنینا نے چاہا کہ موبائل پر ممی کو کال ملا دے تاکہ اکیلے پن کا خوف باقی نہ رہے۔ اس کا سر موبائل نکالنے کے لیے اپنے پرس پر جھکا ہوا تھا جب اچانک بڑی طاقت سے کسی کا سینہ اس کے سر میں آن لگا یا شاید وہ کسی کے سینے سے جا ٹکرائی۔

''آؤچ ....'' وہ بری طرح بڑبڑا کر پیچھے ہوئی۔ دل بڑے بے ہنگم انداز میں دھڑکنے لگا اور پرس ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر گر گیا۔ کئی اشیا یہاں وہاں بکھر گئیں۔ ٹکرانے والا اس سے بھی پہلے نیچے اکڑوں بیٹھ کر اس کا سامان سمیٹنے لگا تھا۔ وہ نیچے بیٹھی، تبھی دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے چار ہوئیں اور حیرت سے دونوں کا منہ ایک ساتھ کھلا۔

''ارے آپ......!'' دیپو بے ساختہ بہت پیاری ہنسی ہنس دیا۔ مسکراتے ہوئے ہاتھ میں دھرا سامان سنینا کی طرف بڑھایا اور سنینا نے بھی اس کالی اندھیری رات کا سارا ڈر، خوف دیپو کے ملتے ہی کہیں اڑن چھو ہوتا محسوس کیا۔

''واہ، کیا اتفاق ہے۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ نہ جانے ہماری تیسری ملاقات کب ہوگی۔''

''آ...... آپ...... یہ بات سوچ رہے تھے؟'' سنینا نے بے یقینی سے اسے دیکھا تو وہ اس کی آنکھوں میں بغور دیکھے گیا۔ لبوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ تھی۔

''کیوں، سچ بتائیں، کیا آپ نے دوبارہ مجھے کبھی نہیں سوچا؟ آپ کو دیپاولی کی قسم۔''

''قسموں کا کیا مطلب؟'' وہ بظاہر منہ بسور کر اٹھ کھڑی ہوئی ورنہ دل کے چور نے کہا، ابھی کچھ دیر پہلے رملا کے ہاں وہ دیپک جلتے دیکھ کر اسی کو تو سوچ رہی تھی۔

''تو دل پر ہاتھ رکھ کر بتادو۔'' دیپو اس تنہائی اور اچانک کی ملاقات کے پوری طرح زیر اثر تھا پھر مرد تھا، اظہار میں بنا سوچے اعتماد سے پہل کردی۔ سنینا کچھ دیر کے لیے لاجواب ہوگئی۔ لب سینے کو وہ ماحول ہی کافی تھا۔ وہ دونوں بلاشک وشبہ بہت دنوں تک ایک دوسرے کو سوچتے رہے تھے اور ان سوچوں میں سب سے گہرا رنگ اس سوال

کا تھا کہ نہ جانے ان کی تیسری ملاقات کب، کہاں اور کن حالات میں ہوگی؟

''میں تو یہاں نزدیک ایک دوست کے ہاں آیا تھا۔ آپ کہاں سے آرہی ہیں، وہ بھی ایسے وقت میں؟'' وہ ہاتھوں کو جیبوں میں ڈالے اب آرام دہ انداز میں اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

''میں بھی اپنی ایک سہیلی کی طرف آئی تھی۔ نکلنا تو جلدی تھا، بس دیے جلاتے دیر ہوگئی۔''

''آئیں، وہ رہی میری کار۔'' وہ ایک طرف کو بڑھا تو سنینا جھجک کر وہیں رک گئی۔ دیپو نے تعجب سے پیچھے دیکھا۔

''مجھے آٹو مل جائے گا۔ آپ ہمیشہ میری خاطر زحمت کرتے ہیں۔''

''ایسے وقت میں، میں کیا آٹو میں جانے دوں گا تمہیں؟ آؤ شاباش!'' اس نے ہاتھ بھی بڑھا دیا تو سنینا ہاتھ کو اگنور کر کے آگے بڑھنے لگی۔ دیپو نے فرنٹ ڈور کھولا تو وہ بیٹھ گئی اور اس نے دروازہ بند کر کے دوسری جانب سے اپنی سیٹ سنبھالی البتہ کچھ دیر گزر جانے کے باوجود بھی گاڑی اسٹارٹ نہیں کی تو سنینا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تمہارا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ہمارا سفر بہت مختصر رہے گا۔ کیا میں تم سے کچھ پوچھوں؟'' وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سنینا نے سر اثبات میں ہلایا پھر نیچے دیکھنے لگی۔

''کیا تم نے میرے بارے میں سوچا تھا؟ آج دوسری ملاقات کو قریب چودہ دن گزر گئے۔ بیچ میں مجھے کتنا یاد کیا یا بالکل بھی نہیں؟''

''آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' اس سے سر نہیں اٹھایا گیا۔

''کیونکہ میں بیچ کے ان تمام دنوں میں تمہارے بارے میں ہی سوچتا رہا اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا ہم دوست بن سکتے ہیں؟ لیکن یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب تم کہیں اور کمیٹڈ نہیں اور......''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے جلدی سے واضح کیا تو دیپو مسکرا دیا۔

''اچھا......اور پہلی بات......؟''

''اس کا میں کیا جواب دوں۔''

''ہاں یا نہ۔'' دیپو نے فوراً سہولت سے کہا۔ ''آئی مین، اگر یاد کیا تو کہو ہاں اور نہیں کیا تو نو۔''

''ہوں۔'' وہ نیچے دیکھتے بڑی مشکل سے سر ہاں میں ہلا پائی اور دیپو کے لیے یہی خوشی بھی کیا کم تھی۔ مسکان لبوں میں دبائے چابی اگنیشن میں گھمائی اور کار آگے بڑھا دی۔

''اچھا، تو کب اور کیسے یاد کیا؟''

''ابھی رملا کے ہاں ہم دیے جلا رہے تھے تو مجھے خیال آیا کہ ضرور آپ کا نام دیپک ہوگا۔'' وہ اپنے بیگ کی زپ کو مروڑ رہی تھی۔ دیپو نے اس کی حرکت اور جھکے سر کو خوب محظوظ ہو کر دیکھا پھر سامنے دیکھنے لگا۔

''تو......اچھا نام ہے دیپک؟''

''جی، بہت اچھا۔'' وہ شرماتے ہوئے اقرار کرنے لگی۔

''لیکن تم نے تو اپنا نام ابھی تک بتایا نہیں۔''

''اچھا......؟'' وہ حیران ہو اٹھی پھر ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ ''ارے واقعی، تعارف تو ہوا ہی نہیں تھا۔''

''تو کیا یہ دیپک آپ کا شبھ نام جان سکتا ہے؟''

''سنینا گوئل!'' اس نے فوراً ہی بتا دیا۔

''بہت خوب! سنینا اپنے نام کی طرح خوبصورت ہے بلکہ......'' اس نے بیچ راستے میں سر نفی میں ہلایا اور مسکرا دیا۔ ''سنینا کا نام بھی سنینا کی طرح خوبصورت ہے۔ یہ زیادہ ٹھیک ہے۔''

''شکریہ۔''

''اچھا تو سنینا جی! دیپاولی کیسی گزری؟''

''اب تو بہت اچھی۔'' وہ ہلکا سا دیکھ کر پھر رخ پھیر گئی۔

''کیا ہم اسے اور خوبصورت بنا سکتے ہیں؟''

''وہ کیسے؟''

''تھوڑا گھوم پھر کر، مختصر سی ڈرائیو کو ذرا جا لانگ کر کے، کچھ تعارفی سوال، کچھ دل کا حال کہہ کر۔''

''بجائے اس کے اگر ہم ایک دوسرے کا نمبر لے لیں؟'' وہ اب شرارت سے ہنسی تھی۔ دیپو نے چونک کر دیکھا پھر قہقہہ لگایا۔

''سنینا گوئل تو بہت اسمارٹ بھی ہیں اور یہ دیپک راج ایک دم بدھو۔ ہے نا؟'' وہ اب اپنا ہی مذاق اڑا رہا تھا جبکہ سنینا دیر تک ہنستی گئی کیونکہ ان کے نئے نئے تعلق کو نمبرز کا تبادلہ ہی مضبوط بنا سکتا تھا اور جس بات کی طرف دیپو کا اب تک دھیان نہیں گیا تھا۔ اس شام سنینا نے دیپک کو اپنا موبائل نمبر دیا اور یوں دونوں کی پیار بھری سرگوشیوں سے شامیں اور راتیں آباد ہونے لگیں۔

☆☆☆

سوہن داس صبح اسے دارجلنگ سٹی لے گیا تھا۔ سندیپ نے کچھ ضروری شاپنگ کرنا تھی لیکن سیاحوں کا

وہاں اتنا رش تھا کہ سندیپ کا سر درد کرنے لگا۔ وہ آدھی ادھوری شاپنگ کرکے کچھ گھنٹوں میں ہی واپس لوٹ آیا۔
آج اسے دارجلنگ آئے پانچواں روز تھا۔ دوپہر کو ریسٹ کرلینے کے بعد اس نے الویرا کو کال ملائی۔ آج وہ پہاڑ کی چوٹی دیکھنا چاہتا تھا۔ الویرا نے کہا تھا کہ وہ اپنی کسی دوست سے ملنے کے بہانے اپنے گھر سے نکلے گی۔ سندیپ نے تیاری کی اور باہر نکل کر باغات کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ الویرا کچھ آٹھ دس منٹ میں وہاں آ پہنچی۔ سادہ کالی فراک، ٹائٹس اور گلے میں اورنج رومال باندھے وہ غضب کی حسین لگ رہی تھی۔ سندیپ سے بہت دیر تک کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

''میری ایک دوست کی پرسوں برتھ ڈے ہے۔ میں نے گھر پر آج کا بتایا اور اس لیے تیاری کرکے نکلی۔'' وہ اس کا سکتہ دیکھ کر جھینپ کر وضاحت دینے لگی۔

''اور پرسوں جب سچ مچ اس کی برتھ ڈے ہوگی، تب کیا کروگی؟'' سندیپ مسکرا کر اب ساتھ چلنے لگا تھا۔

''وہ ان دنوں شملہ گئی ہوئی ہے۔ اس سے پرسوں ملاقات ہی نہیں کرنی۔''

''ہوں، یہ صحیح ہے۔ تو کتنی دور جانا ہے ہمیں؟''

''بہت دور۔'' وہ اپنی چمکتی آنکھیں سندیپ پر ڈالے کچھ دیر تک دیکھے ہی گئی۔ سندیپ کو نہ جانے کیوں ان آنکھوں سے کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ اس نے نظر جھکا کر نیچے باغات کی طرف دیکھا۔

''تم نے کبھی چائے کی پتیاں چنی ہیں؟'' سندیپ کے لہجے میں جان لینے کی کھوج تھی۔ الویرا ہنس دی۔

''ہاں، بچپن میں ہم بھی ٹوکریاں سروں کے پیچھے باندھے یہ شوق پورا کیا کرتے تھے۔''

''تمہارا گھر ویسے بہت خوبصورت جگہ پر ہے۔ صبح میرا دارجلنگ جانا ہوا۔ اف، وہاں کا رش...... ہورِیبل۔'' اس نے ایک جھرجھری لی اور الویرا کچھ پراسرار سا مسکرا دی۔

''اور یہ سندر پہاڑی جہاں ہم اب جا رہے ہیں، ہمارے گھر سے بھی زیادہ پُرسکون جگہ ہے۔ وہاں تو کوئی آتا جاتا ہی نہیں۔''

''اچھا۔'' سندیپ ٹھٹک کر رکا۔ ''اور میں سمجھ رہا تھا شاید کوئی پکنک اسپاٹ ہے۔ کیا واقعی وہاں کوئی نہیں ہوگا؟''

''ہم ہوں گے نا۔'' وہ پلکیں میچ کر مسکرا دی اور تبھی بادلوں کی غیر متوقع گرج چمک نے بے ساختہ دونوں کو آسمان کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔ آسمان کالے سرمئی

بادلوں سے بھر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹی گارڈنز پر گھرے بادلوں کا چھاتا مکمل گیا۔ یہی ویران سڑک پل میں تاریک پڑ گئی۔

''حیرت ہے، ایسے کالے بادل۔'' سندیپ کچھ پریشان سا ہوا۔ دن چڑھے ہی شام، رات کا گمان ہونے لگا تھا۔

''آپ ڈرتے ہیں ایسے موسم سے؟''

''ارے نہیں۔ ڈر کیسا۔'' اس نے اپنی کیفیت کو معمول پر کیا۔ عورت کے سامنے بزدل پڑنا مردانگی نہیں تھی۔ وہ چلتا ہی رہا حالانکہ اس کا خیال تھا کہ شاید ایسا موسم دیکھ کر الویرا خود ہی واپس جانے کی بات کرے گی لیکن اس کا ایسا کوئی ارادہ دکھائی نہ دیا۔ تبھی سندیپ بھی آگے بڑھتا رہا۔ الویرا باغات کے کنارے کنارے چلتے اب جس راستے پر آ گئی تھی، وہ آبادی سے مکمل دور اور اونچائی کی طرف جاتا ہوا سا تھا۔ بادل کچھ اور امڈ آئے تھے۔ بجلیاں چمک چمک کر ماحول میں کچھ اور ہی ہولناکی بڑھانے کا باعث بن رہی تھیں پر الویرا تھی کہ رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ تپلی سنسان سڑک کا ایک موڑ کاٹتے ہی وہاں کچھ ٹین کی ترچھی چھت والے بوسیدہ مکانات دکھائی دینے لگے۔ سندیپ کو آبادی کی موجودگی سے ایک گونہ سکون محسوس ہوا لیکن یہ خوشی وقتی تھی کیونکہ وہ سبھی گھر نہایت پرانے اور غیر آباد تھے۔ اچانک بادلوں میں زوردار گرج کے ساتھ تیز کڑکتی بجلی چمکی اور ان کے سروں پر موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔

''اوہ نو!'' الویرا نے خاصی بدمزگی سے یکلخت رک کر سندیپ کو دیکھا جبکہ سندیپ کے لیے ایسا ردعمل حیرت کا باعث تھا کیونکہ موسم کے تیور تو بڑی دیر سے اسی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ بارش بس برسی کہ برسی..... تو اب بارش کا آغاز الویرا کے لیے ناگواری کا باعث کیوں بنا تھا؟

''مجھے لگتا ہے ہمیں یہیں کہیں کچھ دیر رک جانا چاہیے۔'' سندیپ نے پیچھے مڑ کر ان پرانے گھروں کو دیکھا جبکہ الویرا نے اس کی آستین کھینچی۔

''چوٹی اب زیادہ دور نہیں ہے سندیپ! آؤ چلتے ہیں۔''

''ارے نہیں الویرا! بارش بہت تیز ہے اور ٹھنڈ بھی بہت ہے۔ آگے بڑھنا ٹھیک نہیں۔ کچھ دیر یہاں رک جاتے ہیں۔ بارش کی تیزی میں تو کمی آنے دو۔'' وہ اس بار بنا اسے مزید سنے تیز قدموں سے ایک ٹین کی چھت والے جھونپڑے کی طرف بڑھا۔ اسے بھیگنے سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے کپڑے مکمل نہ بھیگیں۔ تبھی وقت پر ایک پرانے گھر میں داخل ہو گیا۔ ناچار الویرا بھی اس کے پیچھے آ گئی۔ جھونپڑے کی حالت بتاتی تھی کہ وہ ایک مدت سے ویران پڑا ہے۔ سوائے ایک لکڑی کی لمبی بینچ کے، وہاں کچھ نہ تھا۔ سندیپ اسی بینچ پر بیٹھ گیا۔ سردی حقیقتاً بہت بڑھ گئی تھی۔

''شکر ہے ہم نے آگے جانے کا فیصلہ نہیں کیا۔'' سندیپ نے جھونپڑے کی کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا اور بارش کی بڑھتی شدت دیکھ کر الویرا سے تائید چاہی لیکن الویرا اس کی ہاں میں ہاں نہ ملا سکی۔

''کیا ہوا، تم کچھ خاموش ہو گئی ہو؟'' وہ الویرا کے نزدیک آیا۔

''ہم بارش رکتے ہی آگے جائیں گے۔'' وہ اسے ضدی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ سندیپ بے ساختہ ہنس دیا۔

''تو الویرا! اس میں بچپنا ابھی باقی ہے، ہاں؟'' وہ اس کی طرف دیکھتے ذرا سا آگے جھکا لیکن الویرا کا دھیان ابھی وہیں تھا۔

''میں نے کہا نا، ہم چوٹی دیکھے بنا واپس نہیں جائیں گے۔''

''تو مائی ڈیئر! بارش رک جائے پھر دیکھتے ہیں۔'' اس نے بظاہر تسلی دینے کے انداز میں کہا جبکہ اس کا اندر سے ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ دونوں پہلے ہی آؤٹ ہاؤس سے بہت دور نکل آئے تھے۔ سندیپ کو یہ سب کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ الویرا کے گھر والے اس کی سہیلی کے گھر رابطہ کر سکتے تھے پر نہ جانے اس الویرا کو ایسی کسی بات کی کوئی پروا کیوں نہیں تھی۔ بس ایک چوٹی تک پہنچنے کا جنون۔

''تمہارے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' اس نے پیار سے سمجھانا چاہا۔

''کوئی پریشان نہیں ہوگا۔ کسی کو مجھ سے کیا لینا دینا؟'' وہ بپھر گئی۔

''میں ابھی کچھ دن اور بھی یہیں ہوں۔ ہم پھر کسی دن دوبارہ آ جائیں گے۔''

''اچھا!'' وہ خوش ہو گئی۔ ''کتنے دن؟''

''آں..... دو، تین دن اور۔''

''یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے۔''

''تو پھر اس خوشی میں.....'' سندیپ نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑتے الویرا کی کلائی تھامی لیکن وہ ہنس کر دور ہو گئی۔

''اتنا ذلالہ پن اچھا نہیں سندیپ سر!'' وہ معنی خیزی سے مسکرا دی۔

''کیوں اچھا نہیں؟'' سندیپ نے خفگی سے دیکھا۔

"جیون تباہ ہوجاتا ہے لڑکی کا۔" الویرا ایک دم سے گہری آہ کھینچ گئی۔ سندیپ بس دیکھ کر رہ گیا۔ کبھی کبھار یہ لڑکی اسے بالکل سمجھ میں نہ آتی تھی۔

☆☆☆

"میں نے اپنی ممی سے تمہارے بارے میں بات کی ہے۔" وہ انگوٹھی گھماتے مسکرا کر اسے بتانے لگی۔

"اچھا!" دیپو کا فوری ردعمل کچھ ٹھنڈا سا تھا۔ سنینا نے چونک کر اسے دیکھا تو اس نے خود کو سنبھالا۔ "میرا مطلب ہے..... واقعی ..... ! تو کیا کہتی تھیں؟" وہ زبردستی چہکا۔ سنینا سمجھ نہیں پائی اور جوش اور خوشی سے بتانے لگی۔

"تم سے ملنا چاہتی ہیں دیپک! بتاؤ نا کب آرہے ہو ہمارے گھر؟"

"گھر آنا ہوگا..... اور ..... تمہارے ڈیڈی؟"

"وہ تو ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ تم صبح کے وقت ممی سے مل جاؤ۔ ڈیڈی سے وہ تم سے ملنے کے بعد بات کریں گی۔"

"کیا بات؟" دیپک کا لہجہ پھر سنجیدہ ہوگیا۔ کار کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے اس نے سائڈ پر روک دی۔

"ہمیں ایک دوسرے سے ملتے ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا ہے دیپک! ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے ہیں۔ بات کرنا تو اب بہت ضروری ہوگیا ہے۔ تم بھی مجھے اپنی ممی سے ملواؤ نا۔"

"ہاں بھئی۔ مل لیں گے۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے۔" اس نے ڈیش بورڈ سے رتن کے خالی اپارٹمنٹ کی چابی نکالی۔ وہ ان دنوں کام کے سلسلے میں دبئی گیا ہوا تھا۔ اپارٹمنٹ کی چابی پہلے بھی دیپو کے پاس رہا کرتی تھی۔ سنینا سے جب نزدیکیاں بڑھیں تو وہ اسے یہیں لانے لگا۔

"میں اب تم سے دور جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی دیپک!" سنینا نے اس کی کلائی تھام کر روکا تو دیپک نے مسکرا کر اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔

"اندر چل کر بات کرتے ہیں۔ دیکھو، پہلے ہی ہم کتنا لیٹ ہوگئے اور تم جانتی ہو دو دن بعد تو رتن واپس آرہا ہے پھر کہاں موقع ملے گا اس طرح ملنے کا۔" وہ اس وقت عجلت میں دکھائی دیتا تھا۔ سنینا اس کی بات پر حیران ہوتی ہوئی پیچھے آئی۔

"کیا مطلب، رتن کی واپسی کے بعد ہم نہیں ملیں گے؟"

"تم ہی بتاؤ، کہاں ملیں گے؟" وہ اس کے ساتھ اپارٹمنٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

"ہم باہر ملیں گے۔ پارکوں میں، ریستوران میں، جھیل کنارے..... کہیں بھی لیکن ملنا چھوڑ تو نہیں سکتے پھر میں اسی لیے تو ممی پاپا سے ملنے کی بات کر رہی ہوں۔ رتن کا گھر ہمارا مستقل ٹھکانا کبھی نہیں ہوسکتا۔ ہمیں ہمیشہ ملتے رہنے کے لیے اپنا گھر چاہیے۔ رشتہ بنانے کے لیے مضبوط حوالہ چاہیے۔"

"اچھا میری جان! وہ سب بھی ہوجائے گا۔ پہلے ہم سے تو مل لو۔" سنینا کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور اس کا والہانہ پن دیکھ کر سنینا بھی شرما کر رہ گئی۔

☆☆☆

موسم اس شام پھر بڑا گمبھیر ہوگیا۔ سندیپ نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ گہرے کالے بادل پھر برسنے کو تیار کھڑے تھے۔ سنڈے کا پورا دن وہ یونہی قریب گھومتا رہا۔ الویرا سنڈے کی وجہ سے ٹیوشن پڑھنے نہیں نکلی اور شاید اسے نکلنے کا کوئی اور بہانہ بھی میسر نہیں آیا تھا۔ سندیپ کی اس سے موبائل پر بات ہوئی تھی۔ باہر ٹھنڈ بہت تھی۔ صبح وہ بستر میں دبکا دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا تھا اور اب تو موسم کے نرالے تیور کہیں نکلنے ہی نہ دے سکتے تھے۔ وہ مسکرا کر پلٹنے لگا جب کچھ دیکھ کر حیرت سے دوبارہ کھڑکی میں آیا۔ سرخ لباس پہنے وہ الویرا ہی تھی جو ہاتھ ہلا کر اسے نیچے بلا رہی تھی۔ سندیپ نے تعجب سے ایک نظر اوپر بادلوں کو دیکھا اور دوسری نظر الویرا پر ڈالی۔ اسے لگا وہی شاید زیادہ سوتا رہا ہے بھی اس کی آنکھیں ٹھیک سے کام نہیں کر رہیں لیکن وہ سچ مچ الویرا تھی، اسے نیچے بلاتی ہوئی۔ سندیپ نے شال اپنے گرد اوڑھ کر اپنا موبائل اٹھایا اور کاٹ ہاؤس سے باہر نکل آیا۔

"تم اس وقت ..... یہ ..... کہاں کی تیاری ہے؟" وہ اس کے خوبصورت سرخ لباس کو دیکھ رہا تھا۔

"گھومنے پھرنے کی۔" وہ سرخ فراک لہرا کر خود بھی پوری گھوم گئی۔

"اس ٹائم ..... ایسے موسم میں؟" وہ خوشی سے زیادہ حیران تھا۔

"تم نہیں آنا چاہتے تو بول دو۔ میں سہیلیوں کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔" اس نے منہ بسورا۔

"ارے، پر جانا کہاں ہے؟"

"چوٹی کی طرف جارہی ہوں۔" وہ بالکل نارمل تھی۔

"چوٹی کی طرف..... اس وقت شام کو..... اس موسم میں؟"

"تمہیں کیا پتا چوٹی دیکھنے کا مزہ تو ایسے ٹائم میں ہی ہے۔ تم نے پہلے دیکھی ہے کیا؟" اس نے خفا ہو کر ہاتھ کمر پر رکھے۔

''نہیں۔'' سندیپ نے ہنس کر کندھے اچکا دیے۔
''تو چلیں سندیپ بابو؟'' اس نے لاڈ سے پلکیں جھپکائیں۔
''جیسی میم کی اچھا۔'' اس نے ہلکا سا جھک کر تابعداری دکھائی تو الویرا ایک ادا سے ہنس پڑی۔ سندیپ نے اپنے حلیے پر ایک نگاہ ڈالی وہ اس وقت جینز، شرٹ اور سوئٹر میں تھا۔ تیاری کی خاص ضرورت نہ تھی اس لیے الویرا کے پیچھے چل پڑا۔ چھاتا الویرا نے پہلے ہی اٹھا رکھا تھا اس لیے بارش کی صورت میں بھی خاص پریشانی نہ تھی۔ الویرا تیز قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے کسی کسی وقت اسے بھی چور نظروں سے دیکھ لیا کرتی۔ اسے اس روز کی طرح پھر یہ پریشانی ستا رہی تھی کہ اگر بارش راستے میں ہی شروع ہوگئی تو سندیپ پھر واپس لوٹ آئے گا اور اسے آج ہر حال میں اسے چوٹی تک لے ہی جانا تھا کیونکہ اگلے روز صبح سویرے سندیپ کی کولکتہ واپسی تھی۔ الویرا اپنی اتنے دنوں کی محنت ضائع تو ہرگز نہ ہونے دے سکتی تھی۔
ادھر سندیپ کو برابر یہ خیال ستائے جا رہا تھا کہ اس شدید ٹھنڈ میں اگر بیچ راستے میں ہی بارش شروع ہوگئی تو وہ دونوں کہاں پناہ لیں گے۔ اوپر کو جاتے پھسلن زدہ راستے اور بس یہی ایک چھاتا۔ یہ الویرا تو انہی علاقوں کی پلی بڑھی ہے، شاید اس لیے عادی ہے ایسے موسموں کی۔ وہ خود اپنے آپ کو بہلاتے اس کے نقشِ قدم پر چلتا جا رہا تھا جب اس کی نظر نیچے کی بل کھاتی سڑک پر پڑی۔ وہاں اس نے کسی کو دیکھا اور پھر اس نے شک کو دور کرنے کے لیے گلے میں لٹکی دوربین آنکھوں سے لگائی تو شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے دوربین آنکھوں سے ہٹاتے جلدی سے الویرا کا بازو کھینچا اور اسے کنارے سے دور کرتے سڑک کی مخالف سمت میں آیا۔
''تمہارا بھائی...... وہ...... امیت......!'' سندیپ کو نام یاد آتے کچھ ٹائم لگ گیا۔ ''وہ اوپر آ رہا ہے الویرا! جلدی سے کہیں چھپ جاؤ۔''
''اوہ، امیت! وہ یہاں کہاں سے آگیا۔'' الویرا کے چہرے کا رنگ بھی یکلخت بدل سا گیا۔ اس نے بائیں ہاتھ کے پائن ٹریز کے جنگل کو دیکھا اور تقریباً بھاگتے ہوئے ان میں گھس گئی۔ یہاں کسی بھی درخت کے پیچھے خود کو چھپا لینا آسان تھا ورنہ پیچھے ایسے فیلڈز بھی گزرے تھے جہاں دائیں بائیں دونوں جانب صرف چائے کے باغات تھے۔ ایسے میں اگر امیت آ جاتا تو الویرا کا چھپنا محال تھا۔ سندیپ نے سکون کا گہرا سانس لیا اور تبھی امیت موڑ کاٹ کر اس کے پیچھے آ پہنچا۔ سانسیں پھولی ہوئی اور نظریں حیرت سے سندیپ پر جما رکھی تھیں۔
''سندیپ بھیا آپ؟'' وہ اسے سامنے دیکھ کر واقعی حیران ہوا تھا۔
''ارے امیت تم۔ سناؤ تو، بھاگے کیوں آ رہے ہو؟'' سندیپ نے اپنے لب و لہجے کو ایک دم نارمل کیا۔
''بھیا! آپ نے کہیں الویرا کو دیکھا ہے؟'' وہ آہستہ روی سے قریب آتے اپنی سانس بحال کر رہا تھا۔
''الویرا......! آں...... ہاں...... میں جب اوپر آ رہا تھا تو راستے میں وہ ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھی نظارہ کر رہی تھی۔'' سندیپ نے مختصر سی سوچ بچار میں یہی فیصلہ کیا کہ الویرا کے کہیں ہونے کا پتا دے کر پریشان حال بھائی کو تھوڑا اطمینان دلا دے۔ اس کا یہ کہنا کہ الویرا کو نہیں دیکھا، امیت کو نہ صرف پریشان کر دیتا بلکہ وہ بیچارہ اسے ڈھونڈنے مزید آگے نکل جاتا۔
''اچھا...... پیچھے...... مجھے تو دکھائی نہیں دی۔ شاید کسی اور راستے مڑ گئی ہوگی۔''
''ہاں، پر تم اتنے پریشان کیوں ہو؟''
''ہاں، وہ گھر سے تو نشا کے گھر جانے کا بتا کر نکلی تھی پر ممی کو نشا کی کال آگئی جس سے پتا چلا کہ الویرا اس کے پاس نہیں پہنچی۔ تبھی ممی نے مجھے دوڑا دیا۔ اب پتا نہیں یہ اکیلی کہاں گھومتی پھر رہی ہے۔ پہلے ہی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔'' امیت جیسے اپنے آپ میں بڑبڑانے لگا۔
''کیا ہوا اس کی طبیعت کو؟'' سندیپ کو حیرت ہوئی کہ بظاہر تو الویرا اچھی بھلی تھی۔
''ابھی کچھ دنوں سے عجیب سا بی ہیو کرنے لگی ہے۔ اسے باتیں بھولنے لگی ہیں۔ وقت اور تاریخ تک گڈمڈ کر دیتی ہے۔ ممی اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کو تیار بیٹھی ہیں...... شاید کل۔ اچھا بھیا! میں پھر پیچھے کی طرف دیکھتا ہوں۔'' وہ عجلت میں کہہ کر واپس پلٹ گیا اور سندیپ ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے درختوں کی طرف آیا۔
''الویرا!'' اس نے آہستہ سے آواز دی تو الویرا درختوں سے نکل کر سامنے آگئی۔
''چلو، تم گھر واپس جاؤ۔ میں کچھ دیر بعد خود ہی پیچھے آ جاؤں گا۔ تمہارے گھر والے پریشان بیٹھے ہیں۔''
''ہاں، میں نے سنا۔'' وہ کچھ ناراض دکھائی دیتی تھی۔ ''تو آج ہم آگے نہیں جائیں گے؟''
''کیسے جا سکتے ہیں الویرا؟ گھر والے تمہاری کھوج میں نکلے ہوئے ہیں۔''

''اس نشا کی بچی کو تو میں دیکھ لوں گی۔'' سندیپ نے غور سے دیکھا، الویرا کا چہرا یکدم دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ نہایت غصے میں لگ رہی تھی۔

''اس وقت صرف یہ سوچو کہ گھر والوں سے کیا کہو گی۔'' سندیپ کو حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ اسے امیت کے آجانے سے کوئی خاص فکر لاحق نہ ہوئی تھی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح وہ رخصت ہو ہی گئی۔

سندیپ نے اسے دوسرا موڑ کاٹ کر غائب ہوتے دیکھا اور اس کے بعد ہی خود بھی دوبارہ واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ اب قریب دس، پندرہ منٹ بعد اسے بھی گھر واپس پہنچ جانا تھا۔ سندیپ یہ سوچ کر متعجب ہو رہا تھا کہ اگلی صبح جبکہ اس نے یہاں سے واپس چلے جانا تھا، الویرا کی سوچیں آج کچھ اور طرز کی ہونی چاہیے تھیں۔ جیسے وہ یہ سوچ کر پریشان ہوتی کہ نہ جانے وہ دونوں ایک دوسرے سے دوبارہ کب ملیں گے... لیکن اس نے اب تک ایسی کوئی بات نہ کی تھی۔ اسے تو سندیپ کی واپسی سے پہلے بس کسی طرح اسے چوٹی دکھانا تھی۔

☆☆☆

''دیپک! آج کسی طرح مجھ سے ملو۔'' دیپو نے سنینا کا پیغام دیکھا تو بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سر گھما کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ اس نے دل میں کچھ لکھنے کا ارادہ کرتے ہوئے انگلیاں کی پیڈ پر رکھیں کہ دروازہ ناک کر کے ممی نے اندر جھانکا۔

''جاگ گئے دیپو بیٹا! ڈیڈی تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ ساڑھے آٹھ بجے سائٹ ایریا پہنچنا تھا۔ اب کیا کہوں؟''

''اوہ نو۔'' دیپو نے پریشانی سے لبوں کو چبایا۔ اسے ڈیڈی رات ہی سمجھا کر سوئے تھے کہ صبح اس نے سائٹ ایریا پہنچ کر وریندر صاحب سے ملنا تھا۔

''میں چینج کر کے تین منٹ میں نیچے آ رہا ہوں۔ نہانے کا ٹائم نہیں ہے۔ آپ بھی ناشتا تیار مت کروائیں۔ میں بس جوس کا ایک گلاس پیوں گا۔ بیس منٹ وہاں تک پہنچنے میں کافی ہیں۔'' اس نے موبائل وہیں سائڈ پر رکھ کر کمبل ہٹایا اور اگلے ہی پل واش روم میں داخل ہو گیا۔ ممی اس کی طرف سے مطمئن ہو کر واپس پلٹ گئیں اور اس کے بعد سائٹ ایریا سے واپس آتے آتے اسے دوپہر ہو گئی۔ موبائل کی چارجنگ بالکل ختم تھی۔ وہ موبائل چارجنگ پر لگا کر کھانا کھاتے ہی سو گیا۔ شام کو واٹس ایپ دیکھا تو دوسرے کئی میسجز کے ساتھ سنینا کے بھی کئی میسیج آئے ہوئے تھے۔

وہ اس سے سخت خفا لگ رہی تھی اور بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے اور ملنے پر کچھ بتانا چاہتی ہے۔ دیپو کی اس سے رات کو کال پر بات ہو پائی اور چونکہ اب ملنے کا وقت نہیں تھا تو دیپو اس سے معذرت کرنے لگا لیکن جواباً سنینا رونے لگی۔

''ارے پاگل! اتنی سی بات پر رونے لگ گئیں۔ بھئی ہم کل مل لیں گے۔'' دیپو نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''تم بدل رہے ہو دیپک! تم بھی عام مرد نکلے۔ اپنا مطلب نکالا اور چل دیے۔''

''ایسا نہیں ہے سنینا! تم بات کو سمجھو۔''

''تم اپنے پیرنٹس سے بات کیوں نہیں کرتے؟ تمہیں پتا ہے دیپک! میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتی۔'' وہ پھر رونے لگی اور یہی وہ مقام ہوتا جب دیپک کی زبان گنگ ہو جایا کرتی کیونکہ اس کے اور سنینا کے بیچ کلاس کا فرق اتنا بڑا تھا کہ اس کے پیرنٹس نے اس کی اگلی بات ہی نہ سننی تھی۔ وہ ایک غریب گارڈ کی بیٹی تھی۔ اس کے پتا ایک اے ٹی ایم کے سامنے کن لیے پہریداری کرتے۔ چھوٹا سا نہایت پرانا ایک گھر تھا اور ڈھیر سارے روتے بلکتے بہن بھائی۔ سنینا اپنی اچھی شکل وصورت اور چند ایک اتفاقات کی بدولت اس کے قریب تو آ گئی تھی لیکن وہ اسے اپنی پتنی کا درجہ اس جنم میں تو کبھی نہ دے سکتا تھا۔

''تم سمجھنے کی کوشش کرو سنینا! دیکھو، ملنا صرف شادی کرنا ہی تو نہیں ہوتا۔ ہم ہمیشہ کے لیے ایک تو ہو چکے۔ ہمیشہ ایک دوسرے کے دوست بھی رہیں گے..... ملتے رہیں گے۔''

''تو اب تم ایسا سوچنے لگے ہو۔'' اس نے غصے سے آنکھیں رگڑیں۔ ''میں ہمیشہ تم سے کیسے ملتی رہوں گی دیپک؟ کیا میرے ماں باپو میری شادی نہیں کریں گے؟ کیا میں نے ان پر بوجھ بنے رہنا ہے اور..... اور آج آخرکار تم نے صاف صاف انکار کر دیا۔'' وہ پھر سسک سسک کر رونے لگی۔

''اچھا دیکھو، رونا بند کرو۔ میں کوئی راہ نکالتا ہوں۔ پلیز، ٹرائی ٹو انڈرسٹینڈ! مجھے سوچنے کا اور کوئی راہ نکالنے کا وقت دو۔''

''ٹھیک ہے دیپک! تم کل تک کا وقت لے لو۔ کل چار بجے ہم وہیں، ہمارے لو اسپاٹ پر ملیں گے۔ تم مجھے اپنا فیصلہ سنا دینا۔''

''او کے مائی لو..... ٹیک کیئر..... اور دیکھو پریشان مت ہونا۔'' دیپو نے چند ایک تسلی کی باتیں کر کے کال آف

کردی۔

☆☆☆

"آیئے سندیپ سر! میں تو موسم کے تیور دیکھ کر گھبرا رہا تھا۔" سوہن داس نے جلدی سے آنے کا راستہ بنایا۔

"ارے، ایسی کوئی بات نہیں سوہن جی! یہیں پاس ہی تو رہائش ہے۔ موسم جتنا بھی بگڑ جائے، یہاں تک آیا جا سکتا ہے۔" اس نے اپنا کوٹ اتار کر صوفے کے کنارے پر رکھا۔ اندر شاید آتش دان یا ہیٹر آن تھا بھی باہر کی نسبت ٹمپریچر کافی نارمل تھا۔ اگلی صبح اس کی کولکتہ واپسی تھی بھی اس آخری شام کھانے کا اہتمام اپنے ہاں کرتے ہوئے سوہن داس جی نے سندیپ کو بلا بھیجا تھا۔

"کیسی رہی پھر آپ کی ایک ہفتے کی یاترا؟ ہم سے کوئی شکایت تو نہیں ہوئی؟"

"کیسی باتیں کرتے ہیں سوہن جی! آپ کی میزبانی کا تو باقاعدہ لطف لیا ہے پھر آپ کا اتنا خوبصورت دوارس ..... دل چاہتا ہے، یہیں بس جائیں۔" وہ الویرا کے خیال سے اندر تک سرشار ہوا۔ ابھی تو اسے واپس جا کر پہلے اپنے ممی ڈیڈی سے الویرا کے متعلق بات کرنا تھی اور پھر انہی کے توسط سے سوہن داس جی کے ساتھ بھی بات چلانا تھی۔

"آیئے سندیپ سر! کھانا کھا لیتے ہیں۔" سوہن داس اٹھ کھڑا ہوا تو سندیپ نے بھی پیش قدمی کی۔ الویرا بھی اب تک کے وقت میں کہیں دکھائی نہ دی تھی۔ دونوں ڈائننگ ہال میں آئے تو یہاں بیک وقت تین خواتین سے سامنا ہوا۔

"یہ میری مسز شیتل داس!" سوہن داس نے تعارف کروانا شروع کیا۔ "یہ میری بیٹی ارپتا اور یہ بڑی الویرا..... !" انہوں نے تعارف کروایا اور سندیپ نے مسکراہٹ دباتے بڑی شوخ شرارتی سی ایک نظر الویرا پر ڈالی حالانکہ وہ بھی اسی کو دیکھ رہی تھی لیکن چہرہ ایک دم سپاٹ اور اجنبیت لیے ہوئے تھا۔ سندیپ کو لگا شاید وہ اپنے پتا جی سے گھبرائی ہوئی ہے لیکن یہ بھی اس کی خام خیالی ثابت ہوئی کیونکہ کھانے کے دوران وہ برابر اپنی بہن اور ماں کے ساتھ سرونگ میں مصروف رہی تھی لیکن اس کا وہ جنون، وہ محبت ایک بار بھی اس کے چہرے سے نہیں جھلکا۔ دو مرتبہ اس نے بہت قریب آ کر خود سندیپ کی پلیٹ میں کھانا پروسا لیکن وہ تب بھی اس کی آنکھوں، اس کے معنی خیز رویے کی طرف متوجہ نہ تھی۔ نہ جانے وہ اتنی انجان کیوں بن رہی تھی حالانکہ آج تو اسے سب سے زیادہ خوش ہونا چاہیے تھا کہ اس کے پتا جی نے اس کے محبوب کو خود کھانے پر بلایا تھا اور یہ مستقبل کے لیے ایک اچھا سندیش تھا لیکن الویرا کی لاتعلقی اب سندیپ کو پریشان کرنے لگی تھی۔ کھانے کے بعد سوہن داس اسے اپنے کمرے میں لے آئے۔ یہاں آتش دان میں کوئلے جل رہے تھے۔ نوکر نے قہوہ لا کر دیا اور وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ کر قہوہ پینے لگے۔

"آپ کی دو ہی بیٹیاں ہیں؟"

"نہیں، ایک لڑکا بھی ہے۔ نیپال میں ہوتا ہے۔ ایک نجی کمپنی میں اسسٹنٹ منیجر ہے۔"

"اچھا، گڈ!" سندیپ سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے مزید کسی سوال کے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اب بھلا وہ ان سے ان کی بیٹیوں کے متعلق کیا بات کرتا۔

"لڑکے کی منگنی تو کزن کے ساتھ ہو چکی ہے۔ چھ ماہ تک شادی بھی ہو جائے گی لیکن بچیوں کا ابھی کہیں طے نہیں کیا۔" سوہن داس خود ہی بتانے لگے۔

"بھگوان بھلا کرے گا۔ ابھی اتنی تو عمر نہیں۔" سندیپ نے محتاط رویہ اپنایا۔

"ہاں، وہ تو ہے پر اپنی بڑی بیٹی کے پرتی کچھ پریشانی ہے ان دنوں۔" انہوں نے کچھ اٹک اٹک کر کہنا شروع کیا اور قہوہ سندیپ کے گلے میں پھنسنے لگا۔ سوہن داس کی بڑی لڑکی تو الویرا ہی تھی۔ شاید سوہن جی کو ان کے بارے میں کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ سندیپ کو صحیح معنوں میں گھبراہٹ سی ہوئی۔

"جی ....؟" وہ بس اتنا ہی کہہ پایا۔

"الویرا کو کچھ سائیکی پرابلمز شروع ہو گئی ہیں۔ ہم بھی بہت پریشان ہیں۔ اچھی بھلی لڑکی تھی ہماری۔ معلوم نہیں دن بہ دن کیا ہوتا جا رہا ہے۔"

"کک..... کیا ہوا؟"

"پتا نہیں سندیپ سر! عجیب و غریب حرکتیں کرتی ہے ان دنوں۔ نہ اسے باتیں یاد رہتی ہیں، نہ بیتے ہوئے واقعات۔ وہ ہم سب کے بیچ ہو کر بھی جیسے نہیں اور ہوتی ہے۔ اس کا دماغی سنتولن کچھ بگڑا محسوس ہوتا ہے اور یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ مجھے آپ کولکتہ کے کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کا پتا بتا سکتے ہیں۔ میں اپنی بٹیا کو دکھلاؤں گا۔"

"جی، جی..... میں پتا کر کے آپ کو فون پر بتا دوں گا۔" سندیپ نے ان کی ساری بات سن کر ایک گونہ سکون محسوس کیا ورنہ وہ ڈر رہا تھا کہ آخر سوہن داس اسی سے ہی

اپنی بیٹی کا معاملہ کیوں ڈسکس کرنے بیٹھ گئے۔ وہ کولکتہ کے کسی اچھے ڈاکٹر کے متعلق جاننا چاہتے تھے۔

☆☆☆

''میں باہر آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔'' بار بار کی کالز نے سندیپ کی نیند سے آنکھ کھول دی۔ مسڈ کالز بھی ساری الویرا کی جانب سے تھیں اور ابھی ابھی یہ پیغام...... وہ حیرت سے منہ کھولے کھڑکی کے پار دیکھ رہا تھا جہاں ابھی دن کی روشنی دکھائی نہ دیتی تھی۔ سندیپ نے پریشان ہو کر گھڑی دیکھی۔ صبح کے پانچ بجے تھے۔ کچھ ہی دیر میں دن روشن ہونے والا تھا اور اسے سات بجے یہاں سے نکلنا تھا تاکہ وہ دن کی روشنی میں ہی سلی گڑی پہنچ سکے اور ادھر الویرا تھی جو منہ اندھیرے اسے نیچے بلا رہی تھی۔ شاید وہ اس سے ملنے آئی تھی۔ سندیپ نے جلدی سے نائٹ ڈریس سے نجات حاصل کی اور جینز کے ساتھ شرٹ اور گرم جرسی پہن کر نیچے آگیا۔ الویرا سے تو وہ خود بھی ملنا چاہتا تھا۔ آخر اس سے رات کے اجنبی رویے کے بارے میں بھی تو پوچھنا تھا۔

''آج تم اتنی صبح؟'' وہ مسکرا دیا۔

''ہاں، تو کیا ٹیوشن کے ٹائم آتی تاکہ تم واپس جا چکے ہوتے؟'' اس نے منہ بسورا۔

''اب تو تمہی اپنی اپنی دکھائی دیتی ہو اور رات کو کیا ہو گیا تھا؟''

''رات......؟'' وہ خالی خالی نظروں سے دیکھے گئی۔

''اچھا، پہلے اندر تو آؤ۔ یہاں تو کتنی ٹھنڈ ہے۔''

''اندر نہیں سندیپ! ہمارے پاس دو گھنٹے ہیں۔ آؤ تمہیں آج چوٹی دکھالاؤں۔''

''چوٹی......؟'' سندیپ کی تھمی تھمی چیخ ہی نکل گئی۔

''اس ٹھنڈ میں، اتنی صبح......؟ دیکھو الویرا! چوٹی دیکھنا اتنا ضروری ہرگز نہیں ہے۔''

''ضروری ہے سندیپ!'' وہ انتہائی سنجیدہ تھی۔

''وہاں پر دیوی کا مندر ہے۔ ان کی دعا سے محبت بھری شادیاں ہو جاتی ہیں۔ مجھے ایک بار تمہارے ساتھ ضرور ادھر جانا تھا...... پلیز، آؤ۔''

''ہوں...... تو یہ بات تھی جو تم اتنے دنوں سے میرے پیچھے پڑی تھیں...... ہاں۔'' وہ ہلکا پھلکا ہو کر مسکرا دیا۔

آسمان آج بادلوں سے صاف تھا۔ بارش وغیرہ کا کوئی امکان نہیں تھا اور اس بات سے بھی سندیپ کو تقویت ملی تھی۔ واپسی کے لیے نکلنے میں بھی ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔

اس نے الویرا کی خواہش پوری کرنے کا تہیہ کیا اور دونوں تیز قدموں سے چلنے لگے۔

''گھر پر کیا بتایا؟''

''کچھ نہیں۔ سب سوئے ہوئے تھے۔ بعد میں کہہ دوں گی کہ واک کے لیے نکل گئی تھی۔ اکثر جاتی رہتی ہوں۔''

''ہوں۔'' سندیپ نے سر ہلایا۔ آج وہ بڑے کم وقت میں چوٹی تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں ٹمپریچر کچھ زیادہ کم تھا۔ ہوا میں ٹھنڈ کی شدت تھی لیکن نظارہ بہت خوبصورت تھا۔

''واؤ..... بیوٹی فل۔''

''کچھ یاد آیا؟'' الویرا اس کے کان کے قریب بولی تو وہ چونکا۔

''ہوں ..... کیا؟ میں تو یہاں پہلی بار آیا ہوں۔'' وہ ہنس دیا۔

''یہ پہاڑ کی اونچی چوٹی، یہ کنارہ...... وہ گہری کھائی۔'' الویرا کی پراسرار مسکراہٹ سندیپ کے چہرے کے بالکل قریب تھی۔ سندیپ نے ذرا سی گردن پھیر کر الویرا کو دیکھا تو اس کی ہنسی سے زیادہ وہ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر ساکن ہوا..... وہ..... وہ الویرا کی آنکھیں تو نہ تھیں..... وہ تو .....

''کک..... کیسی چوٹی..... کیسا کنارہ.....؟''

سندیپ کا دل بڑے زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ جو کچھ اس نے دیکھا، وہ ناقابلِ یقین تھا اور اب یہ الویرا کی باتیں

''انجان مت بنو سندیپ! تمہیں سب پتا ہے۔'' وہ پراسرار انداز میں مسکرائے ہی جا رہی تھی۔

''کیا پتا ہے ..... اور..... تم .....''

''ہاں، میں ..... کیا..... ؟'' وہ ہنسی تو لہجے میں طنز بھرا تھا۔ ''بولو نا سندیپ ......! میں کیا.....'' وہ قہقہہ لگا کر ہنسی اور سندیپ نے مشکوک انداز میں الویرا کو سر سے پیر تک دیکھا۔

''دھیان سے دیکھو..... اور پہچانو مجھے۔'' وہ برابر ہنس رہی تھی۔ سندیپ کو اپنی ٹانگوں میں کپکپی محسوس ہوئی۔

''تم ..... کیا چاہتی ہو الویرا؟'' اس کا ماتھا شکنوں سے پُر تھا۔ الویرا چلتے ہوئے سندیپ کے بالکل نزدیک آئی اور اپنی ایک کہنی سندیپ کے شانے پر رکھ کر چہرہ اس کے نزدیک کیا۔

''یہ کہو سندیپ کہ تم کیا ''چاہتی'' ہو۔''

''مطلب.....؟'' سندیپ نے تھوڑا دور ہونے کی کوشش کی لیکن الویرا ایک کر پھر اس کے قریب آگئی۔ سندیپ دور ہونے کی کوشش میں چوٹی کے کچھ اور کنارے پر آ گیا لیکن وہ الویرا کی باتوں اور اس کی حرکات سمجھنے میں اتنا گم تھا کہ اسے یہ احساس ہی نہیں ہوا۔ الویرا نے ایک چور نگاہ سندیپ کے قدموں اور چوٹی کے آخری کنارے پر ڈالی اور تھوڑا اور آگے آئی۔

''مطلب سمجھنے میں شاید تمہیں تھوڑا وقت لگ جائے لیکن گھبراؤ نہیں سندیپ ..... کیونکہ وہ وقت آ چکا ہے جب تمہیں تمہارے ہر سوال کا جواب ملنے والا ہے۔'' الویرا نے کہنی کندھے سے ہٹاتے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور پوری طاقت سے دھکا دیتے سندیپ کو بنا سنبھلنے کا موقع دیے نیچے کھائی میں گرا دیا۔ ایک نظر آس پاس کی ویرانی پر ڈالی اور مسکرا کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے فوراً وہاں سے واپس پلٹ گئی۔

☆☆☆

''کوئی گرا ہے یہاں۔ میں نے چیخنے کی آواز سنی ہے۔'' انہاس اپنے کیمپ سے نکل کر صبح سویرے کے مناظر کی تصاویر لے رہا تھا جب اسے ایک دلدوز چیخ کی آواز سنائی دی۔ آواز کسی مرد کی تھی۔ اس نے کیمپ میں واپس گھس کر اپنے دوستوں کو جگایا اور وہ سب بھاگتے ہوئے اس پوائنٹ تک آئے جہاں سے سندیپ کھائی میں گرا تھا۔

''بچاؤ..... کوئی مجھے بچاؤ۔'' سندیپ کی آواز زیادہ نیچے سے نہ آ رہی تھی۔ لڑکوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو چہروں پر خوشی اور طمانیت تھی۔ گرنے والا جو کوئی بھی تھا، ابھی زندہ سلامت تھا اور اس کی مدد کر کے اسے بچایا جا سکتا تھا۔

''ہاں، ہاں بھائی..... ! ہم یہاں اوپر موجود ہیں۔ چنتا مت ہونا..... ہم کچھ کرتے ہیں۔''

''اے آشیش! وہاں دیکھو، نیچے اترنے کا راستہ ہے۔''

''ہاں، آؤ۔ یہاں سے اتر کر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ گرنے والا کہاں لٹکا ہوا ہے۔'' وہ تینوں گھاس پر قدم جماتے آہستہ روی سے ڈھلان اترنے لگے۔

''تم کہاں ہو بھائی؟ ہم ڈھلان اتر رہے ہیں۔'' وکاس نے پھر تسلی دی۔ نیچے گرتے وقت سندیپ کے ہاتھوں میں ایک باہر کو نکلے درخت کا تنا آ گیا تھا۔ گرتے پڑتے اس کے ہاتھوں نے کچھ لچکیلی شاخوں کو مٹھی میں قید کیا اور پھر پوری ہمت سے اس نے دوسرے ہاتھ سے ایک مضبوط شاخ بھی تھام لی۔ گہری کھائی بہت نیچے دور پڑی رہ گئی اور وہ چوٹی سے محض تیس پینتیس فٹ نیچے لٹک کر رہ گیا۔ کچھ دیر اس نے دانستہ خاموشی اختیار کیے رکھی تھی تاکہ الویرا وہاں سے بھاگ

جائے۔ اسے یقین تھا کہ دھکا دینے والی وہاں ہرگز کھڑی نہ رہے گی۔ تبھی کچھ دیر گزر جانے کے بعد جب بچاؤ، بچاؤ کہنا شروع کیا تو قدرت نے وہاں کچھ نوجوانوں کو بھیج دیا۔ آشیش، وکاس اور الہاس کی کوششوں سے بالآخر اسے بچالیا گیا۔ سندیپ کی کمر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ الویرا نے جب اس کو دھکا دیا تو اس کا بدن پہاڑ کی زگزیگ کھاتا ہوا نیچے گرنے لگا تھا تبھی دائیں سائڈ بری طرح چھل گئی تھی۔ کان، گال اور گردن کی ایک سائڈ بھی بری طرح زخمی ہوئی تھی اور اب وہ اسپتال میں تھا۔ سوہن داس کو بھی اس کے کہنے پر بلالیا گیا تھا اور اب سب کے چلے جانے کے بعد سندیپ کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا تھا۔

''مجھے [illegible] میں آپ کی بیٹی نے دھکا دیا تھا سوہن جی! آخر آپ مان کیوں نہیں لیتے ہیں'' سندیپ اس وقت شدید غم و غصے کا شکار تھا۔

''میں معافی چاہتا ہوں سندیپ سر! لیکن مجھے بالکل سمجھ نہیں آرہی کہ الویرا ایسا کیوں کرے گی؟ میں مانتا ہوں کہ صبح جب ہم اٹھے تو وہ گھر پر نہیں تھی لیکن وہ تو بالکل نارمل تھی اور اس نے بتایا کہ وہ یہیں باہر تک واک کرنے گئی تھی۔''

''جب اس نے مجھے نیچے دھکا دیا وہ تب بھی بہت نارمل تھی سوہن جی...! اور سن لیں آپ کہ میں آپ کی بیٹی کو چھوڑوں گا نہیں۔ میں نے یہیں آتے جاتے راستوں میں آپ کی بیٹی کو دیکھا۔ مجھے وہ یقیناً اچھی لگی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ واپس جا کر اپنے ممی پاپا سے اس سلسلے میں بات کروں گا اور وہ آپ سے الویرا کا ہاتھ مانگیں گے... بٹ نو... نیور!'' سندیپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

''کیا الویرا بھی یہ بات جانتی تھی؟'' سوہن داس کے لیے سندیپ کا انکشاف بڑی حیرت لیے ہوئے تھا۔ جو با سندیپ نے کچھ دیر توقف کیا پھر کچھ طے کر کے سر اثبات میں ہلا دیا۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا، اب اس کی تہ تک پہنچنے کے لیے اس نے مصلحتاً بھی جھوٹ کا سہارا نہیں لینا تھا۔

''اچھا...!'' سوہن داس بے یقین سے تھے۔

گزرے چھ سات دنوں کے دوران ان کے گھر میں یقیناً بہت کچھ ہوا تھا اور جس سے وہ نہ صرف تب بے خبر رہے تھے بلکہ ابھی تک بہت ساری باتوں سے انجان تھے۔ وہ تو چند دنوں سے اپنی بیٹی کے عجیب و غریب رویے سے پریشان تھے اور اب یہ نیا کیا سننے کو مل رہا تھا۔ ان کی بیٹی اور سندیپ کی آپس میں دوستی اور محبت......

''مجھے سمجھنے کے لیے کچھ وقت دیں سندیپ سر! میں الویرا سے بات کرنے کے بعد ہی کچھ سمجھنے کے قابل ہو پاؤں گا۔''

''جی ٹھیک ہے۔ آپ آرام سے گھر جائیں اور الویرا سے بات کریں لیکن پلیز، اسے یہاں مت لائیے گا۔ میں اس کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھے یقین ہے کہ بھروسے مند بندے کے ساتھ آپ میری کار میں کولکتہ پہنچ گئیں گے...... وہ بھی کل صبح ہوتے ہی۔''

''جی، جی میں سمجھ گیا۔'' سوہن نے ہلکا سا سر کو جھکایا اور فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''یہ سچ نہیں ہے پاپا! ہیڈیوگی۔ میں اس سندیپ سے بس دو مرتبہ ملی ہوں۔'' الویرا کی آنکھوں میں حیرت کا ایک سمندر آباد تھا۔

''دو مرتبہ کب......؟'' سوہن داس نے تجسس کا مظاہرہ کیا۔ اسے ایک بار الویرا کو بھی سن لینا چاہیے تھا تبھی غصے کو قابو میں رکھا۔

''پہلی مرتبہ اس دن جب وہ اگلی صبح دوربین لیے جنگل کی سیر کر رہے تھے اور زخمی ہوگئے۔ مرلی کاکا مجھے پروفیسر صاحب کے ہاں لینے نہیں آئے تو میں پیدل واپس آرہی تھی۔ تب انہیں زخمی پڑے دیکھا... اور اس کے بعد پچھلی شام جب وہ ہمارے ہاں کھانے پر آئے۔''

''لیکن وہ کہتا ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو اور آج صبح تم اسے پہاڑی کی سیر کے لیے لے گئیں جہاں تم نے اسے دھکا دے دیا۔''

''پاگل ہے وہ...'' الویرا چیخ ہی پڑی۔ ''بالکل غلط۔ میں اس سے خود بات کرتی ہوں۔ آخر اس کا اس سب کے پیچھے مقصد کیا ہے؟ آپ مجھے اسپتال لے چلیں پاپا!'' وہ فوراً ہی بستر سے اٹھنے لگی۔

''سندیپ آج شام خود ہی گھر واپس آرہا ہے۔ اسپتال میں بات کرنا مناسب نہیں۔ میں تمہیں شام کو وہاں لے جاؤں گا۔''

''ہوں...... ٹھیک ہے۔'' الویرا لب بھینچے برابر اس سوچ میں تھی کہ آخر سندیپ نے اس پر بہتان کیوں لگایا۔

☆☆☆

''معافی چاہتا ہوں سندیپ سر! لیکن الویرا آپ سے خود ملنا چاہتی تھی تو اس لیے میں اسے یہاں لے آیا۔''

شام کو سندیپ جب گھر واپس آگیا تو کچھ ہی دیر بعد سوہن داس، الویرا کو لیے وہاں آپہنچے اور اس وقت الویرا باہر اپنے

اندر بلائے جانے کے انتظار میں کھڑی تھی۔

''ہوں...... ٹھیک کیا آپ نے۔ ادھر اسپتال میں میرا بھی دماغ بہت گرم ہو گیا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ الویرا سے ڈائریکٹ بات کرنا بہت ضروری ہے۔ آپ اسے اندر بلالیں۔'' سندیپ کہنی کے سہارے اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوا۔ جسم میں ابھی بھی درد کی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔

''نن..... نمستے!'' الویرا نے اندر آکر فوراً ہی گھبرائے ہوئے انداز میں دونوں ہاتھ سامنے جوڑے۔ سندیپ نے جواباً ہلکا سا سر ہلایا۔ ہاتھ تک ہلانا مشکل تھا۔ ابرو کے اشارے سے سوہن داس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے الویرا کو کرسی کی جانب اشارہ کیا تو وہ گھبرائی نظروں سے دیکھتے ہوئے ہلکی سی ٹک گئی۔ سوہن داس خود بھی بیٹھ گئے۔

''تو تمہارا ماننا ہے کہ تم نے مجھے کھائی میں دھکا نہیں دیا؟''

''بھگوان قسم! بالکل نہیں۔'' اس نے سختی کے ساتھ سر نفی میں ہلانا شروع کیا۔ ''میں تو...... میں تو......'' اس نے رک کر کچھ سوچنے کی کوشش کی۔ ''ڈیڈی بتاتے ہیں کہ میں تو واک کر کے واپس آئی تھی اور بالکل نارمل دکھتی تھی۔''

''ڈیڈی بتاتے ہیں......؟'' سندیپ نے حیرت سے دہرایا۔ ''تو تمہیں خود نہیں پتا کہ اس صبح کیا ہوا تھا؟''

''وہ...... مجھے آج کل باتیں کچھ ٹھیک سے یاد نہیں رہتیں۔'' الویرا نے پشیمانی سے سر جھکایا اور سندیپ اس کی معصومیت پر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ عجیب لڑکی تھی۔ کیسے بھولے پن سے خود کو بچا رہی تھی۔

''دیکھیں الویرا! آپ پلیز سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ سب کچھ جو پیش آیا، نہ وہ بچوں کا کھیل تماشا ہے، نہ اتنی معمولی بات کہ آپ منہ سے انکار کر کے پیچھے ہٹ جائیں گی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے آپ کے ڈیڈی کو بتادیا ہے کہ شروع دن سے کس طرح ہمارے بیچ دوستی شروع ہوئی اور ہم روزانہ ملنے لگے تھے۔''

''روزانہ......؟'' الویرا سے صبر نہیں ہوا تو بیچ میں ہی اس کی بات قطع کی۔ ''ہم روزانہ کب ملے؟ اس پہلی صبح جب آپ کا پاؤں زخمی ہوا اور میں نے آپ کو پٹی باندھی...... اس کے بعد میں نے آپ کو تب دیکھا جب آپ ہمارے گھر کھانے پر آئے۔ مجھے تو پتا ہی تب چلا کہ آؤٹ ہاؤس میں جو بندہ ٹھہرا ہے، وہ آپ ہیں۔''

''پلیز الویرا......! پلیز......! یہ سب نہ کریں۔'' سندیپ کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ ''آپ کو اسی دن ہی پتا چل گیا تھا کیونکہ ہم دونوں گھر تک ایک ساتھ آئے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے۔''

''ایسا نہیں ہے۔ میں نے آپ کو پٹی باندھی..... اور..... اور......'' وہ پھر کچھ اٹک گئی۔ ''ہم...... مجھے گھر آنا یاد تو نہیں...... لیکن میں آپ کے ساتھ نہیں آئی کیونکہ مجھے تو پتا ہی کتنے دنوں بعد چلا کہ وہ آپ ہیں جو یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''الویرا! آپ سوچ سمجھ کر جواب دیں اور دیکھیں، میری جان بچ گئی ہے اس لیے سمجھیں کہ میں نے آپ کو دھکا دینے والے معاملے پر معاف کر دیا لیکن آپ انکار مت کریں۔''

''مجھے میرے ڈیڈی کی قسم...... ممی کی قسم...... سارے بہن بھائیوں کی قسم...... نہ میں نے آپ سے دوستی کی، نہ کبھی اکیلے میں ملی اور نہ ہی میں آپ کو کبھی پہاڑ پر لے گئی۔ دھکا دینے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔''

''اور یہ میری چوٹیں...... ان لڑکوں کا مجھے بچانا...... وہ سب......؟''

''سندیپ سر! آپ ایک بار ٹھنڈے دماغ سے اس سب پر سوچیں کیونکہ میری بیٹی کبھی ہمارے پورے پریوار کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتی۔ آپ ہی بتائیں، کیا آپ اپنے ماں باپ کی جھوٹی قسم کھا سکتے ہیں؟'' سوہن داس نے اس مرتبہ سنجیدگی سے سندیپ کو ٹوک دیا جس پر اس نے ایک گہری سانس لی۔ کسی حد تک بات درست ضرور تھی لیکن پھر وہ اس سچ کا کیا کرتا۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی سوہن داس جی! میں بھی سنی سنائی نہیں، آنکھوں دیکھی روداد سنا رہا ہوں...... اور......'' سندیپ کو اچانک جیسے ایک خیال آیا، اس نے سر اٹھا کر الویرا کو دیکھا۔

''آپ نے کہا کہ آج کل آپ کو باتیں بھول رہی ہیں...... کیا یہ سچ ہے...... اور اگر ایسا ہے تو یہ کب سے ہے؟''

''یہ تو......'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''ابھی کچھ ہی دن ہوئے، یہی کوئی سات آٹھ روز۔ پہلے تو میں بالکل نارمل تھی۔ مجھے یادداشت وغیرہ کا کوئی ایشو بھی نہیں رہا۔ ڈیڈی بھی اسی وجہ سے آج کل ڈاکٹرز وغیرہ کا پوچھنے میں لگے ہیں کیونکہ مجھے نہ ڈیٹس یاد رہتی ہیں نہ وقت...... اور اکثر تو میری جگہ بھی تبدیل ہوتی ہے۔''

''یعنی......؟''

''مطلب...... کسی بھی کام کے دوران بیچ میں بہت وقت کی غیر حاضری سی آجاتی ہے...... جیسے بیچ کا وقت کہیں اڑن چھو ہو گیا ہو...... اور جب میں اپنے آپے میں واپس

لوٹتی ہوں تو میں وہاں نہیں ہوتی جہاں آخری وقت موجود تھی ..... جیسے کہ اکثر ہی ایسا ہوا کہ میں اپنے بستر پر سوئی ہوئی تھی لیکن بڑی دیر بعد میں یہ دیکھتی ہوں کہ میں دن چڑھے واک سے واپس آرہی ہوں حالانکہ اس بیچ مجھے بستر سے نکلنا، واش روم جانا، تیار ہونا، ناشتا کرنا کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ اکثر تو واک سے واپس آکر میں پاگلوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑتی ہوں کیونکہ میں بہت دیر کی بھوکی ہوتی تھی اور دوسری بات یہ کہ مجھے پروفیسر صاحب سے پڑھنا تو یاد رہتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنا اور واپسی کا سفر یاد نہیں ہوتے۔ ایک دم ہی جیسے میں پروفیسر کے گھر سے اپنے گھر کے کمرے میں ہوتی ہوں۔''

''یہ سب بہت عجیب نہیں سوہن جی؟'' سندیپ نے الجھ کر سوہن داس کو دیکھا تو اس کے چہرے پر مزید کرب کے آثار نظر آئے۔

''تو کیا ایسا نہیں ہوسکتا الویرا جی کہ بیچ کا وہ دورانیہ جب آپ کو کچھ یاد نہیں ہوتا، اس میں آپ میرے پاس آئی ہوں اور اسی میں آپ نے مجھے دھکا دیا ہو؟''

''لیکن میں ایسا کیوں کروں گی؟ میری آپ سے کوئی دشمنی نہیں۔'' وہ سندیپ کی طرف دیکھ کر بولی تو پلکوں پر پانی تیر آیا۔ نہ جانے سندیپ کو کیوں اس پر ترس آگیا حالانکہ وہ سخت غصے میں تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ آپ جائیں الویرا! مجھے بھی کل صبح یہاں سے چلے جانا ہے۔ ہم اس واقعے کو ایک تلخ یاد سمجھ کر بھلا دیں گے اور آپ بھی اپنا علاج ضرور کروایئے۔'' اس نے بات کو وہیں ختم کرنے کی کوشش کی کیونکہ ان کی گفتگو سوائے ایک لا حاصل بحث کے اور کچھ نہ تھی۔

☆☆☆

سسکیوں کی آواز بہت پاس بہت واضح تھی۔ سندیپ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ سائڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر وقت دیکھا۔ رات کے پونے تین بجے تھے۔ سائڈ ٹیبل پر رکھے ٹیبل لیمپ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کچھ سوچ کر ہاتھ کو وہیں روکا۔ لائٹ آن کرنا اس اگلے کو چونکانے کے مترادف تھا۔ اس نے نائٹ بلب کی نیلی روشنی کو کافی سمجھتے ہوئے شال اپنے گرد اوڑھی اور بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب آیا۔ سسکیوں کی آواز لگاتار آئے جا رہی تھی۔ اس نے پردہ ہٹا کر سمجھنے کی کوشش کی۔ کھڑکی کا شیشہ تو بند تھا اور باہر بھی اندھیرا چھایا تھا۔ اس کا ارادہ تو نہیں تھا کھڑکی کھولنے کا لیکن شیشے پر یونہی ہاتھ رکھا تو کھڑکی باہر کو کھل گئی۔ خوف کی ایک گٹھلی سی حلق میں کہیں پھنسی۔ وہ کھلے پٹ کو ہاتھ باہر نکال کر تھامنے لگا تاکہ کھڑکی کو دوبارہ بند کرکے چٹخنی چڑھا دے جب ایک انسانی چہرہ اچانک کھڑکی کے سامنے آیا۔ اندھیری رات میں دھندلا دھندلا وہ ہیولا سندیپ کے لیے انجان نہ تھا لیکن جتنا وہ چہرہ شناسا تھا، اتنا ہی اسے خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

''تت... تت ..... تم.....'' الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے اور اس ہیولے نے کوئی چمکتی ہوئی چیز کمرے میں پھینکی اور دیکھتے ہی دیکھتے دھواں ہوگئی۔ سندیپ کو یہ سب سمجھنے میں بہت وقت لگ گیا۔ وہ منہ کھولے ہکا بکا باہر دیکھ رہا تھا جب اپنی پشت پر تیز روشنی سی محسوس کرکے حیرت سے پلٹا تو بری طرح حواس باختہ ہوگیا۔ کمرے میں آگ لگ گئی تھی۔ بیڈ کی چادر نے آگ پکڑ لی تھی۔ شعلہ بہت اونچا ہو رہا تھا۔ اس نے بوکھلا کر پاس رکھا جگ اٹھایا اور آگ پر انڈیل دیا۔ باقی بچی آگ کو چادر لپیٹ کر بجھا دیا۔ یہ آگ کیوں اور کیسے لگ گئی؟ وہ ابھی سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ نظر قالین پر گری ایک کینڈل پر پڑی۔ بجھی ہوئی کینڈل دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ ہیولے نے کچھ دیر پہلے اندر جو چیز پھینکی تھی وہ یہی جلتی ہوئی موم بتی تھی بلکہ یہ کینڈل اس نے سندیپ کے منہ پر ہی پھینکی تھی لیکن وہ ہیولے کی حرکت دیکھتے ہی کنارے پر ہوا اور کینڈل اس دوران پیچھے جا پڑی۔ سندیپ نے بھاگ کر کھڑکی کے نہ صرف پٹ بند کیے بلکہ کانپتے ہاتھوں سے جلدی جلدی چٹخنی بھی چڑھا دی اور اسی تیزی سے آکر روم کا دروازہ چیک کیا۔ اس کی چٹخنی بھی بند تھی لیکن باوجود اس سب کے، وہ خود کو غیر محفوظ تصور کر رہا تھا کیونکہ تھوڑی دیر پہلے جو کچھ ہوا اور جو کچھ اس نے دیکھا، خوف محسوس کرنا فطری تھا۔ وہ ہیولا کوئی جیتا جاگتا انسان نہیں، بھٹکتا ہوا تھا اور آیا تھا کہ بند دروازوں سے کیا لیتا دیتا۔ وہ تو کبھی بھی، کہیں سے بھی... سندیپ دبک کر اپنے بستر پر چڑھ بیٹھا۔ آؤٹ ہاؤس کا اکیلا پن اس لمحے جان لیوا تھا۔ آتما نے اس کی جان لینے کی کوشش کی تھی اور کیوں کی تھی؟ وہ ٹھیک ٹھیک اس بات کو جانتا تھا۔ وہ اس کی جان کی دشمن تھی اور دس ماہ سے اس کے پیچھے پڑی تھی۔ گزرے چند ماہ کے دوران کتنے ہی عجیب و غریب واقعات کو وہ اپنا وہم سمجھ کر ٹالتا رہا تھا لیکن جو کچھ الویرا سے ملنے کے بعد پیش آیا اور جو کچھ ابھی کچھ دیر پہلے اس کی آنکھوں نے دیکھا، سندیپ کے سوچ کے در اپنے آپ وا ہونے لگے تھے۔ الویرا بے قصور تھی۔ اس کو استعمال کیا گیا تھا۔ اس آتما نے ہی الویرا کے جسم میں داخل

ہوکر سندیپ کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ اس کا بار بار پہاڑی پر اسے لے جانے پر دباؤ دینا...... بالآخر اپنی کوشش میں کامیاب ہوتے ہی اسے پہاڑی سے دھکا دے دینا...... وہ اسے ہرگز معاف کرنے کو تیار نہ تھی اور کیسے کر دیتی...... جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا...... وہ معاف کرنے لائق تھا بھی نہیں...... وہ تب سے بھٹک رہی تھی...... اور اس کی روح کو تب تک قرار نہ آسکتا تھا جب تک وہ سندیپ کو اس کے کیے کی سزا نہ دے لیتی۔

☆☆☆

''مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔ کیا میں آپ سے کہیں مل سکتا ہوں؟''

''آں...... جی...... میں آؤٹ ہاؤس کے لان میں آجاتی ہوں۔ باہر کہیں ملنا ممکن نہیں۔ میرے پاپا منع کر گئے ہیں۔'' الویرا نے سجاؤ سے فوراً ہی کہا تو سندیپ نے بھی سکون کا سانس لیا۔ وہ خود بھی ایسا ہی کچھ کہنا چاہتا تھا۔

''اوکے۔ آپ فوراً آجائیے۔ میں آپ کی راہ دیکھ رہا ہوں۔'' وہ موبائل ہاتھ میں لیے اسی وقت باہر نکل آیا۔ لان کی کرسیوں تک پہنچ کر ایک اس نے اپنے لیے گھسیٹی اور اسے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے جب پنک لباس کے ساتھ نیلی شال اوڑھے الویرا وہاں آگئی۔ سندیپ نے اسے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے اپنے فیصلے پر دوبارہ سوچا۔ کیا اسے ایسی لڑکی پر بھروسا کرنا چاہیے جس کے اندر ایک روح حلول کر جاتی ہے اور کیا پتا کہ اب بھی وہ الویرا کے بجائے ایک روح ہی ہو، جیسا کہ پچھلے کئی دنوں تک اس کے ساتھ ہوتا رہا تھا...... لیکن نہیں۔ سندیپ نے اپنے خیالات کی نفی کی۔ اگر وہ الویرا کے بجائے ایک روح تھی تب بھی اسے اپنی بات کہہ دینی چاہیے تاکہ وہ ان ڈائریکٹ اپنی مظلومیت اس روح پر ثابت کر سکے۔ کیا پتا وہ اس سے بدلہ لینے کا اپنا ارادہ ترک کر دے۔

''الویرا! کیا آپ کو ہماری پچھلی رات کی گفتگو یاد ہے؟''

''جی۔'' اس نے اسی مؤدبانہ انداز میں سر ہلایا جیسے کہ رات دکھائی دیتی تھی۔

''کیا آپ وہ باتیں ایک مرتبہ پھر دہرا سکتی ہیں۔ آئی مین...... میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ حاضر حالت میں ہیں یا یہ وہ بیچ کا وقت ہے جب آپ کو کچھ یاد نہیں رہتا۔ باقی میری بات کی مکمل سمجھ آپ کو میری باتیں سننے کے بعد آئے گی۔''

''جی، جی۔ مجھے یاد ہے۔ رات میں پاپا کے ساتھ آپ کے روم میں آئی تھی...... اور......'' پھر الویرا وہی سب دہرانے لگی جو کچھ رات انہوں نے کہا تھا۔ اب سندیپ کو اگرچہ یقین تو نہیں تھا کہ الویرا میں اس وقت روح حلول کر چکی ہے یا نہیں لیکن یہ جوا بہرصورت اس نے کھیلنا ہی تھا۔

''الویرا! مجھے افسوس سے آپ کو بتانا پڑ رہا ہے کہ آپ کی اس حالت کا ذمے دار میں ہی ہوں۔ آپ جس وقت غیر حاضر ہوتی ہیں اور آپ کو کچھ یاد نہیں ہوتا، دراصل وہ وقت ایک آتما آپ کے جسم میں حلول کر کے گزارا کرتی ہے...... اور...... اور......'' سندیپ اٹک سا گیا کیونکہ الویرا پریشان ہو کر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''پلیز الویرا! ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔ آپ ایک بار مجھے سن لیں اور مجھے یقین ہے کہ اس وقت آپ الویرا ہی ہیں اور مجھے آپ کو اپنی بات سمجھانا آسان ہے۔ آپ پلیز بیٹھ جائیں اور یقین رکھیں کہ آپ ایک جیتے جاگتے انسان سے بات کر رہی ہیں۔ صرف مجھے کچھ دیر کے لیے سن لیں...... پلیز!'' سندیپ نے باقاعدہ اس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تو الویرا چاروناچار پھر بیٹھ گئی۔

''میری کہانی کا آغاز برستی بارش کی ایک شام سے ہوتا ہے۔'' سندیپ نے گلا کھنکھار کر کہنا شروع کیا اور الویرا چپ بیٹھی اسے سنتی چلی گئی۔

☆☆☆

''یہاں کی خوبصورتی دیکھو سنینا! یہاں کا سکون...... جہاں ہم نے بہت سارا اچھا وقت گزارا...... بہت سی خوبصورت گھڑیاں...... لیکن بتاؤ بھلا ہم کیا اس خوبصورتی کو اٹھا کر گھر لے جا سکتے ہیں؟ نہیں نا...... اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہاں تک چل کر آنا پڑتا ہے۔ ایسا ہی کچھ رویہ ہمارے تعلقات کا بھی ہے۔ ہمارے کئی دوست، کئی چاہنے والے ہم سے دنوں، ہفتوں اور کبھی کبھار تو مہینوں بعد ملتے ہیں لیکن کیا ہم انہیں اپنے گھر میں رکھتے ہیں؟ نہیں نا...... اس لیے مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آخر لڑکے لڑکی کی محبت اور دوستی کے وقت ایسا رویہ کیوں نہیں اپنایا جا سکتا۔ دو لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوں، ایک دوسرے کو چاہتے ہوں تو کیوں معاشرہ یہ چاہتا ہے کہ ان کو کسی رشتے میں باندھ دیا جائے۔ آخر کیوں وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے صرف دوست بن کر نہیں رہ سکتے۔ میرے والدین میرے لیے کیا سوچتے ہیں یا تمہارے بارے میں ان کی کیا رائے ہوگی...... یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے ہم کیوں نہ آپس میں یہ طے کر لیں کہ ہم اپنے تعلق اور رشتے کو کس سمت میں لے جانا

چاہتے ہیں۔''

''تو تم کیا سوچتے ہو دیپک؟'' سنینا نے اپنے جلتے، سلگتے دل کو بڑی دقت سے قابو میں رکھا۔ فی الحال اسے دیپک کو مکمل سننا تھا۔

''تم مجھے بہت پسند ہو سنینا! تم میرا پہلا پیار ہو۔ تمہیں اپنانا اور اپنی زندگی میں شامل کرنا میری خوش نصیبی ہو گی لیکن اگر میرے گھر کے حالات کو دیکھیں تو مجھے لگتا ہے کہ اگر تم میری پتنی بن بھی گئیں تو تمہیں اس نئے گھر میں بڑی مشکلات اٹھانا پڑ جائیں گی۔ اگر میں اپنے دم پر تمہیں قبول کر بھی لوں تو میرے ممی، ڈیڈی کبھی اس رشتے کے لیے ہاں نہیں بولیں گے اور اگر میں زبردستی اپنی بات منوا بھی لوں تو تمہیں سسرال میں لائف بڑی مشکل سے بتانا پڑ جائے گی اور میں تمہیں پل پل مشکل میں گھرا دیکھ کر پچھتانے لگوں گا۔ تبھی میں چاہتا ہوں کہ ہم کیوں نہ اس رشتے کی خوبصورتی کو ہمیشہ قائم رکھیں اور یہ اسی صورت ممکن ہے جب ہم کبھی کبھار ایک دوسرے سے ملیں۔ اس طرح ہمارا پیار ہمیشہ بنا رہے گا۔ اسے کبھی کوئی بگاڑ نہیں سکے گا۔''

''کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''

''آخری اور پہلا کیا سنینا! یار ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔ آخر ہر بندے کے اپنے کچھ خیالات ہیں اور مجھے یہی لگتا ہے کہ پیار کو اپنا لینے سے رشتے کی ساری بیوٹی خراب ہو جاتی ہے۔''

''لیکن میرے خیالات تو ایسے نہیں ہیں دیپک! مجھے تو یہی لگتا ہے کہ محبت کو پالینا ہی اس کی اصل کامیابی ہے۔ محبوب کے ساتھ سچے رشتے میں بندھ جانا ہی اس کی خوبصورتی ہے اور اگر ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنانے کی ٹھان لیں تو کوئی جیون بھر ہمارے درمیان دیوار کھڑی نہیں کر پائے گا۔ خود میں اپنے سسرال والوں کا اپنی محبت سے ایسے دل جیت لوں گی کہ وہ مجھے ٹھکرا ہی نہیں پائیں گے۔ بس ایک بار تم تو ہاں کرو۔ تم یقین کرو، تمہاری ممی کا دل تو میں تمہیں شادی سے پہلے ہی موم کر کے دکھا دوں گی۔''

''شادی، شادی، شادی!'' دیپک نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے افسوس کی نگاہ سنینا پر ڈالی۔

''آخر تم عورتیں کیوں اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے شادی کا رونا روتی رہتی ہو۔ تم کسی رشتے میں نہ بھی بندھو تو مجھے تمہاری محبت پر پورا بھروسا ہے۔''

''لیکن ایک دن تم نے کسی نہ کسی سے شادی کرنی تو ہے پھر میں کیوں نہیں دیپک؟'' اب وہ اسے بھیگی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے ہار رہی ہو، تھک رہی ہو اور سوائے ہتھیار ڈالنے کے کوئی چارہ دکھائی نہ دیتا ہو۔

''میری ماں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ شادی مجھے ان کی مرضی سے ہی کرنی ہے۔'' بالآخر دیپک کو کہنا ہی پڑا۔

''تو یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟''

''کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ ہم دونوں بہت اچھے دوست ہیں اور ہمیشہ دوست ہی رہیں گے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس تعلق کو شادی سے مشروط سمجھتی ہو۔''

''تو پھر..... اب کیا ہوگا؟'' وہ باقاعدہ رونے لگی۔ اس نے دیپک سے سچی محبت کی تھی۔ وہ اس کی پہلی اور آخری محبت تھا۔ وہ اس کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

''میں بھی تم سے پیار کرتا ہوں سنینا! ایک دم خالص، سچا پیار۔ مجھے یقین ہے ہماری دوستی بہت دور تک جائے گی۔''

''کیا تم میرے بغیر رہ سکتے ہو دیپک؟'' سنینا نے ایک خالی نگاہ کچھ سوچتے ہوئے دیپک پر ڈالی۔

''کیا مطلب؟'' دیپک اب کچھ چڑنے سا لگا۔

''مطلب یہ دیپک کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دیکھنا چاہتے ہو کیسے؟'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اسی وقت پہاڑی کے کنارے تک چلی گئی۔

''دیپک! اگر تم سنینا کے نہ ہوئے تو سنینا تمہاری محبت میں جان دے دے گی۔'' وہ جس ذہنی انتشار کا اچانک شکار ہوئی تھی، وہ اس کے رویے سے صاف جھلکنے لگا تھا اور یہ سب دیپک کے اکھڑے رویے اور اس کے جان چھڑانے والے جوابوں کی وجہ سے ہوا تھا۔

''ایسا نہیں ہوتا سنینا! سمجھو میری جان!'' وہ آہستہ روی سے چلتے ہوئے سنینا کے نزدیک آنے لگا لیکن دیپک کے انداز بتاتے تھے جیسے اسے سنینا کی سنجیدگی کا قطعی اندازہ نہیں ہے۔ وہ اسے سنینا کی ایک دھمکی، ایک مذاق سمجھ رہا تھا اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ سنینا کے غصے کو تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈا کر دے گا پھر نہ صرف وہ اس کی بات سمجھ جائے گی بلکہ اس کے خیالات کی حامی بھی بن جائے گی۔

''چلو، یہاں آؤ..... شاباش..... ایسی حرکت مذاق میں بھی نہیں کیا کرتے۔ خوامخواہ لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔''

''مذاق..... ؟ ہاں دیپک! مذاق۔'' وہ ہذیانی ہو کر چلّانے لگی۔ ''تم نے تو مجھے صرف ایک مذاق ہی سمجھا ہے۔''

''ایسا نہیں ہے سنینا! تم بلاوجہ اتنی سیریس ہو رہی ہو۔ تمہیں ہمارے ریلیشن کو کچھ وقت دینا چاہیے۔''

"کیا بہت سارا وقت لے کر تم یہ فیصلہ کر سکتے ہو دیپک کہ سنینا کو اپنی وائف بنا سکو؟" وہ کنارے کنارے مزید کچھ پیچھے ہوئی اور پیچھے جاتے ہر قدم کے ساتھ وہ دیپک کے تاثرات دیکھتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ دیپک کی آنکھوں میں اس کے کچھ کر گزرنے کے خیال سے خوف اور پریشانی دکھائی دے۔ وہ اسے بچانے کی خاطر آگے آئے اور اس کے گرنے کے خوف سے گھبرا کر اس سے بیاہ کا وعدہ کر لے۔ وہ صرف دیپک کو آزما رہی تھی ورنہ وہی جانتی تھی کہ اونچائی سے وہ کس قدر خوفزدہ ہوتی تھی۔

"بولو دیپک! اگر میں کہوں کہ تم سے شادی نہ ہوئی تو میں یہاں سے چھلانگ بھی لگا سکتی ہوں، تب تم کیا کرو گے؟"

"یہ ایک انتہائی فضول دھمکی ہے سنینا!" دیپک کو ایک دم غصہ آگیا۔ سنینا کا اصرار بلیک میلنگ کی حد تک جا چکا تھا اور یہ بات دیپک کا دماغ گرم کر رہی تھی۔

"یہ کوئی طریقہ نہیں ہے بات سمجھانے کا۔ میں کہہ رہا ہوں، واپس آؤ۔ ہم نے ابھی آج اس موضوع پر بولنا شروع کیا ہے۔ ہمارے اس بحث مباحثے میں آخر کچھ تو وقت لگے گا پھر ایک دن آئے گا جب ہو سکتا ہے تم مجھے قائل کر لو یا میں تمہیں سمجھا پاؤں لیکن پہلے ہی دن، پہلے ہی مرحلے پر دھمکیاں دینے لگنا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"تم اسے دھمکی سمجھ رہے ہو دیپک؟" سنینا ایک مرتبہ پھر چلائی۔ "میں سنجیدہ ہوں دیپک اور یہ سنجیدگی کبھی ایک انچ ادھر سے اُدھر نہیں ہوگی۔ یاد رکھو کہ تم سنینا کو کبھی سمجھا نہیں پاؤ گے۔ ہاں، لیکن اگر تم میری بات آج، ابھی مان جاؤ تو... اور پلیز دیپک! مان جاؤ..... مان جاؤ دیپک! ہم ایک دوسرے کے بنا کبھی خوش نہیں رہ پائیں گے۔ پلیز دیپک!" وہ باقاعدہ منتیں کرنے لگی۔

"کیا دیپک دیپک لگا رکھی ہے؟ میرا نام دیپک نہیں ہے بے وقوف، سندیپ ہے۔ خود ہی فرض کر لیا۔" وہ بری طرح بھنا گیا۔

"تت... تم... "سنینا کا چہرہ متغیر ہوا۔

"ہاں، میں سندیپ رائے ہوں اور جہاں تک بات ہے شادی کی تو... تو۔" سندیپ کی آنکھوں سے غصہ جھلکنے لگا۔ "اگر تمہیں آج اور ابھی... فیصلہ سننا ہے تو سنو سنینا کہ میں تم سے کبھی شادی نہیں کروں گا اور تم بھی یہ بچپنا چھو....."

الفاظ دیپک کے منہ میں رہ گئے اور سنینا قدم قدم پیچھے ہٹنے لگی۔ دیپک نے ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ سنینا اس وقت کھائی کے بالکل کنارے پر پہنچ چکی تھی۔ سندیپ کے لیے سمجھنا مشکل تھا کہ وہ اپنے کنارے پر کھڑے ہونے سے واقف ہے یا نادانستگی میں وہاں تک پہنچی ہے۔ وہ "رکو" کہہ کر تیزی سے اس کی جانب آگے کو بڑھا بھی سہی لیکن سنینا اپنی غفلت کے کارن دیکھتے ہی دیکھتے گہری کھائی میں جا گری۔ اس کا منہ کھلا اور آنکھیں پھٹی ہوئی سی تھیں جس سے سندیپ کو یہی لگا کہ وہ بھی اپنے اچانک گر پڑنے سے یکسر غافل تھی۔

"سنینا... !" وہ بھاگ کر کنارے تک آیا۔ جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا، کیا وہ واقعی ہو چکا تھا۔ سنینا سچ مچ کھائی میں گر چکی تھی... نیچے.... ہزاروں فٹ گہری کھائی... سندیپ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے ذرا سا آگے بڑھ کر دیکھا۔ قریب پچاس ساٹھ فٹ نیچے سبزے والی جگہ پر سنینا کا پیلا آنچل دھیرے دھیرے نیچے جا رہا تھا اور اس آنچل کو دیکھ کر صرف سندیپ ہی یہ بات سمجھ سکتا تھا کہ اس آنچل کے ساتھ ایک جیتی جاگتی لڑکی بھی تھی جس نے ابھی ابھی خود کو موت کے حوالے کیا تھا... اور نہیں معلوم کہ اب وہ زندہ تھی یا... اور کیا وہ اس کی جان بچانے کے لیے کچھ کر سکتا تھا؟ سندیپ کے دماغ نے کچھ کچھ کام کرنا شروع کیا۔ وہاں سے کافی دور ایک ریسٹ ہاؤس تھا جہاں اسے ایسے لوگ مل سکتے تھے جو کسی بھی حادثے کی صورت میں کسی کے بھی کام آ سکتے تھے لیکن کیا اسے ان لوگوں کی مدد لینی چاہیے... کیا سنینا زندہ ہوگی؟ لیکن اگر وہ مر چکی ہوگی تو یہ امداد کرنے والے لوگ الٹا کیا حشر کریں گے... پھر پولیس، جیل، پھانسی... سنینا کے گھر والے... نہیں، نہیں... وہ تیز قدموں سے پیچھے ہٹنے لگا۔ سنینا کی اس سے دوستی سے ابھی کوئی واقف نہیں تھا۔ سنینا کے گھر والے اس تعلق سے ناواقف تھے۔ ... تو پہچانتا ہی کوئی نہ تھا... پھر ... یوں ایک شکار کے طور پر اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کر دے۔ نکل چلو سندیپ... ابھی کے ابھی... بنا کسی کی نظروں میں آئے، یہاں سے نکل بھاگو۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں اور منتشر دماغ کو یکجا کرتا وہاں سے نکلا اور اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

"بس یہی میرا قصور تھا الویرا کہ میں وہاں سے بھاگ آیا اور کسی سے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا۔ سنینا کے گھر والے یقیناً اسے ڈھونڈتے رہے تھے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، انہیں سنینا کی لاش آج تک نہیں ملی۔ ان کے نزدیک ان کی بیٹی لاپتا ہو چکی ہے۔ انہوں نے پولیس

میں رپورٹ درج کروا رکھی ہے لیکن پولیس بھی اب تک اسے ڈھونڈنے میں ناکام رہی ہے کیونکہ سنینا کی موت شہر سے دور ایک پہاڑی سے گر کر ہوئی اور اس کھائی تک اب تک کوئی بھی نہیں پہنچ پایا۔ وجہ یہی ہے کہ سوائے میرے کوئی اس بات سے واقف نہیں کہ اس روز سنینا کہاں گئی تھی۔''

''اوہ.... تو مطلب اس کی لاش اب بھی وہیں کھائی میں موجود ہے۔'' الویرا کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔

''ہوں.... یہی لگتا ہے۔'' سندیپ نے لب بھینچے۔

''پھر تو وہ اسی طرح آپ کو پریشان کرتی رہے گی۔'' الویرا کا لہجہ سرسراتا ہوا سا تھا۔

''یعنی....؟'' سندیپ کچھ سمجھا نہیں۔

''سنینا کا کریا کرم نہیں ہو پایا تو اس کی آتما کو شانتی کیسے مل سکتی ہے؟ اس کی آتما بھٹک رہی ہے تبھی وہ آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ جس دن اس کا انتم سنسکار ہو گیا، یہ واقعات ہونا بند ہو جائیں گے۔''

''آر یو شیور؟'' سندیپ کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔ اب سے پہلے اس نے واقعی ایسی بات نہ سوچی تھی۔

''جی، بالکل۔ آپ کو سنینا کی لاش کو ریکور کرانا ہوگا۔''

''لیکن اس طرح تو شک مجھ پر....'' اور سندیپ کو لگا اب سے دس ماہ پہلے جس مسئلے سے وہ جان چھڑوا کر بھاگا تھا، وہ ایک بار پھر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔ اس کا دماغ جامد ہونے لگا۔ کانوں میں پولیس کے سائرن بجتے سنائی دینے لگے۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم اس پر آرام سے سوچتے ہیں اور تسلی رکھیں سنینا کی موت میں واقعی آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ اپنی نادانی کی وجہ سے خود ہی موت کے منہ میں گئی ہے۔'' الویرا نے شاید تسلی دینے کے انداز میں کہا تھا لیکن سندیپ نے کچھ ایسی تشکر بھری نظروں سے الویرا کو دیکھا کہ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مم.... میں اب چلتی ہوں۔'' اس نے نظریں چرائیں۔

''الویرا! مجھے اس پرابلم سے نکلنے میں آپ کی مدد درکار ہے۔ پلیز، اس سب پر سوچیے گا ضرور۔'' وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور الویرا سر ہلا کر واپس پلٹ گئی۔

☆☆☆

دسویں روز دارجلنگ سے واپسی کے اس سفر میں سندیپ آج اکیلا نہ تھا۔ سوہن داس اور الویرا بھی اس کے ساتھ تھے اور یہ پلان بھی الویرا نے بنایا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے پتا جی کو یہ ساری حقیقت بتائی اور ان دونوں نے سندیپ کو اس مشکل سے نکالنے کے لیے یہ پلان بنایا کہ وہ سب مہمان بن کر سندیپ کے ہاں جائیں گے اور سندیپ انہیں پکنک کے بہانے اس جگہ لے جائے گا جہاں سنینا کھائی میں گری تھی۔ عین اسی جگہ پر الویرا اپنا موبائل کھائی میں گرا دے گی جسے لینے کے لیے سندیپ کھائی میں اترے گا اور سنینا کی لاش دیکھ کر شور مچا دے گا پھر پولیس کو کال کر کے بلایا جائے گا اور یہ سب ایک اتفاق دکھائی دے گا کہ چند سیاحوں کی نشاندہی پر ایک لاش کو ریکور کیا گیا۔ اس طرح سندیپ سمیت ان سب پر کسی کا شبہ نہیں جائے گا لیکن کیا ہمیشہ سب کچھ ویسا ہو پاتا ہے جیسا کہ انسان سوچتا ہے؟

☆☆☆

پکنک کا پروگرام اگلی ہی صبح رکھ دیا گیا۔ الویرا کا کہنا تھا کہ چند ایک دوسرے قریبی دوست بھی ساتھ لگا لیے جائیں تاکہ پورا ایک گروپ بن جائے لیکن سندیپ اس روز اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اس کی کسی اور کو بلانے کی ہمت ہی نہیں پڑی۔ ناچار وہ تین ہی کھانے پینے کا کچھ سامان ساتھ لیے وہاں آگئے جہاں سنینا کھائی سے نیچے گری تھی۔

''تم میری تصویر بناؤ سندیپ! میں پہاڑی کے کنارے تک جاتی ہوں پھر میں اپنا موبائل نیچے گرا دوں گی۔'' الویرا اس کے کان کے قریب سرگوشی کرتی پہاڑ کے کنارے کی طرف جانے لگی۔ سندیپ نے پورے دورانیے میں پہلی مرتبہ اپنے اندر کچھ توانائی سی ابھرتی محسوس کی۔ سنینا کی آتما اسے اتنا پریشان کر چکی تھی کہ اب اس آتما سے ہمیشہ کے لیے مکتی پانا نہایت ضروری ہو گیا تھا اور اب کچھ بھی کر کے اسے الویرا کی اس پلاننگ میں بھرپور طریقے سے اس کا ساتھ دینا تھا۔ سندیپ نے موبائل اوپن کر کے کیمرے پر کلک کیا۔ اسے اب الویرا کی تصویر بنانا تھی۔ پلاننگ یہ تھی کہ وہ کنارے پر کھڑی الویرا کی چند تصویریں اس طرح بنائے گا کہ اس کے ہاتھ میں پکڑا موبائل بھی صاف دکھائی دے تاکہ بعد میں جب پولیس کو واقعے کی تفصیل بتانا پڑے تو ثبوت کے طور پر یہ تصویریں بھی دکھا دی جائیں۔

''سندیپ! سنو، یہ دیکھو، میرے موبائل کو کیا ہو گیا ہے۔'' الویرا نے دور سے ہانک لگائی تو سندیپ نے چونک کر سر اٹھایا۔

''ہوں.... کیا ہوا؟''

”پتا نہیں، یہ میرا موبائل اسٹل ہوگیا ہے۔ ذرا ٹھیک کردو۔“ وہ وہیں کنارے پر ہی کھڑی تھی۔ ناچار سندیپ کو ہی اس تک جانا پڑ گیا اور سندیپ کو آگے کی طرف قدم بڑھاتے دیکھ کر الویرا کے لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ چمکی۔ ”تو قدرت نے یہ انتقام عین اسی جگہ تم سے لینا تھا دیپک...! تو آؤ... اور پاس آؤ... اور پاس...“ وہ اس کے قدموں کو گن رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ سندیپ نزدیک آیا۔

”آؤ نا... یہ دیکھو۔“ اس نے سندیپ کو اپنی سائڈ کی طرف بلایا اور سندیپ بالکل کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی سائڈ پر آن کھڑا ہوا۔ الویرا کا موبائل خراب نہیں ہوا تھا۔ یہ تو سندیپ کو پاس بلانے کا ایک بہانہ تھا۔ اب جب تک سندیپ کی نظر اس کے موبائل پر پڑتی اسے اسی بیچ اپنا کام کرنا تھا۔

”الویرا! یہاں آؤ بیٹا۔ ممی تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“ سوہن داس نے موبائل کان سے ہٹا کر پلٹ کر الویرا کو دیکھا۔ وہ اس وقت پہاڑی کے عین کنارے پر کھڑی سندیپ سے کچھ بات کر رہی تھی۔

”الویرا! یہاں آؤ۔“ سوہن داس نے اسے ایک بار پھر پکارا لیکن الویرا نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا جبکہ سندیپ نے ان کی آواز پر فوراً ہی اپنی توجہ ان کی جانب مبذول کی تھی۔

”الویرا!“ سوہن داس نے تیسری اونچی آواز دی لیکن الویرا نے اسے بھی اَن سنا کیا۔ اس کی توجہ کا محور صرف اور صرف سندیپ تھا... اور سندیپ کو موبائل پر جھکا دیکھ کر اس نے اپنا بازو غیر محسوس انداز میں اس کے شانے پر رکھا۔ ایک نظر پیچھے گہری کھائی کو دیکھا اور نچلا لب دانتوں میں دبا کر مسکرا کر اپنے ہاتھ کا دباؤ اس کے شانے پر بڑھایا۔

”سندیپ...! بچاؤ خود کو... یہ الویرا نہیں ہے... سندیپ... اسنینا...!“ سوہن داس نے چلا کر کہتے خود بھی ان دونوں کی طرف دوڑ لگا دی اور سندیپ کے لیے تو ان کا آدھا جملہ ہی بات کو سمجھنے کے لیے کافی تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے الویرا سے دور ہوا جس سے اس کا شانے پر پڑا ہاتھ پھسل کر دور ہوگیا اور سندیپ نے بھاگ کر خود کو گہری کھائی سے دور کیا۔ قدم قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے الویرا کو دیکھا جس کی آنکھوں میں وحشت اور جنون اترآیا تھا۔

”نہیں چھوڑوں گی... آج تمہیں ہرگز نہیں چھوڑوں گی دیپک!“ وہ دیوانہ وار وہاں سے دوڑی اور سوہن داس نے لپک کر سندیپ کا بازو تھاما اور پیچھے کی طرف دوڑ لگا دی۔ حتیٰ کہ دونوں پہاڑی اتر کر نیچے آ گئے اور کار میں جا بیٹھے۔

”الویرا؟“ سندیپ نے پریشانی سے سوہن داس کو دیکھا۔ وہ ان کی بیٹی تھی اور شاید خطرے میں تھی۔

”بھگوان اس کی رکھشا کرے... شاید سنینا کی روح اسے جلد ہی چھوڑ دے۔ تم دکھائی نہیں دو گے تو ہوسکتا ہے وہ بھی اس سے دور ہٹ جائے۔ میں نے اس لیے تمہیں اس کی نظروں سے اوجھل کیا۔“

”اب کیا ہوگا؟“ سندیپ نے ایک آہ بھری۔ انگلیاں آپس میں پھنسائے وہ سخت مایوس دکھائی دیتا تھا۔

”پریشان مت ہو۔ ہم کسی وقت اکیلے آئیں گے۔ الویرا کو ساتھ شامل کرنا ٹھیک نہیں۔ اسے تمہارے گھر ہی رہنے دیں گے اور اسے بتائیں گے بھی نہیں۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“ سندیپ کو یقین نہیں تھا کہ دوسرا کوئی حل بھی ہوسکتا ہے۔

”سندیپ! اب جو کچھ بھی کرنا ہے، ہم دونوں نے مل کر کرنا ہے اور الویرا کو اس کی بھنک بھی نہ پڑے۔ ہم بھول گئے تھے کہ سنینا کبھی بھی اس کے جسم میں داخل ہو کر اس کا روپ دھار سکتی ہے اور یہ ایک اچھا سائن نہیں ہے۔ الویرا کی اپنی زندگی خطرے میں پڑ رہی ہے۔“

”مجھے بھی یہی ڈر ہے سوہن جی کہ سنینا کہیں الویرا کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔“

”لیکن وہ ایسا کیوں کرے گی؟“

”شاید اس لیے کہ میرے دل میں الویرا کے لیے کچھ جذبات ہیں۔ ایک بات میں نے ابھی تک آپ کو نہیں بتائی اور جو میرے ذہن میں بھی بہت غور کرنے پر آئی ہے۔“ سندیپ نے جھجکتے ہوئے اب ایک دم نہایت فکرمند نظر آتا تھا۔ سوہن داس تو آدھی بات سن کر ہی پریشان ہوگئے اور پھر بنا سندیپ کو سنے عجلت میں کار سے باہر نکل گئے۔ سندیپ سچ کہتا تھا۔ ان کی اپنی بیٹی کی جان کو خطرہ لاحق تھا۔ ایک آتما انتقام کی آگ میں کیا، کیا نہیں کرسکتی۔ وہ پریشان حال سے واپس اوپر پہاڑی پر آئے تو الویرا کو ایک بڑے پتھر پر بیٹھے گہرے گہرے سانس لیتے دیکھا۔

”الویرا!“ انہوں نے بہت جھجک کر ہولے سے پکارا لیکن الویرا تڑپ کر اٹھی اور اپنے پاپا کے گلے لگ گئی۔

”پاپا! مجھے کیا ہوا تھا... پاپا! وہ سندیپ سر کیسے ہیں... میں نے کچھ کیا تو نہیں؟“ وہ ایک دم گھبرائی ہوئی

دکھائی دیتی تھی۔ سوہن داس کو یقین ہوگیا کہ سنینا اب وہاں کہیں نہیں تھی اور سامنے کھڑی لڑکی صرف اور صرف ان کی الویرا تھی۔

''ہاں بیٹا! سب ٹھیک ہے۔ چلو یہاں سے چلتے ہیں۔'' وہ الویرا کا ہاتھ پکڑے تیزی سے پہاڑی سے اتر گئے۔ انہیں اب جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔ حالانکہ وہ بھی یہ بات جانتے تھے کہ سنینا حدود و قیود سے آزاد تھی اور کہیں بھی، کبھی بھی آن وارد ہوتی تھی لیکن فی الوقت ان کے لیے یہی بہت تھا کہ ان کی بچی بالکل ٹھیک تھی اور انہوں نے کسی بھی قیمت پر اسے دوبارہ اس مشکل میں نہیں ڈالنا تھا۔ دونوں کار کے نزدیک آئے تو سندیپ انہی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً کار اسٹارٹ کی اور ان دونوں کو لیے اپنے گھر واپس آ گیا۔ سندیپ کے ممی، پاپا ان سب باتوں سے بے خبر تھے۔ الویرا نے راستے میں انہیں بتایا کہ پہاڑی کے کنارے کی طرف جانا تو اسے یاد ہے لیکن بیچ کا بہت سارا وقت وہ پھر بھول گئی کہ کیا ہوا اور جس وقت وہ اپنے آپے میں واپس آئی تو اس نے اپنے پاپا اور سندیپ کو بھاگ کر دور جاتے دیکھا۔ اسے تبھی شک گزرا کہ درمیان میں ضرور پھر کچھ ہوا تھا۔

☆☆☆

''آپ اس وقت کیا کہہ رہے تھے سندیپ بابو؟'' سوہن داس نے سندیپ کو اکیلے بیٹھے دیکھا تو اس کی طرف چلے آئے۔

''جی...'' سندیپ نے فوراً ہی جان لیا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ سندیپ نے سوچنے کے بعد الفاظ کا چناؤ کیا۔

''سنینا کی موت کے بعد دس ماہ کا عرصہ میں نے بڑا کٹھن گزارا ہے۔ ہر وقت مجھے پچھتاوؤں کا سامنا تھا۔ کبھی سوچتا کاش، سنینا کی بات مان لیتا، کبھی سوچتا سنینا سے نزدیکیاں بڑھانا میری بہت بڑی غلطی تھی۔ حتیٰ کہ یہ بھی سوچتا کہ آخر میں نے سنینا سے دوستی کی ہی کیوں؟ لیکن خیر، وہ سب اپنی جگہ..... آنے والے وقت میں جو کچھ میرے ساتھ پیش آنے لگا، وہ مجھے پہلے پہل تو سوائے ڈپریشن کے کچھ نہیں لگا لیکن کانوں میں سنائی دیتی دلدوز چیخیں مجھے سوچنے پر مجبور کرتیں کہ ہو نہ ہو سنینا یہیں کہیں آس پاس ہی ہے۔ وہ چیخیں ہرگز میرا وہم نہیں ہو سکتیں لیکن بہرحال سنینا نے اس سے زیادہ نقصان مجھے کبھی نہیں پہنچایا۔ نہ ہی مجھے پریشان کرنے کے لیے اس نے کبھی کسی باڈی کا سہارا لیا اور ایسا اس وقت پہلی بار ہوا جب دس ماہ کی مدت میں پہلی بار میں نے کسی لڑکی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ سنینا کے بعد کا وقت نہایت پریشانی میں گزر رہا تھا اور یہ سنینا بھی دیکھ رہی تھی۔ البتہ میری توجہ کا کسی اور سمت میں پلٹنا سنینا سے برداشت نہیں ہوا۔ پہلی ملاقات میں ہی وہ پہلی نظر جو میں نے الویرا پر ڈالی، وہیں سے سنینا نے اپنے انتقام کو ایک نئی شکل میں ڈھالا۔ اس نے اسی وقت الویرا کے جسم میں داخل ہوکر اس کی جگہ لے لی۔ مجھے یاد ہے جب میں نے الویرا کو پرپوز کیا تو وہ سنینا کے لیے نہایت شاکنگ ثابت ہوا تھا۔ میں نے اس سے شادی سے انکار کیا تھا اور اب میں ایک دوسری لڑکی کو خود پرپوز کر رہا تھا۔ تبھی سنینا کے انتقام کی آگ کچھ اور شدت سے بھڑکی اور اس نے مجھے جان سے مارنے کا ارادہ کیا۔''

''تو اب... اب کیا ہوگا سندیپ بابو؟'' سوہن داس صحیح معنوں میں مضطرب دکھائی دے رہے تھے۔

''پریشان نہ ہوں سوہن جی! ہمارے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے کہ سنینا مر چکی ہے۔ وہ ایک آتما ہے اور آخر کب تک کوئی آتما کسی زندہ انسان کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ یہ دنیا اس کی ہے ہی نہیں..... اور الویرا کی بات سچ ہے کہ اس کو مکتی چاہیے اس لیے ہمیں جلد ہی کچھ کرنا ہوگا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔'' سندیپ بات مکمل کرکے خود بھی سوچ میں پڑ گیا۔

''ہوں۔'' سوہن داس نے طویل تبصرے سے اس لمحے اجتناب کیا۔ نہ جانے سندیپ کی بات تھی کہ انہیں بجائے اطمینان کے مزید بے چینی سی محسوس ہوئی۔ سندیپ کا یہ کہنا کہ سنینا مر چکی ہے، انہیں بری طرح کھٹک گیا تھا۔ دل میں ایک خوف بھرا خیال ابھرا کہ سندیپ کو اب کوئی بھی جملہ بنا سوچے نہیں بولنا چاہیے کیونکہ اگر یہ ایک حقیقت ہے کہ سنینا زندہ انسان نہیں اور ایک آتما ہے تو وہ اس لمحے بھی ان پر نظر رکھے ہوئے ہو سکتی ہے اور پھر تو ظاہر ہے کہ وہ ان کے اگلے پلان سے بھی آگاہ ہو سکتی تھی۔ سوہن داس نے دل میں پیدا ہوتے ایک نئے منصوبے کو اس لمحے اپنی ذات تک ہی محدود رکھا۔ وہ اس نئے خیال سے سندیپ کو بھی بے خبر رکھنا چاہتے تھے کیونکہ جانتے تھے سنینا کی آتما ہمہ وقت سندیپ اور الویرا پر اپنی نظریں گاڑے ہوئے ہے۔

☆☆☆

''کیا بات ہے بھئی، بڑی خاموشی ہے گھر میں۔'' سوہن داس برآمدے میں نکلے تو سندیپ ایک کرسی پر جھولتا

دکھائی دیا۔ بیک گراؤنڈ میں چڑیوں کی چہچہاہٹ اور ہوا کی پُراسرار غوں غوں تھی۔ سندیپ مسکرا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''جی۔ آپ صحیح سمجھے۔ گھر پر ہمارے اور آپ کے سوا کوئی نہیں۔ میرے ممی پاپا رات ایک فیملی فنکشن میں گئے تھے۔ رات وہیں رہنا تھا انہوں نے۔ ابھی واپسی نہیں ہوئی ان کی۔''

''او، اچھا۔ میں بھی ویسے باہر نکلنے کی سوچ رہا ہوں۔''

''اچھا...... کہاں...... اور اکیلے؟'' سندیپ اشتیاق سے پوچھنے لگا۔ ''موسم کچھ خراب نہیں لگ رہا؟''

''ہاں، بس نزدیکی بازار تک، یونہی گھومنے پھرنے...... اور موسم......'' انہوں نے بات کرتے ہوئے باہر آسمان کی طرف دیکھا۔ ''کیا لگتا ہے، کسی طوفان کی آمد ہے؟''

''جی بالکل۔ آندھی کے آثار ہیں لیکن ہوسکتا ہے، ہلکی ہوا دیر تک اسی رفتار سے چلتی رہے۔''

''چلو، تو پھر موسم کا لطف لیتے ہیں۔'' وہ مسکرا دیے۔

''جی، جی ضرور۔ یہاں سے پیدل کا راستہ ہے بازار تک۔ الویرا نہیں جائے گی ساتھ؟''

''وہ تو آرام کر رہی ہے۔ میں نے ڈسٹرب نہیں کیا۔''

''اچھا تو سوہن جی......! پھر وہ ہمارا اگلا پلان؟'' سندیپ نے کچھ جھجک کر یاد دلایا کہ ظاہر ہے وہ کوئی اگنور کرنے والی بات نہ تھی۔

''آں...... فی الحال نہیں۔ الویرا جاگ جائے پھر آرام سے کچھ سوچیں گے۔ جلدی کی کوئی ضرورت نہیں۔'' سوہن داس نے بہت سنبھل کر، بہت عام انداز میں جواب دیا اور دراصل یہ جواب سندیپ کے لیے نہیں بلکہ سنینا کے لیے تھا کہ اگر وہ ان کے آس پاس کہیں ہے تو وہ بھی سن لے کہ فی الحال وہ کچھ بھی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ سندیپ کو اگرچہ سن کر مایوسی ہوئی۔ اسے کچھ ایسا لگا جیسے سوہن داس جی اس معاملے سے پیچھے ہٹ رہے ہوں لیکن وہ خاموش رہا اور سوہن داس جی گھر سے باہر نکل گئے اور یہ وہی جانتے تھے کہ ان کا اس وقت یہاں سے بنا کچھ بتائے نکل جانا کتنا ضروری تھا۔ سندیپ کے گھر سے نکل کر ان کا رخ سیدھے اس پہاڑی کی جانب ہوگیا جہاں سے پچھلے روز وہ بنا مقصد پورا کیے واپس لوٹنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

☆☆☆

الویرا کی آنکھ آوازوں کے شور سے کھلی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ اس وقت کولکتہ میں سندیپ کے گھر پر تھی۔ پچھلے روز ان سب کے ساتھ بہت کچھ پیش آیا تھا اور اس وقت یہ شور...... جیسے ایک ساتھ کئی چیزوں کو پٹخا جا رہا ہو۔ وہ اٹھ کر کھڑکی میں آئی، پردے سرکائے اور منہ سے بے ساختہ ''او'' نکل گیا۔ باہر شدید آندھی تھی۔ موسم انتہا کا گمبھیر ہوگیا تھا۔ دن کو مانو شام کا ماحول بن گیا ہو اور وہ شور، ہوا سے بجتی کسی ٹین کی چھت کا تھا۔ شاید آس پاس کوئی گیراج نما جگہ تھی۔ وہ بال لپیٹ کر، شال اوڑھتے ہوئے باہر کوریڈور میں نکل آئی جہاں سامنے سے سندیپ آتا دکھائی دیا۔

''ہائے...... گڈ مارننگ!'' سندیپ اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرا دیا۔ بھلے سے یہ بات کچھ دن پہلے اس پر آشکار ہوچکی تھی کہ الویرا اس کے لیے کسی قسم کے خاص جذبات نہیں رکھتی لیکن سندیپ نے دارجلنگ کی صبحیں اور شامیں اسے الویرا سمجھتے اور اسے الویرا سمجھ کر پیار کرتے ہی گزاری تھیں۔ الویرا کو دیکھ کر اس کا دل اب بھی بالکل اسی خوبصورت احساس سے اس کی جانب ہمکتا تھا۔

''گڈ مارننگ!'' وہ ہلکا سا جھک کر مسکرائی۔

''شاید موسم نے آپ کی نیند میں خلل ڈالا ہے؟''

''جی، میری آنکھ شور سے کھلی ہے لیکن میرا خیال ہے ٹائم کافی ہوگیا ہے۔ مجھے کسی نے جگایا ہی نہیں۔''

''جی، وہ سوہن انکل کچھ دیر پہلے باہر نکلے ہیں۔''

''اچھا...... کہاں...... اس موسم میں؟'' الویرا ایک دم پریشان ہوگئی۔

''میں نے منع تو کیا تھا انہیں۔ آپ کال کرلیں۔''

''جی، میں پوچھتی ہوں۔'' الویرا اسی پریشانی سے واپس کمرے میں پلٹ گئی۔ موبائل پر بات کرلینے سے تسلی ہوجاتی۔ ادھر سندیپ، الویرا کے ناشتے کی خاطر کچن میں چلا گیا۔ ناشتا صبح ان کا کُک ہی تیار کرکے گیا تھا۔ اس نے دو کپ چائے چولہے پر چڑھائی اور فرائنگ پین گرم کرنے رکھا جب باہر سے الویرا کی چیخ سنائی دی۔ سندیپ نے فوراً دونوں چولہے بند کیے اور باہر بھاگا لیکن ابھی کچن کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ ایک دم اندھیرا ہوگیا۔ لائٹ بھی چلی گئی تھی۔ ہوا کا شور باہر ویسے کا ویسا تھا بلکہ شاید کچھ اور بڑھا تھا۔ وہ کوریڈور میں آیا تو یہاں بھی تاریکی تھی۔

''الویرا......!'' وہ پکارتا ہوا اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔

''سندیپ......! سندیپ......!'' الویرا کی چیختی ہوئی آواز اس کے کمرے سے آرہی تھی، ساتھ ہی دروازہ بھی

زور زور سے بجانے کی آواز سنائی دی۔

"کیا ہوا الویرا...... باہر آؤ۔" اس نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ بند تھا۔ "الویرا دروازہ کھولو۔"

"نہیں کھل رہا...... پلیز، کچھ کریں۔" وہ برابر دروازے کا لاک گھما رہی تھی۔

"ہوا کیا ہے؟" سندیپ نے چلّا کر پوچھا۔

"کک...... کوئی ہے...... یہاں اندر کوئی ہے۔"

الویرا کی گھٹی گھٹی آواز میں بلا کا خوف تھا۔ سندیپ کے اوسان خطا ہوگئے۔ فوراً بھاگ کر لاؤنج میں آیا۔ سیڑھیوں کے نیچے دیوار پر کی باکس لگا تھا۔ اس نے کھول کر فوراً ایک چابی اتاری اور دروازے کے باہر آ کر اس کا لاک اوپن کیا اور دروازے کو کھولا تو الویرا اس کے سینے سے آ لگی۔ تیز تیز سانسیں، ہانپتا وجود۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ سندیپ سے خود سے لپٹائے باہر نکل آیا۔ لاؤنج میں آیا تو الویرا کسی حد تک اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے ماتھا اپنے ہاتھوں پر گرا لیا۔

"کیا ہوا تھا الویرا...... کون تھا اندر؟" وہ اس کے قریب بیٹھ کر نرمی سے پوچھنے لگا۔

"پتا نہیں...... پر کوئی مجھے پیچھے سے کھینچ رہا تھا۔ کھڑکی کا شیشہ بھی اپنے آپ کھل گیا تھا۔ میں جیسے ہوا کے زور سے کھڑکی کی طرف کھنچ رہی تھی...... یوں لگ رہا تھا یہ تیز ہوا مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور ابھی میں اڑ کر کھڑکی کے پار جا گروں گی۔ میں نے دروازے کا ہینڈل کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ بھی جام ہوگیا تھا پھر تو جیسے کسی نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے کھڑکی کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ کوئی تھا وہاں...... سندیپ جی...... کوئی اَن دیکھا سا...... کوئی......" اس نے اندر کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے خوف بھری نظروں سے سندیپ کو دیکھا اور ایک بار پھر رو پڑی۔ سندیپ نے ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور وہ ایک بار پھر اس کے سینے میں آ چھپی۔ وہ حد سے زیادہ ڈری ہوئی تھی۔ سندیپ کی فکر دوچند ہوگئی۔ اس نے اندھیرے میں ڈوبے طویل کوریڈور کو دیکھا۔ یہ آخر سینا کا کون سا نیا پینترا تھا۔ الویرا کے جسم کا استعمال کر کے اب وہ الویرا کی جان کی دشمن کیوں بن گئی تھی۔ موبائل کی گھنٹی نے ان دونوں کی توجہ حاصل کی تو دونوں ایک دم ایک دوسرے سے دور ہوئے۔ الویرا کا موبائل تو ابھی تک کمرے میں ہی تھا۔ سندیپ کے موبائل پر سوہن داس کی کال آ رہی تھی۔

"جی انکل!" سندیپ نے موبائل کان سے لگایا۔

اب وہ سوہن جی کے بجائے ان کو سوہن انکل کہنے لگا تھا۔

"سندیپ بیٹا! میں پولیس اسٹیشن میں ہوں۔ کیا آپ یہاں آسکتے ہیں؟"

"پولیس اسٹیشن......!" اس نے الجھ کر الویرا کو دیکھا لیکن پھر انکل کی جانب متوجہ ہوا۔ "خیریت انکل...... وہاں کیسے؟"

"وہ بیٹا! میں صبح واک کرتے کرتے پہاڑی تک چلا گیا تھا لیکن میرا موبائل نیچے کھائی میں گرا تو مجھے کھائی میں اترنا پڑا۔ وہاں مجھے کچھ عجیب چیزیں دکھائی دیں۔ ایک لڑکی کا پرس، پاس کچھ بوسیدہ ہڈیاں...... تو میں نے کال کر کے وہیں پر پولیس کو بلا لیا تھا۔ وہاں سے ایک لڑکی کا ڈھانچا ملا ہے۔ میں پولیس اسٹیشن میں ہوں۔ یہ لوگ میرے حوالے سے کچھ جاننا چاہتے ہیں۔"

"جج...... جی...... میں آتا ہوں۔" اس نے کال آف کر کے جلدی سے ساری سچویشن الویرا کو بتائی۔ سوہن انکل نے اکیلے ہی اکیلے وہ معاملہ نمٹا لیا تھا۔ سندیپ بہت حیرت زدہ تھا کہ صبح گھر سے نکلتے ہوئے سوہن انکل نے کوئی اشارہ تک نہیں دیا تھا۔

"ہمیں پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا، ابھی۔"

"لیکن میں......" وہ پیچھے پیچھے دوڑی۔

"میں تمہیں یہاں اکیلے نہیں چھوڑ سکتا۔ فی الحال یوں سمجھو الویرا کہ سب کچھ میسڈ اپ ہے۔ تم میرے ساتھ ہی رہو۔"

"ہاں، میں چل رہی ہوں۔" اس نے اپنا کلچ اور موبائل لیا اور دونوں تھوڑی ہی دیر میں پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ سندیپ اور سوہن داس نے معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہاں کسی تفصیل میں جانا ممکن نہیں تھا۔ بس اتنا پتا تھا کہ بہت سنبھل کر چلنا ہے۔

"یہ کون ہیں آپ کے؟" انسپکٹر نوین نے بہت غور سے سندیپ کو دیکھا۔

"جی یہ ہمارے بزنس پارٹنر ہیں۔ دوارس دار جلنگ سے آئے ہیں۔ یہ ان کی بیٹی ہے الویرا۔ ابھی دو روز پہلے ہی آنا ہوا۔"

"تو یہ ادھر پہاڑی پر کیا کرنے گئے تھے، اتنی صبح صبح، وہ بھی اکیلے؟"

"جی مارننگ واک کی عادت ہے اور فوٹوگرافی کے بھی شوقین ہیں۔ مجھے بتا کر ہی نکلے تھے۔ میں نے بس موسم کی خرابی سے ہوشیار کیا تھا لیکن وہ اس موسم کو بھی انجوائے کرنا چاہتے تھے۔" سندیپ نے سانس تک روک کر خود کو پُراعتماد ثابت کرتے ایک بیان دیا۔ دل میں ڈر بھی بہت شدت کا

ابھرا کہ نہ جانے سوہن انکل اپنے متعلق کیا کہہ چکے ہیں۔
"ہوں ..... آئندہ مہمان کو کہیں بھی بھیجتے وقت احتیاط سے کام لیں۔ بہر حال ان کی بدولت ہمیں ایک بہت پرانے کیس میں مدد مل گئی ہے۔ ہم نے لڑکی کے گھر والوں کو بلا بھیجا ہے۔ سنینا گوئل کی گمشدگی کی رپورٹ قریب ایک سال پہلے درج کرائی گئی تھی۔ لاش کے نزدیک یہ بوسیدہ پرس ملا ہے اور یہ موبائل ......" انسپکٹر نوین نے موبائل کہا تو سندیپ کی سانس تک وہیں رک گئی۔ سنینا کے گھر والوں کی آمد کا سن کر اسے پریشانی نہیں ہوئی کیونکہ وہ کبھی ان کے سامنے نہیں آیا تھا لیکن سنینا کا موبائل.....

"لیکن اس سے کوئی بھی ہیلپ ملنا تقریباً ناممکن ہے۔ موسم کے وار سہتے سہتے یہ بالکل ہی ناکارہ ہو چکا ہے۔ مشینری سو فیصد تباہ ہو چکی ہے۔" انہوں نے بدرنگ بوسیدہ موبائل کو دور پھینکا تو سندیپ کی اٹکی سانسیں بحال ہونے لگیں۔

قریب تیس چالیس منٹ میں سنینا کے گھر والے وہاں آپہنچے۔ ایک سنینا کا باپ تھا ایک بھائی۔ ان کو نہایت دکھی دل سے سنینا کی موت کی خبر اور اس کا سامان دیا گیا۔ سنینا کی ڈیڈ باڈی اسپتال پہنچائی گئی، وہیں سے اسے گھر لے جانا تھا۔ قریب ایک گھنٹا مزید اس سب پروسیس میں خرچ ہوا اور سوہن داس، سندیپ اور الویرا کو واقعے میں کسی طور ملوث نہ پاتے ہوئے گھر بھیج دیا گیا۔

☆☆☆

"ہمیں آپ کی بیٹی بہت پسند آئی ہے بھائی صاحب! آپ کی آگیا ہو تو سندیپ کے پاپا اور میں خود دوارس آئیں گے بٹیا کا ہاتھ مانگنے۔" سندیپ کی ممی نے سوہن داس جی کے سامنے نہایت سبھاؤ سے سندیپ کا پروپوزل رکھا۔ سندیپ کے پتا جی بھی وہیں بیٹھے تھے۔ سندیپ نے ہی انہیں اپنی پسند سے آگاہ کیا تھا۔ یہ بات سنینا کی ڈیڈ باڈی ریکور ہونے والی شام کی تھی۔ اگلی صبح سوہن داس اور الویرا نے دوارس کے لیے روانہ ہونا تھا۔ سندیپ نے اپنے ممی پاپا کو بھی ان کے یہاں آنے کی ساری حقیقت بتا دی تھی۔ اس کی ممی کا انداز الویرا کے ساتھ نہایت معذرت خواہانہ تھا۔ جو کچھ ان کے بیٹے کے ہاتھوں سرزد ہوا تھا، وہ ان کے لیے شاکنگ تو تھا ہی، باعثِ شرمندگی بھی بہت تھا لیکن وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ سوہن داس اور الویرا پرانی باتوں کو بھول کر ان کے سندیپ کو قبول کر لیں پھر سندیپ نے پورے خلوص سے الویرا کو اپنانے کی اچھا ظاہر کی تھی البتہ الویرا کے خیالات کی طرف سے اسے خاصی مایوسی تھی۔ دوارس میں بتائے دنوں کی کوئی پرچھائیں الویرا کے چہرے سے عیاں نہ ہوتی تھی اور ہو بھی کیسے سکتی تھی۔ سنینا نے الویرا کی زندگی کے کئی حسین پل خود چرا لیے تھے۔ یہ بھی شاید سندیپ کے کیے کی سزا تھی۔ اسے الویرا کا دل اب نئے سرے سے جیتنا تھا۔

"بھابی جی! میرے لیے الویرا کی خوشی اور مرضی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اگر اسے کوئی اعتراض نہیں تو میری مکمل رضامندی سمجھیں۔"

"یہ بچے کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔ سندیپ کہیں گیا ہوا ہے کیا؟" مسز اپرنا نے امیش رائے جی کی طرف سوالیہ دیکھا۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ صبح کے آندھی طوفان کا پرتو ابھی تک ماحول میں رچا بسا دکھائی دیتا تھا۔ تھوڑی دیر میں شام گہری کالی ہونے والی تھی۔ الویرا اور سندیپ دونوں دکھائی نہ دیتے تھے۔ مسز اپرنا اٹھنے ہی لگی تھیں کہ چیخ کی آواز پر بے ساختہ سر اوپر کو اٹھایا۔ چیخنے کی آواز اوپر چھت سے آئی تھی۔

"الویرا.....!" وہ دکھائی دیتے منظر پر پوری شدت سے چلائیں تو سوہن داس اور امیش جی نے بھی اوپر دیکھا۔ حیرت اور خوف سے سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ الویرا چھت کے عین کنارے پر ریلنگ کے اوپر چڑھی کھڑی تھی۔

"کیا سمجھے تم لوگ ..... مکتی حاصل کر لو گے مجھ سے ..... چھپا لو گے اپنے بیٹے کا گناہ؟" الویرا ایک انجان لب و لہجے میں پوری طاقت لگا کر بولی تو سب نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ سنینا ان کی زندگی سے نہیں گئی تھی۔ اس کی باڈی ریکور ہونے کے بعد بھی وہ ..... سوہن داس جی کی حالت اپنی بیٹی کی زندگی خطرے میں دیکھ کر غیر ہونے لگی۔

"جی، کچھ کریں۔ الویرا نیچے گر جائے گی ..... وہ..... وہ اپنے آپ میں نہیں ہے ..... م..... میں جاتا ہوں۔" انہوں نے بنا سوچے اندر کی طرف دوڑ لگا دی۔ انہیں اپنی بیٹی کو بچانے جانا تھا جبکہ اپرنا اور امیش جی ساکن کھڑے الویرا کو دیکھ رہے تھے۔

"تمہارے بیٹے نے میری زندگی برباد کر دی۔ میرا جیون، میرے سپنے، سب خاک میں ملا دیے۔ میں اسے کبھی خوش نہیں رہنے دوں گی۔ میں اس کی محبت کو تمہاری آنکھوں کے سامنے مار دوں گی۔ دیکھنا چاہتے ہو..... دیکھنا چاہتے ہو.....؟" وہ زور زور سے چلا رہی تھی جب اچانک اس کی

پشت پر سندیپ نمودار ہوا۔ وہ ریلنگ کے قریب آیا۔ شاید وہ نہایت آہستگی سے وہاں پہنچا تھا۔ سندیپ کے ممی پاپا دم سادھے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے وہ سنینا سے کس طرح ہینڈل کرنے والا تھا۔

''سنینا... تت... تم... ایسا کچھ نہیں کروگی۔''

سندیپ نے اپنا ہاتھ سنبھالنے کے انداز میں آگے کر رکھا تھا لیکن مزید آگے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ سنینا اسے اتنے قریب پاکر کوئی بھی فیصلہ جلد بازی میں انجام دے سکتی تھی اور اسے ہر حال میں الویرا کی جان بچانا تھی۔

''مم... میرا مطلب ہے، اس کا کوئی قصور نہیں... سب میری غلطی ہے۔''

''ہاں، سب تمہاری غلطی ہے۔'' وہ وہیں کھڑی پھر چلائی۔ ''اور تمہیں اس کی بہت بھیانک سزا ملے گی۔ تم پیار کو ترسو گے سندیپ بابو...! تمہیں محبت کی خوشی کبھی حاصل نہیں ہونے دوں گی۔''

''آئی نو... آئی نو...'' وہ ہاتھ آگے کو بڑھا کر ایک دم انتہائی کیفیت میں کھڑا تھا۔ نظریں الویرا کے قدموں پر تھیں جو نہ جانے کس لمحے سنینا کی سرکشی کے ہاتھوں زندگی سے موت کی طرف بڑھ سکتے تھے۔

''میں الویرا سے شادی نہیں کروں گا۔ میں کبھی کسی سے شادی نہیں کروں گا۔ تت... تم اس بے قصور لڑکی کو چھوڑ دو... پیچھے ہٹ جاؤ سنینا...! تم میرے بدن میں آجاؤ... جو بھی برا سلوک کرنا ہے، میرے ساتھ کرو... میں ہر سزا بھگتنے کے لیے حاضر ہوں... سنینا ایک بار نیچے اترو...''

''تم تیار ہو سزا کے لیے؟'' سنینا کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ عجیب بے یقین نظروں سے سندیپ کو دیکھ رہی تھی۔

''ہاں... ہاں، میں تیار ہوں۔'' سندیپ نے بنا جھجکے فوراً ہامی بھری اور ادھر اپرنا اور امیش رائے نے بے ساختہ ہاتھ اپنے منہ پر رکھا۔ سنینا نے اپنے قدم نیچے چھت کی طرف بڑھا دیے تھے۔ الویرا ریلنگ سے اتر گئی تھی۔ سنینا کی توجہ کا مکمل مرکز سندیپ کی ذات ہو چکی تھی۔ اس نے الویرا کے بدن کو چھوڑ دیا تھا۔ الویرا حیرت سے چاروں جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ چھت پر کب اور کیوں آگئی تھی؟ سامنے سندیپ کھڑا تھا، نیچے انکل اور آنٹی... شام کے گہرے سائے ہر جانب پھیل چکے تھے۔ وہ حیرت سے اس سارے ماحول کو دیکھ رہی تھی جب اچانک سندیپ نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا۔

''آخر میں نے تمہیں پھنسا ہی لیا... ہاہاہاہا...'' وہ خود ہی ہنسے جا رہا تھا۔ ''سندیپ! تم نے بالآخر ہار مان لی... اب تم نہیں بچو گے... تم آج اپنے ہی ہاتھوں اپنی جان لوگے۔ سندیپ! جس طرح اس دن تم میری بے بسی کا تماشا کھڑے دیکھتے رہے تھے، آج تم بالکل اسی طرح خود کو موت کے حوالے کروگے۔'' سنینا، سندیپ کے جسم میں داخل ہو کر اپنے من کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ سندیپ کے قدم بھی رفتہ رفتہ چھت کے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سنینا اس کے جسم میں داخل ہو کر اسے موت کی طرف دھکا دے رہی تھی۔ سندیپ اپنی حالت سے بے خبر اس وقت صرف وہی کچھ کرنے پر مجبور تھا جو اس سے سنینا کروا رہی تھی۔ بھلے کچھ دیر پہلے اس نے خود یہ بھاؤ سنینا کو دیا تھا کہ وہ اس کے بدن میں داخل ہو جائے لیکن اب جبکہ سنینا اس کے وجود پر قابض ہو چکی تھی، وہ ہرگز نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ سنینا نے سندیپ کو چھت کے بالکل کنارے پر لا کھڑا کیا تھا اور وہ کسی معمول کی طرح اس وقت عین چھت کے کونے پر کھڑا مسکرا کر نیچے دیکھ رہا تھا۔

''میں آرہا ہوں سنینا...! بہت جلد میں تمہارے پاس آرہا ہوں پھر ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے...'' اس نے اپنا ایک پاؤں فضا میں باہر نکالا تو اس کی ممی کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ سندیپ، الویرا کو بچانے کی قیمت یوں ادا کر رہا تھا۔ سنینا اس کی جان کے درپے ہو گئی تھی۔ امیش رائے اور ان کی مسز ہاتھ لہراتے رہ گئے اور سندیپ نے اپنا دوسرا پاؤں بھی آگے بڑھا دیا۔ اپرنا جی نے بے ساختہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ فضا میں سندیپ کی ایک زوردار چیخ بلند ہوئی اور الویرا نے آگے بڑھ کر تڑپتے ہوئے سندیپ کی شرٹ کے کالر کو اپنے ہاتھوں میں یوں پکڑا کہ سندیپ کا رخ بھی چھت کی طرف ہو گیا اور وہ ریلنگ کے ساتھ لٹک سا گیا۔

''نہیں... نہیں... مجھے مت جلاؤ... مجھے مکتی نہیں چاہیے... مجھے مت جلاؤ...'' سنینا اچانک بہت بری طرح چلانے لگی۔ سندیپ کے حلق سے سنینا کی آواز نکل رہی تھی۔ سندیپ کا جسم شرٹ کو چھوڑ کر نیچے گرنے والا تھا جب اچانک ہی سندیپ نے خود ریلنگ کے جنگلے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اتنی دیر میں سوہن داس بھی اوپر چھت پر آپہنچے تھے۔

''باز دو مجھے دو سندیپ...! میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔''

''جی انکل......!'' سندیپ نے اوپر اٹھنے کی کوشش کی لیکن یہ بہت مشکل تھا۔ تبھی نیچے کھڑے اس کے ممی پاپا بھی ایک دم ہوش میں آئے۔ ان کے بیٹے کی جان بچ سکتی تھی۔ سنینا اس کے جسم کو چھوڑ چکی تھی۔ انہوں نے لان کے کونے میں رکھی لکڑی کی سیڑھی اٹھا کر ریلنگ کے ساتھ لگائی تو سندیپ اپنے قدم اس پر رکھتا مکمل اپنے حواسوں میں آگیا۔ اب وہ سیڑھی پر اپنے قدم جمائے کھڑا تھا۔ کچھ دیر رک کر اپنی سانس بحال کی اور پھر سیڑھی سے اتر کر نیچے لان میں آگیا۔ الویرا اور سوہن داس بھی دوسری سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے لان میں آگئے۔

''اندر چلو سندیپ......! وہ سنینا...... وہ پھر آجائے گی۔'' اپرنا جی نے بیٹے کا ہاتھ تھام کر اندر کھینچا تو سندیپ نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑوایا۔

''اب وہ کبھی نہیں آئے گی ماں!''

''یہ کیسے بھلا......؟ وہ بہت خطرناک ہے۔'' وہ کچھ سمجھنے کو تیار نہ تھیں۔

''ارے نہیں ممی! شاید سنینا کا کریا کرم ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب عین اسی وقت ادھر اس کے گھر میں اس کی آخری رسوم چل رہی تھیں۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میرا جان سے جانا لازمی تھا لیکن بھگوان کو یہ منظور نہیں تھا۔ تبھی میں اپنے ہوش و حواس میں واپس آگیا کیونکہ سنینا کی روح اپنے آپ میرے بدن سے نکل گئی تھی۔''

''لیکن تم نے اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈالا سندیپ؟'' سوہن داس حیرت سے سوال کر رہے تھے۔

''کیونکہ میں الویرا کو کچھ ہونے نہیں دے سکتا تھا۔ آپ میرے ہاں مہمان ہیں سوہن جی!''

''تمہاری یہی اچھائی تمہارے کام آئی ہے سندیپ! ورنہ سنینا کے عزائم واقعی بہت خطرناک تھے۔''

''مجھ میں کوئی اچھائی نہیں ہے سوہن انکل!'' وہ اپنا بازو سہلاتے ہوئے مایوس سا اٹھ کھڑا ہوا۔ الویرا نے پچھلی رات ہی اپنے پتاجی کو اپنے خیالات بتا دیے تھے کہ وہ سندیپ جیسے انسان سے شادی نہیں کر سکتی۔ وہ چپ چاپ اندر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سوہن داس اور مہیش رائے نے بیک وقت الویرا کی طرف دیکھا تو اس کی پلکیں جھک گئیں۔ وہ سندیپ کی مایوسی کی وجہ جانتی تھی۔

☆☆☆

کولکتہ کا آسمان صبح ہی صبح گہرے سرمئی بادلوں سے مکمل ڈھک چکا تھا۔ دو روزہ آندھی طوفان اور ہواؤں کے بعد بارش اب کسی بھی سمے برسنا چاہتی تھی۔ سوہن داس اور الویرا نے کچھ دیر تک واپسی کے لیے نکلنا تھا۔ سندیپ چائے کا کپ لیے کمرے کی بالکنی میں یونہی موسم کی خوبصورتی دیکھنے آیا تھا۔ نظر نیچے لان میں کسی سرخ رنگ کی جھلک نے کھینچی۔ اس نے نیچے دیکھا، سرخ لباس اور سرخ آنچل میں کالے لمبے بال کھولے وہ پھولوں کی کیاری کی جانب منہ کیے کھڑی تھی۔ سندیپ کے لیے نظر ہٹانا ناممکن تھا۔ وہ اس کی محبوب، اس کی منظورِ نظر تھی۔ سنینا سے محبت اور تعلق کی جذباتیت نے اسے جہاں کئی نقصان پہنچائے تھے، وہاں ایک سیکھ ضرور ملی تھی کہ محبت کے رشتے میں صرف محبت کافی نہیں ہوتی، عزت وہ شکر ہے جو محبت کی چائے کو میٹھا اور مکمل بناتی ہے۔ اس نے سنینا کی عزت کی تھی نہ قدر...... اور یہ پچھتاوا زندگی بھر اس کے ساتھ رہنے والا تھا کہ اس نے سنینا کے جذبات سے کھلواڑ کیا تھا لیکن آگے زندگی بھر یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی اور کے ساتھ ایسا ہونے دیتا۔ الویرا نے اسے ٹھکرایا تھا تو اس نے بھی خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔ الویرا کا اس کی ذات پر بھروسا نہ کرنا جائز تھا۔ سندیپ کو اس وقت الویرا کو دیکھ کر وہ صبح یاد آگئی جب وہ سرخ لباس پہنے نیچے لان میں اسے بلانے آئی تھی۔ وہ فرطِ محبت میں کھنچا چلا گیا تھا اور بھی شاید دیکھے جانے کے احساس سے الویرا نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی نظر سندیپ پر پڑی تو سندیپ نے فوراً اپنی نظریں ہٹائیں اور پھر پلٹ کر اندر چلا گیا۔ الویرا نے بالکنی سے نظریں ہٹا کر نیچے برآمدے میں دیکھا جہاں اپرنا جی بیٹھی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ سوچوں کو جھٹک کر ان کے پاس چلی گئی۔ وہ بھی مسکرا کر الویرا کو دیکھنے لگیں کہ تھوڑی دیر میں انہوں نے چلے جانا تھا۔

☆☆☆

ڈرائیور نے سامان کار کی ڈکی میں رکھا۔ سندیپ بلیو جینز اور بلیک شرٹ کے ساتھ گلے میں گرے مفلر پہنے کار کے نزدیک آیا۔ اس کا ارادہ ڈرائیور سے چابی لے کر خود کار ڈرائیو کرنے کا تھا۔ برآمدے کی کرسیوں پر اس کے پاپا اور سوہن انکل بیٹھے تھے۔ ممی اٹھ کر اس کے قریب آئیں۔

''الویرا کہاں ہے بیٹا؟''

''جی۔'' وہ چونکا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔ میں تو اندر سے آیا ہوں۔''

''ہاں، وہ بھی تو اندر ہی ہے۔ میں سمجھی تم دونوں ایک ساتھ آرہے ہو۔'' انہوں نے کوریڈور کی طرف دیکھا۔

''میں تو اپنے کمرے میں تھا۔ میں نے الویرا کو نہیں دیکھا۔''
''اچھا، تو بلا لاؤ اسے بھی۔ اپنے کمرے میں ہوگی۔''
انہوں نے منت بھرے لہجے میں کہا تو سندیپ بنا کچھ کہے اندر بڑھ گیا۔
سوہن داس اور الویرا گیسٹ روم میں رہ رہے تھے۔
وہ گیسٹ روم کے دروازے پر آیا اور ہلکی سی دستک دی۔
''کون؟'' الویرا چونک کر پلٹی۔
''الویرا! آپ کو باہر بلا رہے ہیں۔'' اس نے روم کے باہر سے ہی کہا۔ سندیپ کی آواز سن کر الویرا کے لبوں پر مسکراہٹ چمکی۔
''جی وہ...... ایکچوئلی! میرا یہ بیگ ...... بہت بھاری ہے۔'' اس نے اٹک اٹک کر یوں کہا جیسے کچھ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ سندیپ سن کر فوراً اندر لپکا۔ اسے تو لگا تھا ڈرائیور نے سامان رکھ دیا ہے۔ وہ کمرے میں آیا تو الویرا دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ہلکی مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کے آس پاس کوئی سامان تھا ہی نہیں۔ سندیپ نے بات سمجھنے کی کوشش کی لیکن سمجھ نہیں پایا۔ بس خاموش سوالیہ نظروں سے الویرا کو دیکھنے پر اکتفا کیا۔ البتہ اس طرح دیکھے جانے پر الویرا ضرور نروس ہوگئی۔ جھینپ کر فوراً ہی پیٹھ موڑ لی۔
''باہر...... سب انتظار کر رہے ہیں۔'' سندیپ نے کچھ دیر رک کر کہا۔
''آپ سے آنٹی نے کوئی بات کی؟''
''ممی نے ......؟ نہیں تو...... کون سی بات؟'' وہ چونکا۔ ''انہوں نے تو کہا ہے کہ آپ کو اندر سے بلا لاؤں۔''
''اوہ۔'' الویرا نے بے اختیار لب دبائے جیسے دہری مشکل میں پڑ گئی ہو۔ سندیپ نے خاصی دلچسپی سے اس کی گھبراہٹ کو دیکھا۔ بات جیسے کچھ کچھ سمجھ آنے لگی لیکن اس نے اپنا چہرہ سنجیدہ رکھا۔
''جی کون سی بات......؟ آپ بتا دیجیے۔''
''نہیں۔'' الویرا نے پھر چہرہ گھما لیا۔ ''آپ انہی سے پوچھ لیجیے۔''
''کیا پتا وہ یہ چاہتی ہوں کہ آپ مجھے خود اپنے منہ سے بتائیں۔'' سندیپ اب دھیرے دھیرے اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔
''کک...... کون سی بات؟'' وہ اس کے نزدیک آنے پر ایک دم گھبرا گئی اور الٹا اسی سے پوچھنے لگی تو سندیپ نے قہقہہ لگایا۔
''بھئی، کمال کرتی ہیں۔ بات آپ نے کرنا ہے، پوچھ مجھ سے رہی ہیں۔''
''جی ...... وہ...... دراصل مجھے سوری کرنا تھا آپ سے۔''
''سوری...... ! کیوں؟'' سندیپ نے مسکراہٹ روکی۔
''وہ میں نے آپ کا پروپوزل قبول نہیں کیا تو......''
''جھوٹ۔''
''جی......'' وہ گھبرا کر پلٹی۔ آنکھوں میں معصوم سی حیرت تھی۔
''میرا مطلب ہے...... سوری والی بات جھوٹی ہے کیونکہ اگر سوری کرنا ہوتا تو آپ میری ممی کے ذریعے کیوں کرواتیں۔ سوری تو آمنے سامنے خود کی جاتی ہے نا؟ کسی اور سے کہلوانے کی بات نہیں ہوتی۔''
''جی۔'' وہ شرمندہ ہو کر ہنس پڑی۔ سر بھی نیچے جھکا لیا تھا۔ الویرا کے کان میں پھنسی لٹ ڈھیلی ہو کر سامنے چہرے پر آ گئی۔ اس کے شرمائے شرمائے انداز ہرگز ایسی لڑکی والے نہ تھے جو کسی کا پروپوزل ٹھکرا دینے کے بعد ہوتے ہیں۔ البتہ سندیپ ابھی اتنی جلدی خوش فہمی میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے رک کر کچھ سوچا۔ اسے الویرا کے دل کی بات اس کی زبانی سننا تھی۔
''آپ کو میرے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے الویرا! مجھے اب اس ماحول سے کچھ عرصے کا بریک چاہیے۔ میں نے سوچا ہے میں باہر چلا جاؤں۔ میرے ایک انکل لندن میں ہیں۔ میں نے ان سے بات کر لی ہے۔ اگلے ہفتے میں بھی......''
''نہیں، نہیں۔'' اس نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ ''وہ...... س...... سوری والی بات نہیں تھی۔ مجھے کچھ اور کہنا تھا...... اور آپ کو بریک لینے کی بھی ضرورت نہیں...... میں...... میں......'' وہ اٹک گئی۔
''جی، جی...... میں کیا؟'' سندیپ اس کے جھکے سر کا فائدہ اٹھا کر ہلکا سا مسکرا بھی دیا البتہ اس کے سر اٹھانے پر دوبارہ چہرہ سنجیدہ کر لیا۔
''میں نے انکار نہیں کیا۔'' وہ بہت ہلکی آواز میں منمنائی۔
''اچھا!'' سندیپ نے ایکٹنگ کی۔ ''لیکن مجھے تو یہی پتا چلا تھا کہ آپ نے منع کر دیا تھا۔''
''ہاں...... وہ پہلے کیا تھا۔'' وہ پھر دھیرے سے بولی۔
''اچھا...... تو بعد میں ایسا کیا ہوا؟'' وہ اس کے چہرے کے بہت قریب آیا۔ سندیپ کی سانسوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ الویرا نے اپنی پلکیں سختی سے میچ لیں۔

''بولونا الویرا! ایک بُرے انسان پر ترس کھانے کی وجہ؟''

''ایسا مت کہیں۔ آپ شرمندہ ہیں اپنے کیے پر..... میرے لیے یہی بہت ہے۔''

''کیا صرف اتنا ہی..... یا میرا ساتھ بھی قبول ہے؟''

اس نے الویرا کے چہرے پر آئی لٹ ہٹا کر کان کے پیچھے کرتے اس کا چہرہ اپنی انگلیوں سے اونچا کیا۔

''ہوں۔'' وہ ہلکا سا مسکرائی۔ آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ سندیپ نے اس کے مسکراتے اقرار کو محبت سے دیکھتے ہوئے اس کی بند آنکھوں کو باری باری چوم لیا۔

''تھینک یو الویرا..... تھینک یو سو مچ.....! تمہارا اقرار میرے لیے نئی زندگی کا تحفہ ہے اور صرف میری نہیں، یہ نئی آنے والی زندگی ہم دونوں کی ہوگی۔''

''آپ نے میری جان بچانے کے لیے کل خود کو موت کے حوالے کر دیا۔ کسی کے خلوص کو پہچاننے کے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔'' وہ اس بار سنجیدگی سے کہہ کر رخ پھیر گئی۔

''کچھ لمحے واقعی سوچ بچار کے نہیں ہوتے الویرا! وہ بھی ایک ایسا وقت تھا جب سوائے اس کے مجھے اور کچھ نہیں سوجھا کہ کسی بھی طرح تمہیں بچانا ہے۔ میں نے محبت کو سمجھنے میں ایک مدت لگا دی لیکن اب محبت مجھے بتا رہی ہے کہ اسے کیسے برتنا ہے۔ جانتی ہو سب سے زیادہ مجھے کس چیز کا درد ہے؟'' وہ بے ساختہ ہنسا تو آواز و لب و لہجے میں عجیب سا درد تھا۔ الویرا جو پلٹ کر اسی کو دیکھ رہی تھی، چند قدم چل کر تھوڑا اور قریب آئی۔ اب وہ اسے بغور سن رہی تھی۔

''سنینا کی حقیقت معلوم ہونے سے پہلے وہ وقت جو میں نے دارجلنگ میں گزارا، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری بیت چکی زندگی اور آنے والے جیون کے یہ سب سے حسین پل ہیں۔ وہ تمام وقت جس میں الویرا میرے ساتھ تھی۔ وہ سارے پل جن میں، میں نے سچی محبت کے خوبصورت احساس کو بہت شدت سے اپنے دل کے بہت قریب محسوس کیا۔ اس پہلی نظر میں جب تم اپنا یورومال میرے زخم پر باندھ رہی تھیں اور میں ہر بات بھول کر بس ایک ٹک تمہیں دیکھے جا رہا تھا۔ وہ پہلی نظر کی محبت کا پہلا لمحہ تھا لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ تمہیں وہ سب باتیں بھول چکی ہیں۔ یہ درد مجھے.....''

''نہیں بھولیں۔'' وہ ایک دم اچانک بولی تو سندیپ ٹھٹکا۔

''ہوں..... مطلب.....؟'' دل جیسے بہت نیچے گہرائیوں میں ڈوب سا گیا۔ الویرا کی مسکراہٹ میں اسے سنینا کی ہنسی کی پراسرار چمک دکھائی دینے لگی۔ وہ گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹا۔ الویرا کا جواب قطعی غیر متوقع تھا۔ ویسی ہی ہنسی..... اور اس کی آنکھوں کی چمک.....

''آپ کی پہلی نظر کی محبت کا وہ پہلا لمحہ مجھے بھی یاد ہے سندیپ جی! کیونکہ وہی نظر سنینا کی آتما کو بری طرح چبھی تھی اور جس کے بعد اس نے میرا روپ دھارن کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن وہ پہلی نظر صرف الویرا کے لیے تھی اور وہ الویرا کو کبھی نہیں بھول سکتی۔'' اس بار الویرا مسکرائی تو سندیپ کی گہری سانس میں بھی اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

''اوہ۔ ایک پل کے لیے تو میں ڈر ہی گیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں الویرا سے نہیں، سنینا سے بات کر رہا ہوں۔''

''سنینا اب ہمارے درمیان کبھی نہیں آئے گی..... اور آپ کی باتیں سن کر میرا دل یہ چاہ رہا ہے سندیپ جی کہ آپ ایک بار پھر ہمارے ساتھ دوارس چلیں تاکہ ہم اس وقت کو ایک بار پھر اپنی مرضی سے جی سکیں، محبت کی خوبصورتی کو ہم نئے سرے سے پھر دریافت کریں، وہ سارے پل ایک مرتبہ پھر سے تازہ کریں جو سنینا نے ہم سے چھین لیے تھے۔''

''سچ کہتی ہو الویرا! تمہاری بھی یہی اِچھا ہے؟'' وہ بے طرح خوش ہو گیا۔

''جی۔'' وہ پلکیں موند کر مسکرائی۔

''تو ٹھیک ہے، پھر آج نہیں..... ہم سب مل کر کل دوارس جائیں گے۔ اس مرتبہ میں اپنے ممی پاپا کو بھی ساتھ لے چلتا ہوں۔ اس لیے آج کا پروگرام کینسل۔ آج آپ لوگ یہیں رکیں کیونکہ میں نے بھی آپ کو اپنا شہر دکھانا ہے اور ابھی تو ہم نے باقی سب کو یہ خوشخبری بھی سنانا ہے۔''

''یہ خوشخبری پہلے ہی پھر وہاں تو پہنچ چکی ہوگی جناب! کیونکہ آنٹی کو میں نے اپنا جواب صبح ہی بتا دیا تھا۔''

''تو مطلب..... مجھے سرپرائز دیا جا رہا تھا، ہوں؟''

اس نے الویرا کو بازوؤں سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کیا۔

''جی۔ آنٹی کہہ رہی تھیں ذرا سندیپ کو تنگ کرو۔'' وہ شرارت سے ہنسی اور سندیپ نے طمانیت سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ زندگی اندھیروں سے نکل کر روشنی کی سمت روانہ ہوئی تھی اور سندیپ نے الویرا کے جیون کی ہر راہ کو چراغوں سے روشن کرنے کا دل میں عہد باندھا۔ سنینا پر جینے کے راستے بند کر کے اس نے ایک معصوم کو جن تاریکیوں کی نذر کیا تھا، وہ بھول دوبارہ دہرانے کی نہ تھی۔ الویرا کو اس نے جیون کی وہ ہر خوشی دینا تھی جس سے سنینا کبھی محروم رہی تھی۔

✱✱✱